Scanned with CamScanner

قال اللہ تعالیٰ

یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ پکڑو)

(وقال الشعرانی فی الیواقیت)

"فنابت عنھم رسائلھم بعد موتھم فی نصح المریدین"

مشائخ کی وفات کے بعد طالبین کی اصلاح کے سلسلہ میں ان حضرات کی تصانیف بھی انکی قائم مقام ہوا کرتی ہیں — بناءً علیہ

مجموعہ تالیفات مصلح الامۃ

(حصہ چہارم)

عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

(بانتظام)

مکتبہ اشرفیہ

۳۶ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سنہ ۱۴۰۲ھ

۱۹۸۲ء

فہرست مضامین
تالیفات مصلح الامۃؒ حصہ چہارم

مرتبہ عبد الرحمٰن جامی غفرلہٗ

Scanned with CamScanner

قال اللہ تعالیٰ

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ

اور ان کو بس یہی حکم ہوا کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی در آنحالیکہ اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہوں

چوں آیت بالا دال است بر ضرورتِ تحصیل اخلاص برائے ہر عام و خاص

بنا بریں کتاب مستطاب مسمّٰی بہ

وصیۃ الاخلاص

کہ مشتمل است بر فضیلت اخلاص و ترغیب و طریق حصول آں

از افادات

جنید وقت و شبلی دوراں۔ متبع سنت عامل قرآں عارف باللہ

حضرت مولانا و مقتدانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی ثم الہ آبادی

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امّابعد:۔ میرے ایک محترم اور مخلص دوست اور عزیز نے نہایت اخلاص سے مجھ سے اس امر کی فرمائش کی کہ میں ایک رسالہ اخلاص کے عنوان پر تالیف کردوں۔ جس میں تعلیم و تعلّم کے فضائل قرآن وحدیث سے بیان کروں ان کا خط میں یہاں بعینہٖ نقل کرتا ہوں

مشفق محترم، مخدوم و معظم دامت برکاتہ و مدت فیوضہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ حضرت والا کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ جناب والا سے رخصت ہوکر اور جلسہ سے فراغت کر کے بخیریت و براحت اپنے وطن رائے بریلی آیا۔ جہاں سے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ راستہ بھر جناب کی شفقتوں اور ارشادات عالیہ کا مزہ لیتا رہا۔ اور التفات خاص سے اپنے شکستہ دل کو تسلی دیتا رہا۔ متعنا اللّٰہ بفیوضکم۔ چند رسائل گرامی ساتھ لایا تھا۔ ان کے مطالعہ کا موقعہ ملا، جی چاہا کہ جناب کی خدمت میں عرض کروں کہ وصیۃ الاخلاص کے نام سے بھی ایک رسالہ تحریر فرمایا جائے خاص طور پر یہ خیال اس کا داعی و محرک ہے کہ مدارس عربیہ میں پڑھنے پڑھانے والوں کی بڑی تعداد اخلاص فی التعلم واخلاص فی التعلیم سے نہ صرف بے بہرہ بلکہ بے حس ہے اس کا نتیجہ ہے کہ اس کے روحانی و اخلاقی ثمرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ آخرت میں سخت مایوسی و شرمندگی ہوگی۔ اگر تعلیم و تعلّم کے فضائل احادیث صحیحہ سے اور اس کے متعلق اپنی تشریحات اور تطبیقات قلمبند فرما دیجائیں تو ہم اہل مدارس کے لئے بہت نافع ہوں گی۔

شوال کا مہینہ مدارس دینیہ عربیہ کے افتتاح کا ہوتا ہے۔ اس وقت اس رسالہ کی اشاعت نہایت مفید ہوگی۔ اگر یہ معروضات نامناسب نہ تصور فرمائی جائیں تو ضرور اس اہم موضوع کی طرف توجہ فرمائی جائے۔ خواہ گرامی نامہ کی شکل اور التذکیر بالقرآن کی صورت میں ہو خواہ مستقل رسالہ ہو انشاء اللہ مفید و نہایت باعث برکت ہوگا۔ واللّٰہ الموفق والمستعان۔ والسلام۔ طالب دعا و توجہ ابوالحسن علی (ندوی)

Scanned with CamScanner

اس کا حاصل یہ ہے کہ میں نے یہ سمجھا کہ تعلیم و تعلم کے فضائل کے بیان کے ساتھ ساتھ اس رسالہ میں اخلاص کا بھی بیان ہو کیونکہ اخلاص کے بغیر عند اللہ کوئی عمل مقبول و معتبر نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں مجھے اولاً تو یہ خیال ہوا کہ تعلیم و تعلم کی فضیلت کی آیات و احادیث تو مشہور ہی ہیں اور اہل علم کے السنۃ پر جاری و ساری ہیں۔ لہذا اہل علم کے روبرو فضائل علم پر کچھ کلام کرنا تحصیل حاصل ہے اس لئے کہ بیان فضیلت سے تو مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس چیز کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں۔ پس جو حضرات اس سے پہلے سے واقف ہیں ان کے سامنے اسکے بیان کی کیا حاجت ہے لیکن چونکہ یہ اخلاص سے کہا گیا تھا اور مخلص کا اخلاص ضائع نہیں ہوتا اس لئے جی چاہا کہ اس کو بعینہٖ پورا کروں یعنی تعلیم و تعلم کے فضائل کا بھی بیان کروں اور اس کے ساتھ اخلاص کا بھی بیان کروں۔

چنانچہ اس رسالہ میں تعلیم و تعلم کی فضیلت پر کلام ایک نئے انداز سے کیا گیا ہے۔ شاید اہل علم کے لئے کسی قدر دلچسپ اور دلپذیر ہو۔ اس کے بعد اخلاص پر کلام کیا گیا ہے۔

علم اور علماء کے فضائل چونکہ علماء کے السنہ پر دائر سائر ہیں اس لئے اس پر طویل کلام کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، لیکن اگر ضرورت سمجھی جائے تو میرے رسالہ التذکیر بالقرآن کو ملاحظہ کیا جائے میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ جس طرح سے علم و علماء کی مدح وارد ہے ذم بھی وارد ہے اور ظاہر ہے کہ مدح کا محل اور ہے اور ذم کا اور، تو دو قسمیں نکل آئیں۔ پھر ایک کو نظر انداز کر دینا (یعنی ذم کے پہلو سے قطع نظر کر لینا) یہ کس قدر انصاف اور تقویٰ اور شعار صلاح سے بعید ہے۔

یوں تو مدح و ذم کی نصوص بیشمار ہیں لیکن ہم یہاں دونوں کی صرف ایک نص بیان کرتے ہیں۔ سنیئے:۔ علماء کی مدح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ (یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں)

میں کہتا ہوں کہ اس میں علماء کے لئے خشیت کا اثبات فرما رہے ہیں۔ اور خشیت چونکہ ہوتی ہے

معرفت سے تو خشیت کے ثبوت سے معرفت کا بھی ثبوت ہوگیا. تو اس کا حاصل یہ ہے کہ معرفت اور خوف میں ساری مخلوق پر جن کو امتیاز حاصل ہے انھیں کو قرآن میں علماء کہا گیا ہے. اور خشیت کو علماء کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کہ خشیت کہتے ہیں. اُس خوف کو جو تعظیم کے ساتھ ہو اور خوف مع العظمۃ یہ مخصوص ہے عالم ہی کے ساتھ چنانچہ تفسیر مظہری میں قاضی صاحب رح وھم من خشیتہ مشفقون کے تحت لکھتے ہیں کہ الخشیۃ خوف مع التعظیم ولذلک خص بہ العلماء فالمعنی وھم من خوفہ لاجل عظمتہ وھیبتہ خائفون لا یامنون مکرہ (تفسیر مظہری صہ ۱۹۲)

دیکھئے اس میں علماء کی مدح کی تصریح ہے. اور ظاہر ہے کہ علماء کی مدح سے علم کی مدح بھی مفہوم ہوئی اور جس طرح سے علم کی مدح نکلی اسی طرح سے اس میں جو لوگ مشغول ہیں خواہ معلّم ہوں خواہ متعلّم اُن کی مدح بھی دریافت ہوئی بشرطیکہ جو بنائے مدح ہے وہ اُن میں موجود ہو (یعنی خشیت اور خوف)

اب اس آیت کی تشریح بخاری شریف کی شرح فتح الباری سے بھی نقل کرتا ہوں وھو ھذا فرماتے ہیں کہ یخاف من اللہ من علم قدرتہ وسلطانہ وھم العلماء قالہ ابن عباس رض

شارح کے اس جملہ سے کہ من علم قدرتہ وسلطانہ وھم العلماء یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جن علماء کی مدح فرما رہے ہیں وہ وہ ہیں جنکو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور سطوت اور قہر و جبروت کی معرفت اور اس کا استحضار تام رہتا ہو. عالم اصطلاحی مراد نہیں کہ جس کے علم کا ایک خاص نصاب (یعنی کورس) تمام ہو گیا ہو جیسا کہ اب ہمارے عرف میں ان کو بھی عالم کہا جاتا ہے اور جو فضیلت و درجہ ان علماء کا ہے جن کا آیت میں ذکر ہے وہ ان کے لئے بھی ثابت سمجھا جاتا ہے. اور ان سے بھی وہی توقعات وابستہ سمجھی جاتی ہیں جو اصلی علماء سے وابستہ ہونی چاہئیں. اس کو بھولا پن کہا جائے یا تجاہل عارفانہ سمجھا جائے.

حضرت قدس سرہٗ سے میں نے ایک حکایت سُنی ہے اس کا ذکر یہاں بے محل نہیں ہے حضرت مولانا یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے تصوّر شیخ جو صوفیہ کرام کے یہاں کا ایک مسئلہ ہے اسکی تقریر فرمائی تھی حضرت رح اس کو تحریر فرما رہے تھے. ایک صاحب پہونچے. انھوں نے دریافت کیا حضرت آپ یہ کیا لکھ رہے ہیں. فرمایا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں. یہ صاحب فرمانے لگے کہ کون شیخ بو علی سینا؟

اب دیکھئے کہ تصور شیخ ہیں جو شیخ ہے ان کو بھی ان بزرگ نے بوعلی سینا پر منطبق کر لیا۔ حالانکہ دونوں میں کون بعید ہے۔

غرض اس آیت سے علما کی جیسی کچھ مدح نکلی ظاہر ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خشیت علما کے لئے وصف لازم ہے۔ اگر وہی کسی میں نہ رہ جائے تو اس پر عالم کا اطلاق موجب ننگ ہی رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ صاحب روح المعانی آیتہ یَا اَھْلَ الْکِتَابِ قَدْ جَآئَکُمْ رَسُوْلُنَا کے تحت فرماتے ہیں کہ:۔

والتعبير عنهم بعنوان اهلية الكتاب للتشنيع فان اهلية الكتاب من موجبات مراعاته والعمل بمقتضاه وبيان مافيه من الاحكام وقد فعلوا ما فعلوا وهم يعلمون (روح پ۶)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انلوگوں کو اہل الکتاب کے عنوان سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے مقصود انکی مذمت کرنا ہے اسلئے کہ اہل کتاب ہونیکا مطلب تو یہ ہے کہ کتاب کے موجبات کی رعایت کرنا اور اسکے مقتضی پر عمل کرنا اس کتاب میں احکام ہیں انکا بیان لوگوں سے کرنا حالانکہ انلوگوں میں انمیں سے ایک بھی وصف نہ تھا سب جاننے کے باوجود بھی جو کچھ کرتے تھے معلوم ہی ہے

اب ذم والی آیت بھی سنئے:۔ ایک مقام پر علما سوء کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ

یعنی اے ایمان والو بہت سے یہود و نصاریٰ کے صرف لسانی اور ظاہری علم رکھنے والے علماء اور عبّاد لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں۔

اس آیت میں اگرچہ علماء یہود و نصاریٰ پر نکیر ہے مگر ابتداءً یا ایھا الذین اٰمنوا سے مومنین کو جو خطاب فرمایا تو اس میں تنبیہ ہے کہ تم خبردار ایسے مت ہونا اور یہ سب کام نہ کرنا۔

میں نے لسانی علم اس لئے کہا کہ روح المعانی میں احبار کے متعلق لکھا ہے کہ کانہ ماخوذ من تحبیر المعانی بحسن البیان عنها یعنی وہ لوگ معانی کو نہایت خوبصورت اور فصیح و بلیغ الفاظ سے ادا کرتے تھے گویا زبان ان کی عالم تھی اور قلب غافل تھا۔ اسی لئے اسکے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ

اَخْوَفُ مَا اَخَافُ علی امتی کل منافق علیم اللسان　　سب سے زیادہ خوف مجھے اپنی امت پر علیم اللسان منافق کا ہے ——

(الجامع الصغیر للسیوطیؒ ج ۱ ص ۱۳ لابن عدی فی الکامل عن عمرؓ)

اور اس کی شرح میں مناوی لکھتے ہیں:۔

ای عالم بالعلم منطلق اللسان به لکنه جاھل القلب والعمل فاسد العقیدۃ مغر للناس بتشقاقه وتفصحه وتقعره فی الکلام. قال المحشی الآخر تحت قوله کل منافق علیم اللسان ای منطلق اللسان فی العلوم والفصاحة خالی القلب من العمل به وانما خاف صلی الله علیه وسلم علیٰ امته منه لانه لفهمه العلم یقتدی به الناس فیضلهم (بیاض صفحہ ۲۳)

مراد اس سے وہ شخص ہے جو علوم میں ماہر ہو اور اس میں اسکی زبان خوب چلتی ہو لیکن اس کا قلب اور عمل بالکل جاہل ہو اور عقیدہ بھی اس کا فاسد ہو مگر لوگوں کو اپنی زبان آوری اور فصاحت بیان اور کلام کی گہرائی سے مغالطے میں ڈال رکھا ہو محشی کہتے ہیں کہ کل منافق علیم اللسان کا مطلب یہ ہے کہ علوم اور فصاحت میں زبان چلانے والا ہو اور قلب اس کا خالی ہو اس پر عمل کرنے سے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر ایسے شخص کا خوف اس لئے فرمایا کہ اسکے علوم کو سمجھنے اور جاننے کی وجہ سے لوگ اسکی بات مانیں گے اور اسکی اقتدا کریں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود تو گمراہ ہے ہی انکو بھی گمراہ کریگا۔

اور یہی مطلب ہے تورپشتیؒ کے اس قول کا جو کہ صاحب نفع قوت المغتذی نے ایک حدیث کے تحت نقل کیا ہے وھو ھذا

فرماتے ہیں کہ :-

حقیقة الفقه فی الدین ما وقع بالقلب فظهر علی لسانه فافاد علماً واورث خشیة وتقویٰ واما ما یتدارسه الغروریة فانه بمعزل عن الرتبة العظمیٰ لانه محله لسانه دون قلبه (صفحہ ۹۹ نفع قوت المغتذی)

فقہ فی الدین کی حقیقت یہ ہے کہ وہ علم قلب میں واقع ہو اور پھر زبان پر ظاہر ہو جس کا ثمرہ علم ہو اور جو خشیۃ اور تقوی بھی پیدا کرے باقی یہ جو اہل غرور پڑھتے پڑھاتے ہیں تو اس مرتبہ عظمی سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ اس علم کا محل تو صرف زبان ہوتی ہے نہ کہ قلب۔

بہرحال جس طرح اہل علم کے پیش نظر یہ دونوں درجے رہتے ہیں اسی طرح یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ معلمین نائب ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کے اور متعلمین بھی بالواسطہ انہیں کے متعلم ہیں، نہ معلم مستقل اور نہ متعلم۔ لہذا اس منصب شریف کا لحاظ معلم اور متعلم دونوں کے لئے اہم مقاصد شرع سے ہے۔

اب سنئے عام طور پر تو علم پر دینی ہی اعتبار سے بحث کی جاتی ہے لیکن میں علم کی اہمیت وضرورت کو دینی اور دنیوی اعتبار سے ثابت کرنا چاہتا ہوں تاکہ اسکی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جائے۔

اب پہلے دنیوی اعتبار سے اس کی ضرورت بیان کرتا ہوں اور اس سلسلہ میں آپ کے سامنے ایک اور چیز بطور تمہید کے پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے اہل زمانہ مانوس بھی ہیں اس لئے کہ اسکی بحث اس وقت دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی بنا ہوا ہے اور وہ ہے "مال" ——

علم کے ساتھ مال کا جوڑ شاید آپ کو ناپسند ہو لیکن میں نے ایک ضرورت سے اس کو لیا ہے وہ یہ کہ عام طور پر تو یہی دیکھا جاتا ہے کہ آج تحصیل علم کی واحد غرض حصول مال ہی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس علم کا مآل مال ہوتا ہے اس کی جانب تو لوگوں کی توجہ زیادہ ہوتی ہے اور جس علم سے مال نہیں ملتا چاہے اس سے مآل یعنی آخرت کیوں نہ درست ہو جائے اور رضائے الٰہی کیوں نہ حاصل ہو جائے اس کی جانب رغبت کم کی جاتی ہے۔ بہرحال اس دنیا میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک علم دوسرے مال۔ مال کی دنیا میں جیسی کچھ ضرورت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ کیونکہ انسان کے لئے مال قوام زندگی ہے قال اللہ تعالیٰ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا۔ (ترجمہ) اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جنکو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے۔

اس میں مال کو قوام زندگی فرمایا گیا ہے۔ بس اس کے بغیر تو دنیا کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ہمارا کھانا۔ پینا۔ پہننا۔ مکان۔ اثاث البیت غرض کہ ہماری تمام ہی ضروریات زندگی کی تحصیل کا ذریعہ مال ہے۔ لہذا مال کی تو اس دنیا میں قدم قدم پر ضرورت ہے اور اسکی ضرورت کا کوئی بھی منکر نہیں۔ نہ کوئی عالم اس کا انکار کر سکتا ہے نہ کوئی جاہل حتّٰی کہ دین و مذہب نے بھی اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہدیا جائے کہ اسلام میں مال حاصل کرنے کی ترغیب موجود ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں میں چند روایات پیش کرتا ہوں جو میرے

Scanned with CamScanner

اس مدعا پر شاہد عدل ہیں۔

(۱) حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلوا بھیجا جب میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ جاؤ کپڑے پہن کر اور ہتھیار سج کر آؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی اور پھر حاضر ہوا اس وقت آپؐ وضو فرما رہے تھے۔ پہلے تو آپ نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر فرمایا اے عمرو میرا یہ خیال ہے کہ تم کو ایک لشکر پر امیر بنا کر بھیجوں تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں مال غنیمت عطا فرمائیں اور خدا کرے تم صحیح سالم رہو۔ اور مجھے تمھارے لئے مال میں رغبت صالحہ ہے یعنی میرا جی چاہتا ہے کہ تمھارے پاس مال دیکھوں حضرت عمرو کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مال کی خاطر تو مسلمان ہوا نہیں۔ میں نے تو اسلام کی خاطر اسلام کو قبول کیا ہے اور اس لئے مسلمان ہوا ہوں کہ (دنیا و آخرت میں) آپ کی معیت مجھے نصیب رہے۔ آپؐ نے فرمایا یا عمرو نعما بالمال الصالح للرجل الصالح یعنی اے عمرو انسان اگر نیک اور صالح ہو اور مال بھی اس کو صالح اور طیب ملے تو پھر صالح شخص کے لئے صالح مال کیا ہی اچھی چیز ہے ـــــ دیکھئے اس میں مال حلال کی ترغیب اور مدح موجود ہے۔

(۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ من اخذہ بحقہ فنعم المعونۃ ھو یعنی جو شخص اس مال کو اس کے حق کے ساتھ لے یعنی جائز طریقوں سے اس کو حاصل کرنے اور صحیح مصرف میں اس کو صرف کرے تو یہ ایک اچھا معین اور اچھا مددگار ہے۔

(۳) حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں دنیا کو جو متاع غرور فرمایا گیا ہے تو یہ جب ہے کہ یہ طلب آخرت سے انسان کو روک دے لیکن اگر یہی دنیا اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی جانب داعی ہو اور آخرت کا ذریعہ بنے تو پھر یہی نعم المتاع ونعم الوسیلہ بھی ہے۔ یعنی نہایت ہی عمدہ برتنے کی چیز اور بہت ہی خوب وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

روح المعانی صـ۱۶ پ۲)

اب آپ حضرات کے سامنے ہیں جو مال کی یہ محمودیت احادیث سے ثابت کر رہا ہوں

تو بہت ممکن ہے یہ بات بھی آپ کو نئی معلوم ہو اس لئے کہ دنیا اور مال کے متعلق مشہور تو یہی ہے کہ دین میں ان کی مطلقاً گنجائش نہیں۔ بلکہ یہ امور دین کے بالکل منافی ہیں۔ میں نے اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اس بحث کو کچھ طول دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد یہ سمجھئے کہ آخر یہ غلط فہمی ہوئی کہاں سے؟ بات یہ ہے کہ دین کے پیش نظر مقصودیت کے درجے میں تو صرف آخرت ہے اور دنیا کی حیثیت اس کے نزدیک صرف وسیلہ کی سی ہے تو اگر کسی نے دنیا سے ایسا تعلق رکھا جو دین کے لئے معین ہو تو اس وقت تو یہ دنیا نعم المعونۃ ہوگی اور نعم المتاع و نعم الوسیلہ اور نعم المال الصالح للرجل الصالح کا مصداق ہوگی۔

اور اگر کسی نے دنیا کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اور آخرت سے دور کرنے والے طریقوں میں استعمال کیا تو بیشک ایسی دنیا کی تو مذمت ہی کی جائیگی اور اس سے احتراز ہی کیا جائیگا۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ھی لین مسھا قاتل سمھا یعنی یہ دنیا ایسی ہے کہ اس کا مَس یعنی چھونا تو نرم ہے اور سَمّ یعنی زہر اس کا قاتل ہی ہے۔ (مَس اور سَمّ کی لطافت ملاحظہ ہو)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ مال اور دنیا میں دونوں ہی پہلو ہیں یعنی ایک حیثیت سے اگر یہ قابل مدح چیز ہے تو دوسرے اعتبار سے مستحق ذم بھی ہے۔ لیکن ذم کا اصل منشاء اس کا سوء استعمال ہے ورنہ تو نفس دنیا کوئی قابل مذمت اور نفرت کی چیز نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ :-

ولا اری الاستدلال علی رداءۃ الدنیا الا استدلالا فی مقام الضرورۃ نعم ھی نعمت الدار لمن تزود منہا لآخرتہ

دنیا کی مذمت جو شریعت میں وارد ہے تو اسکے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ صرف ضرورۃً ہی آئی ہے ورنہ تو یہ ایک اچھی جگہ بھی ہے اس شخص کیلئے جو اس میں رہ کر اپنی آخرت کیلئے توشہ تیار کرے۔

(روح المعانی ص۸۵ پ۱)

خیر یہ بحث تو درمیان میں آگئی تھی میں یہ بیان کر رہا تھا کہ مال کی اس دنیا میں کس قدر ضرورت ہے جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو اب یہ سمجھئے کہ ایک اور چیز بھی ہے جس کا درجہ مال

سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس کی اہمیت مال سے بھی کہیں زیادہ ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ مال کیلئے بمنزلہ علت کے ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ سُن لیجئے کہ وہ شئے علم ہے۔ علم اگر نہ ہو تو انسان مال جیسی ضرورت کی چیز سے بھی نفع نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ علم نہ ہونے کی وجہ سے اولاً تو اسکے اکتساب کے طریقوں ہی سے ناواقف رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مال سے محروم رہے گا اور اگر کسی طرح سے اس کو مال مل بھی گیا اور یہ جاہل ہوا تو اس کی حفاظت اس کے لئے آسان نہ ہوگی کیونکہ اس کے لئے بھی علم درکار ہے لہذا انجام یہ ہوگا کہ حاصل شدہ مال اور جمع کیا ہوا خزانہ بھی اس کی جہالت کی نذر ہو کر ضائع اور ہلاک ہو جائے گا۔ اسی طرح سے اگر مال بالفرض ہوا اور کسی نہ کسی طرح سے اس کی حفاظت بھی کر لی گئی لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مواقع استعمال یعنی (خرچ کی جگہ) اور حدود انفاق سے ناواقف رہا تو بھی مال ایسے شخص کے حق میں وبال ہی ثابت ہوگا۔ چنانچہ دنیا میں بھی یہ شخص ساری عمر بدنظمی اور بدانتظامی کا شکار رہے گا اور آخرت میں اس امانت کے ضیاع کی اس سے بازپرس الگ رہے گی۔

الغرض مال کے لئے اوّل بھی علم کی ضرورت ہے اور درمیان اور آخر میں بھی علم کی ضرورت اور حاجت ہے۔ اسی کو میں نے کہا تھا کہ علم، مال کیلئے بمنزلہ علت کے ہے۔

چونکہ تحصیل مال میں بھی علم کی ضرورت ہے اور اس کے تحفظ اور استعمال میں بھی علم کی حاجت ہے لہذا جس منزل میں بھی آدمی علم سے عاری ہوگا مال یا تو اس کا ساتھ چھوڑ دے گا یا اس پر وبال ہو جائے گا۔

یہاں پر ایک بات اور سُن لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا فرمایا ہے تو عام طور سے تو علت تخلیق قدرت کو سمجھا جاتا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ قادر مطلق ہیں اس لئے اپنی قدرت سے اس عالم کو وجود عطا فرمایا ہے لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ قدرت سے بھی مقدم ایک اور چیز ہے کہ دراصل وہی منشا بنتی ہے استعمال قدرت کا اور وہ ہے علم۔ لہذا تخلیق کی علت قدرت سہی مگر علم اس کے لئے بمنزلہ علت العلل کے ہے اس لئے اس کا مقام

قدرت سے بھی اقدام ہے۔ اسی طرح سے ممکنات میں بھی دیکھئے کہ کوئی شخص کسی کو کھانے میں زہر دیدیتا ہے۔ تو اس کھانے والے کو قدرت تو اس کی ہوتی ہے کہ اس کھانے ہی کو نہ کھائے لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے اُسے استعمال کر لیتا ہے۔ یہی حال مال کا بھی ہے کہ اگر آدمی میں علم نہیں ہے تو مال کا بھی سوء استعمال کرے گا۔ یعنی جب اس کی آمد و خرچ کے مواقع سے ناواقف ہوگا تو کبھی دوسرے پر ظلم کرکے مال کو حاصل کریگا۔ جس سے کبھی غیروں کی حق تلفی ہوجائیگی کبھی ناجائز ذرائع اختیار کرے گا۔ کبھی بے محل اس کا استعمال کرے گا۔ اور یہ سب چیزیں خلق و خالق کے نزدیک مذموم ہیں۔ اسی طرح کبھی یہ ہوگا کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے مال کو اس کے مرتبے سے بڑھادے گا۔ مثلاً یہ کہ مال کی جگہ جیب اور بکس ہے اور یہ اس کو اپنے دل میں رکھے گا جو یقیناً حد سے تجاوز ہے یا مثلاً عقل کے نزدیک اس کی حیثیت خادم اور غلام کی سی ہے اور یہ شخص اس کو اپنے اوپر حاکم بنالیگا۔ اور خود اس کا محکوم ہوجائیگا جو کہ صریح قلب موضوع ہے اور بالکل اس کا مصداق ہے کہ ؎

ان ھذا من اعاجیب الزمن　　کان مملوکی فاضحی مالکی

ایک شخص اپنے غلام پر عاشق ہوگیا تھا۔ جب غلام کو اس امر کا احساس ہوگیا تو وہ ناز و انداز کرنے لگا اور اس کو پریشان کرنے لگا اس پر اُس نے کہا ؎

ان ھذا من اعاجیب الزمن　　کان مملوکی فاضحی مالکی

یعنی دیکھو تو سہی یہ ظالم میرا مملوک تھا اور میں اس کا مالک تھا۔ یہ میرا محکوم تھا میں اس کا حاکم تھا لیکن اب یہ میرا حاکم اور مالک ہوگیا اور میں اس کا محکوم اور مملوک ہوگیا۔ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے۔

اسی طرح سے مال بھی جو کہ تابع اور مملوک رکھنے کی چیز ہے یہ انسان جب علم سے کورا ہوتا ہے تو اس کو بھی اپنا حاکم بنالیتا ہے اور خود اس کا تابع اور محکوم ہوجاتا ہے جیسا کہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں۔ آپ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ جہالت کا کرشمہ ہے کیونکہ آدمی

جب کسی چیز کے حقیقی حدود اور اس کے صحیح مقام سے واقف ہوتا ہے تو پھر اس سے اس قسم کی بدعنوانیاں نہیں ہوتیں۔

غرض کہ مال جس کی شان یہ ہے کہ وہ عقل تک کو سرگشتہ کر دیتا ہے اگر اسکی درستگی اور اصلاح کسی چیز سے ہو سکتی ہے تو وہ یہی علم ہے۔ مولانا رومؒ اسی مضمون کو مثنوی میں بیان فرماتے ہیں ؎

زر خرد را والہ و شیدا کند خاصہ مفلس راکہ خوش رسوا کند

یعنی مال عقل کو سرگشتہ اور شیفتہ کر دیتا ہے۔ اور خصوصاً مفلس کو کہ اسکی تو بری گت بنا دیتا ہے یعنی وہ بہت جلد حرص میں پھنس کر ذلیل اور رسوا ہوتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ ؎

زر اگرچہ عقل می آرد و لیک مرد عاقل باید اورا نیک نیک

یعنی گو مال و زر عقل کو بھی بڑھاتا ہے مگر اس سے ہر شخص کی عقل نہیں بڑھتی بلکہ اس کے لئے بڑے عاقل کی ضرورت ہے جو کہ مال کو اچھے موقع پر صرف کرے اور اپنے دین کا معین و خادم اس کو بنا سکے اور یہ بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔

دیکھئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ مال کا نفع گو ازدیاد عقل ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو بدون علم کے میسر نہیں ہوتا۔ بس یہی بات میں اس وقت آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ علم کی ضرورت اس کی اہمیت اور اس کا درجہ اور مقام معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس نظر سے دیکھئے کہ آج کی دنیا میں مال کا جو درجہ ہے اور ہماری دنیوی زندگی میں اس کی جو حیثیت ہے وہ ظاہر ہے تو اب اس مال کا حاصل کرنا اس کا تحفظ اور بقاء اور اس کا حسن استعمال بھی علم ہی پر موقوف ہے تو جب علم ایسی ضروری چیز یعنی مال کی علت اور اس کا موقوف علیہ ہوا تو خود اس کے مقام کا تو پوچھنا ہی کیا ــــــ

عقلی طور پر علم کا دنیوی مرتبہ جاننے کے بعد اب ہم علم کا مقام دینی اعتبار سے بھی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سنئے دنیا میں دو چیزیں ہیں عبادت اور علم۔ آپ اس سے ناواقف نہ ہونگے کہ قرآن حکیم میں جن و انس کے پیدا کئے جانے کا مقصد عبادت کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۵ (ترجمہ) یعنی ہم نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا تاکہ وہ ہماری عبادت کریں۔ گویا یہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں ہمارے نفع کیلئے ہیں لیکن ہمارا جینا عبادت کی خاطر ہے۔ ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ۵ (ترجمہ) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کیلئے جو کچھ زمین میں موجود ہے سب کا سب۔

اسی مضمون کو حضرت سعدیؒ یوں بیان فرماتے ہیں ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است — تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

یعنی کھانا زندگی قائم رہنے اور خدا کی یاد کرنے کیلئے ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا جینا ہی کھانے کے لئے ہے۔

دیکھئے ان سب تصریحات سے معلوم ہوا کہ دین میں عبادت کا مقام کس قدر بلند ہے۔ لیکن جہاں یہ ہے وہیں یہ بھی ثابت ہے کہ علم دین کا مرتبہ عبادت سے بھی بڑھا ہوا ہے چنانچہ تخلیق عالم کے ذکر کے بعد خلافت آدم کا مسئلہ قرآن شریف میں مذکور ہے۔ اسکی تفصیلات ملاحظہ کرنیکے بعد اس امر میں ذرا بھی پوشیدگی باقی نہیں رہ جاتی کہ خلافت کے باب میں ترجیح آدم علی الملائکہ کا باعث جو امر بنا وہ اُن کا علم ہی تھا چنانچہ وعلم آدم الاسماء میں تو تصریح ہی ہے کہ آدم علیہ السلام کے علم ہی نے ان کو مستحق خلافت ٹھہرایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے صفات میں سے علم کا جو مقام ہے ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ صفت قدرت پر بھی مقدم ہے اور انسان کو جو علم ہوتا ہے وہ بھی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے صفت علم کا پرتو ہوتا ہے اس لئے اس کا بھی درجہ انسان کی اور صفات سے بڑھا ہوا ہے۔ یعنی اس کے ساتھ اتصاف انسان کا سب سے بڑا شرف وفضل اور کمال ہے تو جب آدم علیہ السلام اس میں نائب حق ثابت ہوگئے تو پھر خلیفۃ اللہ فی الارض ہونیکے بھی وہی اہل قرار دیئے گئے۔

علم کی فضیلت اور اس کا دینی مقام بیان کرنے کے سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ حضرت علامہ علی متقیؒ کا کلام آپ کے سامنے نقل کروں جو کہ بیشتر معلومات پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

اتفق المحققون علی ان افضل الاعمال — محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اعمال میں سب سے بہتر وہ عمل

ما ینفع بعد موتہ کالباقیات الصالحات الوارد فی الکتاب العزیز والسبعۃ واردۃ فی الحدیث من تعلیم و اجراء نھر وحفر بیر وغرس نخل و بناء مسجد و ترک مصحف او ولد قال ونشر العلم افضلھا فانہ ابقی اذ مثل النخل والبیر ینمحی بعد مدۃ والعلم یبقی اثرہ الی یوم الدین قال ولہ اسباب کتدریس و وقف کتاب واعارتہ واعطاء کاغذ او مداد وقلم والعمدۃ فیہ تعلیم عامی او صبی الھجاء حتی یتفرع علوم جمۃ فھو کغرس شجرۃ یتفرع علیہ اغصان واثمار والاعانۃ بالکاغذ کھبۃ الارض والمداد کالبذر والقلم کالۃ الحرث

مجمع البحار ص۴۲۱ ج ۲

ہے جو آخرت میں کام دے جنھیں قرآن کریم میں باقیات صالحات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور حدیث شریف میں سات چیزوں سے انھیں شمار کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ تعلیم یعنی علم سکھانا۔ نہر جاری کرنا۔ کنواں کھدوا دینا۔ پھل دار درخت لگانا۔ مسجد تعمیر کرا دینا۔ کسی کو قرآن شریف دے دینا۔ ولد صالح چھوڑ جانا۔ لیکن ان میں سب سے بڑھ کر نشر علم ہے۔ اس لئے کہ وہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ کیونکہ درخت اور کنواں مثلاً کچھ مدت کے بعد خشک ہو جاتے ہیں اور علم کا اثر تا قیام قیامت باقی رہتا ہے پھر اس نشر علم کے بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً کسی کو پڑھا دیا اور اسکی وجہ سے علم سلسلہ بہ سلسلہ چلتا رہا۔ یا کتابیں ہی کسی ادارے میں وقف کردیں جس سے کہ لوگ نفع اٹھاتے رہے۔ یا عاریۃً کسی کو استعمال کیلئے دیا۔ تو یہ سب بھی نشر علم میں داخل ہیں۔ یا کتاب نہیں دی بلکہ کاغذ قلم دوات دے دیا یہ بھی اسی شمار میں ہے اور سب سے عمدہ تو اس باب میں عوام الناس کی تعلیم ہے یا بچوں کو ابتداء سے پڑھانا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمام علوم و فنون کو حاصل کر کے فارغ ہو جائیں۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ایک درخت لگائے جس میں سے خوب شاخیں پھوٹیں اور اس میں خوب پھل آویں چنانچہ کسی طالب علم کو کاغذ دینا ایسا ہے جیسے اس کو ایک قطعہ زمین ہبہ کر دی ہو اور اسکی روشنائی کا انتظام کر دینا ایسا ہے جیسے اسکو بیج دے دیا ہو۔ اور قلم دینے کی مثال ایسی ہے جیسے اس کے لئے ہل وغیرہ کا انتظام کر دیا ہو۔

دیکھا آپ نے حضرت علی متقی رح نے علم کے ساتھ ساتھ آلات علم کی بھی کیسی فضیلت

2

بیان فرمائی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ جب علم کی فضیلت ثابت ہوگئی تو ظاہر ہے کہ اس کے جو ذرائع اور وسائط ہوں گے ان سب کی بھی اہمیت اور فضیلت اسی سے ثابت ہو جائیگی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ الشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ یہی وجہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ آلات علم سب معزز و محترم اور قابل اہتمام ہو جاتے ہیں تو معلم اور متعلم کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

پھر آلاتِ علم میں سے سب سے مہتم بالشان چیز کتابیں ہیں کیونکہ یہی ذریعہ ہیں علم سیکھنے کا بھی اور اس کے باقی اور یاد رہنے کا بھی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر وہ کتب دنیوی علوم کا ذریعہ ہیں تو ان سے علوم دنیوی حاصل ہوں گے اور اگر دینی کتب ہیں تو ان سے علم دین حاصل ہوگا۔ غرض علم دنیا کا ہو یا دین کا اس کے تحصیل کا ذریعہ اور اہم ذریعہ کتابیں ہی ہیں۔ اور یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کیونکہ اگر کتابیں نہ ہوتیں تو زبانی لوگ کتنی باتوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے پھر اگر کوئی بدخواہ درمیان میں کسی موقع پر بھی ان علوم میں تصرف کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا اور اس طرح سے کوئی بھی مسئلہ خواہ دین کا ہو یا دنیا کا قطع و برید اور محو و اثبات سے مامون اور محفوظ نہ رہ سکتا تھا نتیجہ یہ ہوتا کہ علم پر سے اعتبار ہی اٹھ جاتا۔ اور اختلاف کا دَور دَورہ ہو جاتا اسلئے ان حضرات کا یہ احسان عظیم ہے جنھوں نے کہ علوم کو کتابوں میں مدون فرما دیا کہ اب اس کی وجہ سے وہ گویا سیل بہ مُہر ہو کر بالکل محفوظ ہو گئے۔

دیکھئے آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف فرما نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی آپ کے ایک ایک قول اور فعل اور آپ کی جملہ تعلیمات سے جو واقف ہو سکتے ہیں تو یہ کتاب ہی کی تو برکت ہے۔ اسی طرح سے قرآن شریف کو اس عالم میں نازل ہوئے تقریباً چودہ سو برس کا زمانہ گذر گیا لیکن آج بھی ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ کون سی سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور کون سی مدینے میں۔ کون سی آیت رات کو نازل ہوئی اور کون سی دن میں۔ اور کون سی خلوت میں نازل ہوئی اور کون سی جلوت میں۔ یہ کیونکر؟ یہ فیض بھی کتابوں ہی کا ہے! اسی طرح سے آج سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت خواجہ اجمیریؒ بھی موجود نہیں ہیں نیز رومیؒ وغزالیؒ و جنیدؒ

Scanned with CamScanner

وشبلیؔ. سعدیؔ وحافظ رحمہم اللہ بھی اب دنیا میں نہیں رہ گئے ہیں۔ اسی طرح سے سلاطین میں سے جہانگیر وعالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بھی اس وقت موجود نہیں ہیں۔ نیز بقراط وسقراط۔ بوعلی وفارابی بھی اب صفحۂ ہستی پر نہیں رہ گئے ہیں مگر آج بھی ہم کو ان سب کے حالات ملفوظات انتظام سلطنت۔ کلام وتحقیقات کا جو پتہ ہے تو وہ کتابوں ہی کی بدولت تو ہے۔

الغرض علم کی عظمت واہمیت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اہمیت اور ضرورت ظاہر وباہر ہے۔ اب اگر اس کے خلاف کوئی مضمون کسی محقق کا بھی مشہور ہے تو وہ مؤوّل ہے۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر نقل کرتا ہوں اور پھر اپنے فہم کے مطابق اسکی توجیہہ کرکے اس کا مطلب بھی بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بہت ہی مشہور شعر ہے اور زبان زد خاص وعام ہے لیکن اس کے ظاہر لفظوں سے جو مطلب مفہوم ہوتا ہے اگر آپ اس کو لیتے ہیں تو کتابوں کی اہمیت اور عظمت یکسر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے پیدا ہونے کا ذریعہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے بزرگوں کی نظر جس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ پھر تو کتابوں کے یہ ذخیرے کتب خانے اور دار المطالعے اور مدارس اور مکاتب وغیرہ یہ سب چیزیں بالکل بیکار اور لغو ہیں۔ کیونکہ دین کے پیدا کرنے میں جب ان کو کچھ دخل ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی ان کی جانب توجہ بھی نہ کرے گا اور کسی دیندار کیلئے پھر ان امور میں خوشی کا کون سا پہلو رہ جاتا ہے۔

اس غلط فہمی کے پیش نظر اس کلام میں تاویل کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے اسکو یوں سمجھا ہے کہ ایک تو ہوتا ہے دینؔ۔ اور ایک ہوتا ہے تدینؔ۔ دینؔ تو کتابوں ہی میں ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ حدیثؔ کا علم حدیث شریف کی کتابوں میں ہے۔ فقہی مسائل کا علم فقہی کتابوں میں ہے تفسیر کا علم تفسیر کی کتابوں میں ہے۔ لغتؔ کا علم لغت کی کتابوں میں ہے۔ یہ تو دین کے متعلق عرض ہے۔ باقی تدین یعنی دین کا عملی طور پر عامل کے اندر آجانا یہ متدین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ

متدین اس کو کہتے ہیں جو دین کو عملی طور پر اپنے اندر پیدا کرے یعنی صفت تدین سے متصف ہو جائے. تو یہ تدین بغیر متدین کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ تدین کتاب کی صفت نہیں ہے بلکہ متدین کی صفت ہے۔ پس قائل نے یہاں جو دین کا لفظ استعمال کیا ہے وہ میرے نزدیک اپنے ظاہر پر نہیں ہے بلکہ تدین کے معنی میں ہے یا بحذف محبت ہے۔ یا دین سے ان کی مراد محبت دین ہے۔

اب اس کے بعد یہ کلام ایک درجہ میں صحیح بھی ہے کیونکہ قائل کا یہ بھی کہنا ہے کہ باوجود کثرت کتب اور علم کے جو دین لوگوں میں نہیں ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دین (یعنی تدین) کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ تدین دین دار (یعنی متدین) سے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اور میں یہاں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ تدین تو متدین کی صفت ہے ہی دین کا صحیح علم بھی کتاب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے استاد حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ــــــ

"محض کتاب دیکھ کر کسی کو رکوع کرنا بھی نہیں آسکتا تھا صرف کتاب سے اگر اس کو لوگ عمل میں لاتے تو سخت اختلاف ہوتا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا۔ اس کے حد کے اندر سخت اختلاف ہوتا۔ اب تعامل امت سے یہ سب چیزیں آسان ہو گئی ہیں"

غرضکہ کتاب کی ضرورت مسلم ہے۔ کیونکہ کتاب بیں قانون ہوتا ہے۔ لیکن اس کا علم قانون داں کو ہوتا ہے۔ تدین تو بجائے خود رہا علم بھی کسی کتاب یا قانون کا اس کے عالم ہی کے پاس ہوتا ہے۔ اس لئے نہ کتاب سے استغناء ہو سکتا ہے نہ اہل علم سے۔ کتاب سے تو اس لئے ہم مستغنی نہیں ہو سکتے کہ علوم مدون اور منضبط جو ہیں وہ کتابوں ہی میں ہیں۔ اور عالم سے اس لئے مستغنی نہیں ہیں کہ علم کتاب کی صفت نہیں ہے بلکہ عالم کی صفت ہے یعنی علم عالم کا وصف ہے اس کے اندر ہوتا ہے۔ اس لئے علم کی تحصیل کیلئے بھی اہل علم کی صحبت اور علماء

سے استفادہ ناگزیر ہے۔

میں نے مذکورہ بالا شعر کی جو توجیہ بیان کی ہے اس سے مقصد یہ تھا کہ کہیں اس کو لوگ بے محل نہ استعمال کریں اور اس سے معاذاللہ کتابوں ہی کی عدم ضرورت اور عدمِ افادیت پر نہ استدلال کرنے لگ جائیں۔ باقی اس توجیہ سے میری غرض یہ بھی نہیں ہے کہ کتاب ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے۔ اور اس کی وجہ سے لوگ اہل علم کی صحبت سے خود کو مستغنی تصور کرنے لگیں۔ کیونکہ یہ دونوں خیالات خالی اِز افراط و تفریط نہیں۔ اس لئے قابل اصلاح ہیں صحیح اور اعدل الاقوال یہ ہے کہ ہم کتاب کے بھی محتاج ہیں اور علماء کے بھی چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کتابوں سے ایک مسئلہ مدتوں حل نہیں ہوتا۔ اور کوئی محقق اہل علم اس کو چند لفظوں میں حل کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علم اہل علم کے اذہان کا جلا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی بصیرت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور غیر اہل علم یا کم علم والے میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس پر دو واقعے سنیئے:۔

(۱) مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے خواب دیکھا کہ میری ایک ٹانگ مشرق میں ہے اور ایک مغرب میں، کسی جاہل معبر نے اس کی یہ تعبیر دی کہ آپ کی دونوں ٹانگیں چیر دی جائیں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا حالانکہ علم تعبیر کے اصول پر اس کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ آپ کی حدود سلطنت میں توسیع ہو جائیگی یعنی مشرق سے لیکر مغرب تک آپ کے قدموں کے نیچے ہوگا۔ اس لئے خواب کی تعبیر کسی جاہل معبر اور ایسے شخص سے دریافت نہیں کرنا چاہیئے جو سمجھدار یا خیر خواہ نہ ہو کیونکہ جیسی تعبیر دی جاتی ہے اسی کے مطابق واقع ہو جاتا ہے۔

(۲) اسی طرح ایک اور بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ میرے سارے دانت گر گئے۔ صبح ایک معبر سے اس نے تعبیر پوچھی اس نے کہا کہ حضور کا سارا خاندان حضور کے سامنے ہی ختم ہو جائیگا۔ بادشاہ کو اس کی یہ تعبیر پسند نہ آئی۔ اس کو قتل کئے جانے کا حکم فرما دیا۔ اور دوسرے معبر کو بلوایا اور اس سے اس کی تعبیر پوچھی اس نے عرض کیا کہ حضور یہ تو نہایت مبارک

Scanned with CamScanner

خواب ہے آنحضور کی عمر اپنے خاندان کے سب لوگوں سے زیادہ ہوگی۔ بادشاہ اس تعبیر سے خوش ہوا اور اس کو انعام دیا۔

دیکھئے یہاں بات دونوں نے ایک ہی کہی مگر ایک کے ساتھ علم کی رہنمائی تھی۔ اور دوسرے کے ساتھ جہل کی کارفرمائی تھی۔

غرض ہم تحصیل علم کے باب میں کتابوں کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علمائے محققین کے بھی محتاج ہیں۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے۔

حاصل یہ کہ جب علم معزز محترم افضل اور اہم ہے تو اس کے توسط سے آلات علم اور کتب بھی مہتم بالشان ہیں۔ لہذا جس طرح سے علم کا پڑھنا پڑھانا اہم خدمت سمجھی جاتی ہے اسی طرح سے متعلمین کیلئے کتب کا وقف کردینا عاریۃً پر دینا ان کی فراہمی اور اس سلسلے میں ان کو ہر طرح سہولت بہم پہونچانا بھی اہم خدمت منصور ہوگی۔ دار دنیا میں علم دنیا کی بھی حاجت ہے۔ اور علم دین کی تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ کیلئے ضرورت ہے۔ لہذا جس طرح سے کہ دینی کتب کا ذخیرہ جمع کردینا تاکہ بوقت ضرورت اہل حاجت اس سے منتفع ہوسکیں موجب اجر وثواب ہے اسی طرح سے علوم دنیوی اور حوائج زندگی سے متعلق کتب، رسائل اخبارات اور جرائد وغیرہ کا اہتمام اور انتظام بھی بلاشبہہ ایک اہم خدمت ہے۔

میں نے علم کی فضیلت کے سلسلے میں حضرت علامہ علی متقیؒ کا کچھ تھوڑا سا کلام نقل کیا تھا۔ درمیان میں اور باتوں کا ذکر آگیا۔ اب اس کے بعد پھر ان کا کلام نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ:-

وما یدل علی فضل التعلم	تعلیم اور تعلم کی فضیلت پر یہ حدیث بھی دال ہے کہ جو عالم صرف نماز
والتعلیم ح د فضل عالم	پڑھ لیتا ہو اور اس کے بعد علم کی مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو خیر اور بھلائی
یصلی المکتوبۃ ثم یجلس	سکھلاتا ہو اس کی فضیلت اس عابد پر جو دن کو روزے رکھتا ہو اور رات
فیعلم الناس الخیر علی	کو نمازیں پڑھتا ہو ایسی ہے جیسی کہ میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ

العابد الذی یصوم النھار　　شخص پر۔
ویقوم اللیل کفضلی علی　　(یہ مجمل ہے. اس کی تفسیر اور بیان ذیل والی حدیث میں ہے
ادناکم　　ملاحظہ ہو)

اسی حدیث کی مناسبت سے ایک اور حدیث ترمذی شریف کی بھی سُن لیجئے اور پھر اس کی شرح جو صاحب نفع قوت المغتذی نے بیان فرمائی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے. حدیث شریف میں ہے کہ

فضل العالم علی العابد کفضل　　یعنی عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی کہ چاند کی
القمر علی سائر الکواکب　　فضیلت تمام ستاروں پر۔

اس کے تحت نفع قوت المغتذی میں ہے کہ :۔

قال البیضاویؒ العبادۃ کمال　　بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ عبادت انسان میں ایک ایسا کمال اور نور ہے
ونور لازم لذات عابد فلا یتخطاہ　　جو کہ ذات عابد کے ساتھ لازم رہتا ہے اس سے تجاوز نہیں کرتا. لہذا
فاشبہ نور کواکب والعلم کمال　　یہ ستاروں کے نور کے مشابہ ہے۔ اور علم ایک ایسا کمال ہے جو خود
اوجب لعالم شرفا فی نفسہ　　عالم کے نفس میں شرف اور فضل پیدا کر دیتا ہے اور غیروں تک متعدی
وفضلا و یتعداہ لغیرہ فیضیئی　　ہوتا ہے. چنانچہ وہ غیر بھی اس عالم کے نور سے منور اور اس کے
بنورہ و یکمل بواسطتہ لکنہ　　واسطہ سے کمال تک پہنچ جاتا ہے لیکن یہ علم چونکہ ایسا کمال نہیں
کمال لیس للعالم من ذاتہ بل　　جو عالم کا ذاتی ہو بلکہ یہ تو ایک نور ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نور یلتقاہ عن النبی صلی اللہ　　سے اخذ اور حاصل کیا جاتا ہے۔ (یعنی مشکوۃ نبوۃ سے ملتا ہے)
تعالی علیہ وسلم فلہ شبہ　　لہذا اس کو مشابہت قمر سے دی گئی (کہ اس کا نور بھی ذاتی نہیں ہوتا
بالقمر۔　　بلکہ شمس سے مستفاد ہوتا ہے)

قال الطیبی فلا تظن ان العالم　　علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں جو عالم کو عابد پر ترجیح دی گئی ہے تو
المفضل عار عن عمل والعابد　　اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ جس عالم کو فضیلت دی جا رہی ہے وہ

Scanned with CamScanner

عن علم بل ان علم ذالک غالب علی عملہ وعمل ذالک غالب علی علمہ ۔ فلذا جعل العلماء ورثۃ الانبیاء الذین فازوا بالحسنیین العلم والعمل وحازوا الفضلتین الکمال والتکمیل فھذہ طریقۃ العارفین باللہ وسبیل السائرین الی اللہ ۔

عمل سے بالکل ہی کورا ہے۔ اور وہ عابد جس پر فضیلت دی جارہی ہے وہ علم سے بالکل بے بہرہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے بلکہ اس عالم کا علم اس کے عمل پر غالب ہے اور اس عابد کا عمل اس کے علم پر غالب ہے۔ اسلئے علماء جو ورثۃ الانبیاء قرار دیئے گئے تو مراد اس سے وہ علماء ہیں جنھوں نے علم وعمل دونوں کو جمع کیا ہے اور کمال وتکمیل دونوں فضیلتوں کے حامل ہوئے ہیں چنانچہ عارفین باللہ اور سالکین الی اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ علم وعمل دونوں ہی کے جامع ہوتے ہیں۔

آگے حضرت علی متقیؒ ان جہلا کی مذمت بیان فرماتے ہیں جن کو علم اور علماء سے عداوت ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ:۔

قال علیہ الصلوۃ والسلام اغد عالماً او متعلماً او مستمعاً او محبا ولاتکن الخامسۃ والخامسۃ ان یبغض العلم واھلہ ۔

یعنی عالم ہو جاؤ متعلم ہو جاؤ علم کے سننے والے ہو جاؤ۔ علم کو دوست رکھنے والے ہو جاؤ۔ ان چار جماعتوں میں سے جس سے چاہو ہو۔ پانچویں مت ہو۔ یعنی ان میں سے مت ہونا جو کہ علم اور اہل علم کے دشمن ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

انی رایت کثیرا من الجھلاء المتصوفۃ یدعون سلوک الطریق الی اللہ وھم لیسوا علیھا وینکرون التعلم والتعلیم ویمنعون اصحابھم عنھما کانھم اعداء العلم والعلماء ولا یعلمون انہ یضر بایمانھم ویحتجون بکون

میں نے ایسے بہت جاہلوں کو (جو کہ صوفی بنکر سلوک طریق الی اللہ کے مدعی ہیں حالانکہ اس سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے) دیکھا ہے کہ تعلیم اور تعلم ہی کا سرے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اپنے لوگوں کو اس سے اسطرح سے روکتے ہیں گویا کہ ان کو علم اور اہل علم سے عداوت ہے اور مسکین یہ بھی نہیں جانتے کہ اس سے وہ اپنے ہی ایمان کو ضرر پہنچا رہے ہیں اور لطف یہ کہ

النبی صلی اللہ علیہ وسلم امیا ولا
یعرفون انہ صاحب وحی ومعدن
علم. وربما یحصل للجاھل بشغل
ذکرا واسم بعض صفاء فیغتر ولا
یدری ان لہ افات بغیر علم
کالحلول والاتحاد و
ربما یحتج بعض الجھال بقول المشائخ
العلم حجاب اللہ الاکبر ولا یدری
انہ حجۃ علیہ فان مثلہ فی ترک
العلم بھذا المثل من عشق شخصا
فاخبر بانہ وراء جدار فیقول الجدار
حجاب فیترکہ فانظر ھل احد احمق
منہ وکان یجب علیہ ان یقطع
الجدار ویصل الی المحبوب لا ان
یرجع ویترکہ

انما یکون حجابا لمن طلبہ
للتفاخر وحطام الدنیا وایضا
مثل من ترک العلم بمسائل
الدین کشخص یدعی محبۃ شخص

اپنی دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے
اور یہ نہیں سمجھتے کہ آپ صاحب وحی اور معدن علم بھی تو تھے اور اسکو
بھی نہیں سمجھتے کہ جاہل اگر ذکر و شغل کرے گا تو بعض مرتبہ اسکی وجہ
سے اسکے قلب میں کچھ صفائی پیدا ہو جائیگی اور وہ اس دھوکہ
میں پڑ جائے گا۔ اور علم کے بغیر آفات نفس سے خود کو نہ بچا
سکے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنا حاصل شدہ سرمایہ ہی ضائع کر دیگا۔
اسی طرح بعض نادان علم کو قبیح سمجھ کر اس پر مشائخ کے اس
مقولے سے استدلال کرتے ہیں کہ العلم حجاب اللہ الاکبر یعنی علم
اللہ تعالیٰ سے قرب وصال کیلئے ایک بہت بڑا حجاب اور مانع
ہے۔ حالانکہ ظالم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ قول کچھ انکے موافق نہیں
بلکہ ان کے خلاف ہی پڑتا ہے۔ اسلئے کہ اس شخص کی مثال جو علم کو
محض اسلئے ترک کردے کہ وہ حجاب اللہ الاکبر ہے۔ ایسی ہے جیسے کوئی
شخص کسی پر عاشق ہو اور اسکو یہ خبر ملے کہ اس کا محبوب پس دیوار
ہے تو وہ یہ کہہ کر معشوق کی جانب التفات نہ کرے کہ یہ دیوار تو
حجاب ہے اب آپ خود انصاف فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی
احمق ہوگا۔ کیونکہ اگر عاشق صادق تھا تو اس پر واجب تھا کہ دیوار
کو توڑ دیتا اور محبوب سے واصل ہو جاتا۔ نہ یہ کہ دیوار کو دیکھ کے واپس آگیا۔
اور محبوب ہی سے صبر کر لیا۔ ہاں علم حجاب بھی بنتا ہے مگر اس کے
لئے جو اس کو تفاخر اور بڑائی کے لئے اور دنیا کے چند کوڑیوں
کے لئے حاصل کرے۔ باقی جو شخص علوم دینیہ کو نہ حاصل کرے
اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی ایسے غائب شخص کی

Scanned with CamScanner

غائب عنہ لایدری طریق وصولہ الیہ فارسل المحبوب الیہ کتابا یتضمن طریق وصولہ الیہ وھو یطرح الکتاب ولا ینظر الیہ و یظن انہ حجاب فی الوصول الیہ فلا شک انہ ینسب الی الحمق والکذب عند کل عاقل۔ فالقرآن والاحادیث وعلوم الدین تعرف طریق الوصول الی اللہ تعالیٰ۔ وحکی عن شیخنا المولی الاعظم معین الحق والدین قدس اللہ سرہٗ انہ سئل عنہ فقال ھو حُجّاب اللہ بضم حاء وشدۃ جیم واللہ اعلم۔

(مجمع البحار صـ ۴۲۲ جـ ۲)

محبت کا دم بھرتا ہو جس تک رسائی کا ذریعہ اور طریقہ بھی نہ جانتا ہو اور اسی درمیان میں وہ معشوق کوئی خط بھیجے جس میں اپنے تک پہنچنے کی صورت کا بھی ذکر کردے اور یہ عاشق صاحب اس خط کو اٹھا کر پھینکدیں اور اس کو پڑھیں بھی نہیں یہ کہہ کر کہ یہ وصول محبوب میں حجاب ہے تو بلاشبہ ایسے شخص کو یا تو احمق سمجھا جائیگا یا دعوی محبت میں کاذب کہا جائیگا۔ ہر عاقل کا یہی فیصلہ ہوگا۔ جب یہ ہے تو اب سنیئے کہ یہ قرآن وحدیث اور علوم دینیہ بھی وصول الی اللہ کا طریقہ ہی بتلاتے ہیں۔ (لہذا طالب حق کے لئے ان کا تعلیم وتعلم ناگزیر ہے جو ان سے اعراض کریگا وہ طالب ہی نہیں) اور ہمارے شیخ معین الحق والدین قدس سرہٗ یعنی خواجہ اجمیریؒ سے اس مقولے کا مطلب پوچھا گیا کہ العلم حجاب اللہ الاکبر کا کیا مطلب ہے تو انھوں نے خوب بات فرمائی۔ فرمایا کہ یہ حِجاب بمعنی آڑ اور پردہ کے نہیں ہے بلکہ یہ لفظ حُجّاب بمعنی دربان ہے (مطلب یہ کہ جس طرح سے شاہی دربار کیلئے دربان ہوتے ہیں جو بادشاہ سے ملنے والوں کیلئے واسطہ بنتے ہیں اسی طرح سے علم بھی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والوں کیلئے بمنزلہ دربان کے ہے بلکہ سب سے بڑا دربان دربار الٰہی کا یہی علم ہے) واللہ اعلم انتھیٰ کلامہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت علی متقیؒ نے اس مختصر سے کلام میں کتنی اہم گتھیوں کو سلجھا دیا چنانچہ العلم حجاب اللہ الاکبر کا کیسا عمدہ مطلب بیان فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ علم تو نہایت اچھی اور محمود چیز ہے۔ البتہ اس کو آدمی اپنے سوء استعمال سے ما

اس میں دوسری اغراض کی آمیزش کرکے حجاب بنا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو اس طرح سمجھئے کہ علم محمود ہے لہذا یہ کسی مذموم شے کا ذریعہ کیونکر بن سکتا ہے۔ البتہ اگر اس میں کسی جہت سے نقص پیدا ہو جائے۔ یا ابھی یہ رسم سے بڑھ کر حقیقت تک نہ پہنچا ہو تو بیشک اس پر برے آثار بھی مرتب ہو سکتے ہیں لیکن یہ قصور پھر بھی علم کا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے نقص کا ہوگا، جس کا دوسرا نام جہل ہے۔ مثلاً عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کبھی علم بھی سبب بنتا ہے تکبر کا۔ تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ علوم بالخصوص علم دین تو خیر ہی خیر ہے اس لئے وہ کسی شر کا سبب اور ذریعہ کیسے بن سکتا ہے لہذا اہل علم میں جو تکبر دیکھا جاتا ہے میرے نزدیک اس کا منشا ان کا علم نہیں ہے بلکہ ان کا جہل ہے یعنی ان کا علم ابھی ناقص ہے پس جو حصہ علم کا ان کو حاصل نہیں ہوا ہے وہی سبب ہے اس رذیلے کا نہ کہ علم کا وہ حصہ جو ان کو حاصل ہے۔ اور میں اس کی یہ مثال دیتا ہوں کہ جیسے ایک شاخ ہے اس کا نصف میوہ سے پُر ہے اور نصف خالی ہے تو ظاہر ہے کہ جو حصہ میوہ سے لدا اور بھرا ہے وہ جھکا ہوگا اور جو خالی ہے وہ اوپر کو اٹھا ہوگا۔ تو جتنا نیچے کی طرف جھکاؤ ہے وہ اس کے ثمرہ سے پُر ہونے کے سبب سے ہے اور نصف دیگر جو اٹھا ہوا ہے وہ ثمرہ سے خالی ہونے کے سبب سے ہے۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہونے میں ثمرہ سے پر ہونے والے حصہ کو دخل نہیں ہے بلکہ اس کے خلو کو دخل ہے۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ اہل علم میں تکبر کا سبب ان کا علم نہیں ہے علم نے تو ان کو بہت کچھ سنوار دیا ظاہر تو درست ہوگیا۔ البتہ اس کا اثر باطن تک نہیں پہنچا ہے۔ باطن تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی ہے تو اس سے ثابت ہوگیا کہ علم نے کبر پیدا نہیں کیا بلکہ علم کا اثر قلب تک نہیں پہنچا ہے یا نہیں پہونچایا گیا ہے۔ اور دین کا علم چونکہ کبھی ناقص بھی ہوتا ہے اور کبھی یہ اغراض دنیویہ کیلئے پڑھا جاتا ہے جس کی حقیقت رسم سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے اہل حقیقت کے کلام میں کہیں کہیں علم ظاہری کی مذمت آجاتی ہے اور اس کے

واسطے سے علم رسمی والوں کی مذمت بھی ۔ مثلاً مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

ایھا القوم الذی فی المدرسۃ　　کل ماحصلتموہ وسوسۃ

جملہ اوراق وکتب درنار کن　　سینہ را از نور حق گلزار کن

(اے مدرسہ والو دوستو! جو کچھ تم نے حاصل کیا وہ وسوسہ سے زیادہ نہیں ہے)

(سب کتب اور اوراق کو چولھے بھاڑ میں ڈالو اور اپنے سینہ کو نور حق سے گلزار بناؤ)

اس کا بھی مطلب یہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا۔

اب آخیر میں ایک آیت سے تعلیم وتعلم کی فضیلت پر کلام کرتا ہوں۔ قولہ تعالیٰ

ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب اوالقی السمع وھو شھید بیشک اہلاک امم یا اس سورت کے مضامین تذکرہ ونصیحت ہے اس کیلئے جس کے قلب ہو یعنی ایسا قلب جو واعی مدرک الحقائق ہو کیونکہ جو قلب فہم مدرک نہ رکھتا ہو وہ بمنزلہ عدم کے ہے۔ اوالقی السمع وھو شھید ای اصغی الی ما یتلی علیہ من الوحی۔ یا اس پر رحمن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اس پر کان لگادے حاضر ہوکر (روح المعانی)

والمراد ان فیما فعل بسوالف الامم او فی المذکور امامامن الآیات لذکری لاحدی الطائفتین من لہ قلب یفقہ عن اللہ عزوجل ومن لہ سمع مصغ مع ذھن حاضر ای من لہ استعداد القبول عن الفقیہ ان لم یکن فقیھا فی نفسہ۔

اور مراد یہ ہے کہ ان واقعات میں جو امم سابقہ کے ساتھ پیش آئے یا ان آیات میں جو پہلے مذکور ہوئیں بلاشبہ تذکرہ اور نصیحت ہے ان دو طائفوں میں سے ایک کے لئے یعنی ایک تو وہ لوگ جن کے لئے منجانب اللہ ایسا قلب ہو جو واعی ہو مدرک الحقائق ہو اور دوسرے وہ لوگ جن کیلئے متوجہ ہونے والا کان ہو اور حاضر رہنے والا ذہن ہو یعنی جو ایسے ہوں کہ اگر خود عالم نہ بھی ہوں تو کسی فقیہ سے علوم سن کر اس کو قبول کرنے کی استعداد ہی رکھتے ہوں۔

اقول الاول معلم والثانی متعلم　(میں کہتا ہوں کہ اول ان میں سے معلم ہے اور دوسرا متعلم

وأو لمنع الخلو من حيث ان يجوز ان يكون الشخص فقيها ومستعدا للقبول عن الفقيه	اور اَوْ یہاں پر منع خلو کے لئے ہے یعنی یہ مضامین ان دونوں فریقوں میں سے کسی ایک نہ ایک کیلئے تو ضرور ذکری ہیں باقی جائز یہ بھی ہے کہ دونوں کیلئے ہو یعنی ایک شخص ہی خود فقیہ بھی ہو اور وہی شخص دوسرے فقیہ سے عاوم قبول کرنیکی استعداد بھی رکھتا ہو۔
وذكر بعضهم انها التقسيم المتذكر الى تال وسامع والى فقيه ومتعلم اوالى عالم كامل الاستعداد لايحتاج لغير التامل فيما عنده وقاصر محتاج للتعلم فيتذكر اذا اقبل بكلية وازال الموانع باسرها فتامل ۔	بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ متذکر کی تقسیم ہے کہ وہ تالی بھی ہوتا ہے اور سامع بھی یا فقیہ بھی ہوتا ہے اور متعلم بھی۔ یا عالم کامل الاستعداد جو کہ کسی اور کا محتاج نہ ہو۔ بجز اس میں تامل کرنے کے جو اسکے پاس علوم موجود ہیں وہ بھی متذکر ہوتا ہے اور عالم قاصر بھی جو کہ تعلم کا محتاج ہوتا ہے کہ ایسا شخص بھی تذکر حاصل کرسکتا ہے جبکہ ہمہ تن ادھر متوجہ ہوجائے اور تمام موانع کو زائل کردے۔ خوب سمجھ لو۔

میرے ذوق میں اس آیت میں ان دونوں درجوں یعنی معلم و متعلم کا بیان تھا تفسیر کی مراجعت کے بعد بعینہ انھیں الفاظ میں اسکی تفسیر بھی نکلی فالحمد للہ المنعم الوھاب خوبی اس تفسیر میں یہ ہے کہ جس کے لئے قلب کو ثابت اور اس کو متاثر اپنے نصائح سے فرمایا ہے اس کی تفسیر اور اس کا مصداق مفسر نے معلم کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح او القی السمع وھو شھید میں متعلم کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ معلم کو قلب ہونا چاہیئے اور متعلم کے لئے سمع۔

تعلیم اور تعلم کی فضیلت میں اس آیت سے زیادہ مؤثر کوئی آیت میری نظر سے نہیں گذری۔ اس لئے اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اب آخیر میں ایک قصہ بھی سن لیجئے۔

ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ اپنے وزراء کو انعام تقسیم فرمایا اور سب کو حسب مراتب بیش بہا خلعت وغیرہ عطا کیں۔ لوگ شاہی انعامات کو ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے

Scanned with CamScanner

کہ اتنے میں ایک وزیر کو چھینک آگئی۔ اور اس کی ناک سے کچھ ریزش بھی نکل آئی۔ اس نے کیا کیا کہ اسی شاہی عطیہ کے ایک کونے سے اپنی ناک کو صاف کر لیا۔ بادشاہ نے اس کی حرکت کو دیکھ لیا۔ بہت غصہ ہوا اور خلعت وغیرہ اس سے واپس لے لیا۔ اور اس کو دربار سے نکال دیا اور عہدے سے بھی برطرف کر دیا اور یہ فرمایا کہ جو شخص شاہی عطیہ کی ایسی ناقدری کرے اس کی یہی سزا ہے۔

یہ تو خیر ایک واقعہ تھا۔

اب اسی سے سمجھ لیجئے کہ علم بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بیش بہا عطیہ اور انعام ہے جس کا شکر اہل علم پر لازم ہے اگر کوئی شخص اس شاہی عطیہ کی ناقدری کرے گا تو وہ بھی حق تعالیٰ کی نظر کرم سے گر جائے گا۔ اور اپنے منصب سے معزول کر دیا جائے گا۔

اسی طرح سے اہل علم کو تکبر و نظر حقارت سے کسی کو نہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ علم کے شان کے خلاف ہے بلکہ خلوص کے خلاف ہے۔ امام داؤد ظاہری ناقل ہیں کہ میری مجلس میں ایک روز ایک شخص ابو یعقوب بصری نامی شکستہ حال وارد ہوئے اور بدون کسی اشارے کے خود بخود صدر میں آبیٹھے اور فخریہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ سل یافتی عما بدالک یعنی اے جوان جو تیرے جی میں آئے پوچھ۔ مجھ کو ان کی مشیخیت پر سخت غصہ آیا اور استہزاءً میں نے کہا کہ حجامت کی نسبت کچھ فرمایئے (حجامت کہتے ہیں پچھنے یعنی سینگی لگوانے کو) ابو یعقوب نے بارک اللہ کہا اور سب سے اول محدثانہ اور فقیہانہ گفتگو شروع کی۔ حدیث افطر الحاجم والمحجوم کو روایت کر کے بیان کیا کہ کس راوی نے مسنداً اور کس نے موقوف اور کس نے مرسل روایت کیا ہے اور فقہاء میں کس کس کا عمل اسپر ہے۔ اس کے بعد انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگوانے کے مختلف طریقے بیان کئے اور اس اجرت کا ذکر کیا جو آپ نے حجام کو مرحمت فرمائی تھی اور یہ ثابت کیا کہ اگر اجرت حجام حرام ہوتی تو آپ مرحمت نہ فرماتے پھر ایک اور حدیث کے طرق روایت سنائے جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھری شاخیں کھچوائی تھیں۔ پھر اس باب کی تمام احادیث صحیحہ متوسطہ اور ضعیفہ کو علی الترتیب بیان کیا۔ اصول حدیث وفقہ کے مطابق اس قدر بحث کے بعد وہ طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اطباء کی جو رائے حجامت کی نسبت مختلف زمانوں میں رہی ہے مشرح کہہ سنائی طب کے بعد تاریخ کا نمبر تھا۔ آخر کلام میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ سب سے اول یہ عمل اصفہان میں ایجاد ہوا تھا۔ امام ظاہری فرماتے ہیں کہ میں یہ وسعت تقریر دیکھ کر متحیر رہ گیا اور ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ واللہ ماحقرت بعدک احدًا ابدًا یعنی خدا کی قسم آپ کے بعد اب میں کسی کو نظر حقارت سے نہیں دیکھونگا۔

ایک دوسرا واقعہ ایک مخلص عالم کا بیان کرتا ہوں سنیئے۔

آل سلجوق کے بلند پایہ وزیر نظام الملک طوسی نے جو نظامیہ مدرسہ بغداد میں قائم کیا تھا اس میں شیخ ابو اسحاق شیرازیؒ اور امام حجۃ الاسلام غزالیؒ جیسے اکابر رہ چکے تھے فخر الاسلام شافعیؒ جب اس کے مدرس مقرر ہوئے تو پہلے روز مسند تدریس پر متمکن ہونے کے بعد ان اکابر کا خیال آیا جو اس مسند کی عزت بڑھا چکے تھے۔ اس تصور نے ان کے پاکیزہ قلب پر ایک کیفیت طاری کر دی عمامہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار روئے اور یہ شعر پڑھا ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسود　　ومن العناء تفردی بالسودد

یعنی ملک تو اہل کمال سے خالی ہو گیا اور اہل نہ ہونے کے باوجود میں سردار ہو گیا۔ اور یہ میرا سرداری کے ساتھ منفرد ہونا بھی ایک بڑی اور خاصی مصیبت ہے۔

ع۶ - یعنی بھری سینگی لی تھی ۱۲

"الاخلاص"

توحید الٰہی کا مطلب و مقاصد الٰہیہ میں سب سے اجل و اعظم ہونا ثابت و مسلم ہے اسی وجہ سے سب علوم و احکام اس کی فرع ہیں اور یہ سب کی اصل۔ اس کے بغیر کوئی عمل مقبول عنداللہ نہیں ہوتا۔ حقیقت توحید کی اللہ کو واحد اعتقاد کرنا اور اس کو واحد سمجھنا اور واحد کہنا ہے۔ اور اس کے خلاف اعتقاد کرنا اور سمجھنا یہ توحید نہیں بلکہ اشراک اور تشریک اور شرک ہے جو عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ توحید کے عقیدہ رکھنے والے کو موحد کہتے ہیں۔ اور جس طرح اس کو موحد کہتے ہیں اسی طرح اس کا دوسرا نام مخلص ہے۔ اس واسطے کہ ذات واحد واجب الوجود الٰہ العالمین رب العالمین خالق عالم تنہا اس کے ساتھ کسی کی شرکت اس کی ان تمامی صفات میں نہیں مانتا۔ اس طرح اس کے ماننے میں مخلص ہے۔

اول درجہ اخلاص مومن موحد کا یہی ہے کہ اس کی الوہیت میں شرکت کا کسی طرح قائل نہ ہو۔

مخلص اخلاص سے ہے۔ اخلاص خالص کرنے کو کہتے ہیں۔ شرکت غیر سے۔ جیسے دودھ خالص اسی کو کہتے ہیں جس میں ملونی پانی کی نہ ہو۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ مخلص اسی کو کہتے ہیں جس کے عقیدہ میں خلوص ہو کہ جو الٰہ نہیں ہے۔ دلیل عقلی و نقلی سے اس کی نسبت عقیدہ الوہیت کا نہ رکھتا ہو کہ یہ شرک ہے اور اس سے اس ذات واحد واجب الوجود الٰہ العالمین رب العالمین خالق العالم کے ساتھ اس عقیدہ میں مخلص باقی نہیں رہے گا کہ اس کے ساتھ اس کے غیر کو ملا دیا۔ جس کا ملانا خلاف دلیل عقلی و نقلی ہے اور جب اصل توحید اور ایمان میں اخلاص معتبر ہوا تو پھر اس کے بعد جتنے علوم اور اعمال ہیں

Scanned with CamScanner

سب میں یہ معتبر رہے گا۔ کسی طرح کسی وقت منفک نہیں ہو سکتا۔ یہ اجمالی بیان ہے اس کی ضرورت کا۔ اب قرآن و حدیث سے علمائے محققین نے بھی اخلاص کی ضرورت پر بڑا زوردار کلام فرمایا ہے۔ ان کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

قرآن و حدیث سے اس مقصد عظیم پر استدلال کرنا حضرات علماء کے سامنے ایک غیر ضروری امر ہے۔ اخلاص کی نصوص سب کو پیش نظر ہیں۔ اور اس کا سب کو اقرار ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے سلف اور اکابر کو جس درجہ اس کی ضرورت پیش نظر تھی اور اس کا وہ استحضار رکھتے تھے اس قدر ہم کو نہ ہو۔ اس لئے اپنے سلف کے وہ اقوال ہم درج کرتے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو کس درجہ اسکی ضرورت پیش نظر تھی اور اسکا درجہ وہ نظر شارع میں کیا سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس میں کیا کیا عمل کیا اور اوروں سے بھی کیا کیا عمل کرایا۔ کام کرنے والوں کے لئے اس میں اسوۂ حسنہ ہے۔ کام جب ہو گا اسی طریقہ پر ہو گا۔ جس پر ہمارے سلف نے کیا ہے۔ قبل ازیں تیمناً تبرکاً اسکی نصوص پیش کرتا ہوں۔

قال اللہ تعالیٰ ان المنٰفقین	بلا شبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جاویں گے
فی الدرك الاسفل من النار ولن	اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پاوے گا۔ لیکن جو لوگ توبہ کر لیں
تجد لھم نصیرا ٥ الا الذین تابوا	اور اصلاح کر لیں اور اللہ تعالیٰ پر وثوق رکھیں اور اپنے دین کو
واصلحوا واعتصموا باللہ واخلصوا	خالص اللہ ہی کے لئے کیا کریں تو یہ لوگ مومنین کے ساتھ
دینھم للہ فاولٰئك مع المؤمنین	ہوں گے۔

اس آیت میں منافقین کو درک اسفل کی وعید سنانے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس وعید سے ان کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جن میں یہ صفات پائے جائیں کہ وہ نفاق سے تائب ہو جائیں اور اپنی نیات فاسدہ اور احوال فاسدہ کی جو نفاق کی حالت میں رکھتے تھے اصلاح کر لیں اور تمسک کریں کتاب اللہ سے یا وثوق اور اعتماد رکھیں اللہ تعالیٰ پر۔ اور اپنے دین کو خالص کر لیں اللہ کے واسطے تب یہ لوگ مومنین مخلصین کے درجہ میں یا ان

کے زمرہ میں معدود ہوں گے۔

پس یہی صفات ہیں جن سے مومن مخلص منافق سے ممتاز ہوجاتا ہے۔ ان منافقین کو توبہ کے بعد زمرۂ مومنین مخلصین میں داخل کرلینے کا مژدہ سنایا۔ اس میں تین قید اور لگائی۔ ایک اصلاح اپنی نیات اور احوال کی پھر اعتصام باللہ جس کا حاصل مخلوق سے قطع نظر ہے اس کے بعد اخلصوا دینہم للہ یعنی

لایریدون بطاعتہم الا وجہہ و رضاہ سبحانہ لا ریاء الناس و دفع الضرر کما فی النفاق (کما فی روح المعانی) — ترجمہ۔ نہ ارادہ کریں اپنی طاعت سے مگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا نہ مخلوق کو دکھانا مقصود ہو اور نہ اس سے اپنے سے دفع ضرر ہی منظور ہو۔ جیسا کہ نفاق میں ہوا کرتا ہے۔

یعنی دین اغراض نفسانیہ دفع ضرر و جلب منفعت کے لئے نہ اختیار کیا جائے یہ تو اپنے مطلب کیلئے دین ہوا جیسے تجارت و زراعت اپنے مطلب کیلئے ہوا کرتی ہے۔ خدا کا دین خدا کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔

قال الحواریون من المخلص للہ قال الذی یعمل للہ لایحب ان یحمدہ الناس علیہ — حواریوں نے کہا کہ مخلص للہ کون ہے؟ فرمایا کہ وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے کام کرے اور مخلوق سے اس پر تعریف کا خواہاں نہ ہو۔

میرے مدعیٰ کے اثبات میں یہ آیت صریح تھی اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا ہے اس سے دین میں اخلاص کا ثبوت ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دین چونکہ علم اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے ان دونوں میں اخلاص کی ضرورت مفہوم ہوئی۔ بلکہ اخلاص ہی علم اور عمل کو دین بناتا ہے۔ اور جزو اخیر علت تامہ کا ہے یعنی دین کے لئے علم و عمل اور اخلاص تینوں کی ضرورت ہے۔ علم و عمل میں اخلاص کی نسبت ایسی ہے جیسے جزو اخیر علت تامہ کا کہ اس کے بعد معلول کا وجود ہوجاتا ہے۔ اسی طرح علم و عمل کے ساتھ اخلاص کے ملنے سے دین کا وجود ہوتا ہے جیسا کہ سب کے آخیر میں واخلصوا دینہم للہ فرمایا ہے۔ اور اٰیت سے صاف طور پر

Scanned with CamScanner

یہ واضح ہے۔

دوسری آیت سنیئے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط	اے ایمان والو اکثر احبار اور رہبان لوگوں کے مال ناشروع طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔

صاحب روح المعانی اس کا ربط پہلی آیت سے اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:۔

شروع فی بیان احوال الاحبار فی اغوائھم لارذالھم اثر بیان سوء حال الاتباع فی اتخاذھم لھم اربابا وفی ذلک تنبیہ للمومنین حتی لایحوموا حول ذلک الحمی ولذا وجہ الخطاب الیھم۔	اس میں احبار اور رہبان کا حال بیان ہے۔ ان کے اغواء کرنے کا اپنے ارذال کو اتباع کے سوء حال کے بیان کے بعد ان کا سوء حال یہ تھا کہ علماء اور رہبان کو انھوں نے رب بنا لیا تھا۔ اس میں تنبیہ ہے مومنین کے لئے کہ ان کے حمی کے گرد نہ گھومیں یعنی ان کا سا عمل نہ کریں۔ اسی لئے ان کو مخاطب بنایا۔

ترجمہ یہ ہے اے ایمان والو سنو! بہت سے احبار اور رہبان لوگوں کے اموال ناحق حرام طریقے پر ناجائز طور پر جس کا ناجائز ہونا ان کو معلوم رہتا ہے ضرور کھاتے ہیں یعنی لیتے ہیں کھانے کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ بڑا نفع کھانا ہی ہے۔ باقی کھانا پہننا وغیرہ جتنے طریقے استعمال کے ہیں سب اس میں داخل ہیں اور سب کا حکم ایک ہے۔ یعنی ان سب کی مذمت بیان کرنا مقصود ہے۔ اور دوسرا جملہ یصدون عن سبیل اللہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اول میں خود ان کی غوایت کا بیان ہے اور دوسرے میں اغواء کا۔ یا یوں کہیئے کہ اول میں ضلالت کا بیان ہے اور دوسرے میں اضلال کا۔ سبحان اللہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں ان احبار اور رہبان کی مذمت جس قدر ہے وہ

Scanned with CamScanner

بیان سے باہر ہے۔ کل دو جملوں میں ان کی پوری حالت وشناعت واضح فرمادی کہ حبر و رہبانیت کے ساتھ اکل اموال بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ کا کیا جوڑ ہے۔ ان کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی جس کی نسبت دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لولا ینھٰھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون۔ (پ۶) ۔ کیوں نہیں منع کرتے انکے علماء اور زہاد ان کو جھوٹ بولنے سے اور حرام مال کھانے سے۔ انکا یہ نہ منع کرنا بُرا طریقہ ہے۔

یعنی یہ کہ یہ لوگ جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے منع کرتے۔ ان کا منصب یہی تھا اب یہ منع تو کیا کرتے خود کھاتے ہیں اور خود جھوٹ بولتے ہیں۔ اور اصلی شان انکی ارشاد کی تھی کہ لوگوں کو رشد اور دین حق کی طرف بلاتے۔ اور یہ بجائے اس کے خود دین سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ پہلے یصدون عن سبیل اللہ کو بیان فرماتے اس سے ان کی شناعت خوب ظاہر ہوتی کہ صریح خلاف منصب کام کر رہے ہیں کہ منصب تو تھا یرشدون الناس کا اور کر رہے ہیں یصدون عن سبیل اللہ مگر یاکلون کو مقدم فرمایا اس لئے کہ یاکلون اموال الناس بالباطل ہی سبب ہوا ہے یصدون عن سبیل اللہ کا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے سے آدمی بتدریج ہٹتا ہے۔ چھوٹی غلطی سے بڑی غلطی صادر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان کو مخلص نہیں کہا جا سکتا۔ نہ رہبان کو نہ احبار کو۔ یہ فرماتے کہ یہ مخلص نہیں ہیں تو اس میں اتنی مذمت نہیں ہوتی جتنی کہ اس میں ہے کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور ان کو راستے سے روکتے ہیں۔ اس میں اتنی افتضاح وخزی کہ مقبولیت عند اللہ تو فوت ہوئی ہی خزی و (رسوائی) فضیحت عند الخلق اس پر علاوہ ہے۔ خسر الدنیا والاخرہ کے مصداق ٹھہرے۔ اسی موقع پر یہ کہا جاتا ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ اخلاص جب باقی نہیں رہتا تو عزت اور ذلت کی پروا نہیں ہوتی۔ اپنے مطلب سے مطلب رہ جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ اخلاص سکھانے والی اور سب سے زیادہ دنیا اور دنیا والوں سے زہد سکھلانے والی آیت یہی ہے۔

احادیث اخلاص سکھلانے والی بہت ہیں۔ دو اس مقام پر نقل کرتا ہوں۔

انما الاعمال بالنیات وانما لامری مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوامرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔

اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور انسان کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی جانب ہے اس کی تو ہجرت اللہ ورسول کی ہی جانب ہے اور جس کی ہجرت کسی دنیوی غرض کی خاطر ہے جو اسکو مل جاوے یا کسی عورت کے لئے ہے جس سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسکی ہجرت اس کے لئے ہے جس کیلئے اس نے ہجرت کی ہے۔

حسب تصریح حضرت مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب اس میں اخلاص کا بیان ہے نیت اور اخلاص ایک ہی چیز ہے یعنی علوم واعمال کو اغراض وشوائب نفسانیہ سے علیحدہ کر کے ان میں صرف رضائے باری کا قصد کرنا یہی اخلاص ہے پس اخلاص قلب کا فعل ہے جس طرح کہ نیت۔ حدیث میں جو نیت ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ رضائے باری تعالیٰ کا قصد جو غایت ہے اعمال کی یہی نیت کا درجہ ہے نظر شارع میں۔ تصحیح نیت اور تصحیح اخلاص و الاستحسان دونوں ہی امر ثابت ہوئے۔

دوسری حدیث:۔

من اخلص للہ اربعین صباحا اجری اللہ من قلبہ ینابیع الحکمۃ اوکما قال۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن خلوص سے عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیں گے۔

سبحان اللہ اس میں اخلاص کا فائدہ کیسا بیان فرمایا گیا ہے۔

اس حدیث کے متعلق ایک دلچسپ قصہ بھی یاد رکھیئے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ چالیس روز

اس لئے عبادت کرتے رہے کہ حکمت کے چشمے قلب سے جاری ہو جائیں گے مگر چالیس دن کے بعد بھی جاری نہیں ہوئے انھیں خلجان ہوا کہ یہ حدیث ہی نہیں ہے یا مجھ میں خلوص نہیں ہے اور حدیث خلوص کے لئے یہ فضیلت ثابت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حل کے لئے متوجہ ہوئے۔ جواب ملا کہ آپ نے تو حکمت کے چشمے جاری ہونے کے لئے عبادت کی تھی۔ پس اخلاص للہ کیسے ہوا کیا عمدہ گرفت ہے۔ اجری اللہ من قلبہ ینابیع الحکمۃ پر نظر مقصور رہی اور اخلاص للہ پر جس کی جزا ہے اجری اللہ من قلبہ ینابیع الحکمۃ نظر اور توجہ نہ رہی یہی عدم خلوص ہے۔ پورے مہینے تنخواہ پر نظر رہے اور کام پر نہ رہے یہی اس کی مثال ہے اب علماء کے ارشادات نقل کرتا ہوں جو اخلاص کی اہمیت کے بارے میں صادر ہوئے ہیں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں :۔

امابعد فیقول خادم العلماء والصوفیۃ والمتمسك باذیالھم العلیہ ولی اللہ ابن عبدالرحیم عاملھما اللہ بفضلہ العظیم ان من اجل نعم اللہ تعالیٰ التی لا یستطیع العباد شکرھا ان بعث الانبیاء مترجمین عن الغیب ھادین الی طرق التقرب الی اللہ تعالیٰ لیھلك من ھلك عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ ثم جعل لھم ورثۃ یقومون بعلمھم بین الناس ویحیون سننھم ویدعون الی رشدھم۔	بعد حمد و صلوٰۃ کے حضرات علماء عظام اور صوفیاء کرام کا یہ ادنیٰ خادم اور ان کے دامن عالی سے وابستگی رکھنے والا یہ ناچیز راقم یعنی ولی اللہ بن عبدالرحیم۔ اللہ تعالیٰ (آخرت میں) ان دونوں (باپ بیٹوں) کے ساتھ فضل عظیم کا معاملہ فرمائے عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان بڑی نعمتوں میں سے جن کا کہ شکر ادا کرنے کی بندے طاقت نہیں رکھتے ایک بڑی نعمت حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت بھی ہے جو کہ غیب کے ترجمان ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے رستہ کے ہادی ہیں اور یہ بعثت اسلئے ہوتی ہے تاکہ اس کے بعد جو ہلاک ہو وہ بینہ کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بینہ کے ساتھ زندہ رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء علیہم کیلئے ورثہ بنائے جنھوں نے کہ لوگوں میں ان حضرات کے علوم پھیلائے اور ان کی سنت اور ان کے طریق کو زندہ کیا اور ان کی ہی ہدایت کی جانب لوگوں کو دعوت دی۔

Scanned with CamScanner

ومعظم ما دعت الی اقامتہ الرسل امور ثلاثۃ تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاۃ وغیرہا وتکفل بہذا الفن اہل الاصول من علماء الامۃ شکر اللہ مساعیہم	اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے جن امور کے قائم کرنیکی دعوت دی ہے ان میں کے بڑے بڑے امور تین ہیں۔ ایک تو مبداء اور معاد جزاو سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا اور اس فن کے اشاعت کی کفالت علماء امت میں سے اہل اصول (یعنی حضرات متکلمین) نے فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی مشکور فرمائے۔
وتصحیح العمل فی الطاعات المقربۃ والارتفاقات الضروریۃ علی وفق السنۃ وتکفل بہذا الفن فقہاء الامۃ فہدی اللہ بہم کثیرین واقام بہم فرقۃ عوجا	دوسرے طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح کرنا نیز سنت کے مطابق ضروری ضروری طرق انتفاع کا بیان۔ اور اس فن کی کفالت فقہاء امت رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی۔ اور بہت سے فرقوں نے اپنی کجی کو درست کرلیا۔
وتصحیح الاخلاص والاحسان الذین ہما اصلا الدین الحنیفی الذی ارتضاہ اللہ لعبادہ۔ قال تبارک وتعالیٰ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذالک دین القیمۃ۔	اور تیسرے اخلاص اور احسان کی تصحیح کہ یہی دونوں اس دین حنیفی کی اصل ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے پسند فرمایا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اور نہیں حکم کئے گئے تھے یہ لوگ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خاص کرنے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا۔
وقال ان المتقین فی جنت و عیون اخذین ما اتٰھم ربھم انھم کانوا قبل ذالک محسنین ۵ کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون ۵ و بالاسحار ھم یستغفرون ۵ وفی اموالھم	اور فرمایا کہ بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے ان کے ربنے ان کو جو عطا کیا ہوگا وہ اس کو لے رہے ہوں گے۔ وہ لوگ اس کے قبل نیکو کار تھے۔ وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔ اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی کا حق تھا۔ اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں

Scanned with CamScanner

حق السائل والمحروم وفی الارض آیات للموقنین ۝ وفی انفسکم افلا تبصرون ۝

بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وقال فی جواب جبرئیل ع الاحسان ان نعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور حضرت جبرئیل ع کے سوال کے جواب میں کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان اسکو کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو گویا کہ تم اسکو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو یہ تو سمجھو ہی کہ وہ تمکو دیکھ رہا ہے

والذی نفسی بیدہٖ ھذا الثالث ادق المقاصد الشرعیۃ ماخذاً و اعمقھا محتداً بالنسبۃ الی سائر الشرایع بمنزلۃ المعنی من اللفظ وتکفل بھا الصوفیۃ رضوان اللہ علیھم فاھتدوا وھدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادۃ القصوی وحازوا السھم الاعلی فللہ درھم ما اعم نفعھم واتم نورھم۔ (تفہیمات الٰہیہ ص۱۲ ج۱)

اور قسم ہے اس ذات کی کہ میری جان جسکے قبضہ میں ہے یہ تیسری قسم جملہ مقاصد شرعیہ سے ادق ہے از روئے ماخذ کے اور سب سے زیادہ گہری ہے از روئے اصل کے۔ اور تمام شرائع کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے روح جسم کے مقابلہ میں۔ اور اس فن کی کفالت فرمائی ہے حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے۔ چنانچہ یہ حضرات پہلے خود مہتدی ہوئے اور پھر ہادی بنے۔ خود ہدایت حاصل کی اور دوسروں کی ہدایت کی خود پیا اور دوسروں کو پلایا اور سعادت قصوی پر فائز ہوئے اور بڑے حصے کو سمیٹا پس اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے ان کی خوبی اور کیا ہی عام ہے ان کا نفع اور کیسا تام ہے ان کا نور۔ (بلند ۱۲)

یہاں میں نے حضرت شاہ صاحب کی عبارت تتمیم فائدہ کے لئے اپنے مقصود سے کچھ زیادہ نقل کردی ہے۔ ورنہ تو میرا مقصود اور استشہاد تو صرف اس کے تیسرے جزو سے ہے اس طور پر کہ اس کے متعلق فرما رہے ہیں کہ والذی نفسی بیدہ ھذا الثالث یعنی قسم ہے

اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ رسولوں نے جن تین امور عظام کی جانب دعوت دی ہے ان میں سے تیسرا امر مقاصد شرعیہ میں سے سب سے زیادہ ادق ہے ماخذ کے اعتبار سے۔ تو دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے اس کے بیان کو قسم کے عنوان سے شروع فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کو اس پر کس درجہ یقین اور وثوق ہے، تب ہی تو اس پر قسم کھا رہے ہیں کیونکہ قسم امور یقینیہ ہی پر کھائی جاتی ہے اور اس لئے کھائی جاتی ہے تاکہ مخاطب بھی اس امر کا یقین کرلے کہ یہ امر قابل شک اور تردد نہیں ہے۔ ہاں غامض اور دقیق ہے۔ اور اسی اتنے پر بس نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ اخلاص ایسی چیز ہے کہ علوم و اعمال کی اس کے بغیر کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی چنانچہ (اعمال کے اعتبار سے تو) یہ فرمایا کہ وہ جسم بلا روح کے رہ جاتا ہے گویا مردہ ہے اور (علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ) بدون اخلاص کے وہ الفاظ بلا معنی یعنی بالکل مہمل ہیں۔ اب کسی چیز میں اخلاص کے باقی نہ رہنے کا اس سے زیادہ اور کیا ضرر ہوگا کہ وہ بالکل ہی مردہ اور مہمل سمجھی جاوے۔

اس میں تصحیح احسان اور اخلاص پر اور اس کے منزلت اور درجہ پر کتنا زور دار کلام فرمایا ہے بس یہی اس وقت میرا موضوع بحث ہے اور اس کے محصلین کی کتنی مدح فرمائی ہے اور اس مقصد کو سب مقاصد سے زیادہ اغمض اور ادق فرمایا ہے اس لئے کہ یہ سب کا باطن اور روح ہے اور جو چیز ایسی ہوتی ہے وہ ادق و اغمض ہی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ اس کی ضرورت پر کلام اور کسی عنوان سے نہیں کیا جا سکتا جس طرح سے فقہ ظاہری کو اور دیگر علوم و فنون کے مقابلہ میں ادق اور اعمق سمجھا جاتا ہے اسی طرح سے شاہ صاحبؒ اس احسان و اخلاص (فقہ باطن) کو بھی ادق و اعمق اور اغمض فرما رہے ہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ زور دار الفاظ لانے پر اور کوئی کیا قادر ہوگا؟ اسی لئے میں نے نصوص کے بعد اس کو نقل کیا ہے۔ کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ نصوص کے بعد اکابر کا کلام نقل کروں گا تو چونکہ میں نے اخلاص کی اہمیت اور ضرورت پر اس سے زیادہ عمدہ کلام نہیں دیکھا

Scanned with CamScanner

اس لئے اس کو مقدم کیا

حاصل کلام یہ ہے کہ یہاں شاہ صاحبؒ نے یہ بیان فرمایا کہ چونکہ اجل مقاصد شریعت تین تھے۔ (۱) تصحیح العقائد فی المبدا و المعاد (۲) تصحیح العمل فی الطاعات (۳) تصحیح الاخلاص والاحسان۔ اور یوں عمل کے درجہ میں تو سب ہی ضروری ہیں اس لئے جملہ علماء و مشائخ امت بقدر ضرورت تو سب ہی ہیں سے حصہ پائے ہوتے ہیں لیکن علمی اعتبار سے یعنی جزئیات کی تفصیل کی رو سے سب مقاصد پر حاوی ہونا چونکہ ہر ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی اسلئے بعد میں آکر علمائے امت میں تقسیم ہو گئی یعنی کچھ لوگوں نے تو اول کو لیا اور اس کے علوم کا استقصا کیا اور ایک ایک جزئی کو لیکر اس پر خوب خوب بحث فرمائی۔ یہ جماعت متکلمین اسلام کی ہوئی ہے اور کچھ لوگوں نے دوسرے کو یعنی تصحیح عمل کو لیا اور اسی طرح سے اس پر بحث فرمائی۔ یہ لوگ فقہائے امت کہلائے اور کچھ لوگوں نے تیسرے کو لیا۔ یہ لوگ صوفیا کہلائے انھوں نے اس مقصد کی کفالت فرمائی اور اللہ کے بندوں کو بہت نفع پہونچایا خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو سیراب کیا، خود ہدایت یاب ہوئے اور دوسروں کو ہدایت یاب کیا۔ اور سعادت عالیہ کے ساتھ کامیاب ہوئے اور دین کے ایک بڑے حصے کو سمیٹا۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ان کی خوبی اور کیسا عام اور تام ہوا ان کا نفع۔

دیکھئے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان گوشہ نشینوں سے خلق خدا کو نفع عام بھی پہونچا اور تام بھی نہ کہ جیسا لوگوں کا خیال ہے کہ ان حضرات کا نفع عام اور وسیع نہیں ہوا کیونکہ اصل نفع تو وصول اور ایصال ہے لہذا ان کی گوشہ نشینی مضر نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ تو کیا دوسروں سے تو اتنا بھی نفع نہیں پہونچا۔ شاہ صاحب تو یہ فرما رہے ہیں اور قسم کھا کر فرما رہے ہیں اور اب جو اٹھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ پہلے کے لوگوں نے کچھ کام نہیں کیا۔ کام ہم کر رہے ہیں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد اس خیال کی تردید کر رہا ہے (اسطرح سے موجودہ زمانے کے ایک جدید طبقے کے خیال کا رد شاہ صاحب فرما چکے ہیں)

جس غرض سے میں نے شاہ صاحبؒ کی عبارت پیش کی تھی وہ حاصل ہوگئی اسکے بعد والا مضمون بھی اس سے غیر متعلق نہیں ہے لہذا اس کو بھی یہاں بیان کر دیا چنانچہ اس کا ارتباط ماقبل سے ترجمہ ہی سے واضح ہو جاتا ہے اس لئے صرف ترجمہ پر اکتفا کرتا ہوں شاید کہیں دو چار لفظ بطور فائدہ بیان ہو جائے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

ولما کان رضاء الحق ان علماء الامۃ ان یسعوا فی بقاء النور الماخوذ من الانبیاء صلوات اللہ علیھم واشاعتہ وحمل الناس علی الاھتداء بہ کما قال فلولا نفر من کل فرقۃ الآیۃ۔ وقال ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون تواترت النصب الخلفاء وبعث الدعاۃ عصراً بعد عصرٍ وطبقۃ بعد طبقۃ لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا ویتحقق علی ایدیھم ما وعد اللہ فی محکم کتابہ حیث قال وانا لہ لحافظون۔

اور جب کہ حق تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ اس امت کے علماء اس نور کے باقی رکھنے میں سعی اور کوشش کریں جو کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اخذ کیا جاتا ہے اور اسکی اشاعت کریں اور لوگوں کو اسکے ذریعہ سے ہدایت حاصل کرنے پر ابھاریں اور آمادہ کریں — جیسا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے۔ اور فرمایا ہے کہ لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی سکھاتے ہو اور بوجہ اسکے کہ تم پڑھتے ہو— تو لوگوں میں خلیفہ مقرر کرنے اور دعاۃ و مبلغین کے بھیجے جانے کا ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں رواج قائم ہوگیا تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور ان لوگوں کے ہاتھوں پر وہ تمام چیزیں پوری ہوں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں فرمایا تھا یعنی یہ کہ ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

یہ دعاۃ جن کے بھیجنے سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو کیسے ہوتے تھے اور ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں اس کے متعلق صاحب روح المعانی قل ھذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔

وفی الآیۃ اشارۃ الی انہ ینبغی للداعی الی اللہ تعالیٰ ان یکون عارفاً بطریق الایصال الیہ سبحانہ عالماً بما یجب لہ تعالیٰ وما یجوز وما یمتنع علیہ جل شانہ	اور آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینے والے اور مبلغ کے لئے لائق ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ تک پہونچانے کے راستے سے واقف ہو اور اللہ تعالیٰ کے جو حقوق واجبہ ہوں ان کو جانتا ہو اور کیا جائز ہے اور کیا منع ہے۔ اس کو بھی جانتا ہو۔

آگے اپنے وقت کے دعاۃ اور واعظین پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔

والدعاۃ الی اللہ تعالیٰ الیوم من ھؤلاء الذین نصبوا انفسھم الی الارشاد بزعمھم اجھل من۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً۔	اور یہ آج کل کے جو دعاۃ الی اللہ ہیں جنھوں نے کہ اپنے آپ کو بزعم خود مسند آرائے سریر ارشاد بنا رکھا ہے تو وہ تو فلاں سے بھی زیادہ اجہل ہیں (یہاں ذرا سخت لفظ فرما گئے ہیں۔ میں نے اس کو دہرانا مناسب نہیں سمجھا) اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بھی کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ (روح صـــ ج ۱۳)

اسی طرح سے ایک دوسرے مقام پر آیت وداعیاً الی اللہ باذنہ کے تحت لکھتے ہیں کہ :۔

باذنہ ای بتسھیلہ وتیسیرہ تعالیٰ۔ وباذنہ من متعلقات داعیاً۔ وقیدت الدعوۃ بذلک ایذاناً بانھا امر صعب المنال وخطب فی غایۃ اعضال الا تیانی الا بامداد من جناب قدسہ کیف لا وھو صرف للوجوہ عن القبل المعبودۃ وادخال الاعناق فی قلادۃ غیر معھودۃ۔ (روح المعانی صـ۴۳ ج ۲۲)	باذنہ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسہیل اور تیسیر کے ساتھ اور لفظ باذنہ داعیاً کے متعلق ہے چنانچہ دعوت کو اس قید سے مقید کرنے میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ یہ صعب الحصول شے اور نہایت ہی کٹھن قسم کی چیز جس کو بجز امداد خداوندی کے حاصل ہی نہیں کیا جاسکتا اور کیوں نہ ہو یہ دعوت الی اللہ کوئی آسان کام بھی تو نہیں ہے۔ بلکہ چہروں کو ان قبلوں سے پھیرنا ہے جن کو لوگ معبود بنائے ہوئے ہیں اور گردنوں کو ایسے قلادہ (طوق) میں داخل کرنا ہے جو نامانوس ہے (اور ظاہر ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے)

یہ تو دعاۃ پر درمیان میں بات آگئی تھی شاہ صاحبؒ ضرورت خلافت بیان کر کے آگے اس کے اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

والخلافۃ ظاہرۃ وباطنۃ فالخلافۃ الظاہرۃ اقامت الجہاد والقضاء وجبایۃ العشور والخراج وقسمتہا علی مستحقہا وقد حمل اعباءہا العادلون من ملوک الاسلام

پھر یہ سمجھئے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں ایک خلافت ظاہرہ دوسری باطنہ خلافت ظاہرہ تو یہ ہے کہ مثلاً اقامت جہاد کرنا. قضا اور حدود کو جاری کرنا اور عشر و خراج کا انتظام کرنا اور ان کو مستحقین پر تقسیم کرنا وغیرہ اور اس بار کو ان مسلمان سلاطین نے اٹھایا جو کہ عادل تھے۔

والخلافۃ الباطنۃ تعلیم الکتاب والحکمۃ وتزکیتہم بالنور الباطن بقوارع الوعظ وجواذب الصحبۃ کما قال عز من قائل لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

اور خلافت باطنہ یہ ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم کیجاوے اور لوگوں کے قلوب کا تزکیہ نور باطن کے ذریعہ ایسے ایسے مواعظ سے کیا جائے جو قلوب کو ہلا دیں ا رکانوں کو کھڑ کھڑا دیں اور ایسی ایسی صحبتوں سے جو اپنے اندر مقناطیسی جذب رکھتی ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا جب کہ ان میں انھیں کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا جو ان کو اللہ تعالےٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

وفیہم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم العلماء ورثۃ الانبیاء وقال فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ولا یکون الخلیفۃ الا من جمع المقاصد الثلاثۃ التی ذکرناھا وحفظ الکتاب والسنۃ وتدرب فی

اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور یہ فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسی کہ مجھ کو فضیلت حاصل ہے تم میں کے کسی ادنیٰ شخص پر. چنانچہ خلیفہ نہیں ہو سکتا مگر وہی شخص جس نے ان تینوں مقاصد عظیمہ کو جمع کیا ہو جن کو میں نے شروع میں بیان کیا ہے اور وہ کتاب و سنت کا بھی حافظ ہو اور سلوک

قوانین السلوک وتربیۃ السالکین باطن اور سالکین کی تربیت کے جو اصول ہیں ان میں اس کو تجربہ ہو اور مہارت تامہ رکھتا ہو۔ (تفہیمات الٰہیہ صـ۱۳ ج ۱)

اس میں نور جو ماخوذ ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اس کے حاملین اور وارثین کا بیان۔ اور اس کی طرف دعوت اور اس کے لئے سفر اور کو نوار بانیین سے اس پر استدلال اور خلفاء کا نصب اور دعاۃ کا بعث کس قدر اہتمام اور شغف اصلی دین کی اشاعت کا معلوم ہوتا ہے۔ پھر خلافت کی تقسیم کی خلافت ظاہرہ اور باطنہ کی طرف ملوک اسلام کو اس کا حامل بتایا۔ اور خلافت باطنہ، تعلیم کتاب و تزکیۂ باطن تنور باطن و بالوعظ الحقیقی والصحبۃ۔

پھر آخر میں یہ فرمایا کہ لایکون الخلیفہ الا من جمع المقاصد الثلاثۃ وحفظ الکتاب والسنۃ وتدرب فی قوانین السلوک وتربیۃ السالکین۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کلام کے بعد مزید تائید کے لئے ان کے تلمیذ رشید قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کا کلام نقل کرتا ہوں۔ اپنی مشہور و معروف کتاب مالابد منہ میں فرماتے ہیں کہ :۔

کتاب الاحسان:۔ بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام و شریعت است۔ و مغز و حقیقت او در خدمت درویشاں باید جست و خیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت است کہ ایں سخن جہل و کفر است بلکہ ہمیں شریعت است کہ در خدمت درویشاں چوں قلب از تعلق علمی و حبی کہ بما سوی اللہ داشت پاک شود و رذائل نفس برطرف گشتہ

جانو (اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے) کہ یہ سب جو بیان کیا گیا وہ تو ایمان و اسلام اور شریعت کی صورت تھی۔ باقی اسکا مغز اور اسکی حقیقت کو درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہیے اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ حقیقت (یعنی طریقت) شریعت کے خلاف کوئی چیز ہے کیونکہ یہ بات تو جہل بلکہ کفر کی ہے۔ معاذ اللہ صحیح یہ ہے کہ یہی شریعت ہے جو بزرگوں کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے جب قلب تعلق علمی سے جو کہ اسکو ماسوائے اللہ سے حاصل ہوتا ہے پاک ہو جاتا ہے اور نفس کے رذائل

نفس مطمئنہ شود و اخلاص بہم رساند شریعت در حق او بامغز شود و نماز او عند اللہ تعلق دیگر بہم رساند و دو رکعت او بہتر از لک رکعت دیگراں باشد و ہمچنیں صوم او و صدقہ او رسول فرمود صلی اللہ علیہ وسلم اگر شما مثل احد زر در راہ خدا خرچ کنید برابر یک سیر یا نیم سیر جو نباشد کہ صحابہ در راہ خدا دادہ اند ایں از جہت قوت ایمان و اخلاص شان است۔

اس سے دور اور زائل ہو کر اس کا نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے اور اس میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے تو پھر یہی شریعت اس کے حق میں بامغز اور بامعنی اور بار وح ہو جاتی ہے اور اسوقت اسکی نماز اللہ تعالیٰ سے کچھ دوسرے ہی نوع کا تعلق پیدا کرتی ہے اور اب اسکی دو رکعت دوسروں کی لاکھ رکعت سے بھی بہتر ہوتی ہے یہی حال اسکے روزہ اور صدقہ کا ہو جاتا ہے (یعنی ان سب کا کیف بڑھ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ احد پہاڑ کے برابر بھی سونا اگر راہ خدا میں خرچ کرو تو وہ اس ایک سیر یا آدھ سیر جَو کے برابر نہ ہوگا جو کہ صحابہؓ نے خدا کی راہ میں صرف کیا ہے تو یہ فرق ظاہر ہے کہ ان کے ایمان اور اخلاص ہی کی قوت کی وجہ سے ہوا۔

نورِ باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔ (مالابد منہ صـ۱۷)

(حاصل یہ کہ) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہئے اور پھر اس نور سے اپنے سینہ کو روشن اور منور کرنا چاہیئے تاکہ ہر بھلائی اور برائی فراست صحیحہ سے معلوم ہو جایا کرے۔

اب دیکھئے یہ کتاب جس کی عبارت آپ کے سامنے پیش کی گئی فقہ کی کتاب ہے اور کسی نے فقہاء میں سے اپنی کتاب کے آخر میں کتاب الاحسان نہیں لکھا لیکن انھوں نے مالابُد کے آخیر میں الاحسان بھی تحریر فرمایا اور اس کا عنوان کتاب الاحسان رکھا۔ اس میں فرماتے ہیں کہ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام و شریعت است و مغز و حقیقت او در خدمت درویشاں باید جست۔ پھر اخلاص کا درجہ عند اللہ اور اسی سے مراتب کا تفاوت اور صحابہ کی فضیلت ساری امت پر اسی کی قوت کیوجہ سے۔ پھر اس پر تحریض کہ نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ

Scanned with CamScanner

خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔ یہی فقہ اصلی ہے کہ فقہ کی تعریف ابو حنیفہؒ سے یہی منقول ہے یعنی معرفۃ النفس مالہا وما علیہا۔ (یعنی فقہ کہتے ہیں نفس کے پہچان لینے کو ان چیزوں کو جو اسکے لئے (دارین میں) نافع ہوں یا مضر و نقصان دہ ہوں)

اخلاص کے غموض اور دقت کے بیان کے لئے مثنوی شریف سے اس پر کلام نقل کرتا ہوں جو اخلاص ہی کے بارے میں بیان فرمایا گیا ہے وھو ھذا مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ ع از علی آموز اخلاص عمل۔ اور اس کے بعد حضرت علیؓ کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے اس کو نقل کرنے سے پہلے ربط کے لئے اس سے پہلے کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

آتشے افتاد در عہد عمرؓ ہمچو چوب خشک می خورد او حجر

درفتاد اندر بنا و خانہا تا زد اندر پر مرغ و لانہا

نیم شہر از شعلہ ہا آتش گرفت آب می ترسید ازاں و می شگفت

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ کے وقت میں ایک بار ایسی آگ لگی کہ خشک لکڑی کی طرح پتھر کو جلائے ڈالتی تھی اور تمام عمارتوں اور گھروں میں پہونچ گئی تھی حتیٰ کہ طیور کے پروں اور آشیانوں تک صدمہ پہونچا۔ غرض نصف شہر شعلوں سے بھر گیا اور گویا پانی کو بھی اس سے خوف اور تعجب ہوتا تھا۔

مشکہائے آب و سرکہ می زدند بر سر آتش کسانِ ہوشمند

آتش از استیزہ افزودے لہب می رسید او را مدد از صنع رب

آتش از استیزہ افزوں می شدے می رسد او را مدد از بے حدے

ترجمہ:۔ ہوشیار لوگ پانی کے اور سرکے کے (غرض جو کسی کو ملا اسکی) مشکیں اس پر ڈالتے تھے مگر آگ کے شعلے اسی جوش و خروش سے ترقی پر تھے اور صنعت کردگار سے جو کہ بے پایاں ہے اس کو مدد پہنچ رہی تھی (جس کا سبب خاص بھی آگے آتا ہے)

خلق آمد جانب عمرؓ شتاب کآتش ما خود نمی میرد ز آب

گفت آں آتش زآیاتِ خداست شعلۂ از آتش بخل شماست
آب بگذارید وناں قسمت کنید بخل بگذارید گر آں منید

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ کے پاس لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ (خدا جانے کیا بات ہے کہ) ہماری یہ آگ پانی سے فرو نہیں ہوتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آگ آیات (قہر) خداوندی سے ہے اور یہ تمہاری آتش بخل کا ایک شعبہ ہے تم پانی ڈالنا تو موقوف کرو اور روٹیاں (مساکین کو) تقسیم کرو اور بخل ترک کرو اگر تم میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو۔

خلق گفتندش کہ در بکشودہ ایم ما سخی واہل فتوت بودہ ایم
گفت ناں در رسم وعادت دادہ اید دست از بہر خدا نکشادہ اید
بہر فخر و بہر نوش و بہر ناز نز برائے ترس و تقوی و نیاز

ترجمہ:۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم نے تو دروازہ (داد و دہش کا) کھول رکھا ہے اور ہم با سخاوت اور با فتوت ہو رہے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے روٹیاں بطور رسم و عادت کے دی ہیں اور خدا تعالیٰ کے واسطے ہاتھ نہیں کشادہ کیا محض فخر وریا اور اترانے کے لئے دیا ہے نہ کہ خوف و تقوی اور خضوع کی وجہ سے۔

مال تخم است و بہر شورہ منہ تیغ را در دست ہر رہزن مدہ
اہل دیں را باز داں از اہل کیں ہمنشیں حق بجو با او نشیں
ہر کسے بر قوم خود ایثار کرد خواجہ پندارد کہ او خود کار کرد

ترجمہ:۔ (شاید کوئی کہے کہ مال خرچ کرنا تو ہر طرح محمود ہی ہے تو وہ سمجھ لے کہ) مال کی مثال تخم کی سی ہے اسکو شورہ زمین میں مت ڈالو کہ محض ضایع کرنا ہے اسی طرح غیر محل میں صرف مت کرو اور دوسری مثال یہ ہے کہ تلوار کو راہزن کے ہاتھ میں مت دو (اسی طرح سے ایسے شخص کو مت دو جو اس کو معین معصیت بنا دے) بلکہ اہل دین اور اہل عناد (یعنی اہل خلاف) میں امتیاز کرو۔ (یعنی مال سے اہل دین کی اعانت کرو

اور اہل خلاف کی منت کرو جیسا حدیث میں ہے کہ لایاکل طعامک الا تقی لیکن طعام و کسوت حاجت اس سے مستثنیٰ ہے آگے ترقی کے طور پر فرماتے ہیں کہ صرف اعانت مالیہ ہی کی کیا تخصیص ہے کہ اہل دین کے ساتھ کیجاوے بلکہ مطلق مجالست و مخالطت میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ جلیس حق کو تلاش کر کے اس کے پاس بیٹھو (جلیس حق سے مراد جس پر ذکر الٰہی غالب ہو جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ انا جلیس من ذکرنی پھر اس عطا کا غیر محل میں ہونا بیان فرماتے ہیں کہ) ہر شخص نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے کو دیا (صرف اپنا سمجھ کر بلا لحاظ حاجت و مصلحت کے ورنہ صورت حاجت میں تو ان کی تقدیم خود منصوص ہے) اور پھر سمجھ یہ رہے ہیں کہ ہم نے اچھا کام کیا (یعنی اگر تقویٰ سبب عطا ہوتا تو اس میں اخلاص ہوتا حالانکہ حسب تقریر مذکور اخلاص نہیں ہے معلوم ہوا کہ منشا اس کا تقویٰ نہ تھا۔

(توضیح مقام) مولانا رومؒ نے یہاں چھانٹ چھانٹ کر اپنوں کے دینے کو خلاف اخلاص جو فرمایا تو یہ اس وقت ہے جبکہ بلا لحاظ نص شرعی کے ہو جو ان کی تقدیم کے لئے وارد ہے۔ ورنہ تو اپنوں کو چھانٹ چھانٹ کر دینا اگر بلحاظ شرع ہو کہ شرع نے ان پر انفاق کو مقدم کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تقدیم عین حکم شرع اور عین اخلاص ہے۔ اس میں یہ اور غیر برابر ہیں۔ بلکہ ان پر انفاق بہ نسبت غیروں کے نظر شارع میں زیادہ موجب تقرب ہوگا۔ بعض دفعہ آدمی اپنوں پر ان کی محبت کی وجہ سے خرچ کرتا ہے اور یہی حیثیت پیش نظر رہتی ہے دوسری حیثیت کہ شارع نے اس کا امر فرمایا ہے لہذا بامتثال امر شارع اس کو کرنا چاہیئے، یہ ملحوظ نہیں رہتا اسی کو مولانا رومؒ نے خلاف اخلاص فرمایا ہے ورنہ تو اپنے نفس پر بحکم شارع خرچ کرنا جیسا کہ تصدق بہ علی نفسک حدیث ہے۔ یہ بھی صدقہ ہے اور موجب اجر ہے۔

سبحان اللہ! کیسی تعلیم ہے شریعت کی کہ اس طرح سے ہمارے بہت سے انفاق ثواب سے خالی نہیں رہتے کیونکہ زیادہ حصہ آمدنی کا اپنے بیوی بچوں ہی پر خرچ ہوتا ہے یہ تو اجر سے خالی ہوتا۔ صرف جو مساکین کو دیا جاتا وہی کارآمد ہوتا۔

شریعت مطہرہ نے لوگوں کے جن رسم و رواج کی اصلاح فرمائی ہے ان میں سے انفاق کے باب کا ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ عام طور سے انفاق کا مفہوم انفاق علی الغیر ہی سمجھا جاتا تھا چنانچہ ومما رزقناھم ینفقون کا یہی مطلب ذہن میں تھا کہ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ دوسروں کو بھی دیتے ہیں حالانکہ خود قرآن شریف میں جہاں مصارف کا بیان فرمایا گیا ہے وہاں جس طرح سے یتامیٰ اور مساکین کا ذکر ہے اسی طرح اولی القربیٰ کا بھی تو ذکر ہے پھر اس کی جو تشریح احادیث میں وارد ہے اس نے تو اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا کہ عزیز و قریب کے دینے میں زیادہ ثواب ہے اور انفاق کے اولین مستحق یہی لوگ ہیں۔ چنانچہ ابو داؤد شریف میں ہے کہ:۔

عن ابی ھریرۃؓ قال امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالصدقۃ فقال رجل یا رسول اللہ عندی دینار قال تصدق بہ علی نفسک قال عندی آخر قال تصدق بہ علی ولدک قال عندی آخر قال تصدق بہ علی زوجتک او زوجک قال عندی آخر قال تصدق بہ علی خادمک قال عندی آخر قال انت ابصر (وفی روایۃ انت اعلم) بذل ص۶۴ ج ۳	حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صدقہ کا حکم فرمایا، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو اپنی ذات پر صرف کرو۔ کہا ایک اور ہے۔ فرمایا اسکو اپنی اولاد پر صرف کرو عرض کیا ایک اور ہے فرمایا اسکو اپنی بیوی پر صرف کرو۔ کہا ایک اور ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو اپنے خادم پر صرف کرو کہا میرے پاس ایک اور ہے آپ نے فرمایا کہ تم کو اختیار ہے تم اہل حاجت سے بخوبی واقف ہو۔

انت ابصر کی شرح کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ کا قول صاحب بذل المجہود نقل فرماتے ہیں کہ:۔

قال القاریؒ بحال من یستحق الصدقۃ من اقاربک وجیرانک واصحابک	یعنی اس کے حال سے تم زیادہ واقف ہو جو تمہارے اقارب پڑوسی اور دوستوں میں سے صدقہ کے زیادہ مستحق ہیں۔

دیکھئے اس روایت میں تصریح ہے کہ صدقہ کی ابتداء پہلے اپنوں ہی سے ہونی چاہیئے غالباً یہیں سے ماخوذ ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ اول خویش بعدہٗ درویش۔

نیز مراقی الفلاح میں ابو حفص الکبیرؒ کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ لا تقبل صدقۃ الرجل وقرابتہ محاویج حتی یبدأ بہم فیسد حاجتہم یعنی آدمی کا صدقہ قبول ہی نہیں ہوتا درآنحالیکہ اس کے قرابتدار حاجتمند ہوں یہاں تک کہ پہلے ان کو دیکر ان کی حاجت روائی کردے۔

(طحطاوی ص۳۹۴)

ایک دوسری حدیث سنیئے، ریاض الصالحین میں ہے کہ:۔

الید العلیا خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول وخیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی — اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے اور انفاق کی ابتداء اس سے کرو جو تمھارے زیر کفالت ہو اور سب سے بہتر صدقہ وہ ہے جو اپنی ضرورت کا لحاظ کرکے کیا جائے۔

اس کے تحت صاحب دلیل الفالحین لکھتے ہیں کہ:۔

بمن تعول لانہ اما واجب او مندوب ففیہ اداء حق وصلۃ رحم — ان سے ابتدا کرو جو تمھارے پرورش میں ہیں اس لئے کہ ان کا نفقہ یا تو واجب ہے یا مستحب ہے پس ان پر خرچ کرنے میں ادائے حق بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ اپنے کو دینے میں دوہرا اجر ہے ادائے حق کا اور صلہ رحمی کا باقی جن نصوص سے مساکین وغیرہ کو دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے مثلاً ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً ویتیماً واسیراً تو اس لئے کہ یہاں اگر اخلاص نہ ہوگا تو ان پر انفاق ہی نہ ہوگا بخلاف اپنوں کے ان کو اگر اخلاص نہ بھی ہوگا تب بھی آدمی دے گا تو عوض و بدلہ ہی کے لئے سہی پس یہاں انفاق کے اور بھی دواعی ہیں۔ یہ وجہ ہے مساکین پر انفاق کی فضیلت کے بیان کی نہ یہ کہ وہی اخلاص ہوتا ہے اور اپنوں میں نہیں ہوتا۔

عن ظھر غنی ای ما وقع عن غنی وعدم احتیاج الی المتصدق بہ لنفسہ — ظہر غنی سے مراد یہ ہے کہ صدقہ اس شخص کا خیر اور بہتر ہے جو اتنا مال صدقہ کرے کہ صدقہ کرنیکے بعد پھر خود ہی اس کا محتاج نہ ہو جائے کہ یہ تو قلب موضوع ہے۔

(دلیل الفالحین ج۳ ص۱۲۵)

Scanned with CamScanner

انفاق مال کے متعلق یہ بحث تو درمیان میں آگئی تھی مگر اہم تھی اس لئے میں نے مفصل کلام اس پر کر دیا۔ اب حضرت علیؓ کا واقعہ جو یہاں مقصود بیان ہے عرض کرتا ہوں۔ اوپر (جو واقعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آگ لگنے کا بیان ہوا اس میں) اخلال بالتقویٰ اور بے اخلاصی کی مذمت تھی۔ اس قصہ میں اخلاص ناشی عن التقویٰ کی مدح اور تعلیم ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کافر کو بخوف مشارکت نفس چھوڑ دیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ:۔

(قصہ خیو انداختن خصم در روئے امیر المومنین حضرت علیؓ وانداختن آنحضرت شمشیر از دست)

یعنی قصہ حضرت علیؓ کے مقابل کا آپ کے چہرۂ انور پر تھوکنے کا اور آپ کا اسکے قتل سے باز آنے کا

از علی آموز اخلاص عمل   شیر حق را داں منزہ از دغل

درغزا بر پہلوانے دست یافت   زود شمشیرے برآورد و شتافت

ترجمہ:۔ حضرت علیؓ سے اخلاص سیکھنا چاہیئے اور اسد اللہ کو آمیزش ریاء سے پاک جاننا چاہیئے جہاد میں کسی پہلوان پر آپ غالب آئے اور فوراً تلوار نکالکر اس پر دوڑے۔

او خیو انداخت بر روئے علیؓ   افتخار ہر نبی و ہر ولی

او خیو انداخت بر روئے کہ ماہ   سجدہ آرد پیش او در سجدہ گاہ

درزماں انداخت شمشیر آں علیؓ   کرد او اندر غزائش کاہلی

ترجمہ:۔ اس نے (جان سے ناامید ہو کر) نعوذ باللہ حضرت علیؓ کے چہرہ مبارک پر جن پر انبیاء و اولیاء کو افتخار ہے تھوک دیا (اور چونکہ افتخار کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں پر ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے کہ میں اور امتوں کے مقابلہ میں تم پر فخر کروں گا اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عرفات پر ملائکہ کے سامنے فخر فرماتے ہیں اس لئے کوئی اشکال نہیں۔ اولیاء کا فخر تو یہ ہے کہ ہم

ہیں ایسے بزرگ ہیں اور ابتیاز کا یہ ہے کہ ہمارے اتباع (یعنی ماننے والوں) میں ایسے شخص ہیں اس نے ایسے چہرے پر نعوذ باللہ تھوکا کہ چاند کو بھی اس کے سامنے سجدہ کرنا زیبا ہے۔ آپ نے اسی وقت تلوار پھینک دی اور اس کے جنگ میں التوار فرمادیا۔

گفت حیراں آں مبارز زیں عمل | در نمودن عفو و رحمت بے محل
گفت بر من تیغ تیز افراشتن | از چہ افگندی مرا بگذاشتن
آں چہ دیدی بہتر از پیکار من | تا شدی تو سست در اشکار من

ترجمہ:۔ وہ حریف اس عمل سے اور بے محل عفو فرمانے سے نہایت متحیر ہوا کیونکہ اس کا مقتضا ظاہر تو یہ تھا کہ (اور بھی جلدی قتل کر ڈالتے) اور عرض کیا کہ آپ نے مجھ پر تلوار کا وار کیا اور کس وجہ سے تلوار پھینک دی اور مجھ کو چھوڑ دیا اور کافر کو چھوڑ دینے کا مسئلہ مَنّ سے کہ مجتہد فیہ ہے مدفوع ہے دوسرے یہ کہ معرکہ میں دوسرا شخص اس کے شر کو دفع کر سکتا ہے آپ کو میرے جنگ اور قتل سے بڑھ کر کیا چیز نظر آگئی کہ آپ اس طرف مشغول ہو کر میرے مقابلہ و مقاتلہ میں ڈھیلے پڑ گئے۔

دور تک مولانا روم رح اس مضمون کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ پھر آخر میں جاکر حضرت علی رض کا جواب نقل فرمایا ہے:۔

(گفتن امیر المؤمنین با قرین خود کہ سبب ناکشتن تو چہ بود و مسلمان شدن او بدست حضرت علی رض)

(حضرت علی رض کا اپنے مقابل سے اس کو قتل نہ کرنے کی وجہ بیان فرمانا اور اس کا آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوجانا)

گفت امیر المؤمنین با آں جواں | کہ بہنگام نبرد اے پہلواں
چوں خدو انداختی بر روئے من | نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

نیم بہر حق شد و نیمے ہوا　　شرکت اندر کار حق نبود روا

ترجمہ:۔ حضرت امیر المومنین ؓ نے اس شخص سے (اس عفو کا سبب) فرمایا کہ لڑائی کے وقت جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو (غصہ سے) جنبش ہوئی اور میرا حسن خلق بگڑنے لگا پس (میرا غزوہ) کچھ تو اللہ تعالیٰ کے واسطے رہ گیا اور کچھ ہوائے نفسانی ہوگیا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں شرکت جائز نہیں (چنانچہ رضاء خلق کے واسطے ریاء فی العبادۃ کو حدیث میں شرک فرمایا ہے۔

تو نگار یدہ کف ہو نیستی　　آں حقے کہ کردۂ من نیستی

نقش حق را ہم بامر حق شکن　　بر زجاجہ دوست سنگِ دوست زن

ترجمہ:۔ اور تو دست حق کا بنایا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کا مملوک ہے میرا مخلوق نہیں (کہ جس طرح چاہوں تصرف کرلوں پس وہی تصرف جائز ہوگا جو باذن حق ہو اور شرکت فی العبادت میں اذن حق نہیں ہے اس لئے تجھ کو چھوڑ دیا کیونکہ تو مصنوع حق ہے اور) مصنوع حق کو امر حق ہی سے توڑنا چاہیئے اور شیشۂ دوست پر سنگ دوست ہی مارنا چاہیئے۔ (یعنی ان کے مصنوعات و مملوکات میں ان کے ہی اذن سے تصرف کرنا چاہیئے۔)

گبر ایں بشنید و نورے شد پدید　　در دل او تا کہ زنارش برید

گفت من تخم جفا می کاشتم　　من ترا نوع دگر پنداشتم

تو ترازوے احد خو بودۂ　　بل زبانہ ہر ترازو بودۂ

تو تبار و اصل خویشم بودۂ　　تو فروغ شمع کیشم بودۂ

ترجمہ:۔ اس کافر نے جو یہ بات سنی تو اس کے قلب میں ایک نور ظاہر ہوا جس سے زنار توڑ ڈالا۔ اور عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ تخم جفا بوتا تھا کہ آپ کا مقابل بنا اور گستاخی سے پیش آیا میں تو آپ کو کچھ اور ہی طرح کا سمجھتا تھا (کہ مال و جاہ کے لئے ان کا قتال ہے) مگر آپ تو میزان عدل فی الاخلاق والاعمال نکلے جو متخلق باخلاق الٰہیہ ہیں (کہ عدل صفات الٰہیہ میں سے ہے)

بلکہ آپ تو دوسری میزانوں کے لسان ہیں (جن سے میزان کی استقامت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے اہل کمال کے معیار استقامت ہیں کہ آپ کی حالت پر منطبق کر کے ان کے کمال و نقصان کا حال معلوم ہوتا ہے) پس میرا خاندان اور اصل قرابت دار تو آپ ہی ہیں (یعنی اپنے کنبہ کو چھوڑتا ہوں) اور میرے اس کیش کے جواب قلب میں القا ہوا ہے فروغ شمع (یعنی سبب ہدایت) آپ ہی ہیں۔

من غلام آں چراغ شمع خو | کہ چراغت روشنی پذیرفت ازو
من غلام موج آں دریائے نور | کو چنیں گوہر درآرد در ظہور

ترجمہ:۔ میں تو اس چراغ شمع خو کا غلام ہوں جن سے آپ کے چراغ کو نور حاصل ہوا (مراد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے فیض سے آپ کو یہ کمال ملا) میں تو اس موج دریائے نور کا غلام ہوں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ بحر انوارِ حق کے موج یعنی مظہر کمالات حق ہیں) جو ایسے گوہر کو (جیسے حضرت علیؓ ہیں) ظاہر کریں۔

عرض کن بر من شہادت را کہ من | من ترا دیدم سرافرازِ زمن
قرب پنجہ کس زخویش و قوم او | عاشقانہ سوئے دیں کردند رو
او بہ تیغ حلم چندیں خلق را | واخرید از تیغ چندیں حلق را

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل زصد لشکر ظفر انگیز تر

ترجمہ:۔ پس مجھ پر کلمۂ شہادت کو پیش فرمائیے کہ میں آپ کو (اس وقت) تمام زمانہ سے افضل سمجھتا ہوں غرضکہ اس کے اقارب برادری میں سے پچاس آدمیوں کے قریب نے نہایت عشق و شوق سے اسلام قبول کیا۔

آپ نے تیغ حلم سے اتنی خلق کو یعنی تیغ ہلاکت سے اتنے حلقوں کو بچا لیا۔ واقعی تیغ حلم تیغ آہنی سے زیادہ تیز ہے بلکہ صدہا لشکر سے بڑھ کر باعث فتح و ظفر ہے۔

Scanned with CamScanner

حضرت مولانا رومؒ نے اس واقعہ کو مثنوی میں بیان فرمایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ع

"از علی آموز اخلاص عمل"

اب آپ خود غور فرمائیے کہ وہ مقابل جو مسلمان ہوگیا اور اپنے سب اہل خاندان کو مسلمان کرایا تو یہ کس چیز کی برکت تھی؟ ظاہر ہے کہ آپ کا حلم اور آپ کا اخلاص تھا جس کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ع "تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر" یعنی حلم کی تلوار لوہے کی تلوار سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ہم لوگ ہوتے تو اس کافر کی اس گستاخی پر اور جلدی اس کو ذبح کر دیتے کہ ہر طرح سے اس پر قابو تھا اور خوش ہوتے اور سمجھتے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے واسطے یہ جہاد کیا اور ایک کافر کو فنا فی النار والسقر کر دیا لیکن آپ کے اخلاص نے اس سے زیادہ مؤثر کام کیا کہ کتنے لوگوں کو جہنم سے رہائی دلا کر ان کو جنت کا مستحق ٹھہرا دیا۔ سبحان اللہ۔

حضرت علیؓ کا ایسے غلبہ اور جوش کے وقت میں اپنے مقابل کو اس طرح سے چھوڑ دینا باوجود اس کے کہ اس نے ایسی سخت گستاخی بھی کی تھی کس قدر للّٰہیت پر مبنی ہے۔ نیز یہ کہ جب وہ کافر چھوٹ گیا تو بجائے اس کے کہ وہ موقع کو غنیمت سمجھ کر بھاگ جاتا کیونکہ فطرۃً انسان ایسے مواقع میں یہ خیال کرتا ہے کہ جان بچی لاکھوں پائے۔ مگر اس نے یہ نہیں کیا بلکہ آپ ہی کے اخلاص کی ایک برکت یہ ظاہر ہوئی کہ وہ آپ سے آپ کے اس فعل کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ اخلاص میں کس قدر زور ہے کہ بھاگنا اور جان بچانا یا الٹ کر حملہ کرنا تو الگ رہا ان سب باتوں کو بھول کر میدان کارزار میں ایک دشمن دوسرے دشمن سے علمی تحقیق اور طریقت کا مسئلہ حل کرتا ہے اسی کو میں نے اخلاص کی برکت کہا ہے۔

حضرت علیؓ کے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے اخلاص کے ساتھ کسی کام کے کرنے میں برکت ہوتی ہے اسی طرح سے اخلاص ہی کی وجہ سے اگر کسی کام کو ترک کر دیا جائے تو اس میں بھی برکت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس قصہ سے ہمیشہ کے لئے یہ مسئلہ نکل آیا کہ جب

Scanned with CamScanner

کسی کام میں اخلاص باقی نہ رہے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ مقصود فعل ہے نہ ترک بلکہ خلوص للہیت مقصود ہے اور وہ جس طرح سے کہ کبھی کسی کام کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح کبھی ترک میں بھی ہوتی ہے۔

پھر یہ کہ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر نہیں ہوا کیونکہ آپ تو معصوم تھے اس لئے وہاں نفس کی شرکت کا کیا سوال ؟ بلکہ صحابہ کرام سے اس قسم کے واقعہ کا صدور ہوا تاکہ معلوم ہو جائے اور قیامت تک کے لئے امت کے لئے سبق ہو جائے کہ ممکن ہے کہ ایک کام اخلاص کے ساتھ شروع کیا گیا ہو لیکن بعد میں اس میں نفس کی شرکت ہو جائے مگر حضرات صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتِ صحبت سے ایسا نور حاصل ہوا تھا کہ اگر اخلاص میں کچھ بھی نفسانی ظلمت عارض ہو جاتی تھی تو یہ حضرات اس نور کے ذریعہ فوراً اس کو پہچان لیتے تھے اور اپنے عمل کو اس سے پاک فرمالیتے تھے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں دیکھئے کہ نفس نے اپنا کام کیا اثر ہوا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نور نے جو آپ کو حاصل تھا غلبہ کیا اور آپ نے اس عارضی ظلمت کو پہچان لیا اور اس میں ملوث ہونے سے اپنے عمل کو بچا لیا ——————

حضرات صحابہؓ معصوم نہ تھے مگر معصوم سے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قوی نسبت رکھتے تھے لہذا ایسے مواقع میں معصوم کی برکت ان کو پہونچتی تھی اور اللہ تعالیٰ انکو بھی اس سے بچا لیتے تھے اسی مضمون کو کسی نے خوب کہا ہے ؎

صَلِّ یَا رَبِّ عَلٰی مَنْ ھُوَ مِنْ عِصْمَتِہٖ　　یَعْصِمُ الْحَقُّ مُحِبِّیْہِ مِنَ الْخَنَّاسِ

ترجمہ :- رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جن کے معصوم ہونیکی برکت سے بچالیتے ہیں حق تعالیٰ ان کے محبین کو خناس (کے شر) سے۔

انسان کا اخلاص اسی وقت پہچانا جاتا ہے جبکہ کوئی چیز عارض ہو۔ نفس کے غلبہ کے وقت ایمان کی قوت اور ایمان کا نور ظاہر ہو۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کی صفت کا بیان

Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

والذین اذا فعلوا فاحشۃ اوظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم یعنی جب ان سے کسی غلطی کا صدور ہوجاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوجاتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں لوگ اخلاص کا بڑا اہتمام کرتے تھے اور اسکو مشکل سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنے عمل میں اس کا خوف کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اخلاص باقی نہ رہے۔ اب لوگوں کا یہ حال ہے کہ کام کرتے ہی چلے جاتے ہیں اور اخلاص کی جانب مطلقاً توجہ ہی نہیں کرتے کہ ہے یا نہیں کیونکہ وہ مقصود ہی نہیں ہے اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ جہل مرکب میں مبتلا ہیں، یعنی حال تو یہ ہے کہ اخلاص کی ہوا بھی نہیں لگی لیکن اگر ان سے اخلاص اختیار کرنیکے لئے کہا جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ واہ صاحب ہم لوگ اتنا اتنا عمل کر رہے ہیں اور اب تک ہم میں اخلاص ہی نہیں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ عمل آپ لوگ چاہے جس قدر کریں اس کا انکار نہیں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ آج کل لوگ رات و دن ریا اور نمود کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور اپنے انھیں ظاہری اعمال پر مطمئن رہتے ہیں چنانچہ بلا خوف لومۃ لائم یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مفوت اخلاص (یعنی جو لوگ کہ اخلاص سے عاری ہیں وہ) اس زمانے میں صورت تو چکنی چپڑی نیکوں جیسی بنالیتے ہیں اور انکی سیرت بالکل منافقوں جیسی رہتی ہے ان کو اخلاص کا خیال تک نہیں آتا اور نہ اس کو حاصل ہی کرنا چاہتے ہیں اسی لئے لوگوں نے تو اس زمانہ میں اس کی بساط ہی کو تہ کرکے رکھدیا ہر چیز کی بس صورت صورت رہ گئی ہے معنی کا پتہ نہیں اور وہ معنی کیا ہیں؟ یہی اخلاص ہے، حالانکہ بزرگان دین نے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں نہایت ہی شد و مد کے ساتھ اس کی بحث فرمائی ہے اور قرآن وحدیث تو اخلاص کے بیان سے گویا بھرا ہی ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ:۔

الا للہ الدین الخالص۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ:۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین

یہاں پر ایک بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ کسی کام میں شروع سے لیکر آخر تک مخلص رہنا

آسان ہے اسی طرح سے اخلاص کے بغیر بھی کسی کام کا کرنا نہایت آسان ہے خواہ کرنے والا بھی جانتا ہو کہ مجھ میں اخلاص نہیں ہے یا اخلاص نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اخلاص ہے بہرحال یہ دونوں درجے سہل ہیں مگر یہ کہ کسی کام کو اخلاص کے ساتھ شروع کیا ہو اور پھر درمیان میں نفس کی شرکت ہو جائے اور یہ اس کو پہچان لے اور پھر اس کی وجہ سے اس کام ہی کو چھوڑ دے یہ بات بہت مشکل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ سے ہم کو یہی سبق ملتا ہے اور آپ نے اسی صورت پر جو کہ مشکل ہے عمل کر کے دکھلا دیا کہ دیکھو اہل اخلاص ہر کام میں رضاء الٰہی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور یہی ان کا مقصود اس عمل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں اخلاص کی کمی کا شبہ ہوا بس فوراً ترک فرما دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ دشمن کو چھوڑ دینے میں ہماری ذلت ہوگی یا یہ کہ وہ چھوٹ کر کے کہیں ہم پر ہی نہ غالب آجائے مبادا کوئی تکلیف پہونچا دے یا قتل ہی کر دے۔ غرضکہ کسی بات کی آپ نے پرواہ نہیں کی بلکہ جس طرح سے اللہ تعالے کے لئے قتل و قتال کر رہے تھے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ترک جہاد بھی فرما دیا پس آپ جس طرح سے کہ فعل میں مخلص تھے اسی طرح سے ترک میں بھی مخلص ہی رہے کیونکہ مقصود ان حضرات کا اپنے ہر فعل سے رضاء الٰہی تھا اور وہ دونوں صورتوں میں حاصل رہا۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله یعنی جو شخص اس لئے مقاتلہ کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو تو یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور شرعاً محمود و مطلوب ہے اور اپنے نفس کے انتقام کے لئے جو جنگ اور قتال ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ فی سبیل اللہ نہ ہوگا بلکہ سبیل نفس ہوگا اس لئے حضرت علیؓ ایسے موقع پر جہاد سے رک گئے اس وقت یہی اخلاص تھا۔ اللہ اکبر کیسا کچھ اخلاص ہے کہ اتنے بڑے شخص ہو کر اس کافر کے سامنے اقرار کر رہے ہیں اور اپنے نفس کے عیب کو بیان فرما رہے ہیں کہ تیرے تھوکنے سے میرے نفس کو حرکت ہوئی اور میرا خلوص ختم ہونے لگا اور عمل سے

میرا مقصود وہی تھا وہی خلوص مجھے محبوب تھا اور مطلوب تھا جب وہی رخصت ہونے لگا تو پھر اس کام میں میرے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا اس لئے میں نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ دیکھتے ہیں آپ کیسے لوگ تھے؟ اب ان سب باتوں کو سن لینا تو آسان ہے مگر عمل کرنا بہت مشکل ہے چنانچہ اس مقابل نے بھی آپ کے اس جواب کو سنکر آپ کو پہچان لیا کہ اللہ اکبر کیسے مخلص شخص ہیں اور کس قدر خدا پرست لوگ ہیں اور یہ کہ ان لوگوں کی نیتیں کیسی عمدہ اور پاک ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے ہم لوگوں میں کتنے دنوں سے اسلام چلا آرہا ہے مگر اخلاص کی گفتگو تک کو نہیں سمجھتے بلکہ جب اخلاص کی بحث لوگوں سے کرتا ہوں تو نہایت تعجب سے سنتے ہیں ایسا کہ ان کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں جیسے ان کے کانوں میں کبھی پڑی نہیں۔ اخلاص کے ساتھ آج ہمارا تو اتنا تعلق رہ گیا ہے۔ اور وہ شخص کافر تھا مگر حضرت علیؓ نے جب اس سے یہ مضمون بیان کیا تو اس نے فوراً سمجھ لیا اور آپ کی اس بات سے آپ کی کمال للہیت اور خدا ترسی پر استدلال کیا اور بالآخر تمام خاندان کو لیکر مسلمان ہو گیا۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ شخص تلوار سے مسلمان ہوا تھا یا ترک تلوار سے۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا ہے بلکہ حضرات صحابہ کے اخلاص سے اور ان کے اخلاق سے پھیلا ہے۔ اس شخص نے اس بات کو سمجھا اور بصیرت کے ساتھ مسلمان ہوا حضرت علیؓ کا یہ واقعہ اخلاص کی نظیر بن گیا۔ اور قیامت تک کے لئے اس سے یہ مسئلہ نکالا جائے گا کہ جس طرح آدمی اخلاص کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے اور اس کی برکت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح سے بعض وقت اخلاص ہی سے کام ترک بھی کر دیا جاتا ہے اور چونکہ یہ بھی اخلاص سے ہوتا ہے اس لئے ترک میں بھی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

حضرت علیؓ کا یہ تاریخی واقعہ بہت مشہور ہے مگر اس میں لوگوں کی نظر اس پہلو پر جاتی ہے کہ حضرت علیؓ کی وجہ سے اتنے آدمی اسلام لے آئے۔ یہ بات بیشک بڑی ہے لیکن

اس نتیجہ کی جو بنا اور سبب ہے وہ اس سے زیادہ اہم ہے یعنی آپ کا خلوص اس پر نظر نہیں جاتی حالانکہ یہ سب برکتیں اسی کی تھیں حضرت علیؓ اپنے اس فعل سے لوگوں کو اخلاص سکھلا گئے اب قیامت تک جو شخص بھی اس کی وجہ سے اخلاص اختیار کرے گا حضرت علیؓ کو بھی اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ع

از علی آموز اخلاص عمل

اب بتایئے ایسے ایسے حضرات کے اخلاص کی برکتیں نہ ظاہر ہوں گی تو کیا ہماری ظاہر ہوں گی۔ ایک اور واقعہ سنیئے:۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مسلمانوں نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ۔ ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے اگر مطابق ہو جائے گا تو ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دینگے اور شہر تمھارے حوالہ کر دیں گے چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی اور آپ شام (بیت المقدس) کے لئے روانہ ہو گئے۔ بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اونٹ پر سوار تھے یہ دیکھ کر اسلامی سپہ سالاروں نے آپ سے درخواست کی کہ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں لہذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے مگر ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے پھول رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا اور یہ فرمایا کہ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام یعنی ہم ایسی قوم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ اللہ اکبر۔

دیکھئے کس قدر اخلاص تھا کہ باوجود اس کے کہ امیر المومنین ہیں اور مخالفین کے

مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں لیکن اچھے کپڑوں کی وجہ سے جب ذرا سی نفس کو حرکت ہوئی فوراً اس کو اُتار پھینکا اور کیا ٹھکانا ہے اس اخلاص کا کہ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے ماتحتوں سے یہ ظاہر بھی کر دیا کہ میرا نفس ان چیزوں سے پھولنے لگا تھا۔ یہ کام آسان نہیں ہے وہی شخص کر سکتا ہے جسکی نظر مخلوق سے بالکلیہ اٹھ چکی ہو اور خالق کی رضا جس کا نصب العین بن چکا ہو۔

حضرت عمرؓ نے تو محض اخلاق اور للہیت کیوجہ سے ایسا کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی برکات ظاہر فرمائیں۔ اس طرح سے کہ آپ جب قلعہ کے سامنے اسی ہیئت سے پہونچے تو مخالفین نے قلعہ کے اوپر سے آپ کے حلیہ کو اپنی کتاب سے منطبق کرنا شروع کیا چنانچہ طابق النعل بالنعل بعینہ یہی حلیہ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ ایسے ایسے کپڑے ہوں گے اور اونٹ پر سوار ہوں گے۔ بس اہل شہر نے اس کو دیکھتے ہی قلعہ کا دروازہ کھولدیا اور شہر مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ اب دیکھئے کہ حضرت عمرؓ نے اس قصد سے یہ نہیں کیا تھا کہ اس سے قلعہ فتح ہو جائے گا انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کی کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے اور انھوں نے اسی کو معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ تو آپ کے اخلاص کا ثمرہ تھا اور اس کی برکت تھی جو ظاہر ہوئی۔

ان دونوں واقعات سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ مخلصین کے اخلاص کو اس دنیا میں بھی ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ اس کے ثمرات اور برکات ضرور عطا فرماتے ہیں۔ اور سنیئے:۔

حضرت علیؓ نے ایک بار باریک کرتا پہنا پھر خود ہی اس کی آستین کو کاٹ کر کے اسکو عیب دار کر لیا اور فرمایا کہ اس کرتے کے پہننے سے مجھ میں عجب پیدا ہونے لگا تھا اس لئے میں نے اس کو عیب دار کر دیا۔ تو صاحب ان لوگوں کو نہ کرتا مقصود تھا اور نہ اونٹ اور نہ عمدہ کپڑے مقصود تھے اور نہ گھوڑے بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی نیت پختہ طور پر باندھی تھی۔ جہاں ذرا سا اخلاص کے خلاف سمجھا یا نفس کی آمیزش دیکھی بس اس موقع ہی کو ختم کر دیا اور اس سے علحدہ ہو گئے۔ ایک اور بزرگ کا واقعہ سنیئے:۔

Scanned with CamScanner

حضرت معروف کرخیؒ اپنے نفس کو مخاطب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ اے نفس! اخلاص اختیار کر خدا تعالیٰ کے یہاں رہائی پا جائے گا: بزرگان دین اپنے اخلاص کی تجدید کیا کرتے تھے۔ لوگ ہر چیز کی تو تجدید کرتے ہیں مگر اخلاص کی تجدید نہیں کرتے حالانکہ خدا تعالیٰ کے یہاں اخلاص ہی مطلوب ہے۔ اور تمام کام بھی اسی سے بنتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ سمجھئے کہ اخلاص پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اخلاص یونہی ایک دم سے نہیں پیدا ہوگا اور نہ اس کا اعلیٰ مقام اول ہی دن حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بس کام میں لگے رہو۔ چلے چلو انشاء اللہ تعالیٰ دھیرے دھیرے ایک دن کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ باقی جب تک کسی کام میں اخلاص کا ہونا یا نہ ہونا نہ معلوم ہو جائے تو خیر اس کام کو کرتے رہو لیکن جب کسی کام کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں اخلاص نہیں ہے تو اس کام کو تو چھوڑ ہی دینا چاہیئے جیسا کہ اسلاف کے واقعات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ بزرگوں نے اخلاص کی خوب خوب بحث کی ہے چنانچہ صاحب اخلاق محسنی نے اپنی کتاب میں اخلاص کا ایک باب ہی قائم فرمایا ہے اور اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

عمل کو ریاء اور اغراض سے پاک کرنا اور نیت کو خالص اللہ تعالیٰ کیلئے درست کرنا یہی اخلاص ہے ؎

ہر کہ باخلاص قدم می زند عیسیٔ وقت است کہ دم میزند

ترجمہ:۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ (طریق میں) قدم رکھتا ہے اسکو یوں سمجھو کہ وہ عیسیٔ وقت ہے جو کہ پھونک مار رہا ہے یعنی بہت بابرکت شخص ہے۔ اور جس طرح سے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قم باذن اللہ کہتے مردہ زندہ ہو جاتا تھا اسی طرح سے اس شخص کے کلام میں بھی تاثیر ہوگی جس سے قلوب زندہ ہونگے۔

جب یہ ہے تو چاہئے کہ ہر کام میں خدا تعالیٰ کو راضی رکھنے کی نیت کرے اور اپنے نفس کو دخل نہ دے کیونکہ اغراض نفسانی، اعمال حقانی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ حکایت ہے

Scanned with CamScanner

کہ خراسان کے ایک خلیفہ نے ایک مجرم کو سزا کا حکم دیا اس مجرم نے اسی اثناء میں خلیفہ کو گالی دینا شروع کیا خلیفہ نے فرمایا کہ اس کو آزاد اور رہا کردو...... ایک شخص نے پوچھا کہ اس وقت جبکہ وہ گستاخی کر کے مزید سزا کا مستحق تھا جہاں پناہ نے اسکو آزاد کردیا۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ میں اس کو محض اللہ تعالیٰ کے لئے تادیب کرتا تھا لیکن جب اس نے مجھ کو برا کہنا شروع کیا تو میرے نفس میں حرکت ہوئی اور انتقام کا جوش پیدا ہوا پس میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ جو کام اللہ سبحانہ کے لئے خالص تھا اس میں نفس کو دخل دوں اور اس کو شریک کرلوں کیونکہ یہ بات اخلاص کے خلاف ہے لہذا میں اس کی تادیب سے رک گیا۔

داعیۂ نفس چو بنمود رو معنیٔ اخلاص نماند اندرو

کار کز اخلاص نشد بہرہ ور ترک چناں کار سزاوار تر

ترجمہ:۔ نفس کا داعیہ جب ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کام میں اخلاص نہیں رہ جاتا۔ اور جس کام میں اخلاص نہ ہو تو ایسے کام کو ترک کردینا ہی بہتر ہے۔

آپ حضرات نے بزرگوں کے حالات اور واقعات میں۔ اخلاص کا اہتمام دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ جس نے بھی اخلاص اختیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسکے ثمرات اور برکات سے ضرور بالضرور اس کو نوازا ہے جب یہ ہے تو پھر میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ وقت نازک ہے تو کچھ کام کیجئے اور وہ کام یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچا ایمان لے آئیے اور نفس کو چھوڑ دیجئے: خدا تعالےٰ کی جانب متوجہ ہو جائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمارہے ہیں کہ لا تسلط علینا من لا یرحمنا یعنی اے پروردگار ہم پر ایسے لوگوں کو مسلط نہ فرمائیے جو ہم پر رحم نہ کریں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط کیا جاتا ہے۔ لہذا جب تک خدا کو راضی نہ کروگے کچھ نہ حاصل ہوگا۔

Scanned with CamScanner

آپ لوگ جو یہ اعمال کر رہے ہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں یہ ساری باتیں کچھ کم نہیں ہیں اسی میں اخلاص پیدا کر لیجئے پھر برکتیں دیکھئے۔

کوئی کام اگر آپ کے لئے مشکل نظر آتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کیلئے تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے تو مسائل حاضرہ پر بھی تو اسکو قدرت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت محدود نہیں ہے۔ ان اللہ بکل شیئ محیط۔ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت میں ہے ان اللہ علی کل شیئ قدیر اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

جب اس پر ہمارا ایمان ہے تو پھر تو معاملہ بالکل آسان ہے۔ کیسا ہی سخت سے سخت وقت کیوں نہ ہم پر پڑے ہمارے لئے راہ عمل متعین ہے وہ یہ کہ اخلاص اختیار کریں مخلص بندے بن جائیں اور اللہ تعالیٰ ہی سے اپنی حاجات کا سوال کریں اور ان ہی سے مصیبت سے نجات پانے کے لئے دعا کریں۔ مسلمانوں کا کام ہمیشہ اسی سے بنا ہے۔ اور یہ یقین رکھئے کہ مسلمان جو دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں نصوص میں تصریح موجود ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آخر آپ لوگ اتنی اتنی عبادتیں جو کرتے ہیں تو کیا یہ سب قبول نہیں ہوتیں؟ اگر قبول نہیں ہوتیں تو پھر کرتے کیوں ہیں؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ قبول ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی ہیں بس اسی طرح سے دعا کیا کیجئے وہ بھی قبول ہوگی۔ آپ لوگ دعا کرتے ہیں مگر انھیں کاموں میں جہاں اسباب مساعد دیکھتے ہیں اور جن امور میں سمجھتے ہیں کہ اسباب نامساعد ہیں وہاں دعا نہیں کرتے۔ غور کیجئے گا تو اس میں نفس کا چور پائیگا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو بھی معاذ اللہ اسباب کا محتاج سمجھتے ہیں اسی وجہ سے جہاں اسباب کو مساعد دیکھتے ہیں دعا کرتے ہیں اور جہاں نہیں وہاں نہیں کرتے یہ خیال ہوتا ہے کہ بھلا یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟ معاذ اللہ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ان کے نزدیک تو مشکل سی

مشکل، آسان تر ہے۔

حضرت زکریا ؑ بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں لیکن چونکہ نبی تھے اپنے لئے اولاد کی درخواست کی۔ دعا قبول ہو گئی۔ بلا اسباب کسی بات کا ہو جانا ہمارے لئے خرق عادت مگر اللہ تعالیٰ کو جس طرح سے اسباب کے ساتھ کسی چیز کو پیدا کر دینے پر قدرت ہے اسی طرح بدون اسباب کے بھی کسی چیز کو پیدا کر دینے پر قدرت ہے ان کے لئے دونوں برابر ہیں۔

پس مسلمانوں کے لئے پریشانی کے وقت میں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو راضی کیجئے اور انھیں سے سب چیزیں مانگئے۔ وہ دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں۔ ایک جج صاحب کہتے تھے کہ میرے والد صاحب وکالت کیا کرتے تھے۔ میں ان کے لئے تین چیزوں کی دعا کرتا تھا ایک یہ کہ یا اللہ میرے والد صاحب پیشۂ وکالت چھوڑ دیں، دوسرے یہ کہ حج کر آویں اور تیسرے یہ کہ فلاں بزرگ سے مرید ہو جاویں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تینوں دعائیں قبول فرمالیں یعنی والد صاحب نے وکالت بھی چھوڑ دیا۔ حج بھی کر آئے اور ان بزرگ سے بیعت بھی ہو گئے میں کہتا ہوں کہ بھائی دعا کی قبولیت کوئی جج اور وکیل کے ساتھ تو خاص نہیں ہے آپ بھی دل لگا کر دعا کیجئے آپ کی بھی دعا قبول ہو گی۔

اہل مکہ میں سے جو مسلمان ضعف کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے اور مکہ میں کفار ان کو طرح طرح سے ایذاء دیتے تھے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ہی مدد چاہی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قرآن شریف میں بیان بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے یوں کہا کہ :۔

وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۔ یعنی اپنے پاس سے ہمارا کوئی دوست اور مددگار بنا دیجئے۔

چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا نصیر بنا کر بھیجا اور آپ نے مکہ فتح فرمایا۔ جب بندہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے اور دعا میں جس قدر رجاء (امید قبولیت) زیادہ ہوتی ہے اتنی وہ مقبول ہوتی ہے۔ ہم اگر کچھ نہیں کر سکتے تو دعا تو کر سکتے ہیں اور اس میں اخلاص تو پیدا کر سکتے ہیں اپنے اختیار میں جتنا کام ہو اسکو تو کر ہی لینا چاہیئے۔

ایک بزرگ ایک مسجد میں نماز پڑھنے گئے دیکھا کہ مسجد بالکل ویران ہے بستی کے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی کہ لوگ نماز میں کیوں نہیں آتے لوگوں نے بتایا کہ اس بستی میں فلاں شخص بڑا با اثر ہے اگر وہ نماز پڑھنے لگے تو بہت سے لوگ نمازی ہو جائیں یہ سنکر وہ بزرگ اس شخص کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے کہا کہ میں داڑھی چڑھاتا ہوں اور بار بار وضو کرنے میں مجھے داڑھی کھولنی پڑتی ہے اور پھر باندھنا پڑتا ہے اس میں مشقت ہوتی ہے اس لئے میں نماز ہی نہیں پڑھتا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی جب وضو کرنے میں دشواری ہوتی ہے تو تم بلا وضو ہی کے پڑھ لیا کرو چنانچہ اس کو نماز کے لئے آمادہ کر کے مسجد میں لا کھڑا کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میرے اختیار میں بس اتنا ہی تھا کہ تیرے سامنے کھڑا کر دیا اب ان کے دل کا پھیرنا آپ کے اختیار میں ہے چنانچہ دعا قبول ہو گئی۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس شخص نے سوچا کہ جب ہم اتنی محنت کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ایک مولوی کے کہنے سے بے وضو ہی پڑھ رہے ہیں تو کیوں نہ اللہ تعالیٰ کا حکم مان کر وضو بھی کر لیا کریں تاکہ نماز کا ثواب تو ملا کرے چنانچہ وہ شخص با وضو نماز پڑھنے کا پابند ہی ہو گیا۔

دیکھا آپ نے دعائیں کس طرح قبول ہوتی ہیں۔ اس بات کا ہم سب کو یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ جتنی باتیں پریشانی کی ہوتی ہیں یہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے سبب سے ہیں۔ دشمن کی ناراضگی کی وجہ سے نہیں ہیں۔ دشمن کی رضا یا ناراضگی تو کوئی چیز نہیں ہے سہ

گو ہوا دشمن زمانہ ہو مگر اے دل ہمیں
دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

اخلاص پر اس قدر کلام کر چکنے کے بعد اب آخر میں جی چاہتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیتوں کی تفسیر بیان کر کے اسی پر اس رسالہ کو ختم کردوں اور انہی دو آیتوں کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے آج ہم بھی انھیں حالات سے دوچار ہیں اس لئے ہمارے لئے ان میں عبرت اور نصیحت کا سبق موجود ہے اور اخلاص سے کچھ غیر مربوط بھی نہیں ہے بلکہ اس کے مناسب ہے اس لئے کہ مخلص کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے حالات کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ان کو قرآن کریم پر ہر وقت منطبق کرتا رہے تاکہ جس وقت کے مناسب جو تعلیم اسکو ملے اسپر عمل کرے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا جو قصہ بیان فرمایا ہے چونکہ ہمارے نقد حال کے مطابق ہے اس لئے مولانا رومؒ کے یہ اشعار اس موقع کے بالکل مناسب ہیں فرماتے ہیں ؎

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں — خود حقیقت نقد حالِ ماست آں
نقد حالِ خویش را گر پے بریم — ہم ز دنیا ہم ز عقبیٰ بر خوریم
ایں حقیقت را شنو از گوشِ دل — تا بروں آئی بکلی زآب و گل
فہم گر دآرید جا نزادہ دہید — بعد ازاں از شوق پا در رہ نہید

ترجمہ:۔ یعنی اے دوستو! یہ داستان سنو کہ واقع میں ہماری ہی حالت کے مطابق ہے اگر ہم اپنی موجودہ حالت میں غور و فکر کرتے رہا کریں تو دونوں جہاں کا ہم کو نفع حاصل ہو اس واقعہ کو دل کے کان سے سنو تاکہ دنیوی تعلقات (مصائب و پریشانیوں) سے

تکمیل خلاصی پا جاؤ۔ فہم کو مجتمع و یکسو کرو اور دل کو متوجہ کرو اس کے بعد ذوق و شوق کے ساتھ راہ میں قدم رکھو۔

اب پہلے میں آپ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کرتا ہوں پھر اس کا ترجمہ کر کے مفسرین کے اقوال سے اس کی تفسیر و تشریح کروں گا اور آخر میں ان آیات میں ہمارے لئے جو عبرت اور سبق ہے اس کو بیان کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورہ اسراء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے واقعہ سے شروع فرمایا اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دیئے جانے کا ذکر فرمایا ہے جس کے لئے آپ کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے یہ گویا آپ کی معراج تھی ان ہر دو معراج کا ذکر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یعنی توریت وغیرہ میں یہ بات بطور پیشین گوئی کے بتلادی تھی کہ تم سرزمین شام میں دوبار گناہوں کی کثرت کر کے خرابی کرو گے اور دوسروں پر بھی بڑا زور چلانے لگو گے (گویا حقوق اللہ اور حقوق العباد سب ہی ضائع کرو گے) پھر جب ان دو باروں میں پہلی بار کے وعدہ کا وقت آئیگا تو ہم تمہاری سزا کیلئے تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے جنگجو ہونگے پھر وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑینگے اور تمہارا قتل و غارت کریں گے یہ وعدہ سزا ایک ایسا وعدہ ہے جو ضرور ہو کر رہیگا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا

پھر جب تم نادم و تائب ہو گے تو ہم پھر ان پر تمہارا غلبہ کر دیں گے اور مال اور بیٹوں سے ہم تمہاری امداد کریں گے اور ہم تمہاری جماعت کو بڑھا دیں گے (اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ) اگر آئندہ اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کیلئے اچھے کام کرو گے اور اگر پھر برے کام کرنے لگو گے تو بھی اپنے ہی لئے کرو گے۔ پھر جب ان دو باروں میں سے آخری بار کی سزا کے وعدہ کا وقت آئے گا تو پھر ہم دوسروں کو تم پر مسلط کر دیں گے تاکہ تم کو مار مار

تَتْبِيرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ کر اتنا رنج وغم پہونچائیں کہ تمہارا منہ بگاڑ دیں یعنی آثار غم تمہارے
وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا چہروں پر نمایاں ہو جائیں اور جس طرح سے وہ پہلے لوگ مسجد میں گھسے
جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب
کو ہلاک و تباہ اور برباد کر ڈالیں (اور اس کتاب میں ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے بعد بھی) عجب نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے (اور تم کو ادبار اور ذلت سے بچائے) اور اگر تم پھر وہی شرارت کروگے تو ہم بھی پھر وہی سزا کا برتاؤ کریں گے۔ یہ تو دنیا میں ہوگا اور ہم نے آخرت میں ایسے کافروں کا جیل خانہ جہنم کو بنا رکھا ہے۔

ان آیات میں حق تعالیٰ سبحانہ نے بنی اسرائیل کا حال بیان فرمایا ہے کہ ان کو بطور پیشین گوئی کے از روئے شفقت بہت پہلے سے یہ بات بتلا دی گئی تھی کہ تم ارض شام میں دو بار فساد کروگے اور ہر بار ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو تم کو قتل کریں گے اور تمہیں تہس نہس کر کے رکھ دیں گے تم کو غلام بنائیں گے اور ہر طرح سے تمہاری اہانت، تذلیل اور تحقیر کریں گے اور اس جسمانی عذاب کے ساتھ ساتھ روحانی اذیت بھی تم کو پہنچائیں گے یعنی تمہارے گھروں میں گھسنے کے ساتھ ساتھ وہ تمہاری مساجد اور عبادت خانوں میں بھی گھس جائیں گے اور اس کی بے حرمتی کریں گے۔ یہ سب پہلے سے اس لئے بتا دیا تھا کہ شاید وقت پر کسی کو ہوش آجائے اور لوگ فساد سے باز رہیں۔

لیکن ہوا وہی جو مقدر منجانب اللہ تھا یعنی انھوں نے فساد کیا اور کتاب اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا محارم اللہ کا ارتکاب کیا اور انتہا یہ کر دی کہ ان صلحائے امت بلکہ انبیاء علیہم السلام تک کو قتل کیا جو کہ ان کے کسی دنیوی معاملہ میں دخل بھی نہ دیتے تھے۔ اور قوم کے مشاغل سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے چونکہ انبیاء اور صلحاء کی اس قسم کی تحقیر اور ایذا رسانی اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر عتاب ہوا لیکن اس کے بعد بھی حسب وعدہ ندامت اور توبہ کے بعد درمیان میں معافی

بھی ہوتی رہی چنانچہ پہلے فساد کے بعد ان سے کہدیا گیا تھا کہ ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساءتم فلھا اور آخر میں یہ کہہ کر نصیحت ختم فرمائی کہ عسٰی ربکم ان یرحمکم ای ان تبتم وان عدتم عدنا یعنی معاملہ کچھ ان دو ہی مرتبہ کے ساتھ خاص نہ ہوگا بلکہ اگر تم پھر فساد کی طرف لوٹو گے تو ہم بھی پھر عقوبت کی طرف لوٹیں گے۔

غرضکہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ قرآن شریف میں جو بیان کیا گیا ہے تو مقصود اس سے یہ ہے کہ امت محمدیہ کے لئے عبرت کا سامان مہیا کیا جائے تاکہ یہ لوگ اس کو نظر اعتبار سے دیکھیں اور اسباب عروج اقوام اختیار کریں اور اسباب زوال امم سے اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے لئے جو صفات جالب ہیں ان کے ساتھ متصف ہوں اور جو خصال کے موجب غضب وسخط الٰہی ہیں ان کو ترک کریں۔

پھر قرآن شریف میں ایک ہی کیا ایسے ایسے بیشمار واقعات کا ذکر ہے جنھیں ایام اللہ کہا جاتا ہے اور یہ تذکیر بایام اللہ بھی قرآن شریف کے اہم مقاصد میں سے ہے اور اس کا ایک مہتم بالشان مضمون وموضوع ہے اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے قرآن شریف میں صالحین کے واقعات اور ان پر ان کی طاعات کیوجہ سے جو انعام فرمایا ہے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح سے طالحین کے حالات اور ان کی نافرمانی کے سبب ان کو جو سزائیں دی ہیں انکا بھی بیان فرمایا ہے تاکہ بعد والوں کو اس سے عبرت ونصیحت ہو۔

بنی اسرائیل کا یہ واقعہ جسکی تفصیل میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں بعد میں آنیوالوں کے لئے نہایت ہی عبرت کا واقعہ ہے۔ معلوم نہیں کتنے اللہ کے بندوں نے انھیں ایام اللہ سے بڑی بڑی عبرت حاصل کی ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں نے انھیں واقعات کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی کے نازک اور اہم مواقع پر اپنے کو سنبھال لیا ہے۔ اسی لئے جی چاہا کہ اس واقعہ کو کسی قدر مفصل بیان کردیا جائے تاکہ جب بھی مسلمان ان حالات سے دوچار ہوں تو ان کے لئے قرآن شریف کا تبلایا ہوا یہ قلمی علاج سبب شفا بن سکے اور ان کے لئے واقعات

جاننے کے بعد اپنے حالات کا ان کے حالات سے مقابلہ اور موازنہ آسان ہوجائے۔ کیونکہ بنی اسرائیل اہل کتاب اور نبی زادے تھے لیکن جب انھوں نے نافرمانی کی اور فساد کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں سزا دی اسی طرح سے یہ امت بھی اگر کبھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی خلاف ورزی کرنے لگ جائے اور دین شریعت سے بغاوت اور سرکشی پر کمربستہ ہوجائے جیسا کہ فی زماننا مشاہد ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے قانون ان عدتم عدنا سے یہی کیوں مستثنیٰ رہے گی؟

قرآن شریف میں یہ واقعہ اگرچہ منصوص ہے لیکن چونکہ قرآن شریف کا بیان مختصر ہوتا ہے کہ اہل علم ہی اگر اللہ تعالیٰ کے منشاء اور مراد کو اس سے سمجھ لیں تو بڑی بات ہے تا بعوام چہ رسد اور گو مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسکو مفصل بیان فرمایا ہے مگر ہر شخص کو تفاسیر کہاں میسر؟ اس لئے اکابر مفسرین کے کلام سے ان آیات کا مفصل مطلب اور اسکی واضح شرح بیان کرتا ہوں تاکہ شاید کسی اللہ کے بندہ کو اس سے کچھ نفع پہنچ جائے۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ :-

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب ای اوحینا الیھم وحیًا مقضیًا مبتوتًا۔ (بیضاوی کامل ص ۲۶۶)

وقضینا الی بنی اسرائیل کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انکی جانب ایک اپنے طے شدہ اور قطعی وحتمی فیصلہ کی وحی فرمائی یعنی یہ کہ یہ امر قضا الٰہی میں بلاشک وتردد کے مقرر ومقدر ہوچکا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔

اسی کے متعلق صاحب ابن کثیر فرماتے ہیں کہ :-

ای تقدمنا الیھم واخبرھم فی الکتاب الذی انزلہ علیھم انھم یفسدون فی الارض مرتین ویعلون علوًا کبیرًا ای یتجبرون ویطغون ویفجرون علی الناس (ابن کثیر ص ۲۵ ج ۳)

یعنی توراۃ میں پہلے ہی سے یہ نازل فرمادیا تھا اور انکو اس کتاب میں جو ان پر نازل ہوئی تھی یہ خبر دیدی تھی کہ یہ لوگ زمین میں دو بار فساد مچائیں گے اور دوسرے لوگوں پر زور دکھائیں گے۔ طغیانی اور سرکشی کریں گے اور فسق وفجور کا بازار لوگوں میں گرم کریں گے۔

چنانچہ صاحب جلالین لکھتے ہیں کہ :۔

لتفسدن فی الارض مرتین	یعنی تم زمین میں دو بار فساد مچاؤ گے اور بڑی بغاوت اور
ولتعلن علواً کبیراً ای تبغون بغیاً	سرکشی پر کمربستہ ہو جاؤ گے۔
عظیماً (جلالین)	

صاحب روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ :۔

لتفسدن بانفسکم بارتکاب المعاصی	یعنی تم اپنے نفوس کو ارتکاب معاصی کرکے فاسد اور
ولتعلن علواً کبیراً ای لتستکبرون عن	تباہ کرو گے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت سے روگردانی اور تکبر
طاعۃ اللہ تعالی۔ اولتغلبن الناس	کرو گے۔
بالظلم والعدوان وتفرطن فی ذلک	یا لوگوں پر ظلم و زیادتی کرکے ان پر غلبہ حاصل کرو گے اور اس
افراطاً مجاوزاً للحد۔ (روح المعانی)	سلسلہ میں اسقدر افراط سے کام لو گے کہ حد سے تجاوز کر جاؤ گے۔

نیز مرتین کی شرح فرماتے ہوئے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ :۔

مرتین ای افسادتین اولاھما ان	مرتین یعنی دو بار فساد مچاؤ گے چنانچہ ایک تو یہ تھا کہ
خالفوا احکام التوراۃ ورکبوا المحارم وقتلوا	انھوں نے احکام تورات کی مخالفت کی اور محارم کا ارتکاب کیا
شعیا بن امضیا علیہ السلام وثانیتھما	اور حضرت شعیاءؑ کو قتل کر دیا۔ اور دوسرا فساد یہ تھا کہ حضرت
ان قتلوا زکریا ویحیی وقصد وا قتل عیسی	زکریاؑ اور یحییٰؑ کو قتل کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل
علیھم السلام وقیل اولاھما قتل زکریا و	کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ پہلا فساد تو
ثانیتھما قتل یحیی وقصد قتل عیسی	قتل زکریاؑ تھا اور دوسرا قتل یحییٰ اور قصد قتل عیسیٰؑ
علیھم السلام۔	تھا۔

صاحب روح المعانی مرتین کے تحت لکھتے ہیں کہ :۔

والمراد افسادتین اولاھما علی ما نقل	مراد ان دو فسادوں میں سے پہلے سے جیسا کہ سدی نے

Scanned with CamScanner

السدی عن اشیاخہ قتل زکریا علیہ السلام وروی ذلک عن ابن عباسؓ وابن مسعودؓ وذلک انہ لما مات صدیقۃ ملکھم تنافسوا علی الملک وقتل بعضھم بعضا ولم یسمعوا من زکریا فقال اللہ تعالیٰ لہٗ قم فی قومک اوح علی لسانک فلما فرغ مما اوحی علیہ عدوا علیہ لیقتلوہ فھرب فانفلقت لہ شجرۃ فدخل فیھا وادرکہ الشیطان فاخذ ھدبتہ من ثوبہ فاراھم ایاھا فوضعوا المنشار فی وسط الشجرۃ حتی قطعوہ فی وسطھا۔	اپنے مشائخ سے نقل کیا ہے قتل زکریاؑ ہے اور یہی ابن عباس اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے اور اس کا واقعہ یوں ہوا تھا کہ جب ان کے بادشاہ صدیقۃ کا انتقال ہوا تو ہر ایک کو ملک کی ہوس ہوئی چنانچہ آپس میں خوب خانہ جنگی ہوئی اور حضرت زکریاؑ کی نصیحت کو قوم نے نہیں قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اپنی قوم کو جمع کرو اور وعظ کے لئے کھڑے ہو اور میں تمہاری زبان پر بولوں گا چنانچہ جب حضرت زکریا علیہ السلام وحی سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا تاکہ آپ کو قتل کریں آپ بھاگے اور ایک درخت کے پاس سے گذرے وہ پھٹ گیا آپ اسی میں گھس گئے شیطان نے آپ کا تعاقب کیا۔ آپ کے کپڑے کا ذرا سا پھندنا لٹک رہا تھا اس کو پکڑ کر قوم کو دکھلایا کہ دیکھو یہ ہیں زکریا۔ لوگوں نے بیچوں بیچ میں آرہ رکھ کر اس درخت کو چیر دیا یہاں تک کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔
وقیل سبب قتلہ انھم اتھموہ بمریمؑ قیل قالوا حین حملت ضیع بنت سیدنا حتی زنت فقطعوہ بالمنشار فی الشجرۃ۔	ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قتل کا سبب یہ ہوا تھا کہ لوگوں نے آپ کو حضرت مریمؑ کے ساتھ متہم کیا تھا چنانچہ جب وہ حاملہ ہوئیں تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے سید کی لڑکی زنا کر کے خراب ہو گئی اس لئے انکو درخت کے اندر ہی آرے سے چیر دیا۔
وقال ابن اسحاق ھی قتل شعیاء وقد بعث بعد موسیٰ علیہ السلام فلما بلغھم الوحی ارادوا قتلہ فھرب فقتل وھو صاحب الشجرۃ۔ وزکریا	اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ پہلا فساد حضرت شعیاؑ کا قتل تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی بنا کر بھیجے گئے تھے جب انھوں نے قوم کو وحی پہونچائی تو قوم نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ آپ بھاگے اور پھر وہی درخت کا واقعہ ہوا چنانچہ آپ ہی

Scanned with CamScanner

علیہ السلام مات موتا ولم یقتل۔ صاحب شجرہ ہیں اور زکریا علیہ السلام نے تو اپنی موت طبعی سے انتقال فرمایا وہ قتل نہیں کئے گئے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(روح المعانی صـ۱۳ پ ۱۵)

بنی اسرائیل کا پہلا فساد جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا احکام توریت کی مخالفت۔ محارم کا ارتکاب اور صلحاء امت اور انبیاء علیہم السلام کا قتل تھا اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر اور اس کے اصحاب کو مسلط فرمادیا۔ اور دوسرا فساد ان کا قتل زکریا و یحییٰ علیہما السلام اور قصد قتل عیسیٰ علیہ السلام تھا جو پہلے سے بھی زیادہ اشد تھا اس لئے حق تعالیٰ کی جانب سے بھی اس کی جو سزا ان کو دی گئی وہ پہلی سے زیادہ اشد و اعظم تھی۔ اس کی جو تفصیل تفسیر مظہری میں بغوی کے حوالہ سے قاضی صاحبؒ نے نقل فرمائی ہے وہ یہاں بعینہ درج کرتا ہوں بڑے ہی عبرت و نصیحت کا واقعہ ہے۔ ہر مسلمان کو جس کا ایمان قرآن شریف پر ہو ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ایک طویل روایت نقل فرماتے ہوئے صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ:۔

فلما رفع اللہ عیسیٰ من بین اظہرھم وقتلوا یحیی بعث اللہ علیہم ملکا من ملوک بابل یقال لہ خردوش فسار الیہم باھل بابل حتی دخل علیہم الشام فلما ظہر علیہم امر رأسا من رؤس جنودہ یدعی بیورزاذان صاحب الفیل فقال انی قد کنت حلفت بالھی لئن اظفرت علی اھل بیت المقدس لاقتلنھم حتی تسیل دماؤھم

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے درمیان سے اٹھا لیا اور انھوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کردیا تو اللہ تعالیٰ نے بابل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو جس کا نام خردوش تھا ان پر مسلط کردیا چنانچہ وہ اہل بابل کو لیکر ان کی طرف آیا اور حدود شام میں داخل ہوگیا۔ اور جب غالب آگیا تو اپنے لشکر کے ایک سردار سے جس کا نام بیورزاذان تھا اور وہ ہاتھی والا تھا۔ کہا کہ میں نے خدا کی قسم کھائی ہے کہ اگر میں بیت المقدس والوں پر فتح پا گیا تو ضرور بالضرور ان میں سے ایک ایک کو چن چن کر قتل کروں گا۔

یہاں تک کہ ان کا خون میرے لشکر کے درمیان سے ہوکر بہے سوا اس کے کہ ان میں کا کوئی فرد رہ ہی نہ جائے سو یہ اور بات ہے۔

فی وسط عسکری الا ان لا اجد احداً
قتلہ۔ فامرہ ان یقتلھم حتی یبلغ
ذلک منھم وان بیورزاذان دخل
بیت المقدس فقام فی البقعۃ
التی کانوا یقربون فیھا قربانھم فوجد
فیھا دما یغلی فسألھم فقال یا بنی
اسرائیل ما شان ھذا الدم یغلی
اخبرونی خبرہ قال ھذا دم قربان لنا
قربناہ فلم یقبل لنا فلذلک یغلی
ولقد قربنا منذ ثمان مائۃ سنۃ القربان
فیقبل منا الا ھذا۔ فقال ما صدقتمونی
قالوا لوکان کاول زماننا لیقبل منا
ولکن قد انقطع منا الملک والنبوۃ
والوحی فلذلک لم یقبل منا۔ فذبح
منھم بیورزاذان علی ذلک الدم
سبعمائۃ وسبعین زوجا من رؤسھم
فلم یھدأ فامر فاتی سبعمائۃ غلام
من غلمانھم فذبحھم علی الدم
فلم یبرد فلما رأی بیورزاذان ان الدم
لا یھدأ قال لھم یا بنی اسرائیل ویلکم
اصدقونی ـــ واصبروا علی امر

پس اس کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو قتل کرے تاکہ میری قسم پوری
ہوجائے ادھر یہ ہوا کہ بیورزاذان بیت المقدس میں داخل ہوا
اور اس جگہ کھڑا ہوا جہاں لوگ اپنی قربانی ذبح کیا کرتے تھے تو
دیکھتا کیا ہے کہ ایک جگہ سے خون ابل رہا ہے۔

دریافت کیا کہ اے بنی اسرائیل! یہ خون کیسا ہے؟ مجھے اس
کے واقعہ سے باخبر کرو، ان لوگوں نے بات بناتے ہوئے کہا کہ
یہ ہماری ایک قربانی کا خون ہے جس سے ہم نے اللہ تعالیٰ کا
تقرب حاصل کیا تھا مگر وہ قبول نہیں ہوئی اس لئے آج
تقریباً آٹھ سو سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ یہ اسی طرح سے ابل رہا
رہا ہے اور ہماری قربانیاں قبول ہوئیں بجز اسکے یہ سن کر بیورزاذان
نے کہا کہ تم لوگوں نے مجھ سے صحیح بات نہیں بیان کی بلکہ واقعہ
کو چھپایا ہے لوگوں نے پھر کہا کہ اگر ہمارا پہلا زمانہ ہوتا تو قبول
ہوجاتی مگر مشکل یہ ہے کہ اب ہم میں نہ سلطنت رہ گئی اور نہ
نبوت ہی باقی رہی اور وحی آنی بھی بند ہوگئی ہے یہ وجہ ہے
قبول نہ ہوسکی۔ بیورزاذان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تو اس نے
یہ کیا کہ اسی خون پر سات سو جوڑے ان کے سرداروں کے ذبح کئے
مگر خون اب بھی بند نہ ہوا تو اس نے سات سو نوجوانوں کے ذبح
کئے جانے کا حکم دیا چنانچہ انھیں بھی اسی خون پر ذبح کیا گیا مگر
اس کا جوش اب بھی فرو نہ ہوا تو جب بیورزاذان نے دیکھا کہ یہ
خون کسی طرح تھمتا ہی نہیں تو اس نے قوم کو مخاطب کرکے کہا

ربکم فقد طال ماملکتم فی الارض تفعلون فیہا ماشئتم قبل ان لا اترک منکم نافخ نار ذکر ولا انثیٰ الا قتلتہ۔

کہ اے بنی اسرائیل! تمہارے لئے ہلاکت ہو سچ سچ جو بات ہو کہدو اور اپنے رب کی تقدیر پر صابر و شاکر رہو تمہاری حکومت تو بہت دنوں تک رہ چکی ہے ایسی کہ تم جو چاہتے تھے کرتے تھے) اب تمہاری سزا ہے لہذا صحیح واقعہ بیان کردو قبل اسکے کہ میں تمہاری قوم میں سے ایک فرد کو بھی چھوڑ دوں نہ مرد کو نہ عورت کو کہ جس کو قتل نہ کردوں۔

فلما راوا الجہد وشدۃ القتل صدقوا الخبر فقالوا ان ھذا دم نبی کان ینہانا عن امور کثیرۃ من سخط اللہ فلو اطعناہ فیہا لکان ارشد لنا وکان یخبرنا بامرکم فلم نصدقہ فقتلناہ فہذا دمہ۔

جب بنی اسرائیل نے اسکی یہ سختی اور اپنی یہ مشقت دیکھی اور سمجھ لیا کہ اب تو ہم ختم ہی ہوجائیں گے تو سچی بات کہدی یعنی کہا کہ یہ ایک نبی کا خون ہے جو ہم کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے بہت سے کاموں سے منع فرماتے تھے اور ہم ان کی نہ سنتے تھے کاش ہم انکی اطاعت کر لئے ہوتے تو ہمارے لئے زیادہ اچھا ہوتا اور یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا اور افسوس انھوں نے تمہارے اس واقعہ کی بھی خبر ہمیں دی تھی مگر ہمیں تو نشہ ہی کچھ اور سوار تھا ہم نے انکی تصدیق نہ کی اور انکو قتل کردیا یہ انھیں کا خون ہے۔

قال بیورزاذان ما کان اسمہ قالوا یحیی بن زکریا قال الآن صدقتمونی لمثل ھذا ینتقم ربکم منکم۔ فلما رائ بیورزاذان انہم صدقوہ خر ساجداً وقال لمن حولہ اغلقوا ابواب المدینۃ واخرجوا من کان ھہنا من جیش خردوش وخلا فی بنی اسرائیل وقال یا یحیی بن زکریا

بیورزاذان نے پوچھا کہ ان کا نام کیا تھا کہا یحییٰ بن زکریا۔ اس نے کہا ہاں اب تم نے سچ کہا ہے۔ اسی جیسی ہستی کا انتقام تم سے تمہارا رب لے رہا ہے جب بیورزاذان نے دیکھا کہ انھوں نے سچا سچا واقعہ بیان کردیا تو سجدہ میں گر گیا اور اپنے ارد گرد والوں سے کہا کہ شہر کے تمام دروازے بند کردو اور خردوش کے لشکر کے جو لوگ ہوں ان کو باہر کردو اور بنی اسرائیل کے ساتھ تنہائی اختیار کرکے خون یحییٰؑ کو مخاطب کرکے کہا کہ اے یحییٰ بن زکریا میرے رب نے اور آپ کے رب نے جان لیا اسکو جو آپ کی وجہ سے آپ کی قوم کو پہونچا اور جتنے لوگ کہ ان میں سے قتل ہوگئے لہذا اپنے رب کے حکم سے

Scanned with CamScanner

قد علم ربي وربك ما اصاب
قومك من اجلك۔
وما قتل منهم فاهدأ باذن
ربك قبل ان لا ابقي من قومك
احدًا فهدأ الدم باذن الله ورفع
بيورزاذان عنهم القتل وقال امنت بما
آمنت به بنو اسرائيل وايقنت انه
لا رب غيره وقال لبني اسرائيل ان
خردوش امرني اقتل منكم حتى
تسيل دماءكم وسط عسكره
واني لست استطيع ان اعصيه
قالوا له افعل ما امرت به فامرهم
فحفروا خندقا وامر باموالهم
من الخيل والبغال والحمير والابل
والبقر والغنم فذبحها حتى سال
الدم في العسكر وامر بالقتلى الذين
قتلوا قبل ذلك فطرحوا على ما
قتل من مواشيهم فلن يظن
خردوش الا ان ما في الخندق
من بني اسرائيل فلما بلغ الدم عسكره
ارسل الى بيورزاذان ان ارفع عنهم

اب رک جا۔
ورنہ انجام یہ ہوگا کہ میں آپ کی اس قوم میں سے ایک فرد بشر
کو بھی بغیر قتل کئے نہ رہوں گا۔ جب اس نے یہ کہا تو خون اللہ تعالیٰ
کے حکم سے ٹھہر گیا اور بیورزاذان نے ان کا قتل بند کر دیا اور کہا
کہ میں اس پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے
ہیں اور میں نے یقین کیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں ہے۔
اور بنی اسرائیل سے کہا کہ خردوش نے تو مجھے حکم دیا ہے کہ
میں تم کو قتل کرتا رہوں یہاں تک کہ تمہارا خون اس کے لشکر تک
بہ کر پہونچ جائے اور میں اس کے حکم کے خلاف کرنے کی اپنے
اندر طاقت بھی نہیں پاتا۔ لوگوں نے کہا کہ پھر جو حکم آپ کو ملا
وہ کیجئے۔ پس اس نے ان لوگوں کو خندق کھودنے کا حکم دیا
لوگوں نے خندق کھودی پھر اس نے یہ کیا کہ ان کے گھوڑے
خچر۔ گدھے۔ اونٹ۔ گائے بیل۔ بھیڑ۔ بکری سب مویشی جمع
کرا کے سب کو ذبح کیا یہاں تک کہ خون لشکر تک بہ گیا۔
اور اب تک جتنے لوگوں کو قتل کیا تھا ان کی لاشوں کو منگوا کر
ان ذبح کئے جانوروں کے اوپر اسی خندق میں ڈال دیا۔ جس
کا فائدہ یہ ہوا کہ خردوش نے یہ سمجھا کہ خندق میں سب بنی اسرائیل
ہی کی لاشیں پڑی ہیں۔ چنانچہ جب خون بہ کر لشکر تک پہونچ
گیا تو اس نے بیورزاذان کے پاس کہلا بھیجا کہ اب کوئی قتل
نہ کرو بس کر دو۔

Scanned with CamScanner

القتل ثم انصرف الی بابل وقد افنی بنی اسرائیل او کاد یفنیهم وهی الوقعة الاخیرة التی انزل الله لبنی اسرائیل فقوله تعالیٰ لتفسدن فی الارض مرتین فکانت الوقعة الاولیٰ بخت نصر وجنوده والاخریٰ خردوش وجنوده وکانت اعظم الوقعتین

پھر بابل واپس ہوگیا درآنحالیکہ یہاں بنی اسرائیل کا خاتمہ ہی ہوچکا تھا یا وہ لوگ قریب بہ ختم کے ہوگئے تھے اور یہی وہ دوسرا واقعہ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد لتفسدن فی الارض مرتین میں کا پہلا واقعہ تو بخت نصر اور اس کے لشکریوں کا واقعہ تھا اور دوسرا واقعہ یہ خردوش اور اس کے لشکریوں کا ہوا۔

اور یہ واقعہ پہلے سے بھی زیادہ شدید تھا۔

فلم تقم بعد ذلک لهم رأیة وانتقل الملک بالشام ونواحیها الی الروم والیونانیة الا ان بقایا بنی اسرائیل کثروا وکانت لهم الریاسة ببیت المقدس ونواحیها علیٰ غیر وجه الملک وکانوا فی نعمة الیٰ ان بدلوا واحدثوا الاحداث فسلط الله علیهم طیطوس بن اسیانوس الرومی فاخرب بلادهم وطردهم عنها و نزع الله عنهم الملک و

اس کے بعد پھر بنی اسرائیل کا پرچم نہیں اڑا اور ان کا ملک شام اور اس کے اطراف سے لیکر روم اور یونان کی طرف منتقل ہوگیا مگر یہ کہ بنی اسرائیل کے باقی ماندہ لوگوں کی نسل بڑھی اور ان کا تسلط بیت المقدس اور اس کے اطراف میں ہوگیا۔ مگر بادشاہت کے طور پر نہیں بلکہ یونہی خوشحال رہے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے کو پھر بدل ڈالا اور نئی نئی بدعات جاری کیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طیطوس بن اسیانوس رومی کو مسلط فرمادیا جس نے ان کے دیار کو تباہ و برباد کیا اور ان کو اس سے نکال پھینکا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ملک اور ریاست پھر سلب فرمالی اور ان پر ذلت و مسکنت لازم کردی۔ پس جس قوم میں بھی یہ اس کے

Scanned with CamScanner

الریاسۃ وضرب علیھم الذلۃ
فلبسوا فی اتہ الاد علیھم الصغار
والجزیۃ و بقی بیت المقدس
خرابًا الی ایام عمر بن الخطاب رض
فعمرہ المسلمون بامرہ

وذکر السدی باسنادہ ان رجلاً
من بنی اسرائیل رأی فی النوم ان
خراب بیت المقدس علی یدی غلام
یتیم ابن ارملۃ بابل یدعی بخت نصر
وکانوا یصدقون فتصدق رؤیاھم
فاقبل یسئل عنہ حتی نزل علی امہ
وھو یحتطب فجاء علی راسہ حزمۃ
حطب فالقاھا ثم قعد وکلمہ ثم اعطاہ
ثلاثۃ دراھم فقال اشتر بھذا طعامًا
وشرابًا فاشتری بدرھم لحمًا وبدرھم
خبزًا وبدرھم خمرًا فاکلوا وشربوا وفعل
فی الیوم الثانی کذلک وفی الثالث
کذلک ثم قال انی احب ان تکتب لی
امانًا ان انت ملکت یومًا من الدھر
قال اتسخر بی فقال انی لا اسخر بک
ولکن ما ترید علیک ان تتخذ بھا عندی

بعد سے رہے ان پر برابر ذلت اور جزیہ ہی مقرر
ہوا کیا اور بیت المقدس اس کے بعد سے حضرت
عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک خراب
اور ویران ہی رہا تا آنکہ پھر مسلمانوں نے آپ کے
حکم سے اس کو آباد کیا۔

اور سدی نے اپنی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ
بنی اسرائیل میں کے ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ
بیت المقدس بابل کی ایک بیوہ کے یتیم لڑکے کے ہاتھوں
تباہ و خراب ہوگا جس کا نام بخت نصر ہے اور وہ لوگ
چونکہ سچے تھے اس لئے ان کا خواب بھی سچا تھا۔ پس
وہ شخص اس جوان کا پتہ لگانے کے لئے نکلا اور اسکی
ماں تک پہونچا وہ لڑکا لکڑیاں چننے گیا ہوا تھا اتنے
میں سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھر لئے ہوئے آیا اور اس کو
پھینکا اور اپنے نووارد مہمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس
اسرائیلی نے اس کو تین درھم دیئے اور کہا کہ اس سے
کھانا وغیرہ لے آؤ۔ وہ ایک درھم کا تو گوشت لایا اور ایک
ہی کی روٹی لی اور ایک کی شراب لایا۔ سب نے کھایا
پیا۔ دوسرے روز اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ اور تیسرے
دن پھر یہی کیا۔ پھر بخت نصر سے اس نے یہ کہا کہ میں
چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے امان کا پروانہ لکھدو اگر تم
کسی وقت میں بھی یہاں کے بادشاہ ہوئے اس نے کہا کہ

Scanned with CamScanner

یداً فکتب لہٗ اماناً فقال ان جئت والناس حولك قد حالوا بینی و بینك قال ترفع صحیفتك علیٰ قصبۃ فاعرفك فکتب لہٗ واعطاہ۔

ثم ان ملك بنی اسرائیل کان یکرم یحییٰ بن زکریاء ویدنی مجلسہٗ وانہ ھوی بنت امرأتہ وقال ابن عباسؓ ابنۃ اختہ فسال یحییٰ فنھاہ عن نکاحھا فبلغ ذلك امھا فحقدت علے یحییٰ وعمدت حین جلس الملك علیٰ شرابہ فالبستھا ثیاباً رقاقاً حمراً وطیبتھا والبستھا الحلی وارسلتھا الی الملك وامرتھا ان تسقیہ فان راودھا علیٰ نفسہ ابت علیہ حتی یعطیھا ما سالتہ فاذا اعطاھا سالتہ راس یحییٰ بن زکریا ان یوتی بہ فی طست ففعلت فلما ارادھا فقالت لا افعل حتی تعطینی ما اسئلك قال ما تسئلنی قالت راس یحییٰ بن زکریا فی ھذا الطست فقال ویحك سلینی غیر ھذا فقالت ما ارید

کیا میرے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ کہا نہیں مذاق نہیں کرتا۔ ہاں آپ ہی البتہ یہ نہیں چاہتے کہ اسکے ذریعہ مجھ پر کوئی سلوک کریں۔ یہ سنکر اس نے اس شخص کیلئے امان کا پروانہ لکھدیا۔ اس اسرائیلی نے کہا ایک بات اور سن لیجئے کہ اگر میں آپکے پاس ایسے وقت میں آیا کہ آپکے گرداگرد لوگ جمع ہوئے اور وہ میرے اور آپکے درمیان میں حائل ہوئے یعنی انھوں نے بالفرض مجھ کو آپ سے ملنے نہ دیا تو میں کیا کروں گا؟ کہا اس کاغذ کو نیزہ پر اٹھالینا میں تمکو پہچان لونگا۔ غرضکہ امان لکھ کر اسکے حوالہ کردیا۔

ادھر بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا بہت احترام کرتا تھا اور اپنی مجلس میں انھیں قریب بٹھاتا تھا اور اس کو اپنی سوتیلی بیٹی سے عشق تھا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اپنی بھتیجی سے بہرحال اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے اس سے نکاح کرنے کو منع فرمایا۔ یہ خبر اس لڑکی کے ماں کو ملی تو اسکو حضرت یحییٰ سے کینہ ہوگیا۔ ایک دن جبکہ بادشاہ شراب نوشی کے لئے بیٹھا تھا اس نے اس لڑکی کو ریشمین سرخ جوڑہ پہنادیا۔ اور عمدہ عمدہ خوشبو لگائی اور زیورات سے اسکو آراستہ و پیراستہ کرکے بادشاہ کے سامنے بھیجدیا اور اس سے کہاکہ اسکو شراب تو ہی پلا اور جب بادشاہ تیری جانب راغب ہو تو انکار کرنا اور یہ کہنا کہ شرط یہ ہے کہ پہلے میری ایک آرزو پوری کیجئے اور جب بادشاہ اس کو منظور کرلے تو اس سے یحییٰ بن زکریا کے سر کی فرمائش کرنا کہ اسکو ایک طشت میں ابھی منگوا دیجئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا جب بادشاہ نے اسکی جانب رُخ کیا تو اس نے کہا جب تک میری ایک شرط نہ پوری کردو میرے پاس نہ آؤ۔ اس نے کہا کیا مانگتی ہے مانگ۔ کہا یحییٰ بن زکریا کا سر اس طشت

الا ھذا فلما ابت علیہ بعث فاتی براسہ فوضع بین یدیہ والراس یتکلم یقول لا تحل لک

فلما اصبح اذا دمہ یغلی فامر بتراب فالقی علیہ فاذا الدم یغلی والقی علیہ من التراب حتی بلغ سور المدینۃ وھو فی ذالک یغلی فبعث صحابین ملک بابل جیشا الیھم وامر علیھم بخت نصر فسار بخت نصر حتی اذا بلغوا ذالک المکان تحصنوا منہ فی مدائنھم فلما اشتد علیہ المقام اراد الرجوع فخرجت الیہ عجوز من عجائز بنی اسرائیل فقالت تریدان ترجع قبل فتح المدینۃ قال نعم طال مقامی وجاع اصحابی قالت ارأیت ان فتحت لک المدینۃ تعطینی ما سألتک فتقتل

ہیں۔ اس نے کہا تجھ کو بلا کی ہو یہ نہ مانگ اور اس کے سوا جو چاہے مانگ لے۔ اس نے کہا میرا تو بس یہی ایک سوال ہے مجھے اور دوسری کسی چیز کی خواہش نہیں غرض جب اس نے اس پر اصرار کیا اور اڑ گئی تو بادشاہ نے جلاد کو بھیجا چنانچہ وہ آپ کا سر لے کر آیا۔ جب بادشاہ کے سامنے رکھا گیا تو وہ سر ہی کلام کرتا تھا اور حضرت یحییٰ یہی فرماتے تھے کہ ارے ظالم یہ عورت تیرے لئے حلال نہیں ہے۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ خون اب تک اُبل ہی رہا ہے حکم دیا کہ اس پر مٹی ڈال دیجائے چنانچہ مٹی ڈالی گئی مگر اس کے اوپر پھر خون آگیا اور اُبلنے لگا اور مٹی ڈالی گئی پھر اس کے اوپر خون۔ چنانچہ اتنی مٹی ڈالی گئی کہ شہر پناہ کے برابر ٹیلہ ہو گیا مگر اس کے اوپر خون علی حالہ بہتا رہا اسی اثناء میں صحابین جو بابل کا بادشاہ تھا اس نے ان کی طرف لشکر بھیجا اور اس پر امیر بخت نصر کو بنایا۔ چنانچہ بخت نصر آیا اور یہاں پر پہونچا تو یہ بنی اسرائیل اپنے شہر میں قلعہ بند ہو گئے۔ بخت نصر نے ان کا محاصرہ کر لیا مگر جب بخت نصر کے لئے یہاں کا قیام دشوار ہو گیا تو اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں بنی اسرائیل کی ایک بوڑھیا نکلی اس نے کہا کہ شہر کو فتح کرنے سے پہلے ہی واپسی کا ارادہ کیا۔ بخت نصر نے کہا ہاں بڑی بی کیا کریں بہت دن ہو گئے۔ میرے ساتھی بھوک سے پریشان ہیں اس نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ اگر یہ شہر فتح ہو جائے تو مجھے جو مانگوں گی دوگے اور جسے کہوں گی قتل کردوگے اور جس سے منع کروں گی اس سے باز رہوگے۔ اس نے کہا ہاں منظور ہے۔

من امرك بقتله وتكف اذا	کہا اچھا سنو! جب صبح ہو تو اپنے لشکر کے چار حصے کرو پھر شہر کے
امرتك ان تكف قال نعم	ہر ہر گوشہ پر ایک ایک لشکر کو بھیج دو۔
قالت اذا اصبحت فاقسم	پھر سب لوگ اپنا ہاتھ آسمان کی جانب اٹھاؤ اور یوں دعا
جندك اربعة ارباع ثم	کرو کہ اے اللہ ہم آپ سے فتح طلب کرتے ہیں یحییٰ بن زکریا کے
اقم على كل زاوية ربعا ثم	خون کے واسطہ سے بس اس کی وجہ سے قلعہ کی دیواریں گر جائیں گی
ارفعوا ايديكم الى السماء	چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور ویسا ہی ہوا کہ شہر پناہ کی
فنادوا انا نستفتحك بالله	دیواریں گر گئیں اور یہ سب لوگ ہر طرف سے اندر گھس گئے بڑھیا
بدم يحيى بن زكريا فانها سوف	نے کہا کہ ابھی ہاتھ روکو اور کسی کو مت مارو اور اس کو یحییٰ بن
تساقط ففعلوا فتساقطت	زکریاؑ کے خون کے پاس لے گئی اور کہا کہ اس خون پر لوگوں
المدينة ودخلوا من جوانبها	کو قتل کرو تا آنکہ اس کا ابلنا بند ہو جائے چنانچہ اس نے
فقالت كف يدك وانطلقت	اس پر ستر ہزار آدمیوں کو قتل کیا اور یہ خون ٹھہر
به الى دم يحيى بن زكريا وقالت	گیا جب خون کا ابلنا بند ہو گیا تو بڑھیا نے کہا کہ اچھا اب اپنا
اقتل على هذا الدم حتى تسكن	ہاتھ روک لو۔ اور یہ قتل اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبی کے قتل پر
فقتل عليه سبعين الفا حتى	اس وقت تک راضی نہیں ہوتے جب تک کہ وہ شخص
سكن فلما سكن قالت كف يدك	قتل نہ ہو جائے جس نے ان کو قتل کیا ہے بلکہ جب تک
فان الله لم يرض اذا قتل	کہ وہ تمام لوگ نہ قتل ہو جائیں جو اس کے فعل سے
نبي حتى يقتل من قتله ومن	راضی ہوں۔
رضي بقتله۔	
واتاه صاحب الصحيفة بصحيفة فكف	اسی اثناء میں وہ صحیفہ والا پروانہ امان لے کر آیا بخت نصر
عنه وعن اهل بيته فخرب بيت المقدس	نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو امان دے دیا مگر بیت المقدس
وطرح في الجيف واعانه على خرابه	کو خراب کر کے رکھ دیا اور اس میں مردار ڈالے اور اس کی اس

الروم من اجل بنی اسرائیل قتلوا یحییٰ بن زکریا علیہما السلام وذھب معہ وجوہ بنی اسرائیل وذھب بدانیال وقوم من اولاد الانبیاء وذھب معہ برائس جالوت۔

تخریب میں روم نے بھی حصہ لیا اس لئے کہ بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰ کو قتل کیا تھا۔ جس کا انتقام وہ لوگ بھی لینا چاہتے تھے۔ اور بخت نصر اپنے ہمراہ بنی اسرائیل کے بہت سے سرداروں کو لے گیا اور دانیال اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی لے گیا اور جالوت کا سر بھی لے گیا

فلما قدم بابل وجد صحابین قد مات فملك مكانه وكان اكرم الناس عنده دانیال واصحابه فحسدهم المجوس ووشواھم الیه وقالوا ان دانیال واصحابه یکذبون الهك ولا یاکلون ذبیحتك فسالھم فقالوا ان لنا ربا نعبده ولسنا ناكل من ذبیحتكم فامر بخد فخد لھم والقوافیه وھم ستة والقی معھم سبع ضاری لیاكلھم فذھبوا ثم راحوا فوجدوھم جلوسا والسبع مفترش ذراعیه معھم لم یخدش منھم احدا ووجدوا معھم رجلا سابعا فقال ما ھذا السابع انما كانوا ستة فخرج السابع وكان ملكا فلطمه لطمة فصار

جب بابل واپس پہونچا تو دیکھا کہ صحابین مرچکا تھا پس اس کی جگہ ملک کا مالک ہوگیا۔ اور یہ بخت نصر دانیال اور ان کے رفقاء کا بہت اکرام کرتا تھا مجوس نے ان لوگوں پر حسد کیا اور ان کی چغلی بخت نصر سے کھائی یہ کہا کہ دانیال اور ان کے ساتھی تو تمھارے الٰہ کی تکذیب کرتے ہیں اور تم لوگوں کا ذبیحہ تک نہیں کھاتے۔ بخت نصر نے ان لوگوں سے دریافت کیا انھوں نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے ہمارا ایک رب ہے ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور ہم تمھارا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے۔

پس اس نے ایک خندق کھودے جانے کا حکم دیا خندق کھودی گئی اور یہ سب اس میں ڈالدیئے گئے اور یہ کل چھ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک درندہ بھی ڈالا تاکہ وہ خندق میں ان سب کو کھائے پھر وہ لوگ چلے گئے پھر واپس آئے تو اندر دیکھا کہ وہ لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ درندہ بھی ان کے ہمراہ اپنے بازو پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے اور اس نے ان میں سے کسی کو بھی زخمی نہیں کیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ ان کے ہمراہ ایک ساتواں

فی الوحش ومسخہ اللہ سبع سنین وذکر وھب ان اللہ تعالیٰ مسخ بخت نصر نسراً فی الطیر ثم مسخ ثوراً فی الدواب ثم مسخ اسداً فی الوحش فکان مسخہ سبع سنین وقلبہ فی ذلک قلب انسان۔

انسان اور کبھی بے کہنے لگے یہ ساتواں شخص کون ہے اور یہ یہاں کیسے آگیا یہ لوگ تو چھ ہی تھے یہ سنکر وہ ساتواں باہر نکلا اور وہ فرشتہ تھا اور بخت نصر کو ایسی زور کا طمانچہ رسید کیا کہ وہ ایک وحشی جانور کی شکل میں مسخ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اسکو سات سال تک مسخ رکھا وھب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو پرندوں میں سے گدھ بنایا پھر مسخ کرکے جانوروں میں سے بیل بنایا پھر مسخ کرکے درندوں میں سے شیر بنایا اور اسکے مسخ کا کل زمانہ سات سال گذرا اور اس کا قلب ان تمام تقلبات میں انسان ہی کا قلب تھا۔

ثم رد اللہ الیہ ملکہ فامن فسئل وھب اکان مومناً فقال وجدت اھل الکتاب اختلفوا فیہ فمنھم من قال مات مومناً ومنھم من قال احرق بیت اللہ وکتبہ وقتل الانبیاء فغضب اللہ علیہ فلم یقبل توبتہ۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کا ملک اس کو واپس فرمادیا تو وہ ایمان لے آیا وھب سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ مومن تھا فرمایا کہ میں نے اہل کتاب کو اس امر میں مختلف پایا۔ بعض کہتے ہیں کہ مومن مرا اور بعضے کہتے ہیں کہ اس نے بیت اللہ کو جلایا کتاب اللہ کو جلایا انبیاء اللہ کو قتل کیا پس اللہ تعالیٰ کا اس پر بہت ہی غصہ ہوا اس لئے اسکی توبہ نہیں قبول فرمائی۔

قال السدی ثم ان بخت نصر لما رجع الی صورتہ بعد المسخ ورد اللہ الیہ ملکہ کان دانیال واصحابہ اکرم الناس علیہ فحسدھم المجوس وقالوا لبخت نصر ان دانیال اذا شرب الخمر لم یملک نفسہ ان یبول وکان ذلک فیھم عاراً فجعل لھم طعاماً وشراباً فاکلوا

سدی کہتے ہیں کہ بخت نصر جب مسخ کے بعد اپنی اصلی صورت میں لوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ملک اس کو واپس فرمادیا تو دانیال اور ان کے اصحاب اس کے بہت مقرب تھے اور وہ ان کو بہت مانتا تھا پس مجوس نے حسد کیا اور بخت نصر سے کہا کہ دانیال جب کبھی شراب پیتا ہے تو فوراً بدون پیشاب کئے رہ نہیں سکتا اور یہ بات ان لوگوں میں عار کی شمار ہوتی تھی۔ پس اس نے ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ سب نے کھایا پیا اور

Scanned with CamScanner

وشربوا وقال للبواب انظروا اول من یخرج لیبول فاضرب بالطبرزین وان قال انا بخت نصر فقل کذبت بخت نصر امرنی فکان اول من قام لیبول بخت نصر فلما راٰہ شد علیہ فقال ویحك انا بخت نصر فقال کذبت بخت نصر امرنی فضربہ فقتل۔ (مظہری صـ ۳ پ ۱۵)	دربانوں سے یہ کہدیا جو شخص سب سے پہلے مجلس طعام سے پیشاب کرنے کے لئے اٹھے تو اس کو قتل کردو اور اگر وہ یہ کہے کہ میں بخت نصر ہوں تو اس سے کہنا کہ تم جھوٹے ہو بخت نصر ہی نے تو مجھے اس امر کا حکم دیا ہے۔ اتفاق یہ کہ اس دن سب سے پہلا وہ شخص جو پیشاب کے لئے اٹھا وہ بخت نصر ہی تھا جب دربان نے اس کو دیکھا تو اس پر حملہ کیا اس نے کہا اے کمبخت تیرے لئے ہلاکت ہو میں تو بخت نصر ہوں۔ کہا تم جھوٹ کہتے ہو بخت نصر ہی نے تو مجھ کو یہ حکم دیا ہے۔ یہ کہہ کر اس کو قتل کر دیا۔

یہاں تک تو میں نے مفسرین کے کلام سے لتفسدن فی الارض مرتین کی مفصل شرح نقل کی ہے اب آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:۔

فاذا جاء وعد اولٰھما ای فاذا حان وقت حلول العقاب الموعود بعثنا علیکم عبادا لنا اولی باس شدید ای قوۃ وعدۃ وعدد وسلطنۃ شدیدۃ۔	پس جب ان دو وعدوں میں سے پہلا وعدہ آئے گا یعنی جب اس عقاب موعود کے پائے جانے کا وقت آئے گا تو ہم تم پر اپنے سخت گرفت وپکڑ کرنے والے بندوں کو مسلط کردینگے یعنی ہم تم پر اپنی مخلوق میں سے ایک جنکو جو قوت اور طاقت والے ہونگے سامان اور عدد میں بھی زیادہ ہوں گے اور شوکت و دبدبہ والے ہونگے مسلط کردینگے
قال البیضاوی ذو قوۃ وبطش فی الحروب شدید۔ فجاسوا خلال الدیار ای تملکوا بلادکم وسلکوا خلال بیوتکم ای بینھا ووسطھا وانصرفوا ذاھبین وجائین لا	بیضاوی میں ہے کہ قوت طاقت کے ساتھ ساتھ جنگ آزمودہ ہونگے اور وہ لوگ تمہارے گھروں کے اندر گھس جائیں گے یعنی تمہاری بستیوں کے مالک ہوجائیں گے۔ تمہارے محلوں اور گھروں میں بے تکلف گھس جائیں گے جیسے کوئی اپنے گھر اور وطن میں چلتا پھرتا ہو اور کسی کا خوف نہ کریں گے۔

یخافون احداً۔ (ابن کثیر)

قال البیضاوی خلال الدیار ای وسطها للقتل والغارة فقتلوا کبارهم وسبوا صغارهم وحرقوا التورات وخربوا المسجد۔

بیضاوی میں ہے کہ گھر کے اندر گھس گھس کر تمکو قتل اور غارت کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان لوگوں نے بڑوں کو قتل کیا چھوٹوں کو قید کیا۔ توریت جلائی اور مسجد کی بے حرمتی کی۔

قال ابن کثیر فی تفسیره وقد اختلف المفسرون من السلف والخلف فی هؤلاء المسلطین علیهم من هم؟ وذکر بعد ذلک عدة من الروایات ثم قال فی آخرها

ابن کثیر میں ہے کہ سلف و خلف کے تفسیروں میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ مسلطین کون لوگ تھے۔ پھر اس کے بعد چند روایات نقل کر کے آخر میں کہا ہے کہ:۔

وفیما قص الله علینا فی کتابه غنیة عما سواه من بقیة الکتب قبله ولم یحوجنا الله ولا رسوله الیهم وقد اخبر الله عنهم لما طغوا وبغوا سلط الله علیهم عدوهم فاستباح بیضتهم وسلك خلال بیوتهم واذلهم وقهرهم جزاءً وفاقاً وما ربك بظلام للعبید۔ فانهم کانوا قد تمردوا وقتلوا خلقاً من الانبیاء

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جتنا واقعہ بیان کیا ہے وہ ماسوا سے مستغنی کر دینے والا ہے اس کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ اور دوسری کتابوں (اسرائیلیات وغیرہ) کے واقعات معلوم کریں۔ اللہ و رسول نے ہم کو ان کا محتاج نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تو بس یہ خبر دی ہے کہ جب انھوں نے سرکشی اور بغاوت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے دشمن کو مسلط کر دیا جس نے ان کا قتل عام کیا۔ ان کے گھروں میں گھس گئے۔ ان کو ذلیل و خوار، مغلوب و مقہور کیا غرضکہ جیسا ان کا ظلم تھا اسی طرح پورا پورا اس کا مزہ چکھایا اور واقعی آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں فرماتا۔ انھوں نے کچھ کم ظلم نہیں کیا تھا۔ تمرد میں انتہا کو پہونچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ نہ جانے کتنے صلحاء اور انبیاء کو قتل کر چکے

والعلماء۔ (ابن کثیر ص۲۵ ج۳) تھے (جو کہ ظلم کی انتہا تھی)

آگے فرماتے ہیں کہ :۔

ثم رددنا لکم الکرۃ ای الدولۃ والغلبۃ علیھم علی الذین بعثوا علیکم (بیضاوی) وفی الروح الذین فعلوا بکم ما فعلوا قال کان بین البعث والرد علی ما قیل مائۃ سنۃ وذلک بعد ان تابوا ورجعوا عما کانوا علیہ واختلف فی سبب ذلک (روح المعانی ص۱۷)

پھر ہم نے تمہاری دولت۔ سلطنت اور غلبہ واقتدار کو واپس کردیا۔ یعنی ان پر تم حاکم ہوگئے جو تمھیں سزا دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ روح المعانی میں ہے کہ تم کو ان پر غلبہ دیا جن لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا تھا جو کچھ کہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بعث اور رد کے درمیان سو سال کا عرصہ گذرا تھا اور یہ عزت اس وقت ملی جب کہ ان لوگوں نے توبہ کی اور اپنے کئے سے باز آئے باقی اس کی صورت کیا ہوئی اس میں اقوال مختلف ہیں۔

وامددناکم باموال وبنین وجعلناکم اکثر نفیرا مما کنتم من قبل

اور ہم نے مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تم کو پہلے سے زیادہ تعداد اور جتھے والا کردیا۔

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا۔ وفی الروح ان احسنتم اعمالکم سواء کانت لازمۃ لانفسکم او متعدیۃ للغیر ای عملتموھا علی الوجہ المستحسن اللائق او فعلتم الاحسان احسنتم لانفسکم ای لنفعھا بما یترتب علی ذلک من الثواب وان اساتم اعمالکم لازمۃ کانت او متعدیۃ

اور یہ کہا کہ اگر بھلائی کروگے تو اپنے لئے اور برائی کروگے تو اپنے لئے یعنی اعمال اچھے کروگے خواہ وہ لازمی ہوں کہ جن کا نفع صرف تم کو ہو۔ یا متعدی ہوں یعنی اس کا نفع دوسروں کو بھی پہونچتا ہو۔ غرض اگر تم وجہ مستحسن پر کام کروگے یا تم باہم احسان کروگے تو اس کا نفع اور ثواب تم ہی کو ملے گا۔

اور اگر تم برائی کروگے خواہ لازمی ہو خواہ متعدی یا تم اساءت کروگے تو وہ تمہارے ہی نفس کے لئے ہوگا۔ اس لئے کہ اس پر جو وبال اور عتاب مرتب ہوگا وہ تمہارے ہی نفوس کو بھگتنا

بان عملتموها علی غیر الوجه اللائق پڑے گا۔
او فعلتم الاساءة فلها ای فالاساءة
علیها لما یترتب علی ذلک من العقاب

وجاء عن علی کرم الله تعالیٰ وجهٗ — چنانچہ حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ میں نے کسی پر احسان
انه قال ما احسنت الی احد — کیا ہی نہیں اور نہ کسی کے ساتھ برائی کی اور اس کے بعد آپ
ولا اساءت الیه وتلا الآیة۔ — نے یہ آیت تلاوت فرمائی مطلب یہ کہ جو کچھ کیا اپنے ہی نفس کیلئے کیا۔
ووجه مناسبتها لما قبلها علی — اور اس آیۃ کو ماقبل سے مناسبت یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل
ما قال القطب انه لما عصوا — نے نافرمانی کی تو اللہ تعالےٰ نے ایسوں کو مسلط کر دیا جنھوں
اسلط الله تعالیٰ علیهم من — نے ان کو لوٹ مار قتل و قید کرکے رکھدیا۔ لیکن پھر جب
قصدهم بالنهب والاسر ثم — انھوں نے توبہ کی اور اطاعت اختیار کی تو ان کا حال
لما تابوا واطاعوا احسنت حالهم — اچھا بھی ہوگیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے حسنِ عمل
فظهران احسان الاعمال و — اور سوءِ عمل کو ان کے حالات کے تبدل میں دخل عظیم تھا۔
اساءتها مختص بهم۔

والآیة تضمنت ذلک وفیها — اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہے اور اس میں احسان
من الترغیب بالاحسان والترهیب — کی جیسی کچھ ترغیب اور اسارت کی جیسی کچھ ترھیب نکلتی
من الاساءة مالا یخفی۔ — ہے مخفی نہیں ہے۔

(روح ص۱۵ پ ۲۵)

فاذا جاء وعد الآخرة ای — پھر جب دوسری بار کا وعدہ آیا یعنی دوسری بار کی
وقت وعد عقوبة المرة الآخرة — سزا کے وعدے کا وقت آیا تو
لیسوء وا وجوهکم ای بعثنا — ہم نے اپنے دوسرے جند کو بھیجا تاکہ ان کے چہروں کو
هم لیسوء وا وجوهکم ای یجعلوها — بگاڑ کر رکھدے یعنی ان کو ایسا کردیں کہ تکلیف اور غم کے آثار

بادیۃ آثار المساءۃ فیھا۔ (مظہری ص۹)

ان کے چہروں پر نمایاں ہوجائیں۔

وقال فی الروح ای لیجعل العباد المبعوثون اثار المساءۃ والکابۃ بادیۃ فی وجوھکم فان الاعراض النفسانیۃ تظھر فیھا فیظھر بالفرح النضارۃ و الاشراق وبالحزن والخوف الکلوح والسواد۔ (روح ص۱۱)

روح المعانی میں ہے کہ تاکہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے بندے رنج اور مصیبت کے آثار کو تمہارے چہروں پر ظاہر کردیں اور یہ اس لئے کہ اعراض نفسانیہ چہرے پر ظاہر ہوجاتے ہیں دیکھئے خوشی میں چہرہ دمکنے لگتا ہے اور روشن و تروتازہ معلوم ہوتا ہے اور حزن اور ملال یا سخت خوف میں چہرے پر ہوائی اڑنے لگتی ہے اور چہرہ سیاہ پڑجاتا ہے۔

وقال ابن کثیر فی تفسیرہ:۔

ابن کثیر میں ہے کہ

فاذا جاء وعد الاخرۃ ای الکرۃ الاخرۃ ای اذا افسدتم الکرۃ الثانیۃ وجاء اعداؤکم لیسوءوا وجوھکم ای یھنوکم ویقھروکم ولیدخلوا المسجد ای بیت المقدس کما دخلوہ اول مرۃ ای فی التی جاسوا فیھا خلال الدیار لیتبروا ای یدمروا ویخربوا ما علوا ای ما ظھروا علیہ تتبیراً

جب دوسرا وعدہ آیا یعنی جب تم نے دوسری بار فساد مچایا اور تمہارے دشمن آئے تاکہ تمہاری اہانت اور تذلیل کریں اور تم کو مغلوب اور مقہور کریں اور مسجد میں یعنی بیت المقدس میں گھس جائیں جس طرح کہ پہلی بار گھسے تھے اور پہلی بار تو تمہارے گھروں میں بھی گھسے تھے اور تاکہ جس جس چیز پر ان کا بس چلے اور وہ قابو پائیں اسکو ہلاک اور برباد اور تباہ کرکے رکھدیں۔

وفی المظھری ما علوا ای ما غلبوا و استولوا علیہ او مدۃ علوھم تتبیراً۔ عسٰی ربکم یابنی اسرائیل ان یرحمکم بعد ذلک ان امنتم بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم واصلحتم اعمالکم باتباع القرآن ۝ وان

مظہری میں ہے کہ جس چیز پر ان کا غلبہ اور استیلا رہو اسکو خراب کردیں یا مطلب یہ ہے کہ اتنی مدت تک غالب ہیں جتنی مدت تم حاکم رہے شاید کہ تمہارا رب اے بنی اسرائیل اسکے بعد پھر رحم کرے۔ یعنی اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اپنے اعمال کی اصلاح کرلو اتباع قرآن کرکے

عدتم الی المعصیة ومخالفة الرسول صلی الله علیه وسلم عدنا الی العقوبة والانتقام فرحم الله من آمن منهم بمحمد صلی الله علیه وسلم مثل عبد الله بن سلام ومن معه والنجاشی وکعب الاحبار وغیرهم واثنی علیهم بقوله ومن اهل الکتاب امة قائمة یتلون آیات الله آناء اللیل وهم یسجدون الخ وبقوله واذا سمعوا تری اعینهم تفیض من الدمع الخ وعاد بنی قریظة وبنو النضیر واشباههم فارادوا قتل النبی صلی الله علیه وسلم وسحروه وجعلوا السم فی طعامه وحاربوه فعاد الله علیهم بالانتقام۔ فقتل بنی قریظة واجلی بنی النضیر و ضرب علیهم الجزیة یؤدونها عن ید وهم صاغرون۔ (مظہری ص۲۲ پ ۲۵)

اور اگر تم پھر لوٹے معصیت اور مخالفت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو ہم بھی لوٹیں گے۔ عقوبت اور انتقام کی جانب۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر جو ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے رحم فرمایا جیسے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے رفقاء اور نجاشی اور کعب احبار وغیرہ۔ اور ان حضرات کی تعریف فرمائی اپنے اس ارشاد میں کہ بعض اہل کتاب میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو راتوں کی ساعات میں تلاوت کرتی ہے درآنحالیکہ وہ لوگ سجدہ میں ہوتے ہیں الخ اور یہ فرمایا کہ جب یہ لوگ سنتے ہیں اسکو جو رسول پر نازل کیا گیا یعنی قرآن تو انکی آنکھوں کو دیکھیں گے کہ آنسو بہا رہی ہیں الخ اور بنی قریظہ اور بنو نضیر وغیرہ لوٹے یعنی عداوت اور مخالفت کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا، آپ پر جادو کیا آپکے کھانے میں زہر ملایا اور آپ سے مقابلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انتقام لیا پس بنی قریظہ قتل ہوئے اور بنی نضیر کو جلاوطن کیا گیا اور ان پر جزیہ مقرر ہو گیا جسے وہ اپنے ہاتھوں سے ذلیل ہو کر ادا کرتے رہے۔

وقال فی الروح:۔

اور روح المعانی میں ہے کہ :۔

عسی ربکم ان یرحمکم بعد البعث الثانی ان تبتم وانزجرتم عن المعاصی وان عدتم للافساد بعد الذی تقدم منکم عدنا للعقوبة فعاقبناکم فی الدنیا بمثل ما عاقبناکم به فی المرتین اولین وهذا

پھر بعث ثانی کے بعد شاید کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے یعنی اگر تم نے توبہ کی اور معاصی سے رکے تب۔ اور اگر تم فساد کی جانب لوٹو گے بعد اسکے کہ تم درست رہ چکے ہو تو ہم بھی سزا اور عقوبت کی جانب لوٹیں گے چنانچہ ہم نے تم کو پھر دنیا میں سزا دی جسطرح سے کہ وہ دو دفعوں میں سزا دی تھی۔ اور یہ عسیٰ ربکم الخ کا ارشاد بھی منجملہ اس

من المقتضی لھم فی الکتاب الیٰ وکذ الجملۃ الآیۃ وعادوا تکذیب النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وقصدھم قتلہ فعاد اللہ تعالیٰ تسلیطہ علیہ السلام علیھم فقتل قریظہ واجلی بنی النضیر وضرب الجزیۃ علی الباقین۔

پیشین گوئی ہی کے تھا جو کتاب توراۃ میں ان سے بیان کی گئی تھی۔ اسی طرح سے اگلا جملہ بھی اسی سلسلہ کا تھا اگر وہ لوگ پھر لوٹے اس طرح سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور آپ کے قتل کا معاذ اللہ ارادہ کیا پس اللہ تعالیٰ بھی انکی سزا کیلئے لوٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ان پر مسلط فرمادیا چنانچہ آپ نے قریظہ کو قتل کیا اور بنی نضیر کو جلاوطن کیا اور باقی لوگوں پر جزیہ مقرر کیا۔

وقیل عادوا فعاد اللہ تعالیٰ بان مسلط علیھم الاکاسرۃ ففعلوا بھم ما فعلوا من ضرب الاتاوۃ ونحو ذلک۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ لوگ لوٹے تو اللہ تعالیٰ بھی لوٹے بایں طور کہ ان پر اکاسرہ کو مسلط فرمادیا تو انھوں نے ان کے ساتھ کیا جو کچھ کہ کیا یعنی انہ ٹیکس مقرر کیے۔

والتعبیر بان فیہ اشارۃ الی انہ لا ینبغی ان یعودوا۔

(روح ص۳۰)

اور ان کے ساتھ تعبیر فرمانے میں اشارہ ہے کہ اب تم کو لوٹنا نہیں چاہیئے لیکن اگر لوٹے تو یاد رکھو کہ پھر ہم بھی لوٹیں گے۔

وجعلنا جھنم للکافرین حصیرا۔ محبسا فی الاخرۃ لا یقدرون علی الخروج منھا ابدا وقیل بساطا کما یبسط الحصیر وقال ابن کثیر حصیرا ای مستقرا ومحصرا وسجنا لا محید لھم عنہ۔

(ص۲۶ ابن کثیر)

اور ہم نے جہنم کو کافرین کے لئے حصیر بنا رکھا ہے یعنی آخرت میں ایسا قیدخانہ بنا رکھا ہے کہ اس سے پھر کبھی خلاصی پر قادر ہی نہ ہوں گے ایک قول یہ ہے کہ حصیر کے معنی بستر کے ہیں یعنی جس طرح سے کہ حصیر بچھی ہوتی ہے اسی طرح سے یہ لوگ جہنم ہی پر لوٹے پوٹیں گے اس سے باہر نہ نکل سکیں گے۔

ابن کثیر میں ہے کہ حصیر کے معنی ہیں مستقر اور قیدخانہ کے ایسا کہ پھر جس سے ان کو رہائی نہ ہوگی۔

میں نے جن آیات کی تفسیر بیان کرنے کے متعلق عرض کیا تھا الحمد للہ کہ علماء متقدمین کی مستند تفاسیروں سے ان پر مفصل کلام نقل کرچکا ہوں اب اس کے بعد یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اخلاص کے مضمون کے ساتھ اس کا جو جوڑ لگایا ہے تو وہ اسی لئے کہ جس طرح سے اخلاص، مُومن کی خاص صفت ہے جو اس سے منفک نہیں ہوتی اسی طرح سے مؤمن کی ایک شان تذکیر بالقرآن اور ایقاظ بالقرآن بھی ہے۔ لیکن جہاں ہمارے علم وعمل سے آہستہ آہستہ اخلاص ختم ہوتا جارہا ہے اسی طرح سے دینی مناسبت کی کمی کی وجہ سے قرآن شریف کے بیان سے سبق لینے کا معمول بھی آہستہ آہستہ ہم سے رخصت ہورہا ہے۔

چنانچہ آج کل ہر طرف سے مسلمانوں پر جو تباہیاں آرہی ہیں کہ نہ ان کی جان محفوظ ہے اور نہ ان کا مال محفوظ ہے۔ نہ عزت محفوظ ہے اور نہ آبرو۔ حتیٰ کہ ان کی مساجد کی بے حرمتی کی جارہی ہے۔ ان کے اسلاف کے شان میں زبان درازیاں کی جارہی ہیں۔ ہم اپنی تباہی اور ذلت و رسوائی آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ اور اس پر پریشان ہوکر چیخ و پکار بھی مچارہے ہیں مگر افسوس اس تباہی کے حقیقی اسباب پر ان کی نظر نہیں پہونچتی اور ان کے گھر میں جو خدا کی کتاب یعنی قرآن مجید موجود ہے جو کہ قیامت تک کے لئے رہنما بن کر آئی ہے اس سے راستہ نہیں پوچھتے۔ اگر آج مسلمان قرآن کو دیکھیں اور خدا تعالیٰ نے پچھلی امتوں کی تباہی کے جو اسباب بیان فرمائے ہیں ان سے اپنی حالت کا موازنہ اور مقابلہ کریں تو طابق النعل بالنعل اپنی حالت ویسی ہی پائیں گے جو تباہ ہوجانے والی امتوں کا حال اپنے اپنے زمانہ میں تھا۔

بس اب اسی دعا پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصلحت وعلیہ المعول فی جمیع الحالات

اخلاص کے معنی

فرمایا کہ ——— بڑی دشواری اس زمانہ میں یہ ہوگئی ہے کہ حقائق پوشیدہ ہوگئے ہیں اور کوئی انکا بتانے والا بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی چیز کا علم ہی نہ ہوگا تو اسپر عمل کرنا اور اس چیز کو بروئے کار لانا کیونکر ممکن ہوسکیگا اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جسقدر زیادہ اور عام ضرورت کی چیز اس زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں اخلاص ہے شاید ہی کوئی اور شئے ایسی ہو کیونکہ ہمارا جو کام بھی آج خراب ہے خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا اسی اخلاص کی کمی یا اسکے فقدان کے سبب سے ہے مگر لطف یہ کہ جس درجہ یہ ضرورت کی چیز تھی اسی قدر ہم اس سے دور اور اسکی حقیقت تک سے ناآشنا ہیں۔

اسی کے متعلق اسوقت کچھ کلام کرنا چاہتا ہوں خدا کرے اسکی حقیقت آپ حضرات کی سمجھ میں بھی واضح طور سے آجائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھئے کہ اخلاص دراصل ایک قلبی چیز ہے اور باطنی کیفیت کا نام ہے لیکن جب یہ صفت کسی شخص میں پیدا ہوجاتی ہے یعنی کوئی شخص اسکے ساتھ متصف ہوجاتا ہے تو ایسا بھی نہیں کہ دوسروں پر یہ مخفی رہ جائے یہ نہیں ہوسکتا بلکہ مخلص کا اخلاص اسکے قلب سے چھلک پڑتا ہے جس طرح برتن سے پانی یا پھول سے خوشبو، اور دوسروں کو بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس شخص کے اندر یہ صفت ہے اور یہ شخص مخلص ہے اور اخلاص جب قلب میں گھر کر جاتا ہے تو پھر اسکے اقوال و افعال اور احوال ہی کچھ دوسری طرح کے ہوجاتے ہیں اور یہی قول و فعل اور حال اسکے اخلاص کے آثار اور اسکی علامت ہوتے ہیں

اب اسکے بعد یہ سمجھئے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے طبیعتیں بھی مختلف بنائی ہیں نیز استطاعت کے اعتبار سے بھی مختلف لوگوں میں مختلف صلاحیتیں رکھی لہٰذا کوئی تو مالدار ہے اور رئیس ہوتا ہے تو کوئی زبان آور اور فصیح۔ کوئی اعضاء اور جوارح کا قوی ہوتا ہے تو کوئی محنتی اور جفاکش، کوئی تعلقات اور رسوخ والا ہوتا ہے تو کوئی عابد زاہد اور دل سے خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا وغیر ذلک۔

اسلئے ان سب کا اخلاص جو کہ گو ان سب میں قدرے مشترک ہوتا ہے لیکن اسکے الوان جدا جدا ہوتے ہیں یعنی جس طرح سے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مالدار کسی موقع میں مال خرچ کر کے اپنے مخلص ہونے کا ثبوت دے اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان ہی کو استعمال کرے اور کلمۂ طیبہ سے مساعدت کر دے یہی اسکا اخلاص ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

لا خیل عندک تهدیها ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

یعنی اگر تمھارے پاس گھوڑا اور مال نہیں ہے جسکو ہدیہ میں پیش کر سکو تو چاہیئے کہ نطق ہی سے ساعدت کرو اگر حال ساعد نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص چل پھر کر کچھ اعانت کر دے یا کم از کم دل ہی سے دعا کر دے تو یہ بھی اخلاص ہی ہے اور اس شخص کا شمار بھی مخلصین ہی میں ہے۔

بس اسی مسئلہ کو ذرا صاف کرنا چاہتا تھا کہ خدا معلوم کہاں سے لوگوں نے اخلاص کے معنی ایسے مقامات پر صرف مال خرچ کرنے کے سمجھ رکھے ہیں کیا اخلاص کے معنی مال کے ہیں؟ یہی غلطی ہے۔ بعض مواقع پر کسی شخص کی چل پھر کر یا اپنی زبان سے کچھ کلمۂ خیر کہکر یا محض اس امر کا اظہار کر کے کہ میں تمھارے ساتھ ہوں جس قدر اعانت ہو سکتی ہے وہ مال سے نہیں کیجا سکتی، اگر اخلاص کے معنی صرف مال ہی صرف کرنے کے ہوتے تو امیر ہی مخلص ہو سکتے بیچارے غریبوں کے مخلص ہونے اور انکے لیئے اظہار اخلاص کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی حالانکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان غربا کو بھی جو جہاد میں محض اسلیئے شریک نہو سکتے تھے کہ ان کے پاس مال نہ تھا مخلص فرمایا ہے کیونکہ گو انھوں نے مال نہونے کی وجہ سے مال نہیں صرف کیا تھا لیکن ان کے حال نے انکے اخلاص کو ظاہر کر ہی دیا اور انکے اندر سے اخلاص بول اٹھا کہ یہ مخلص لوگ ہیں کیونکہ جہاد میں گو وہ شریک نہوئے لیکن اس عدم شرکت کا انکو بیحد قلق اور غم رہا، چنانچہ شدت غم کی وجہ سے انپر گریہ و بکا بھی طاری ہوا جنکی تسلی کے لیئے اللہ تعالیٰ نے آیتیں نازل فرمائیں چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:-

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ یعنی الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو باوجود اہل سامان ہونے کے اجازت چاہتے ہیں، اور اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ

وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ

یعنی کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جنکو خرچ کرنیکو میسر نہیں جبکہ یہ لوگ اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ خلوص رکھیں اور ان نیکوکاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ اور الزام ہے کہ جسوقت وہ آپ کے پاس اسلئے آتے ہیں کہ آپ انکو سواری دیدیں اور آپ کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کردوں تو اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ انکی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اس غم میں کہ انکے پاس خرچ کرنے کو کچھ میسر نہیں۔

ان دونوں آیتوں میں مخلص اور غیر مخلص کا فرق صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ غیر مخلص اغنیاء تھے انکو مالی وسعت تھی اور صحت و طاقت بھی تھی مگر پھر بھی جہاد میں نجانے کی اجازت مانگتے تھے۔ اور مخلص اگرچہ مال نہ ہونے کیوجہ سے شریک نہو سکے مگر اس عدم شرکت کا غم اور اسکی وجہ سے بکا طاری ہوا۔

جسکا حاصل یہ ہے کہ مخلص بڑا ذہنی ہوتا ہے اور اخلاص میں کبھی خلو نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی شخص جان و مال اور اعضاء و زبان کی اعانت سے مجبور بھی ہوا تو وہ اسکے غم سے تو خالی ہو ہی نہیں سکتا۔

مخلص برابر اسی ادھیڑ بن میں اور اسی جستجو میں رہتا ہے کہ کون سی صورت اختیار کروں کہ اپنے محبوب کے غم میں شریک ہوجاؤں اور اگر کسی کو اسکا غم بھی نہیں تو بیشک وہ مخلص نہیں۔

Scanned with CamScanner

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

بنا ئے علیہ رسالہ نافعہ

برائے اہلِ اسلام

مسمّٰی بہ

تصوف

و

نسبتِ صوفیہ

حصہ اول و دوم

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

ناظرین کی خدمت میں حضرت مصلح الامۃؒ کی تصنیفات میں سے "تصوف اور نسبت صوفیہ" پیش خدمت ہے پہلے اسکا حصہ اول مع ایک ضمیمہ کے طبع ہوا پھر حصہ دوم طبع ہوا اس میں تین ضمیمے ہیں، اس تمام مجموعے کو ایک ہی کتاب قرار دیا گیا ہے

حضرت والاؒ نے ابتداء میں تصوف کی تعریف اور اسکی حقیقت پر جو محققانہ کلام فرمایا ہے اسکو ملاحظہ فرمانے کے بعد معاصر بڑے بڑے جلیل القدر علماء نہایت ہی مسرور ہوئے۔ کسی بزرگ نے یہ فرمایا کہ جماعت اسلامی کے معتدل المزاج لوگ اگر اس کا مطالعہ کریں تو انکے لئے تصوف کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہجائے۔ کسی نے یہ فرمایا کہ "تصوف" کے سلسلہ میں بہت کچھ غلطیاں اور گتھیاں تھیں جو اس کتاب کے مطالعہ سے سمجھ میں آگئیں۔ بعض مصلحین نے یہ بھی فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسکا انگریزی ترجمہ کر کے عرب ممالک میں اسکی اشاعت کی جائے۔ ابھی تک اسکی نوبت نہ آسکی لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْراً۔

کتابی صورت میں بھی یہ مضمون محرم ۱۳۸۶ھ میں اسرار کریمی پریس الہ آباد میں شایع ہوچکا ہے۔ اب ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء دوبارہ تالیفات حصہ چہارم کا جزو بنکر منصۂ شہود پر آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسکے ذریعہ خلق کثیر کو نفع عظیم عطا فرماوے۔

اب اسوقت اس جمع و طباعت کے محرک حضرت مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ و جانشین حضرت مولانا شاہ قاری محمد مبین صاحب مدظلہ العالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکو اجر سے نوازے اور اس قسم کی اور خدمات کی توفیق عطا فرماوے۔ والسلام

مرتب جامی

Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مصلح الامت حضرت مولانا دامت برکاتہم کا ایک مضمون بعنوان "تصوف" اور دوسرا "نسبت صوفیہ" کے نام سے رسالہ معرفت حق میں شایع ہوا جسکو عام طور سے پسند کیا گیا. خصوصاً اہل علم حضرات ان دونوں مضامین سے نہایت محظوظ اور لطف اندوز ہوئے اور اسکی نافعیت وافادیت کا اظہار فرمایا اور بعضوں نے یہانتک کہا کہ اس مضمون کو عربی میں بھی شائع ہونا چاہیئے تاکہ یہاں کے علاوہ دوسری جگہ کے لوگوں کو بھی نفع پہونچے اور تصوف واہل تصوف کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں. بعض مخلص اہل علم نے یہ بھی مشورہ دیا کہ ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں آجانا چاہیئے. اس سے زیادہ نفع کی امید ہے۔ اس بنا پر ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ خدا کرے اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچے۔ وباللہ التوفیق

قبل ازیں کہ مضامین عالیہ کو ملاحظہ فرمائیں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیں کہ حضرت والا دامت برکاتہم اس قسم کے مضامین اکثر وبیشتر بیان فرماتے رہتے ہیں اور مختلف عنوان سے بیان فرماتے ہیں جسکے بعض حصہ کو معرفت حق میں شائع کیا گیا ہے۔ وجہ اکثار بیان کی یہ ہے کہ زمانہ انکار وعناد کا ہے بالخصوص باطنی چیزوں کے تو اکثر اہل ہوا سرے سے قائل ہی نہیں تا بعمل چہ رسد۔ اور اپنے اس انکار پر اس امر سے تمسک کرتے ہیں کہ یہ تصوف وطریقت کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ چیزیں نہیں تھیں اسلئے یہ بدعت ومحدث ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یوں پہلے بھی صوفیہ پر انکار کیا گیا ہے مگر چونکہ زمانہ خیر القرون کے قریب کا تھا اس لئے انکار میں بھی حد سے تجاوز نکرتے تھے بلکہ اکثر تائب ہو کر ان حضرات کے سلسلہ میں داخل ہوتے اور اپنی اصلاح کرکے باطنی دولت حاصل کرتے تھے مگر ابتو عجب خرابطہ ہے کہ ہر شخص ہی محقق بنا بیٹھا ہے جسکو ذرا بھی دین وفہم کا حصہ نہیں وہ بھی بڑے سے بڑے شخص پر انکار کرنے کے لئے تیار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس انکار کو اپنا فریضۂ وقت تصور کرتا ہے اس لئے حضرت والا ایسے مضامین کو بڑے ہی شد ومد سے بیان

فرماتے ہیں تاکہ حقیقت کا انکشاف ہو جائے اور عدم علم کی وجہ سے جو انکار ہے وہ ختم ہو جائے چنانچہ حضرت والا نے اس مضمون میں تصوف کی حقیقت اور اسکی غرض وغایت کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے نیز صوفی کی وجہ تسمیہ اور دیگر ضروری مسائل پر سیر حاصل کلام فرمایا ہے جسکو دیکھ کر ہر منصف مزاج اور سمجھدار شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ تصوف یا بعنوان دیگر طریقت شریعت اور سنت کے عین مطابق ہے بلکہ شریعت کا مغز اور لُبّ ہے اور اس کا مقصود اعلیٰ ومطلوب اسنیٰ ہے۔ اگر کوئی شخص لفظ تصوف پر انکار کرے تو کر سکتا ہے اسکو محدث کہنے تو کہہ سکتا ہے مگر اس کے مقاصد سے کون شخص انکار کر سکتا ہے اسلئے کہ تصوف نام ہے تعمیر الظاہر والباطن کا۔ یعنی اہل تصوف کیلئے ضروری ہے کہ ظاہر کو ان اعمال شرعیہ سے آراستہ کریں جن کا تعلق ظاہر سے ہے مثلاً نماز۔ روزہ وغیرذالک اور باطن کو ان اعمال سے آراستہ کریں جن کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔ یعنی عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ۔ مثلاً اخلاص۔ صبر۔ شکر۔ زہد۔ تواضع وغیرہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور رسالہ التکشف میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی واخلاق کی اصلاح کی فرضیت پر دال ہیں قرآن وحدیث میں زہد۔ قناعت۔ تواضع، اخلاص، وصبر وشکر وحب الٰہی ورضا بالقضاء وتوکل وتسلیم وغیرذلک کی فضیلت اور ان کے تحصیل کی تاکید اور ان کے اضداد حُبّ دنیا، حرص، تکبر وریا وشہوت وغضب حسد وغیرہا کی مذمت اور ان پر وعید وارد ومذکور ہے پھر ان کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا، اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے۔" انتہی کلامہ

نیز قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ اپنے رسالہ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ:۔

"طلب طریقت اور کمالات باطنی حاصل کرنے کیلئے کوشش کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ۔ اے مسلمانو! ان چیزوں سے جو خدا کو پسند نہیں پورا پورا پرہیز کرو یعنی کمال تقویٰ کے ساتھ ظاہر وباطن میں کوئی امر عقائد واخلاق سے خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ اور امر وجوب کیلئے ہوتا ہے۔ انتہیٰ۔

پس جن چیزوں کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے ان کی اصلاح وازالہ واجب ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ۔ یعنی ظاہری گناہوں کو جنکا تعلق جوارح سے ہے چھوڑ دو اور باطنی گناہ جو اعمال قلب وصفات نفس سے ہیں ان کو بھی چھوڑ دو۔

نیز فقہ کی مشہور کتاب مقدمہ شامی ص۳۰ پر ہے کہ:۔

Scanned with CamScanner

ان علم الاخلاص والعجب والحسد والریاء فرض عین ومثلها غیرها من آفات النفوس کالکبر والشح والحقد والغش والغضب والعداوۃ والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلاء والخیانۃ والمداھنۃ والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعۃ والقسوۃ وطول الامل ونحوها مما ھو بیّن فی ربع المھلکات من الاحیاء قال فیہ ولا ینفک عنها بشر فیلزمہ ان یتعلم منها ما یری نفسہ محتاجا الیها وازالتها فرض عین ولا یمکن الا بمعرفۃ حدودها واسبابها وعلاماتها وعلاجها فان من لا یعرف الشر یقع فیہ۔

(مقدمہ شامی ص۳)۔

یقیناً اخلاص وعجب، حسد ریا کا علم فرض عین ہے اسی طرح اس کے علاوہ جو اور آفات نفوس ہیں ان کا علم بھی جیسے کبر، بخل کینہ، خیانت غصہ، عداوت، بغض، طمع، بخل، بطر، خیلاء مداہنت، استکبار عن الحق۔ مکر۔ خداع قسوت۔ طول امل اور اس کے مثل دوسرے امراض جن کا احیاء العلوم کی ربع مہلکات میں بیان کیا گیا ہے۔

احیاء العلوم میں یہ فرمایا ہے کہ ان امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہے تو لازم ہے کہ ان میں سے جن کا اپنے کو محتاج سمجھے اسکو سیکھے اور اس کا ازالہ فرض عین ہے اور یہ ممکن نہیں ہے جب تک کہ حدود و اسباب وعلامات اور اس کے علاج کو نہ جانے اس وجہ سے کہ جس کو شر کی معرفت نہیں ہوتی وہ اسی میں واقع ہو جاتا ہے۔

دیکھئے علامہ شامی جو فقہائے متاخرین میں سے ہیں اور انھیں کی کتاب سے عام طور پر فتوی دیا جاتا ہے اور ہم سب لوگ اسکو تسلیم کرتے ہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ علم اخلاق کی تحصیل فرض عین ہے۔ اسلئے کہ ہر آدمی (الا ماشاء اللہ) ان مذکورہ امراض میں سے ایک یا اکثر یا کل میں ضرور ہی مبتلا رہتا ہے جن کا ازالہ فرض ہے تو بغیر علم کے ان کی اصلاح وازالہ کیسے متصور ہو سکتا ہے نیز بہت سے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جنکی تحصیل لازم ہے جیسے اخلاص وتواضع وغیرہ تو ان کا حاصل کرنا بھی بغیر علم ممکن نہیں اس لئے اخلاق حمیدہ اور اخلاق سیئہ کا علم ضروری ٹھہرا۔

ان سب کے باوجود آج ابنائے زمانہ جو ادھر نہیں آتے ہیں بلکہ انکار تک کرتے ہیں تو اسکی وجہ حضرت والا دامت برکاتہم یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر دین کو اختیار کرنا آسان ہے اسلئے اسکو تو اختیار کر لیتے ہیں اور باطنی اعمال اختیار کرنا اور اخلاق کی اصلاح کرنا چونکہ مشکل معلوم ہوتا ہے نفس کو مارنا پڑتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں۔ اس لئے باطن میں ہاتھ ہی نہیں لگاتے بلکہ اسکی طرف آتے ہی نہیں۔

نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کام کیلئے آدمی کو عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہونیکی ضرورت ہے۔ دنیا کو حاصل کرلینا اور صرف ظاہری اعمال کو اختیار کرلینا عالی ہمتی نہیں بلکہ عالی ہمتی یہ ہے کہ تمام تعلقات غیر ضروریہ کو قطع کرکے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑا جائے اور نسبت مع اللہ حاصل کیجائے۔ مگر ان لوگوں کے لئے تعلقات کا ترک کرنا موت ہے موت۔ اسلئے نہ ان کو ترک کرتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تو صبر کرلیتے ہیں مگر ان علائق سے صبر نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ فیا حسرتاہ واو دیلاہ اور واقعی یہ ہر کس و ناکس کا کام بھی نہیں۔ ولقد صدق من قال

ہر حریصے نا سزائے ترک دنیا کے کند   شیر مرد و باید و دریا دلے مردانہ

نیز فرمایا کہ علماء پر جیسے یہ فریضہ ہے کہ عقائد و فقہ حاصل کریں اسی طرح ان پر دو فریضے اور بھی عاید ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور نسبت حاصل کریں اور ثانیاً یہ کہ رذائل نفس کی اصلاح کریں اور نفس امارہ کو شریعت و سنت کا اتباع کرکے نفس مطمئنہ بنائیں۔ اور یہی تصوف و طریقت کا مقصود ہے اور یہی اسکی غایت و غرض ہے۔ مگر اب چونکہ عموماً جو لوگ سلوک میں آتے ہیں اور اپنے کو اہل تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ ان پر کچھ ایسا جمود طاری رہتا ہے اور کچھ ایسے کھوئے گئے ہیں کہ باوجود آمد و شد کے صحیح مقصد کا استحضار نہیں رہتا کہ آخر ہمکو کرنا کیا ہے اور اس آمد و رفت کا مقصد اصلی کیا ہے۔ اس وجہ سے بھی حضرت والا اکثر و بیشتر ایسے مضامین بیان فرماتے ہیں کہ آنے والوں کو بصیرت ہو اور حقیقت امر منکشف ہو کر ان کے لئے لائحہ عمل متعین ہو جائے۔ بطالت چھوڑیں اور صدق اختیار کرکے کام پر لگ جاویں تاکہ رسمی آنے جانے والوں کی وجہ سے اصلی تصوف اور اہل تصوف بدنام نہ ہوں ؂

در کسوت خاص آمدہ عامے چند   بدنام کنندۂ نیکو نامے چند

کے مصداق نہ بنیں۔

جب یہ بات محقق ہو گئی کہ رذائل نفس کا ازالہ اور نسبت مع اللہ کی تحصیل ضروری ہے تو اب سمجھئے کہ اس کیلئے سب سے آسان صورت یہ ہے کہ اپنے کو کسی کامل مکمل کے سپرد کر دے۔

اس لئے کہ عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ یہ باطنی دولت بغیر صحبت و خدمت اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتی ؂

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی   چو بصاحب دل رسی گوہر شوی

اہل کمال کی صحبت کی ضرورت اور اسکی اہمیت کا بیان حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی ؒ نے اپنی کتاب اخبار الاخیار کے مقدمہ میں اس طرح فرمایا ہے:۔

Scanned with CamScanner

اما بعد فقیر حقیر اضعف عباد اللہ القوی الباری عبد الحق ابن سیف الدین الترک الدہلوی البخاری معروض می گرداند کہ بر ارباب الباب و اصحاب ابصار کہ زمرۂ اہل خبرت و اعتبار اند محقق و مقرر است کہ مؤثر ترین حالات بلکہ افضل عبادات مصاحبت اہل کمال و مجالست مقربان درگاہ ذو الجلال است۔
زیرا کہ بہ مشاہدۂ استقامت احوال ایشاں سالک را ہمتے دست دہد کہ تحمل اعبائے عبادت و برداشت مشاق ریاضت کہ لازم سلوک ایں طریق است آسان شود۔ بلکہ بمعائنہ جمال ایشاں نورے در دل افتد کہ ظلمت ریب دار نیاب کہ علت بُعد و حجاب است زائل گردد۔

(اخبار الاخیار ص۶)

بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر حقیر اللہ قوی و باری کا یہ نحیف ترین بندہ عبد الحق ابن سیف الدین ترک دہلوی بخاری عرض پرداز ہے کہ تمام ان ارباب فہم اور اصحاب بصیرت کے نزدیک جنکا شمار باخبر اور قابل اعتبار ہستیوں میں کیا جاتا ہے یہ امر محقق اور مسلم ہے کہ مؤثر ترین حالت بلکہ افضل ترین عبادت اہل اللہ کی صحبت اور مقربان دربار خداوندی کی ہم نشینی ہے۔
اسلئے کہ ان حضرات کی استقامت (اور انکے ثبات و استقلال) کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایک قوت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے عبادت کا تعب اور ریاضت کی مشقتوں کا برداشت کرنا جو کہ اس طریق پر چلنے کیلئے لازم ہیں اسکے لئے آسان ہو جاتا ہے بلکہ ان حضرات کے جمال کے مشاہدہ سے اس کے قلب میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے شکوک و شبہات کی تاریکیاں کہ در اصل وہی بعد اور حجاب ہوتی ہیں اسکے قلب سے زائل ہو جاتی ہیں۔

دیکھئے یہاں حضرت شیخ محدث قدس سرہٗ مصاحبت اہل کمال کو افضل عبادات فرما رہے ہیں اور اسکی دلیل یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان حضرات کے ثبات و استقامت کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایسی قوت و ہمت پیدا ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے اعمال کی مشقتوں کا تحمل آسان ہو جاتا ہے اور ان کے جمال کے مشاہدہ سے ایسا نور قلب میں آجاتا ہے کہ شک و شبہہ کی ظلمت دور ہو جاتی ہے اور حجاب مرتفع ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تعبیر بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نور اللہ مرقدہٗ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"بے شمار لوگوں کی ایک جماعت جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اس کا ہر ایک فرد بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے۔ زبان قلم سے اور قلم زبان سے (یعنی تحریراً و تقریراً) خبر دیتی ہے کہ ہمکو مشائخ کی صحبت کیوجہ سے جنکی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے عقائد و فقہ کے سوا جن سے

Scanned with CamScanner

وہ انکی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے۔ باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمال صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہوگئے ہیں یہی حالت ہے جسکو کمال کہنا چاہیئے اور یہی حالت بہت سے کمالات کی موجب ہے۔
(تحفۃ السالکین ص۴)

قاضی صاحب نے مشائخ کی صحبت سے جو فیض و نفع ہوتا ہے اسپر کتنی عمدہ اور کیسی محکم دلیل بیان فرمائی، کہ بے شمار لوگوں کی ایک جماعت (متعدد اور مختلف مقامات سے) خبر دیتی ہے کہ ہمکو مشائخ کی صحبت سے عقائد و فقہ کے سوا باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے جو پہلے حاصل نہیں تھی۔ پھر اس جماعت کے اوصاف بیان فرمائے کہ اس کا ہر ایک فرد بسبب تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے تو جب کسی جماعت کے ہر ہر فرد کی یہ حالت ہو۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ کس قدر قابل وثوق و لائق اعتماد ہوگی۔ اور جب ایسی جماعت حقہ کے لوگ کسی امر کے متعلق بالاتفاق فیصلہ کرینگے تو یقیناً موجب جزم اور قطع ہوگا۔ گویا قاضی صاحبؒ یہ فرما رہے ہیں کہ تحریراً و تقریراً ہر زمانہ میں اتنے ثقہ لوگ اس امر کے قائل رہے ہیں کہ حد تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ اب اس کے بعد کسی کو مجال انکار نہیں۔ اور باطن میں نئی حالت جو مشائخ کی خدمت سے پیدا ہوتی ہے اس سے مراد نسبت احسان ہے جسکا ذکر حدیث جبرئیل ان تعبد اللہ کانک تراہ میں آیا ہے۔

میری سمجھ میں صحبت کی ضرورت و اہمیت پر اس سے زیادہ کلام کی ضرورت نہیں یوں اگر کسی کو تفصیل مطلوب ہو تو حضرت مولانا دامت برکاتہم کا رسالہ فوائد الصحبۃ مطالعہ کرلے۔ امید ہے کہ اس مختصر کلام سے ضرور کچھ بصیرت ہوگی اور پیش نظر مضمون کے سمجھنے میں اعانت ہوگی۔

اب اخیر میں یہ گذارش ہے کہ جن لوگوں کو بفضلہ تعالیٰ اہل اللہ کی صحبت میسر ہو ان کو چاہیئے کہ صدق نیت و حسن عقیدت کے ساتھ ان سے تعلق رکھیں اور حاصل شدہ وقت کو غنیمت شمار کرکے ان سے باطنی فیض حاصل کریں ؎

با کریماں کارہا دشوار نیست

اس حقیر کیلئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاق کی اصلاح کو آسان فرمادیں اور اپنی محبت و نسبت سے نوازیں۔ آمین

اب آپ حضرات کے سامنے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے مضامین پیش کیے جارہے ہیں۔ بغور مطالعہ فرمائیں۔ مَتَّعَنَا اللّٰہُ بِھَا وَاِیَّاکُمْ وَسَائِرَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

یکے از خدام

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تصوف

حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل حدیث جبرئیل ہے جس میں آیا ہے کہ ما الاحسان ؟ قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ صوفی، مقرب اور محسن کو کہتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں مختلف درجہ کے لوگ ہیں بعض ان میں سے اصحاب یمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے۔ جو شخص اپنے ایمان کو صحیح کرے اور شرعی اوامر و نواہی کے مطابق اپنا عمل رکھے تو یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور ان امور کے ساتھ ساتھ جس شخص کی غفلات بھی کم ہوں اور نوافل و طاعات کی کثرت ہو اور اسکے قلب پر ذکر اللہ کا استیلاء ہو جائے اور حق تعالیٰ سے مناجات کا تسلسل اور دوام اس کو حاصل ہو گیا ہو ایسے شخص کو مقرب اور محسن کہتے ہیں اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو یحییٰ زکریا کا جو قول نقل کیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس کو ناظرین کے افادہ کیلئے بعینہ درج کرتے ہیں۔ ہذا نصہٗ ۔

وهؤلاء الموصوفون بما ذكرهم المقربون المتصفون بالاحسان. في الخبر الصحيح ما الاحسان ؟ قال ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك والامة درجات متفاوتة ينقسمون الى اصحاب اليمين والى المقربين كما دل عليه الكتاب العزيز

اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو کہ صفت احسان کے ساتھ متصف ہیں۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ احسان کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسکو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ نہ حاصل ہو تو یہ سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ امت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں بعضے اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور بعضوں کو مقربون

فمن صح ایمانہ وعمل بما امر بہ شرعاً فہو من اصحاب الیمین ومن قلت غفلاتہ وتوالت منہ نوافلہ وطاعاتہ وتوالی علی قلبہ ذکرہ ودعواتہ فہو المقرب والمحسن ویعبر عنہ بالصوفی الذی صفا عن الاخلاق المذمومۃ وتخلق بالاخلاق المحمودۃ حتی احبہ اللہ تعالیٰ وحفظہ فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ کما جاء فی الخبر ما تقرب المتقربون الیّ بمثل اداء ما افترضت علیہم ولا یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ الحدیث۔

(حاشیہ قشیریہ صـ۲)

کہاجاتا ہے جیساکہ خود قرآن حکیم میں آیا ہے۔ لہٰذا جس کا ایمان درست ہوگیا اور اس نے امورِ شرعیہ پر عمل کیا وہ اصحابِ یمین کہاجاتا ہے اور جسکی غفلات کم ہوگئیں اور نوافل میں دوام اور استمرار اسکو حاصل ہوگیا اور اسکی طاعات کثیر ہوگئیں اور ذکر اللہ کا قلب پر استیلاء ہوگیا اور اپنی تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی جانب رجوع ہوا اور اسی سے دعا کرنا جس کا حال بن گیا وہ مقرب کہلاتا ہے۔ اور اسی شخص کو محسن کہاجاتا ہے اور اسکو صوفی بھی کہتے ہیں جوکہ صفائے نفس ہے یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک صاف ہوگیا اور اخلاق محمودہ کے ساتھ متصف ہوگیا یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے محبوب بنا لیا اور جملہ حرکات اور سکنات میں اسکے محافظ او نگراں ہوگئے۔ جیساکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجھ سے تقرب حاصل کرنے والوں میں سے کسی نے اس جیسا تقرب نہیں حاصل کیا جوکہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے (یہ قرب فرائض کہلاتا ہے) اور بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے (یعنی ادائے فرض کے بعد کیونکہ اسکے بدون نوافل سبب قرب تو کیا ہوتے معتبر بھی نہیں) یہانتک کہ میں اسکو محبوب بنا لیتا ہوں اور جب وہ مجھے محبوب ہوجاتا ہے تو پھر میں اسکا کان بنجاتا ہوں جس سے سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔ (یہ قرب نوافل کہلاتا ہے)

بعنوان دیگر اس کو یوں کہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک کے بعد مسلمانوں میں سے جو لوگ کہ اپنے وقت کے افاضل ہوتے تھے ان کا کوئی خاص نام (بجز صحابیٔ رسول کے) نہ ہوتا تھا اس لئے کہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی تفضل وشرف ہی نہ تھا جس کی جانب ان کو منسوب کیا جاتا۔ پھر جب صحابہ کا دَور ختم ہوا اور قرنِ ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہ کی صحبت پائی تھی ان کو تابعین کہا جانے لگا اور یہی اس وقت ان کے حق میں سب سے بڑی تعریف سمجھی جاتی تھی۔ پھر ان کے بعد لوگ تبع تابعین کے لقب سے ملقب ہوئے۔ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ مختلف درجات اور منازل مراتب میں تقسیم ہوگئے تو اب اسوقت خواصِ ناس جن کو امور دین کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا زُہّاد اور عُبّاد کے نام سے پکارے جانے لگے یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ "فلاں عابد" "فلاں زاہد"۔ پھر اس

کے بعد جب بدعات کا شیوع ہوگیا اور سب فرقوں میں باہم تقابل اور تنافس ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زھاد ہیں یہ دیکھ کر خواص۔ اہل سنت نے جنھوں نے کہ اپنے لئے معیّت الہیہ کو تجویز کیا اور جنھوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انھوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لئے اسم تصوف تجویز کیا چنانچہ اسی نام سے اس جماعت کے اکابر دو سو ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہوگئے یعنی انھیں حضرات کو صوفی کہا جاتا تھا۔

(قشیریہ صہ ۸)

اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگرچہ بہت دنوں کے بعد زبانوں پر آیا تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرن اول میں بھی موجود تھا جیسا کہ صاحب ابداع لکھتے ہیں کہ:۔

ظهرت التصوف فی القرون الاولی للاسلام فکان له شان عظیم وکان المقصود منه فی اول الامر تقویم الاخلاق وتهذیب النفوس وترویضها باعمال الدین وجذبها الیه وجعله وجدانا لها وتعریفها بحکمه واسراره بالتدریج۔ صہ ۲۲۵

فرماتے ہیں کہ تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر ہوا تھا تو اس کے لئے ایک عظیم شان تھی یعنی وہ ایک عظیم المرتبت چیز تھی اور ابتداءً اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کر لانا اور دین و شریعت کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا۔ نیز دین کے حِکَم و اسرار سے تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر ہر مقصد اپنی جگہ پر نہایت ہی صحیح۔ ضروری اور شریعت کے عین مطابق تھا۔ اس لئے ان سے کسی کو اختلاف یا ان کا انکار نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن علماءِ ظاہر چونکہ معاملات اور اعمال جوارح ہی سے متعلق احکام کو دین سمجھتے تھے ان حضرات نے اس جماعت پر ان کے اسرار دین کی معرفت وغیرہ کا انکار کیا۔ اور ان کو کج رَو اور ملحد کا خطاب دیا۔ ادھر یہ بات بھی ان کے سازگار ہوگئی کہ امراء و سلاطین علماء کے محتاج تھے۔ لہذا صوفیاء تنہا پڑ گئے اور بے یار و مددگار ہوکر اور مخالفین کا خوف کرکے اپنے مسلک کو ان سے پوشیدہ کرنے پر مجبور ہوئے اور اس خیال سے کہ ان کے کلام کو اغیار نہ سمجھیں انھوں نے مخصوص رموز و اصطلاحات وضع کیا اور اپنے طریق میں داخل ہونے والوں کے لئے نہایت سختی کے ساتھ پیش آئے۔ چنانچہ یہ حضرات بڑی شرائط کے ساتھ اور زمانے دراز تک آزمائش کر لینے کے بعد تب کسی کو اپنے طریق میں لیتے تھے۔ اور ان کا یہ کہنا تھا کہ جو شخص ہم میں شامل ہونا

Scanned with CamScanner

چاہیے اس کو پہلے طالب ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ پھر اس کے بعد وہ مرید اور پھر اس کے بعد وہ سالک ہو سکتا ہے۔ اور پھر سلوک کے بعد دو حال سے خالی نہیں یا تو واصل ہی ہو جائے گا اور یا نہیں تو راجع اور منقطع ہو جائے گا

اس تمام تر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ان حضرات کی اعلیٰ درجہ کی دیانت تھی اور صدق و اخلاص تھا کہ ایک طویل زمانہ تک طالب کے اخلاق اور اس کے اطوار کو آزماتے تھے۔ تاکہ یہ جان لیں کہ یہ ارادت میں بھی پکا ہے یا نہیں۔ اور اس کی عزیمت صادق ہے یا نہیں یعنی ہمارے طریق میں اسکو خدا کی طلب اور محبت لائی ہے یا محض اس لئے داخل ہوا ہے کہ ہمارے یہاں گھس کر ہمارے اسرار سے واقف ہو جائے یعنی ہمارے الفاظ کو صرف چر گنے کے لئے یاد کرلے یا خفیہ مخبر اور ہم میں رہ کر ہماری باتوں کو دوسری جگہ پہونچا دے۔ بہرحال کامل اطمینان کے بعد کسی کو وہ اپنی جماعت میں لیتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر اعتماد کرتے تھے۔

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ:-
ھو علم تعرف بہ احوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاھر والباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ۔ وہ ایسا علم ہے کہ جسکے ذریعہ نفوس کا تزکیہ اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں جسکی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے

اب آپ خود غور فرمائیے کہ ان میں سے کون سی چیز غلط ہے۔ نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ برا ہے۔ ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے۔ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بیکار ہے۔ اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنا لینا ان امور میں سے کون سی شئے مقاصد شرع کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک شے کتاب و سنت کے عین مطابق اور اللہ و رسول کے منشا کو پورا کرنے والی ہے۔ اسکے بعد بھی آپ نے یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں بھی اور گذشتہ زمانہ میں بھی اس قدر شد و مد کے ساتھ اسکی مخالفت کی گئی تو اس کے کچھ اسباب تھے۔

تصوف سے انکار کی پہلی وجہ

سب سے بڑا سبب تو اس کا وہی ہوا کہ علمائے ظاہر ہی اسرار دین کے مخالف ہو گئے اور چونکہ امراء اور سلاطین پر ان کو تسلط حاصل تھا اسلئے ان کو بھی ان حضرات کے خلاف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب علماء اور سلاطین مسلمانوں کے یہ دونوں بڑے طبقے اس جماعت کے مخالف ہو گئے تو لوگوں کو ان کی جانب کیسے توجہ ہو سکتی تھی۔ خاص کر قوم صوفیہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ دونوں طبقے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں اور ہماری باتوں کا سننا سنانا اور ان کو رواج دینا تو درکنار خود ہمارا وجود ہی

ان پر شاق ہے تو یہ حضرات گوشہ نشین ہو گئے اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ اندر اندر اپنے کام کو جاری رکھا اور ان حضرات کے مخالفتوں کے باوجود اپنے کام کو چھوڑا نہیں بلکہ طریق کو باقی رکھنے کے لئے اپنے سر اور جان کی بازی لگا دی ۔ پکڑے جاتے تھے۔ قید ہوتے تھے بلکہ بعضوں کو تو قتل تک کر دیا گیا لیکن قوم صوفیہ اس خیال کے پیش نظر کہ یہ باطن بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ایک شعبہ ہے اور اہم شعبہ ہے جس قیمت پر بھی یہ باقی رہ سکے اسکو باقی رکھنا ہے۔ مصائب سہے اور طریق کو باقی رکھا۔ چنانچہ انھیں کے اخلاص کی یہ برکت تھی کہ اس قدر شدید مزاحمت اور موانع کے باوجود بھی طریق زندہ رہا اگرچہ ایک جماعت اس کا انکار بھی کرتی رہی اور اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک دوسری وجہ لوگوں کے انکار کی یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ طریق چونکہ نہایت ہی اعلیٰ تھا کیونکہ احکام ربوبیت اور آداب عبودیت پر یہ مشتمل تھا اور مخلوق کو خالق سے ملانے کا ذریعہ تھا اسلئے شیطان پر بہت ہی شاق تھا لہٰذا اسے یہ کب گوارا تھا کہ بندے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کریں اس لئے ان کو گمراہ رکھنے کے لئے اس نے ایک طرف تو یہ کیا کہ بہت سے قلوب میں اس کا انکار مزین کر دیا۔ اور دوسری جانب یہ کیا کہ بہت سے مدعیان طریق بھی ایسے پیدا کر دیئے کہ جو طریق کا زبان سے نام تو لیتے تھے لیکن اصل طریق سے انھیں اصلاً مس نہ تھا۔

بلاشبہ بہت بڑی گمراہی اس طبقہ سے بھی پھیلی۔ یعنی اس نے بزرگوں کے نام پر اپنے ھویٰ و نفس کی پیروی کی اور طریق کو بدنام کیا۔ اب اگر منکرین طریق اسی کو اپنے انکار کا منشاء قرار دیں کہ لوگوں نے طریق کے نام پر بہت سے خلاف شرع امور کا ارتکاب کیا تو اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ سالکین کی کوتاہیوں اور بعض اہل طریق کی بے راہ رویوں کو لیکر اصل طریق ہی کا انکار کر دینا نہایت ہی عناد اور بعید از انصاف بات ہے۔ کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اچھا تصوف کو جانے دیجئے اس کی جگہ پر اسلام کو لے لیجئے اس کا جو نقشہ آج مسلمانوں کے عمل سے آپ کی نظروں میں کھنچتا ہے کیا وہی حقیقی اسلام ہے؟ اگر نہیں تو کیا ان لوگوں کے غیر اسلامی امور کے اختیار کر لینے کی وجہ سے اصل اسلام کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر تصوف ہی کا کیوں انکار ہے اور اس میں اور اسلام میں کون سا امر فارق ہے؟

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں یا جسکو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعبیر الظاہر والباطن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایک

Scanned with CamScanner

بانظم اور با اصول چیز ہے اس میں مریدین کے لئے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب موجود ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اسکو شریعت کا مغز اور دین کا لب کہنا بجا ہے۔ اور جب ان آداب و شرائط ہی کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دے دیا جائے تو پھر تو وہ طریق ہی نہیں جو کہ ہمارا موضوع بحث ہے اس لئے ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بنا پر چڑھ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو اس میں ایک تصوف ہی تو متفرد نہیں ہے۔ نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور آپ کا ان سے تعلق بھی ہے۔ جو کہ ابتدا اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں۔ منصف کے لئے یہ کافی ہے اور دلائل کی بحث از بس طویل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا اسم اگر بدعت ہے تو مسمی تو اس کا بدعت نہیں آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے۔ علم الاخلاص اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو اس کو محسن، مقرب، متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان اور محسن اور متقی اور مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ:-

ومعظم ما دعت الی اقامتہ الرسل امور ثلثۃ۔ تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاۃ وغیرھا وتکفل بھذا الفن اھل الاصول من علماء الامۃ شکر اللہ مساعیھم و تصحیح العمل فی الطاعات المقربۃ والارتفاقات الضروریۃ علی وفق السنۃ وتکفل بھذا الفن فقہاء الامۃ فھدی اللہ بھم کثیرین واقام بھم فرقۃ عوجاء

اس کے بعد شاہ صاحب نے احسان کا بیان کیا ہے اور آیات و حدیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

وتصحیح الاخلاص والاحسان الذین ھما اصل الدین الحنیفی الذی ارتضاہ اللہ لعبادہ قال تبارک وتعالیٰ:

۱۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ۔

۲۔ وقال ان المتقین فی جنات وعیون اٰخذین ما اٰتھم ربھم انھم کانوا قبل ذالک محسنین کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون وفی اموالھم حق للسائل والمحروم و

فی الارض ایات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون ۵
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وقال فی جواب جبرئیل الاحسان
ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک۔
یہاں تک تو مقاصد ثلاثہ کا بیان فرمایا اب آگے ان کے مراتب اور احسان کی ان سب پر ترجیح
کا بیان اس عنوان سے فرما رہے ہیں کہ (والذی نفسی بیدہ ھذا الثالث ادق المقاصد الشرعیۃ
ماخذا واعمقہا محتدا بالنسبۃ الی سائر الشرائع وبمنزلۃ الروح من الجسد وبمنزلۃ المعنی
من اللفظ وتکفل بہا الصوفیۃ رضوان اللہ علیہم فاھتدوا وھدوا واستقوا وسقوا وفازوا
بالسعادۃ القصوی وحازوا السھم الاعلی۔ (تفہیمات الھیہ ص ۱۳ ج ۱)
دیکھئے شاہ صاحب فرما رہے ہیں کہ اخلاص واحسان ایسی چیز ہے کہ علوم واعمال کی اس کے
بغیر کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی اور اسی مضمون کو ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں
بیان کیا ہے۔ احسان کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔
قیل اراد بہ الاخلاص فانہ شرط فی صحۃ الایمان والاسلام لان من تلفظ بالکلمۃ وجاء
بالعمل من غیر نیۃ الاخلاص لم یکن ایمانہ صحیحا۔
اس سے معلوم ہوا کہ احسان مرادف ہے اخلاص کے۔ بغیر اس کے اسلام اور ایمان دونوں صحیح
نہیں ہوتے۔ اور عمل کی قبولیت بھی اسی پر منحصر ہے۔ اس کے بغیر علوم اور اعمال کی کچھ حیثیت ہی نہیں
رہ جاتی۔ چنانچہ اعمال کے اعتبار سے تو حضرت شاہ صاحب نے یہ فرمایا کہ بدون اخلاص کے وہ جسم
بلا روح کے رہ جاتا ہے۔ یعنی مردہ اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ وہ گویا الفاظ بلا معنی
رہ جاتے ہیں یعنی بالکل مہمل۔ پس کسی چیز میں اخلاص کے شامل نہ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا
ضرر ہوگا کہ وہ بالکل ہی مہمل اور مردہ سمجھی جائے۔
دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے احسان پر کتنا زور دار کلام فرمایا ہے اور اس کے محصلین
کی کتنی مدح فرمائی ہے یعنی اس مقصد کو سب مقاصد سے زیادہ اغمض اور ادق فرمایا ہے۔ اس لئے
کہ یہ سب کی روح اور باطن ہے اور جو چیز ایسی ہوتی ہے وہ ادق ہوتی ہی ہے۔ میرے خیال میں
تصوف (یعنی احسان کی ضرورت پر اس سے بڑھ کر کسی اور عنوان سے کلام نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی
جس طرح سے فقہ ظاہری کو دیگر علوم و فنون کے مقابلے میں ادق و اعمق اور اغمض سمجھا جاتا ہے
اسی طرح سے شاہ صاحب فقہ باطن یعنی احسان و اخلاص کو بھی ادق و اغمض فرما رہے ہیں۔

اور سنئے:۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ "احسان اشارت باصل تصوف کہ عبارت از صدق توجہ الی اللہ است و جمیع معنی تصوف کہ مشائخ طریقت بآں اشارہ کردہ اند راجع بہمیں معنی اند۔

نیز حیات شیخ عبدالحق میں ہے کہ ان کے والد ماجد نے ہدایت کی تھی کہ "ملائے خشک و ناہموار نہ باشی" چنانچہ عمر بھر ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت رہا اور دوسرے میں سندان عشق عشق الہی کی لگن تو ان کا خاندانی ورثہ تھی شیخ سیف الدین نے ان میں عشق حقیقی کے وہ جذبات پھونک دیئے تھے جو آخر عمر تک ان کے قلب و جگر کو گرماتے رہے۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص۸۸)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اصلی تصوف کو بہت سراہا ہے اور صوفیہ صافیہ کی عظمت اور جلالت شان کو نہایت عمدہ عنوان سے بیان فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ

اصل عنوان صوفیہ مرتبۂ عظیم و مقام رفیع و مسلک طریق مستقیم است۔ (حیات شیخ دہلوی ص۲۹۵)	حضرات صوفیہ کا اصل عنوان عظیم المرتبۃ اور رفیع المنزلۃ ہے اور ان حضرات کا مسلک صراط مستقیم ہے۔

صاحب حیات شیخ دہلوی تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صوفیہ مقتبسان انوار سنت اور مکاشفان سر حقیقت ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قرآن و حدیث کے بعد سب سے زیادہ عزت و احترام کے قابل ہے اسلئے کہ اس کا ایک ایک حرف اس ذہن کی پیداوار ہے جس پر قرآن و حدیث کا رنگ خوب رچ چکا تھا یعنی حضرات صوفیہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتاب و سنت کے بعد نہایت مستند ہے کیونکہ یہ حضرات مزاج شناس تھے شرع کے۔ اسلئے کتاب و سنت کے خلاف ہرگز ہرگز لب کشائی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

اگرچہ علم حدیث و تفسیر بالذات برہمہ مقدم است امادر حقیقت تصوف تفسیر کتاب خدا و شرح سنت رسول و مدلول و نتیجہ آنہا است۔	علم حدیث اور علم تفسیر اگرچہ تمام دیگر علوم پر اپنی ذات کے اعتبار سے مقدم ہے تاہم تصوف بھی کتاب اللہ ہی کی تفسیر اور حدیث رسول کی شرح اور اس کا مدلول اور نتیجہ ہی ہے۔ اس سے الگ اور اس کے بالمقابل کوئی چیز نہیں ہے۔

شریعت اور طریقت میں فرق کرنا گمراہی کی دلیل ہے۔ جو لوگ شریعت پر عامل نہیں وہ صوفیا کہلانے کے مستحق نہیں۔ انھیں باطنیہ یا حشویہ کہنا چاہیئے۔ (حیات شیخ ص۲۹۵)

اور سنئے:۔

اسی مضمون کو علامہ شامی نے بھی بیان فرمایا ہے کہ شریعت، طریقت اور حقیقت میں باہم تلازم ہے۔ چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ:۔

الطریقۃ سلوک طریق الشریعۃ والشریعۃ اعمال شرعیۃ معدودۃ۔ وھما والحقیقۃ ثلثۃ

متلازمة لان الطریق الی اللہ تعالیٰ ظاهر و باطن۔ فظاهرها الطریقة ۔ والشریعة ۔ وباطنها الحقیقة فبطون الحقیقة فی الشریعة کبطون الزبد فی لبنه لا یظفر بزبد بدون مخضه والمراد من الثلاثة اقامة العبودیة علی الوجه المراد من العبد + (شامی ج ۱ ص ۴۲)

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔ مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"فی الواقع شریعت فرض اور مقصد اصلی ہے ۔ طریقت بھی شریعت باطنی ہے ۔ اور حقیقت و معرفت متمم شریعت ہیں ۔ اتباع شریعت بکمال بدون معرفت نہیں ہو سکتا" (مکاتیب رشیدیہ ص ۲۴)

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے یہ جو فرمایا کہ اتباع شریعت بکمال بدون معرفت کے نہیں ہو سکتا ۔ تو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں ۔ وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ :۔

استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه ۔ اس میں ترک استنزاہ اور عذاب قبر میں باہم مناسبت ظاہر نہیں ہے ۔ یعنی پیشاب سے احتیاط نہ کی جائے تو اس کی وجہ سے عذاب قبر ہوگا ۔ اس خاص سزا کو اس جرم کے ساتھ کیا تعلق ہے ؟ تو سنیئے اس کے متعلق حضرت انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بحر الرائق میں ہے کہ :۔

وجه مناسبة عذاب القبر مع ترک استنزاہ البول هو ان القبر اول منازل الآخرة والاستنزاہ اول منزل من منازل الطهارة والصلاة اول مایحاسب به المرأ یوم القیامة وکانت الطهارة اول مایعذب بترکها فی اول منزل من منازل الآخرة ۔

پیشاب وغیرہ سے عدم احتیاط میں اور اس پر عذاب قبر کے ہونے میں مناسبت یہ ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے اور تنزہ طہارت کی سب سے پہلی منزل ہے (اور طہارت نماز کا مقدمہ اور اس کی شرط اولین ہے) اور نماز سب سے پہلا وہ عمل ہے جس پر قیامت میں پرسش ہوگی (روز محشر کہ جاں گداز بود + اولیں پرسش نماز بود) تو چونکہ طہارت جس کے لئے تنزہ شرط ہے یہ پہلی منزل ہے اس لئے پہلی منزل میں پہلی چیز کے ترک پر عذاب دیا جاتا ہے ۔

(بحر الرائق ص ۱۴۰)

سبحان اللہ کیا خوب نکتہ ہے اور کیا اسرار شریعت ہیں ۔ طہارت اور نجاست کا دخل اور اس کا اول منزل ہونا اور اس کا ربط اول منزل آخرت کے ساتھ یہ ہیں علمائے شریعت اور یہ ہیں

Scanned with CamScanner

اسرارِ شریعت۔ پس حضرت گنگوہیؒ کا یہ ارشاد کہ کامل اتباعِ شرع بدون معرفت کے نہیں ہو سکتا بجا ارشاد ہے۔

اور شفاء العلیل میں ہے کہ کامل مطلق فی الواقع وہ ہے جو علم ظاہر و باطن دونوں کا جامع ہے ورنہ نقصان سے خالی نہیں۔ عالم ظاہر تحصیل نسبت باطن کا محتاج ہے اور باطنی نسبت والا کتاب و سنت کے حاصل کرنے کا حاجتمند ہے۔ تا جامع النورین و مجمع البحرین اور یادگار اولیاء سابقین اور وارث الانبیاء والمرسلین ہو جائے۔ اس کے متعلق حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ من تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق ومن تفقہ ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینہما فقد تحقق۔ یعنی جو صوفی ہوا اور فقہ نہ حاصل کی پس بلاشبہ زندیق ہوا۔ یعنی ٹھیٹ کافر اور جو کوئی فقیہہ ہوا اور تصوف نہ حاصل کیا پس بلاشبہ زاہد خشک اور پھیکا پھاکا ملا ہے اور جس نے دونوں کو جمع کیا (یعنی تصوف اور فقہ کو) پس بلاشبہ محقق ہوا۔

دیکھئے شاہ ولی اللہ صاحب رح۔ صاحب مرقات۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔ علامہ شامیؒ حضرت گنگوہیؒ غرض کہ سارے ہی محققین ایک ہی بات فرما رہے ہیں یعنی تصوف کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو یہ سبھی حضرات اپنے اپنے وقت میں نہایت شد و مد کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں۔ حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بھی آپ نے اس کا ذکر ملاحظہ فرمایا اور انھیں لفظوں میں (یعنی تصوف کے عنوان سے) ملاحظہ فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی یہ لفظ موجود تھا۔

اور سنئے۔ علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الاعتصام میں فرماتے ہیں کہ:۔

الطریق مبنی علی الاخلاص التام بالتوجہ الصادق وتجرید التوحید عن الالتفات الی الاغیار۔

یعنی طریق کی بناء اخلاص تام۔ توجہ صادق اور التفات الی الاغیار سے توحید کو مجرد کرنے پر ہے یہ کتاب تحقیق بدعت میں ایک معرکۃ الارا تصنیف ہے جس میں صوفیائے کرام کے اصل مسلک کو بتایا گیا ہے۔ لہٰذا اس پر کسی کو کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

دیکھئے صوفیائے کرام کا اصل مسلک اخلاص تام، توجہ صادق اور ترک التفات الی الاغیار کو فرمایا ہے۔ غور فرمائیے کہ ان میں سے کون سی چیز قبیح ہے پھر خود ہی اس کا فیصلہ کیجئے کہ جو فن ان پاکیزہ اور شریف امور پر مشتمل ہو۔ اس کی کیونکر مذمت کی جا سکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات تو خود فرماتے ہیں کہ ہمارا طریق ہی توحید کو التفات عن الغیر سے تجرید پر مبنی ہے جیسا کہ حضرت حاجی صاحبؒ

Scanned with CamScanner

فرماتے ہیں ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے کہ خیال رُخ دلدار ہے درباں اپنا

لیکن انھیں کے فن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ التصوف من اقوی الاسباب لوقوع المسلمین فی ابرهل بدینهم وبُعدهم عن التوحید الخالص الذی هواُسُّ النجاۃ ومدار صحۃ الاعمال ۔

اب جو جماعت یہ کہہ رہی ہو کہ اس کا مقصد ہی توحید خالص ہے اسی کو اس کا مخالف قرار دیا جائے کس قدر عجیب بات ہے ۔ اب اس کا منشا جہل قرار دیا جائے یا کچھ اور ۔

بہرحال ؎

وان کنت لاتدری فتلک مصیبۃٌ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظمُ

علما اور مشائخ کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ طریقت ، شریعت کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسکی روح اور مغز ہے ۔ عام طور پر تو یہ مشہور ہے کہ طریق میں رذائل اور ہوائے نفس سے بحث کی جاتی ہے یعنی ایسے طریقے بتائے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ انسان ہوائے نفس سے چھوٹ جائے اور اس میں اخلاص پیدا ہو جائے لیکن علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الاعتصام میں وضع شریعت کی بھی یہی غرض و غایت فرماتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ :۔

الشریعۃ موضوعۃ لاخراج المکلف عن داعیۃ هواه حتی یکون عبد اللہ ۔

یعنی شریعۃ کی وضع اس لئے ہوئی ہے کہ مکلف کو اس کی خواہشات نفس کے داعیہ سے نکالا جائے اور صحیح معنوں میں اسکو عبداللہ (اللہ کا بندہ) بنا دیا جائے ۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان میں بالعموم داعیہ نفس و ہوئی موجود ہوتا ہے اور پھر وہ ان کا ازالہ داعیہ شریعت کے ذریعہ کرتا ہے ۔ یعنی شریعت کا داعیہ ہوئی کے داعیہ پر مستولی ہو جاتا ہے اور اس کا بزور و بقہر اخراج کر دیتا ہے جسکی وجہ سے انسان نفس کے داعیہ سے چھوٹ کر نص کے داعیہ پر چلنے لگتا ہے اس لئے عبداللہ ہو جاتا ہے کیونکہ احکام خداوندی پر چلنے کا داعیہ جس پر غالب ہو وہی عبداللہ ہے ۔

اس موقعہ پر وہ آیت یاد آتی ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے قاصد کو جبکہ وہ ہدایا لیکر آیا تھا مخاطب کرکے فرمایا تھا ۔ ارجع الیهم فلنأتینهم بجنود لاقبل لهم بها ولنخرجنهم منها اذلۃ وهم صاغرون یعنی تم ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ سو ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے اس کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کرکے نکالدینگے اور وہ ماتحت ہو جائیں گے ۔ یعنی جس طرح ملوک اپنے مخالفین و مقابلین کو بزور

Scanned with CamScanner

تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر والحواس نمی باشد پس بنا براین ضرورت مردے راکہ باوجود علم وتقوی دو صفت داشتہ شد۔ یکے عدم مساہلت ومداہنت در مقام امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ دوم شناختن آنچہ بحال طالب افضل واسہل است۔ پس این چنیں کس را اختیار کند وزمام امور خود را بدست او سپارد۔ ومتابعت او بر خود لازم گیرد تا مراد خود رسد۔ وثمرہ این رسیدن است بہ نجات کلی در عقبی ودخول اودر جناب العلی وتحصیل رضائے مولی۔

تشتت کا سبب ہے کیونکہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوا کرتا لہذا اس ضرورت کے ماتحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح بنانے کے لئے ایسے کسی شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ جو کہ علاوہ علم وتقویٰ کے دو اور اوصاف سے متصف ہو۔ ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور مداہنت کو روا نہ رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ طالب کے مناسب حال سہل اور افضل جو امور ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔ پس ایسے شخص کا انتخاب کر کے اپنے تمام امور کی لگام اسکے ہاتھ میں دے دے اور اسکی اتباع کو اپنے اوپر لازم پکڑے تاکہ اپنی مراد کو پہونچے اور اس کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجات کلی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

(رسالہ بیعت ص۲۷)

دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے یہاں یہ فرمایا کہ بیعت کا حاصل یہ ہے کہ انسان غفلت اور معصیت سے نکل کر تقویٰ وطاعت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اور اس کے لئے کسی عالم متقی جو کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں مداہن اور متساہل نہ ہو۔ نیز طالب کے حال کے لئے جو چیزیں افضل واسہل ہوں ان سے واقف ہو ایسے شیخ کو اپنے اوپر حاکم بنالے اور باب اصلاح میں اس کی اتباع کو لازم کرے۔ غور فرمائیے کہ ان امور میں سے کون سی چیز محل اشکال ہے۔ ظاہر ہے کہ غفلت کا ترک کرنا ضروری ہے اور معصیت کا بھی اور یہ بھی معلوم ہے کہ خود انسان اس معاملہ میں اپنا علاج کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی شیخ کامل کو اپنے اوپر اختیار کلی دیدے اور اصلاح نفس کے بارے میں بلا چوں چرا اس کا اتباع کرے۔ اس لئے کہ جس چیز کو خود نہیں سمجھتا اگر دوسرے کے سمجھانے میں بھی میم میخ نکالے گا تو پھر اس کی اصلاح ہو چکی۔ آپ خود دیکھئے استاد بچہ سے کہتا ہے کہ کہو الف۔ اب اگر اس نے اتباع کرلی تو اس کے پڑھ لینے کی امید کی جا سکتی ہے اور خود مزاحمت شروع کردی یعنی یوں کہا کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو اس کے پڑھنے کی کوئی سبیل نہیں یہ جاہل ہی رہ جائے گا۔ یہی مطلب

کتاب اللہ کے ساتھ رسول کو بھی بھیجا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ رشد و ہدایت کے باب میں تنہا کتاب کافی نہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ اس راز کو بہت سے انگریزی دانوں نے سمجھا لیکن ہمارے سمجھ میں نہیں آیا۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں کہ ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

آج کتاب وعظ اور زر سبھی کو حصول دین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اگر انکار رہے تو بزرگوں کی نظر کا حالانکہ اسی کا نام تزکیہ تھا۔ جس کے متعلق نص کا اشارہ بیان ہوا۔ اور سنئے:۔

امام ابوالقاسم قشیری اپنی مشہور کتاب رسالہ قشیریہ میں ضرورت شیخ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ثم یجب علی المرید ان یتأدب بشیخ فان لم یکن لہ استاذ لا یفلح ابدا ھذا ابو یزید یقول من لم یکن لہ استاذ فامامہ الشیطان وسمعت الاستاذ اباعلی الدقاق یقول الشجرۃ اذا نبتت بنفسہا من غیر غارس فانہا تورق لکن لا تثمر کذالک المرید اذا لم یکن لہ استاذ یاخذ منہ طریقتہ نفسا نفسا فہو عابد ھواہ لا یجد نفاذا۔ (قشیریہ ص۱۹۹)

پھر مرید پر واجب ہے کہ کسی شیخ سے ادب (یعنی تعلیم و تربیت) حاصل کرے اگر اس کا کوئی شیخ نہ ہوگا تو وہ کبھی فلاح نہ پائے گا۔ یہ حضرت ابویزید فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی شیخ نہیں تو اس کا رہبر شیطان ہے (یعنی اسی کے کہے پر وہ چلے گا) میں نے اپنے استاذ ابوعلی دقاق کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو درخت کہ خودرو ہوتا ہے وہ پتے تو لاتا ہے لیکن پھل نہیں دیتا۔ اسی طرح مرید کا بھی حال ہے یعنی جب اسکے لئے کوئی شیخ نہ ہوگا جس سے کہ وہ طریق شیئاً فشیئاً حاصل کرے تو اپنے خواہش ہی کا بندہ رہے گا۔ اس سے اس کو خلاصی نہیں ہو سکتی۔

اسی کتاب القول الجمیل میں ایک دوسرے مقام پر ضرورت شیخ کے بارے میں شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

والشرط الخامس ان یکون صحب المشائخ وتأدب بھم دھراً طویلاً واخذ منھم النور الباطن والسکینۃ وھذا لان سنۃ اللہ جرت بان الرجل لا یفلح الا اذا رای المفلحین کما ان الرجل لا یتعلم الا بصحبۃ العلماء وعلی ھذا القیاس غیر ذالک من الصناعات

(القول الجمیل ص۲۱)

یعنی پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدوں کامل کی صحبت میں رہا ہو۔ اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانہ دراز تک۔ اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ یعنی صحبت کاملین اس

واسطے مشروط ہوئی کہ عادت الٰہی یوں جاری ہوئی ہے کہ مراد نہیں ملتی جب تک کسی مراد پانے والے کو نہ دیکھے جیسے انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے اسی قیاس پر ہیں اور پیشے جیسے آہنگری بدون صحبت آہنگر یا نجاری بدون صحبت نجار کے نہیں آتی۔

(فائدہ) مولانا نے ارشاد کیا کہ جریان سنت اللہ کا بھید یہ ہے کہ انسان اس نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ اپنے کمالات کو حاصل نہیں کر سکتا بدون اپنے ابنائے جنس کے مشارکت اور معاونت کے بخلاف اور حیوانات کے کہ ان کے کمالات پیدائشی ہیں اور کسبی نہایت کمتر ہیں چنانچہ تیرنا حیوانات میں پیدائشی کمال ہے اور انسان کو بدون سیکھے نہیں آتا۔)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ خلف الرشید حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا کلام بھی نقل کر دوں جو طریقت کی ضرورت، بیعت کی حقیقت اور شرائط مشیخت وغیرہ پر مشتمل ہے اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا جس قدر صحیح نقشہ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں بیان فرمایا ہے کم لوگ اس طرح بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اپنے ایک مختصر سے رسالہ "رسالہ بیعت" میں لکھتے ہیں کہ :۔

اما بیعت شریعت پس حقیقتش آنکہ مرد عامی کہ عمر را در غفلت و معاصیت گذارده ہرگاہ بریں خیال متنبہ می شود و ندامت می کشد و رجوع بر آں تقوی و طاعت می خواہد حصول ایں معنی بدون تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود در عادت منتظم نمی تواند شد چہ دیدن کتا بہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است۔ بیمار را بدون حصول ملکہ طب و معالجہ بایں قدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔

ہر حال بیعت شریعت پس اسکی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے کہ اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کیا ہو جب اسکو اپنے اس حال پر تنبہ ہو (یعنی اسکے درستگی کا خیال آوے) اور (حالات گذشتہ پر) وہ نادم ہو کر تقوی اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو یہ چیز بدون کسی عالم کے جو ظاہراً اور باطناً متقی ہو اپنے اوپر حاکم بنائے ہوئے یونہی بطور خود عادۃً وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ شریعت کی کتابوں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی طب کی کتاب کی مراجعت کی جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ) بیمار کیلئے بغیر اس کے کہ طب اور معالجہ میں اسکو ملکہ اور مہارت حاصل ہو۔ محض کتب بینی کے ذریعہ سے اصلاح کر لینا اور مرض کا دفع کرنا بہت دشوار ہے۔

پھر آگے اس کے بعد انتخاب شیخ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

وہمچنیں بقول ہر عالمے عمل کردن موجب

اور اسی طرح سے ہر عالم کے قول پر عمل کر لینا تحیر اور

فارسی	اردو
تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر والحواس نمی باشد پس بناء بریں ضرورت مردے راکہ باوجود علم وتقوی دو صفت داشتہ شد۔ یکے عدم مساہلت ومداہنت در مقام امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ دوم شناختن آنچہ بحال طالب افضل واسہل است۔ پس ایں چنیں کس را اختیار کند وزمام امور خود را بدست او سپارد۔ ومتابعت او بر خود لازم گیرد تا مراد خود رسد۔ وثمرہ ایں رسیدن است بہ نجات کلی در عقبی ودخول او در جناب العلی وتحصیل رضائے مولی۔	تشتت کا سبب ہے کیونکہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوا کرتا لہٰذا اس ضرورت کے ماتحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح بنانے کے لئے ایسے کسی شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ جو کہ علاوہ علم وتقویٰ کے دو اور اوصاف سے متصف ہو ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور مداہنت کو روا نہ رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ طالب کے مناسب حال سہل اور افضل جو امور ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔ پس ایسے شخص کا انتخاب کرکے اپنے تمام امور کی لگام اسکے ہاتھ میں دے دے اور اسکی اتباع کو اپنے اوپر لازم پکڑے تاکہ اپنی مراد کو پہو نچے اور اس کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجات کلی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

(رسالہ بیعت صـ۲۷)

دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے یہاں یہ فرمایا کہ بیعت کا حاصل یہ ہے کہ انسان غفلت اور معصیت سے نکل کر تقویٰ وطاعت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اور اس کے لئے کسی عالم متقی جو کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں مداہن اور متساہل نہ ہو۔ نیز طالب کے حال کے لئے جو چیزیں افضل واسہل ہوں ان سے واقف ہو ایسے شیخ کو اپنے اوپر حاکم بنائے اور باب اصلاح میں اس کی اتباع کو لازم کرلے۔ غور فرمائیے کہ ان امور میں سے کون سی چیز محل اشکال ہے۔ ظاہر ہے کہ غفلت کا ترک کرنا ضروری ہے اور معصیت کا بھی اور یہ بھی معلوم ہے کہ خود انسان اس معاملہ میں اپنا علاج کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی شیخ کامل کو اپنے اوپر اختیار کلی دیدے اور اصلاح نفس کے بارے میں بلا چوں چرا اس کا اتباع کرے۔ اس لئے کہ جس چیز کو خود نہیں سمجھتا اگر دوسرے کے سمجھانے میں بھی میم میخ نکالے گا تو پھر اس کی اصلاح ہوچکی۔ آپ خود دیکھئے استاد بچہ سے کہتا ہے کہ کہو الف۔ اب اگر اس نے اتباع کرلی تو اس کے پڑھ لینے کی امید کی جاسکتی ہے اور جو مزاحمت شروع کردی۔ یعنی یوں کہا کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو اس کے پڑھنے کی کوئی سبیل نہیں یہ جاہل ہی رہ جائے گا۔ یہی مطلب

سے اس کا جو صاحب الابداع نے لکھا ہے کہ :-

ثم انهم جعلوا للشيخ سلطة خاصة على مريديه حتى قالوا يجب ان يكون المريد مع الشيخ كالميت بين يدى الغاسل لان الشيخ يعرف امراضه النفسية وعلاجها فاذا ابيح له مناقشة ومطالبة الدليل تعسر معالجته او تعذر فلابد من التسليم له فى كل شئ من غير منازعة وقالوا ان الوصول الى العرفان المطلق لا يكون الا بهذا۔

(الابداع ص۳۲۵)

پھر اہل طریق نے شیخ کو ایک خاص مرتبہ دیا ہے یعنی مرید پر اسکو تسلط کامل دیا یہانتک کہ یہ فرمایا ہے کہ مرید کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ شیخ کے سامنے اس طرح سے رہے جیسے مردہ بدست زندہ۔ اور یہ اس لئے کہ شیخ امراض نفسانیہ کا عارف اور اس کے علاج کا ماہر ہوگا۔ لہذا اگر اس سے مناقشہ (یعنی چون وچرا) جائز کردیا جائے اور یہ کہ مرید اس سے ہر چیز کی دلیل (علت اور لم) پوچھے تو اسکے لئے ایسے شخص کا معالجہ اگر متعذر نہیں تو متعسر ضرور ہوجائے گا۔ (یعنی ناممکن نہیں تو دشوار یقیناً ہوجائے گا) اسلئے ضروری ہوا کہ بدون منازعت اور مناقشت کے ہر امر میں اسکی بات کو تسلیم کرے اور اسکا منقاد رہے چنانچہ ان حضرات نے یہ تک کہدیا ہے کہ معرفت تک وصول اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا (اور یہ صحیح ہے کیونکہ استاذ اگر کسی بچے سے کہے کہ کہو الف اسپر وہ یہ کہنے لگے کہ کیا دلیل کہ یہ الف ہے تو وہ پڑھ چکا۔ تحقیق کا مقام حاصل ہونے کیلئے اولاً کسی محقق کی تقلید ضروری ہے۔

پھر اتخاذ شیخ کے باب میں شاہ صاحب کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو شیخ بنانے کے لئے اس میں بہت سی شرائط ہیں یعنی ہر شخص کو شیخ نہیں بنایا جاسکتا اس لئے کہ ہر آدمی میں شیخ ہونے کی اہلیت ہونا تو الگ رہا ہر شخص صحیح الفکر اور صحیح الحواس بھی نہیں ہوتا لہذا اگر انتخاب شیخ میں غور و تامل سے کام نہ لیا اور کسی نااہل کو شیخ بنا لیا گیا مثلاً اس کی فکر اور حواس ہی درست نہ ہوئے تو اس کا بیڑا ہی ہوجائے گا اسی لئے جہاں مشائخ نے ضرورت شیخ پر کلام کیا ہے وہیں اسکی علامات بھی بیان کی ہیں چنانچہ علامہ شاطبی نے الموافقات میں عالم متحقق بالعلم کی تین علامتیں بیان کی ہیں اور یہ اسی لئے تاکہ لوگ علم کو اس کے اہل ہی سے لیں اور نااہل کو مقتدا و پیشوا بناکر ضیاع علم کا سبب نہ بنیں۔

فرماتے ہیں کہ ان تین علامتوں میں سے پہلی علامت یہ ہے :-

(الاولى) العمل بما علم حتى يكون قوله مطابقاً لفعله فان كان مخالفاً له فليس باهل لان يوخذ عنه

ایک علامت تو یہ ہے کہ اپنے علم پر خود عامل ہو تاکہ اسکا قول اسکے فعل کے مطابق ہو اسلئے کہ اگر اس کا فعل قول کے مطابق نہ ہوگا تو یہ شخص اس کا اہل نہیں ہے کہ اس سے علم اخذ کیا جائے اور نہ اس لائق ہے کہ ایسے

ولا ان یقتدی بہ فی علم ۔

(الثانیۃ) ان یکون ممن رباہ الشیوخ فی ذلک العلم لاخذہ عنھم وملازمتہ لھم فھو الجدیر بان یتصف بما اتصفوا بہ من ذلک وھکذا کان شان السلف الصالح فاول ذلک ملازمۃ الصحابۃ رضی اللہ عنھم لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخذھم باقوالہ وافعالہ واعتمادھم علی مایرد منہ کائناما کان وعلی ای وجہ صدر فھم فھموا مغزی ما اراد بہ اولا حتی علموا وتیقنوا انہ الحق الذی لا یعارض وحکمۃ الذی لا ینکسر قانونھا ولا یحوم النقص حول حمی کمالھا وانما ذلک بکثرۃ الملازمۃ وشدۃ المتابعۃ +

(الثالثۃ) الاقتداء بمن اخذ عنہ و تأدب بادبہ کما علمت من اقتداء الصحابۃ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم واقتداء التابعین بالصحابۃ وھکذا فی کل قرن وبھذا الوصف امتاز مالک عن اضرابہ اعنی بشدۃ الاتصاف بہ والا فالجمیع ممن یھتدی بہ فی الدین کذلک کانوا ولکن مالکا

علم میں مقتدا بنایا جائے ۔

اور دوسری علامت یہ ہے کہ یہ شخص ایسا ہو کہ اس علم میں مشائخ نے اسکی تربیت فرمائی ہو بایں وجہ کہ اس نے ان حضرات سے علم حاصل کیا ہو اور ان کی خدمت میں برابر رہا ہو تو ظاہر ہے کہ ایسا ہی شخص اس قابل ہوگا کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو جن سے اس کے مشائخ متصف تھے چنانچہ سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا (یعنی اپنے مشائخ سے اخذ علم اور ان کی ملازمت کی بنا پر ان کے اخلاق وصفات سے متصف ہو گئے تھے) دیکھئے سب سے پہلے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کو لازم پکڑا اور آپ کے اقوال وافعال کو لیا اور جو کچھ آپ سے صادر ہوا اس پر سبھی نے اعتماد کیا۔ خواہ وہ جس قسم کی بھی چیز رہی ہو اور جس نہج پر بھی آپ سے صادر ہوئی ہو اور خواہ ان حضرات نے آپ کے مقصود کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو یہاں تک کہ انھوں نے سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ آپ نے جو کچھ کیا یا فرمایا وہ ایسا حق ہے جس کا معارضہ نہیں کیا جا سکتا اور ایسی حکمت ہے جس کا قانون ٹوٹ نہیں سکتا اور جسکے کمال کے گرد نقصان پھٹک نہیں سکتا اور اس میں شک نہیں کہ یہ کیفیت طویل صحبت اور انتہائی صبر و برداشت کے بعد ہی انسان میں پیدا ہو سکتی ہے ۔

اور تیسری علامت یہ ہے کہ وہ شخص جس سے علوم کو لیتا ہو اسکی اقتدا بھی کرتا ہو اور اسکے آداب سے مؤدب ہو جیسا کہ تم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی اقتدا کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھا اور ایسے ہی تابعین کے اقتدا کو حضرات صحابہ کے ساتھ و ہکذا مسلسل چنانچہ اس صفت (یعنی اقتدار سلف) کے ساتھ امام مالکؒ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہوئے ہیں یعنی ان کے اندر شدت اہتمام اس کا تھا ورنہ تو دین کے جو لوگ بھی پیشوا ہوئے ہیں سب ہی ایسے ہوئے ہیں۔ لیکن امام مالک کی اس باب میں جو شہرت ہوئی تو مبالغہ فی الاہتمام

اشتهر بالمبالغة في هذا المعنى فلما	کی وجہ سے لیکن جب یہ طریقہ متروک ہوگیا تو بدعات نے سر
ترك هذا الوصف رفعت البدع	اٹھایا اس لئے کہ ترک اقتداء اس امر کی دلیل ہے کہ تارک
رؤسها لان ترك الاقتداء دليل	کے نزدیک کوئی نئی چیز حادث ہوگئی ہے (جب ہی تو
على امر حادث عند التارك اصله	اس نے طرز قدیم چھوڑا) اور اس کی اصل اور اس کا منشاء
اتباع الهوى۔	اتباع ہوی ہے۔

(الموافقات ص۹۵ ج۱)

دیکھا آپ نے کسی عالم سے علم حاصل کرنے کے لئے علماء نے کتنی شرائط بیان کی ہیں بس یہی شرائط کسی کو شیخ بنانے کی بھی ہیں یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ اولاً وہ شریعت پر خود عامل ہو۔ ثانیاً اس کی تربیت کسی شیخ کامل نے کی ہو جس کے لئے ان کی خدمت میں ایک معتد بہ مدت تک یہ رہا ہو۔ ثالثاً اپنے مشائخ کی اتباع اور ان کی اقتداء کا کامل داعیہ اس میں موجود ہو۔ اس کے متعلق صاحب موافقات نے فرمایا ہے کہ جب سے یہ وصف (اتباع اسلاف) متروک ہوگیا۔ بدعات نے سر اٹھایا کیونکہ جب مشائخ اور اکابر کی اتباع کو آدمی ضروری نہ جانے گا تو اسکے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے نفس اور شیطان کی اتباع کرے اور اس کا بدعت اور محدث ہونا ظاہر ہے۔
عجیب بات ہے کہ جس علم اور اصول پر چلکر انسان بدعت سے بچ سکتا تھا خود اسی مسلک کو بدعت کہا جانے لگا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فی زمانہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص جاہل اور بدعمل ہے اسکو تو رہبر اور پیشوا بنایا جارہا ہے اور جو شخص کہ ولی کامل ہے اس کے سینہ میں اللہ تعالیٰ نے نور کا اور اپنی معرفت کا خزانہ رکھا ہے۔ اسی کے لوگ مخالف ہو جاتے ہیں بلکہ بعض بعض تو اس کو مسلمان تک نہیں سمجھتے۔ فیا للعجب۔

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ علم تصوف بدعت اس لئے نہیں کہ اسکی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور ہویٰ کو پہچانے اور اس کو ترک کر کے اللہ ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اپنے قلب میں پیدا کرے کہ اتباع شریعت کے لئے یہی محرک بنتی ہے اور اتباع شرع فرض ہے اس لئے یہ بھی فرض ہے۔ پس جو چیز کہ فرض پر لگا دے وہ مذموم کیسے ہوسکتی ہے اور رہا یہ کہ اللہ ورسول کے محبت کی فرضیت کہاں سے معلوم ہوئی تو اس کے متعلق سنیئے:-

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ

اللہ کی محبت کی فرضیت

تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمھارا البنہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو تم منتظر رہو یہانتک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

اس آیت سے نیز یحبہم و یحبونہ سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثبوت ہے اور چونکہ یہ نص قطعی ہے اس لئے یہ محبت فرض ہوگی۔ اور اس کی فرضیت اس لئے ہوئی ہے کہ احکام شرعیہ کا اتباع بدون ان دونوں محبتوں کے نہیں ہو سکتا۔ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کی اتباع ہوگی یعنی اگر محبت کامل ہو تو اتباع بھی کامل ہوگی اور محبت ناقص ہوگی تو اتباع بھی ناقص ہی رہے گی۔

بہرحال ہر شخص کے لئے اللہ و رسول کی اس قدر محبت فرض ہے جس سے اوامر کا امتثال اور معاصی سے اجتناب کرے۔ چنانچہ فتح الباری شرح بخاری صفحہ ۵۲ ج ۱ میں اس حدیث ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما الحدیث کے تحت لکھا ہے کہ:۔

محبۃ اللہ علی قسمین فرض وندب۔ فالفرض المحبۃ التی تبعث علی امتثال اوامرہ والانتہاء عن معاصیہ والرضاء بما یقدرہ فمن وقع فی معصیۃ من فعل محرم او ترک واجب فلتقصیرہ فی محبۃ اللہ حیث قدم ھوی نفسہ ..... والندب ان یواظب علی النوافل ویجتنب الوقوع فی الشبہات والمتصف عموماً بذالک نادر قال وکذالک محبۃ الرسول علی قسمین۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرض دوسرے مندوب۔ فرض وہ محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کے امتثال اور معاصی سے اجتناب اور مقدر پر راضی رہنے پر ابھارے پس جو شخص کسی معصیت میں (خواہ کسی حرام شے کے ارتکاب کرنے یا کسی واجب کے ترک میں) واقع ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں قصور کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے نفس کی خواہش

کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مقدم کیا۔ اور مندوب محبت یہ ہے کہ نوافل پر مواظبت کرے اور شبہات میں واقع ہونے سے اجتناب کرے اور اس محبت سے متصف بالعموم بہت کم لوگ ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بھی دو قسم ہے۔ یعنی فرض اور مندوب۔

پس جب اللہ ورسول کی محبت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے تو اسکی تحصیل بھی شرعاً مطلوب و مامور بھا ہوئی۔ اور ابھی ہم نے بیان کیا ہے کہ تصوف کی یہی غرض ہے لہذا اب اس میں کسی کے لئے کیا مجال انکار باقی رہا۔ یہ گفتگو تو ان امور کے متعلق ہے جو طریق میں مقصود کا درجہ رکھتے ہیں باقی اس میں شک نہیں کہ بہت سی چیزیں اشخاص اور ازمنہ کے مناسب بطور وسائل وذرائع کے بھی اختیار کی جاتی ہیں چونکہ یہ سب بھی مکملات دین سے ہیں اس لئے ان کو مقصود سمجھنا تو یقیناً غلطی کی بات ہے لیکن اپنی حد پر رکھ کر ان پر عمل کر لینا یہ بدعت مذمومہ نہیں اسکو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ کسی طبیب نے نسخہ میں مثلاً شربت بنفشہ لکھا۔ مریض کو شربت بنفشہ کی ضرورت ہے مگر بازار میں نہیں ملتا۔ اس لئے وہ اس مقصود کی تحصیل کی خاطر کچھ وسائل اختیار کرتا ہے لکڑیاں لاتا ہے آگ جلاتا ہے شکر لاتا ہے دیگچی لاتا ہے پانی و بنفشہ لاتا ہے اور شکر و بنفشہ وغیرہ کو دیگچی میں ڈال کر آگ پر پکاتا ہے اور شربت بنفشہ تیار کر کے نسخہ کی تکمیل کرتا ہے۔ تو یہ لکڑیاں لانا، آگ جلانا وغیرہ وغیرہ زیادۃ فی النسخہ نہیں ہے بلکہ تکمیل النسخہ ہیں اسی طرح صوفیا کرام نے بھی جو وسائل اذکار واشغال وغیرہ اختیار فرمائے ہیں۔ یہ سب محبت کی تکمیل اور نسبت احسان کی تحصیل کے لئے ہیں گویا یہ متممات ومکملات دین سے ہیں۔ محبت کی تکمیل وتحصیل کے لئے ان کو اختیار کیا جاتا ہے ؎

"از پئے وصل نگارے حیلہا انگیختیم"

ان کو اصل دین اور مقصود کوئی نہیں سمجھتا۔

اب یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے جو چیز مانع وحاجب بنتی ہے وہ انسان کا نفس ہے علما حقیقت نے مختلف تطورات کے اعتبار سے اسکے سات درجے قائم فرمائے ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اسکے الگ الگ نام بتائے ہیں۔ امارہ، لوامہ، ملہمہ، مطمئنہ، راضیہ، مرضیہ، کاملہ، قرآن شریف میں امارہ اور راضیہ، مرضیہ۔ لوامہ، اور مطمئنہ کا ذکر آیا ہے۔ قال تعالیٰ۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ وَقَالَ تَعَالَى لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ وَقَالَ تَعَالَى يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۝

Scanned with CamScanner

ہم یہاں پر ان میں سے صرف امارہ ، لوامہ اور مطمئنہ کا کچھ بیان کرتے ہیں۔ صاحب ترصیع فرماتے ہیں کہ نفس امارہ کو امارہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ برائیوں کا حکم کرتا ہے۔ اور نفس کی یہ قسم نہایت ہی خبیث ہے۔ ایک معمولی شہوت کے بدلے اپنی آخرت ہی کو بیچ دیتا ہے۔ چنانچہ بخل۔ حرص۔ حسد جہل۔ کبر۔ شہوت۔ غضب۔ غفلت۔ شدت طمع۔ سوئے خلق۔ بیکار باتوں میں مشغولی۔ مخلوق کے ساتھ استہزاء۔ بغض۔ ہاتھ اور زبان کے ساتھ ایذا رسانی وغیرہ یہ سب اسی کی صفات ہیں اور یہ اس لئے کہ نفس اس درجہ میں اپنی طبیعت کے ظلمات میں پڑا رہتا ہے۔ پس وہ خیر و شر میں تمیز ہی نہیں کرتا بلکہ شیطان کا اس کے اغوا میں دسیسہ اور آلہ کار بنتا ہے۔ چنانچہ تمہارے دو دشمنوں میں سے یہ بڑا دشمن ہے۔ لہذا اس سے بہت ہی زیادہ ہوشیار رہو اور پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تم پر لازم ہے کہ ابواب شریعت پر وقوف کرو اور ہر آن اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو۔ اور اسکو موت سے۔ عذاب قبر سے اور قیامت کے ہولناک حالات سے ڈراتے رہو نیز اپنے لئے ذلت۔ انکسار مسکنت۔ خضوع اور انواع بر اور نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی جانب تضرع اور ابتہال کو لازم کر لو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے طبعی ظلمت سے نکالدے اور یہ ہرگز نہ کرنا کہ گھبرا کر اور ملول ہو کر دعا کرنا چھوڑ دو۔ یا فتح اور کامیابی کو بعید سمجھ کر اس کی جانب سے سست اور تنگدل ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ چیزیں تو مرید کے رشتے ہی کو منقطع کر دینے والی ہیں لہذا جو چیزیں بتلائی ہیں ان میں تندہی کے ساتھ لگو اور جو امور کہ تم کو تمہارے مولا سے مشغول کر دینے والے ہوں ان سے اعراض کرو۔ قناعت کو لازم پکڑو اور لذات کو اور بے فائدہ امور میں مشغولی ترک کرو۔ اپنے رب سے گریہ وزاری کرو اور ہمہ تن اس کے جانب متوجہ ہو جاؤ اس مرتبہ میں یہی سب کام تمہارے کرنے کے ہیں۔

یہاں تک تو نفس امارہ کا بیان تھا۔ اب نفس لوامہ کے متعلق سنئے :۔

نفس لوامہ کو لوامہ اس لئے کہتے ہیں کہ جب اس کا صاحب کسی برائی میں واقع ہوتا ہے تو یہ اس کو ملامت کرتا ہے چنانچہ اس کی صفات میں سے ملامت۔ ہوی۔ مکر۔ عجب۔ ریا۔ ظلم غیبت۔ کذب۔ غفلت۔ حب ریاست۔ حب شہوت۔ وغیرہ امور ہیں اور کبھی اس نفس کے ساتھ ساتھ نفس امارہ کی بھی بعض صفات پائی جاتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے۔ اور اب بہ نسبت پہلے کے زیادہ سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو

Scanned with CamScanner

ملکوتی مصباح سے جسے اللہ تعالیٰ قلب سالک میں روشن فرماتے ہیں کچھ روشنی مل جاتی ہے۔
ایسی کہ پھر وہی باعث بنتی ہے اس بات پر کہ سالک مجاہدہ کے ذریعہ صفات مذمومہ سے خلاصی پائے
اور اخلاق حمیدہ کے ساتھ متصف ہو جائے لیکن ابھی تک وہ خلاصی پائے ہوتا نہیں مگر شریعت
کے موافقت کی اس میں ایک رغبت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور اس کے لئے مجاہدہ کا خیال بھی ہو جاتا
ہے چنانچہ اس مرتبہ میں اس کے لئے کچھ صالح اعمال بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً قیام۔ صیام۔ صدقہ وغیرہ
لیکن ان میں رذائل کی بھی آمیزش رہتی ہے مثلاً عجب۔ ریا۔ اور اپنے اعمال صالحہ پر مخلوق
کی حمد و ثنا کی خواہش وغیرہ کا ہونا۔ لہٰذا ان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی ان برائیوں کو
(مثلاً عجب و ریا) ظاہر کردو۔ ورنہ یہی سبب انقطاع بن جائے گا۔ پس اس سے خلاصی کیلئے
ایک تو مجاہدہ کرنا ہوگا اور دوسرے کثرت ذکر۔ اب اگر اس پر وحدت افعال ظاہر ہو چکا ہے تو
پھر اس سے عجب و ریا کا تو خاتمہ ہی ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ اس وقت کسی عمل کو اپنا سمجھے ہی
گا نہیں تو عجب کس پر کرے گا وہ تو ہمہ وقت اپنے خالق و مولا کی حمد و شکر ہی میں لگا رہے گا۔ اور اس
بات سے ڈرتا رہے گا کہ اگر شکر میں کوتاہی ہوئی تو یہ دولت ہی سلب ہو جائیگی۔ پس عجب و ریا تو نہ ہوگا
البتہ اس مقام میں خواطر۔ وساوس۔ افکار کی کثرت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ذکر جہر کے ذریعہ انھیں دور
کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا رہے جن و انس میں سے ہر اس قاطع سے جو اللہ تعالیٰ سے اس کو
قطع کردے۔ یہ بیان نفس لوامہ کا تھا۔ اب نفس مطمئنہ کے بارے میں سنیئے:-

نفس مطمئنہ کی صفات میں سے جود و توکل ہے۔ عبادت اور تذلل ہے۔ رضا اور شکر ہے
خشیت اور اتباع سنت ہے۔ اس طور پر کہ امور تکلیفیہ سے ایک بالشت بھی ادھر ادھر نہ ہو۔ اور
اللہ تعالیٰ کی صحیح عبودیت اختیار کر کے غیر اللہ سے غنائے تام حاصل کرنا ہے۔ اور سالک کے اس
مقام میں داخل ہونے کی علامت یہ ہے کہ تکلیفات شرعیہ میں اس کی کوشش زیادہ ہو جائے اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے ساتھ وہ متخلق ہو جائے۔ اس طرح سے کہ آپؐ کے اقوال
صحیحہ کی اتباع کئے بغیر اس کو چین ہی نہ آئے اسلئے کہ یہ مقام تمکین عین الیقین اور ایمان کامل
کا مقام ہے اور اس مقام میں ناظرین کی آنکھیں سالک کی زیارت سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔
اور اس کے اقوال کی جانب سامعین کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ ساری عمر کلام کرتا رہے تو
بھی اس سے ملول نہ ہوا جائے اور یہ اس لئے کہ اس کی زبان اس مقام میں ان حقائق اشیاء اور
اسرار شریعت کی ترجمان ہوتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں ڈالتے ہیں۔ چنانچہ کوئی کلمہ وہ

تکلم نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اللہ ورسول کے فرمان کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اور اس کا یہ سب بیان کرنا کسی کتاب کے مطالعہ یا کسی سے سننے کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ اور اس کے باطن میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آتی ہے انا سرک ایھا الحبیب وانت سری فقر عینا وطب نفسا (یعنی اے حبیب میں تیرا سر ہوں اور تو میرا سر ہے۔ پس اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر اور اپنے نفس کو خوش کر) اس وقت اس سالک کے قلب سے اضطراب دور ہو کر اس کو ایک قسم کا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے (چنانچہ اسی جہت سے اسکو مطمئنہ کہا جاتا ہے) اور اب وہ اس وقت حیا اور ادب کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے خشیت اور ہیبت کو لازم کر لیتا ہے۔ مخلوق کی قبولیت اور ان میں جو عزو وقار اسکو حاصل ہوتا ہے اسکی گدڑی کو تار کھینکیا ہے۔ اور عالم کون کی حقیقت اسپر منکشف ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد کل من علیھا فان کی حقیقی تفسیر سمجھ میں آجاتی ہے۔ پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ جب تم اس مقام میں پہنچو گے تو تمہارا میلان اوراد و ادعیہ کی جانب بھی ہوگا اور تمہارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کچھ اور ہی اندازکی ہو جائے گی جو اس سے پہلے والے مقام کی محبت سے مختلف ہوگی۔ اور یہ یاد رکھو کہ خبردار اس مقام پر پہنچکر دعوی کمال کبھی نہ کرنا۔ یعنی یہ نہ سمجھنا کہ میں ہو گیا ہوں۔ اور نفس سے چھوٹ گیا ہوں کیونکہ اس وقت تو تم نفس کے شر سے مامون ہو جاؤ گے اور اس کے کید سے مطمئن و غافل حالانکہ دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیئے اگرچہ وہ دوست ہی کیوں نہ ہو جائے ؎

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت

دام داں دگرچہ دانہ گویدت

اور اس مقام میں کبھی حب ریاست۔ شہرت اور اپنے آپ کو مشیخت اور ارشاد کے مقام میں ظاہر کرنے کا داعیہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ان میں سے کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے مت تجویز کر لینا۔ بلکہ اس سے بہت دور رہنا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ ہی تم کو مشیخت کا لباس پہنائیں اور حلیہ قبول سے آراستہ فرمائیں جس میں تمہارا کوئی دخل نہ ہو تو پھر اللہ کے حکم سے کام کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے نفس کے لئے نہیں اور جو کچھ کرو اللہ کی مراد سمجھ کر اور اللہ کے اختیار سے کرو۔ نہ کہ اپنی مراد اور اپنا اختیار سمجھتے ہوئے۔

اور علامت اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے مقام ارشاد پر تم کو فائز فرما دیا ہے۔ یہ ہے کہ تم اپنے سب بھائیوں کی نظروں میں محبوب ہو جاؤ۔ اور وہ سب کے سب تمہارے امر ونہی کے مطیع ہو جائیں بایں ہمہ تم اپنے لئے ان پر کوئی تمیز اور فوقیت۔ فخر و سلطنت نہ دیکھنا۔ بلکہ یہی سمجھنا کہ وہی سب لوگ تم سے افضل ہیں۔

پھر آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ جب یہ مقام تم کو حاصل ہو جائے یعنی تم اپنے نفس میں روحانی طمانیت پانے لگو اور تمہارا قدم کتاب و سنت سے بال برابر بھی نہ پھسلے بلکہ اتباع شریعت تمہارے گوشت پوست میں سرایت کر جائے گویا شریعت ہی تمہاری طبیعت بن جائے۔ تو تم کو الطاف الہی کا ہاتھ پورے طور پر جذب کر لیگا۔ (اور یہی یحببکم اللہ ہے) اور یہ جذب اس جذب کے مغائر ہوگا جو اول سلوک میں پیش آیا کرتا ہے۔ (اور وجہ مغایرت یہ ہے کہ یہ جذب اتباع کے بعد ہوا ہے یعنی اسکا سبب اتباع بنتا ہے۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور پہلا اتباع سے پہلے کا ہے) اور تمہارے نفس میں سر الستر کی لسان سے یہ ندا دی جائے کہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ اور پھر تم پر ایک خاص قسم کا نسیان طاری ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے تم دنیا اور آخرت کی کسی چیز کا ادراک ہی نہ کر سکو گے۔ بجز اس کے کہ وہ تمہارے سامنے ہو۔ اور جہاں وہ تم سے غائب ہوئی بس تم بھی اس سے غائب ہو جاؤ گے۔ اور یہ اس لئے کہ تمہارا قلب اس وقت جمال حق کے مشاہدہ میں علی الدوام مشغول ہو جائے گا۔ نہ اس سے تھکے گا اور نہ اس سے اس کو سیری ہی ہوگی۔ یہ بیان نفس مطمئنہ سے متعلق تھا جس کو صاحب ترصیع نے بیان کیا ہے۔

میں نے یہاں نفس کا بیان ذرا تفصیل سے اس لئے کیا ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اسکو مغلوب کرنا کس قدر زبردست مجاہدہ ہے۔ اس کی اہمیت کو حضرات صوفیہ نے سمجھا۔ اور لوگوں کو یہ سمجھا دیا کہ اسکو اگر زیر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف محبت سے یعنی جب اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو جائے گی تو نفس ختم ہو جائیگا۔ چنانچہ علم تصوف میں اصل یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح نسبت اور حقیقی رابطہ پیدا کیا جائے۔ اسی کی تحصیل کے لئے حضرات صوفیہ نے اپنے ذمہ تین چیزیں لازم کر لی ہیں۔ اخلاء خواطر۔ معالجہ اخلاق اور نفی غفلت۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ :-

لیس للمریدین کثرۃ الاوراد بالظاھر فان القوم فی مکابدۃ اخلاء خواطرھم ومعالجۃ اخلاقھم ونفی الغفلۃ عن قلوبھم لا فی تکثیر اعمال البر الذی لابد لھم منہ اقامۃ الفرائض والسنن الراتبۃ فاما الزیادات من الصلوات النافلۃ فاستدامۃ الذکر بالقلب	مریدین کا وظیفہ اوراد ظاہری کی کثرت نہیں ہے اس لئے قوم کا مجاہدہ تو بس تین چیزوں کا ہے۔ اخلاء خواطر ردیہ عن القلب یعنی قلب سے ردی وساوس کا ازالہ۔ معالجہ اخلاق اور نفی غفلت۔ باقی اور عبادات وغیرہ کی کثرت وغیرہ مطلوب نہیں بس جو ان کے لئے ضروری ہے وہ یہ کہ فرائض ادا کریں اور سنن رواتب (موکدہ) کا اہتمام کریں اور رہیں دیگر نفلی نمازیں تو قلب کو ذکر کے ساتھ مدام رکھنا یعنی

الحمد لله۔ ذکر قلبی کا اہتمام کرنا ان کے لئے کہیں زیادہ بہتر ہے۔
(قشیریہ صـ۲۰۱)

اب دیکھئے جن اشیاء کو یہ حضرات قوم کا وظیفہ فرما رہے ہیں ان میں سے کون سی چیز بدعت ہے۔ خواطر اور وساوس کا معاملہ تو معلوم ہی ہے کہ کس قدر اہم ہے۔ بعض مرتبہ ایک معمولی سا وسوسہ منجر بکفر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اخلاق کی درستگی کا مہتم بالشان ہونا بھی ظاہر ہی ہے۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحب رحؒ فرماتے ہیں کہ بدون اصلاح اخلاق کے سالک کے اندر وصول الی اللہ کی استعداد تک نہیں پیدا ہوتی۔ حضرت کا یہ ارشاد حدیث شریف سے موید ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ

ان العبد لیبلغ بحسن خلقہ عظم درجات الآخرۃ وشرف المنازل وانہ لضعیف العبادۃ وانہ لیبلغ بسوء خلقہ اسفل درک جہنم وانہ لعابدٌ	بلاشبہ بندہ اپنے حسن خلق کے ذریعہ آخرت کے بڑے بڑے درجات اور منازل پالیتا ہے حالانکہ وہ عبادت میں ضعیف ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اپنے سوء خلق سے جہنم کے نچلے طبقہ کا مستحق ہو جاتا ہے حالانکہ کثیر العبادت ہوتا ہے۔

اس سے کس قدر اخلاق کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا درجہ عبادت سے بھی بڑھا ہوا ہے اسی طرح سے نفی غفلت کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہے کہ یہ غفلت ذکر کے منافی ہے اور اسی کی وجہ سے حق تعالیٰ سے نسبت اور تعلق سے محرومی رہتی ہے۔

غرض تصوف میں مقصود تو یہی نسبت اور تعلق ہے باقی اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مشائخ نے اپنے اپنے طور پر بعض طریقے تجویز کئے ہیں۔ جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کا ماخذ شرع میں موجود ہے۔ چنانچہ اشغال و مراقبات مثل تصور شیخ وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں یعنی ذریعہ ہیں۔ مقصود نہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی رحؒ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقہ کے وضع کئے سو یہ سب مقدمات اسی کے ہیں کوئی طریق معین نہیں۔ ہر شخص کا طرز جدا گانہ ہے۔ مگر اس زمانہ میں ترک تعلق کو شرط کامل ٹھہرایا ہے ؎

نخست موعظ پیر محصل ایں سخن است
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

(مکتوبات رشیدیہ صـ۸۱)

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

نفی غفلت

تعلق حجاب است دبے حاصلی　　چو پیوند ہا بگسلی واصلی

ارواح ثلثہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ نقل کیا گیا ہے جس سے اس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ

" آدمی کے لئے سینکڑوں بت ہیں جو اسکو توجہ الی الحق سے مانع ہیں۔ کہیں اس کا دل مال میں اُلجھا ہوا ہے کہیں جاہ میں کہیں جورو میں کہیں اولاد میں کہیں معشوق میں الی غیر ذالک۔ غرضکہ اس کا دل ہزاروں مطلوبات میں مشغول ہے اور یہ مشغولی اسکو توجہ الی الحق سے مانع ہے۔ جب مشائخ نے جو اطباء روحانی ہیں اس مانع کو محسوس کیا تو اس کا علاج تصور شیخ تجویز کیا تاکہ اس کا قلب سب طرف سے ہٹ کر ایک مرکز پر آ ٹھہرے اور اس میں مقصود اصلی کی طرف توجہ کی استعداد پیدا ہو جائے۔ گو یہ تصور خود بھی بت یعنی غیر مقصود تھا مگر بضرورت جمع خاطر اسکو اختیار کیا گیا تھا جب ان کے افکار و خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر اس قابل ہو جاتے تھے کہ وہ مقصود اصلی و حقیقی یعنی حضرت حق کی طرف متوجہ ہو سکیں تو اس بت کو بھی توڑ دیتے تھے اور تصور شیخ کو بیچ سے ہٹا کر اس قلب کو براہ راست حق تعالیٰ سے وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ اصلی غرض تھی تصور شیخ کی اور یہ مقصد تھا اس کا۔

(ارواح ثلثہ)

چنانچہ جو حقیقی مشائخ تھے انھوں نے ہر چیز کو اپنی حد پر رکھا اور جو لوگ اس میں مدعی اور دخیل ہو گئے انھوں نے حدود کا لحاظ نہیں کیا بلکہ مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنا لیا۔ کیونکہ انکا مطلوب دین تو تھا نہیں اس لئے مشائخ کا بھیس پہنکر اور ان کے الفاظ چرا کر اپنا مطلب حاصل کیا اور اپنے مرتبہ سے بڑھ بڑھ کر دعاوی کئے جس کی وجہ سے پھر وصول ہی سے محروم رہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

حرف درویشاں بدزدد مرد دوں　　تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(کمینہ آدمی بزرگوں کے الفاظ چراتا ہے اور دوسروں کے سامنے نقل کرکے لوگوں کو مسخر کرنا چاہتا ہے)

اور صاحب رسالہ قشیریہ نے اس کو مریدین کے قلوب کے لئے مضر ترین شئے فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

ولا شئ اضر لقلوب المریدین من　　یعنی بشریت کے مغلوب ہونے سے قبل مریدین کے قلوب

حصول الجاہ قبل خمود بشریتھم ومن آداب المرید ان لا یسبق علمہ فی ہذہ الطریقۃ منازلتہ فانہ اذا تعلم سیر ہذہ الطائفۃ و تکلف الوقوف علی معرفۃ مسائلھم و احوالھم قبل تحققہ بھا بالمنازلۃ والمعاملۃ بَعُدَ وصولہ الی ہذہ المعانی۔

میں جاہ پیدا ہو جانے سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں ہے چنانچہ مرید کے آداب میں سے ہے کہ اس طریق میں اس کا علم اس کے مرتبہ سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے کیونکہ اگر اس کو صوفیہ کے سیر کا علم ہو گیا اور اس نے ان کے مسائل اور ان کے احوال کی معرفت ان کے ساتھ متصف ہونے اور ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے حاصل کر لیا تو پھر تو اس کا وصول ان احوال تک کبھی بھی نہ ہوگا۔

ولھذا قال المشائخ اذا حدثت العارف فجھلوہ فان الاخبار عن المنازل دون المعارف ومن غلب علمہ منازلتہ فھو صاحب علم لا صاحب سلوک۔ (قشیریہ)

اسی لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی عارف معارف کی خبر دے تو اسکو جاہل سمجھو اس لئے کہ خبر منازل (یعنی طے شدہ راہ) کی دی جاتی ہے معارف کی نہیں۔ اور جس شخص کو منازل کا پہلے ہی سے علم ہو گیا ہو وہ علم والا تو کہلائے گا مگر اسکو صاحب سلوک نہیں کہا جائے گا۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی صوفی اور ہوتے ہیں اور ڈینگ ہانکنے والے اور۔ چنانچہ میں یہاں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس سے میرا مقصد اصلی اور حقیقی تصوف کو سراہنا اور اسی کی نصرت کرنا ہے۔ تاکہ لوگ اہل طریق سے جو کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں۔ بدظن اور متنفر نہ ہوں اور ان کی شان میں بدزبانی کا معاملہ روا نہ رکھیں کہ یہ ان کے حق میں سراسر موجب حرمان و خسران ہے۔ باقی جو لوگ کہ صرف مدعیان طریق ہیں۔ حقیقی صوفی نہیں ہیں بلکہ صرف صوفیوں کا بھیس بنا کر اصلی تصوف میں تغیر و تبدل کر کے اسکو خلاف شرع بنا لیا ہے تو ان متصوفہ کی حمایت مجھے منظور نہیں اور نہ اس تصوف کے ہم موئد ہیں۔ کیونکہ جس جماعت نے کتاب و سنت کے بتلائے ہوئے راستہ کے خلاف راہ اختیار کر رکھی ہو تو اس پر تو خدا کو اعتراض ہے۔ خدا کے رسول کو اعتراض ہے۔ دین و شریعت کو اعتراض ہے اس لئے مسلمانوں کو بھی اس پر اعتراض ہونا ہی چاہیئے اور ایسے لوگوں کو آخرت میں جو سزا ملے گی وہ ملے گی ہی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ بھی ایک دنیوی عذاب ہے کہ مخلوق خدا کے دل میں ان کی جانب سے نفرت اور ان کے بارے میں زبانوں پر ملامت جاری ہے۔

حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ:-

"میرے نزدیک جو صوفی فقیہ (یعنی عالم) کی حالت پر انکار کرے (یعنی اسکو برا کہے) یقیناً مبتلائے قہر ہے اور جو فقیہ صوفی کی حالت پر انکار کرے (اسکو برا کہے) وہ بھی راندۂ درگاہ ہے۔ ہاں اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کر رہا ہو شریعت کے موافق نہ چلتا ہو تو پھر ایک دوسرے کو برا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں"

(البنیان المشید ص۱۵۸)

لہذا اب ایسے لوگوں کی نصرت جائز ہی کب ہے؟ اس لئے میری اس تمام تر گفتگو کا مصداق نہ تو متصوفہ زمانہ ہیں اور نہ رسمی تصوف ہے بلکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ اصلی تصوف اور حقیقی صوفیوں کے متعلق کہا ہے جو کہ متمسک بالشریعۃ تھے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے نور ایمان سے نہ معلوم کتنے قلوب کو منور کر دیا تھا اور اخلاص۔ اخلاق اور شفقت علی الخلق کے ذریعہ لوگوں کے قلوب میں گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ حضرات اس حدیث کے پورے پورے مصداق تھے کہ:-

"اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیلؑ سے فرما دیتے ہیں کہ میں اس بندہ سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر اس کے لئے آسمان اور زمین میں قبولیت رکھدی جاتی ہے اور وہ سب کو محبوب اور سب کے نزدیک مقبول ہو جاتا ہے"

میرا یہ خیال ہے کہ جن حضرات کو تصوف اور اہل تصوف پر انکار ہے وہ غالباً اسی دوسری ہی قسم پر ہوگا باقی جو حضرات کہ شریعت سے جس قدر قریب ہیں ان پر لوگوں کو اعتراض بھی کم ہوگا۔ تو یہ صحیح ہے شریعت ہی تو اصل ہے چنانچہ ہم بھی صوفیہ کی جو نصرت کر رہے ہیں وہ اسی لئے کہ ہم دیانتہً یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے قلوب میں شریعت کا پورا پورا احترام ہوتا ہے اور اس پر یہ حضرات پوری طرح عامل ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقی صوفیہ میں بھی ایک طبقہ ایسا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں تو صادق تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور تعلق بھی حاصل ہوا ہے۔ مگر عملاً کچھ تسامحات بھی ان سے ہوگئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم شریعت کا باب نہایت وسیع ہے اس کا احاطہ ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے بظاہر جو کوتاہیاں اس جماعت سے ہوئی ہیں اس کا سبب ان کی کج خلقی اور اس کا منشاء قلت علم تھا۔ چنانچہ انھیں کی وجہ سے تصوف بدنام ہوا یعنی اس جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اخلاق کا مظہر اور نمونہ ہونا چاہیئے تھا اس

تصوف کے بدنامی کی ایک وجہ

سے اس میں کمی ہوئی اسی لئے اس جماعت ہی کو لوگوں نے بدخلق مشہور کر دیا۔ اور سبب اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے تو ان کو محبت اور تعلق حاصل ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کے حقوق کی رعایت نہیں کی گئی بلکہ بہت سے لوگوں نے مخلوق سے تعلق کو خالق سے تعلق کے لئے حاجب اور مانع سمجھا اس لئے انھیں مخلوق سے ملنے ہی میں وحشت اور ایک قسم کی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ یہ لوگ تو اس پر مطمئن رہے کہ مخلوق ہم کو چھوڑ دے تو اچھا ہی ہے۔ خالق کے ساتھ ہمارا معاملہ یکسو رہے گا۔ لیکن مخلوق نے اسی کو ان کا نقص جانا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنے اس اعتراض میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ شریعت نے جہاں خالق کے حقوق کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہیں مخلوق کے حقوق ادا کرنیکی تاکید کی ہے۔ اللہ و رسول ؐ نے اس امر کو پسند نہیں فرمایا ہے کہ انسان ان کے حقوق اس طرح سے ادا کرے کہ مخلوق کا حق ہی فوت ہو جائے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ! مجھے یہ خبر پہونچی ہے کہ تم ہمیشہ تمام دن روزہ رکھتے ہو اور ساری راتیں نماز میں گذارتے ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ یہ کرو کہ روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ نماز بھی پڑھو اور سو بھی رہا کرو۔ اس لئے کہ تمھارے بدن کا تم پر حق ہے۔ اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمھارے اہل خانہ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان اور تمہارے پاس آنے جانے والے دوست احباب کا بھی تم پر حق ہے۔ اس کی شرح میں صاحب مرقات فرماتے ہیں کہ بدن کا تم پر حق ہے لہذا کھانے پینے اور سونے اور عبادت کرنے میں اس کی حفاظت رکھو۔ پس تمام ایام روزہ رکھنے میں اور ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنے میں قوی کا انحطاط اور بدن کا اختلال ہے۔ پس افراط و تفریط سے بچو۔ ایسا نہ ہو کہ تکثیر فی العبادت انقطاع عن العبادت کا سبب بن جائے۔ اور جو یہ فرمایا کہ تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسی طرح سے صیام و قیام کرتے رہوگے تو ان کے ساتھ سلوک اور حسن معاشرت نہ برت سکوگے اور ان کی خاطر مدارات اور خدمت نہ کر سکوگے یا تو اس لئے کہ کثرت عبادت سے تمہارا بدن ہی ضعیف ہو جائے گا۔ یا اس لئے کہ تمہارا سوئے خلق قوی ہو جائے گا۔

دیکھئے صاحب مرقات نے صوفیوں کا کیسا چور پکڑا سبحان اللہ یہی حضرات ہیں جو حقیقی معنی میں محافظ دین ہیں اس جماعت کی دکھتی ہوئی رگ ہی پکڑلی۔ فرماتے ہیں کہ تکثیر عبادت سے

انسان کا سوئے خلق قوی ہو جاتا ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے جو مذکور ہوئی کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ سے ایک ربط خاص اور اس کی اطاعت وعبادت سے انس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غیر اللہ کا تعلق اپنے معاملہ میں مخل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حضرات مخلوق سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ اور کبھی ان سے اُلجھ جاتے ہیں۔ اب لوگ بجائے اس کے کہ ان کو اس میں معذور سمجھیں یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ بدخلق ہیں اب واقع میں چاہے ایسا ہو یا نہ ہو۔ بہرحال اس کا ظاہر تو قابل اعتراض ہے ہی۔ اسلئے کہ اخلاق نبوی کے خلاف ہے۔ باقی اس کا منشاء ان لوگوں کا تعلیمات شرعیہ سے جہل ہے اور بلاشبہہ یہ لوگ ناقص ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا بھی حق پورا پورا ادا کیا جائے اور مخلوق کے حقوق بھی۔ گویا ایک ہاتھ میں اگر سندان عشق ہو تو دوسرے ہاتھ میں شریعت کا جام بھی رکھنا ضروری ہے۔ مگر ان دونوں کے ساتھ کھیلنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

غرض اس سے تو انکار نہیں کہ تصوف میں کامل درجہ یہی ہے کہ شریعت کی بھی پوری پوری رعایت کی جائے۔ اب اگر کسی سے اسکے علم کی کمی کی وجہ سے کچھ کوتاہیاں ہوگئی ہیں تو اس کی وجہ سے طریق ہی کی مذمت اور مطلقاً اس کا انکار کرنا تو صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ شکل تو دوسری جگہ بھی پیش آتی ہے مثلاً دیکھئے اسلام ایک دین ہے اس کے ماننے والے بہت سے لوگ ہیں لیکن کیا سب لوگ برابر کے درجے کے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اگر بہت سے لوگ کامل موجود ہیں تو ایک جماعت ناقص العمل بھی پائی جاتی ہے تو کیا اس کے فسق اور بدعملی کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا جا سکتا ہے؟ اس کا سرے سے انکار ہی کر دینا صحیح ہے؟ اسی طرح ایک مدرسہ میں بہت سے طلبا پڑھتے ہیں مدرسین ان کو پڑھاتے ہیں لیکن کیا سب ایک ہی استعداد کے نکلتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے عالم و فاضل ہوتے ہیں تو بہت سے ناقص الاستعداد اور جاہل رہ جاتے ہیں تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کے نقص و جہل کی وجہ سے کیا ان اساتذہ کی تعلیم پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب ایک استاذ کے تمام شاگردوں کا برابر ہونا ضروری نہیں اور کسی شیخ کے تمام مریدین کا یکساں ہونا لازم نہیں اور اس کی وجہ سے ان حضرات کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح تصوف کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک طریق و مسلک ہے جس کا مقصود تو شریعت ہی پر عمل کرنا

ہے اور ظاہری و باطنی کمال کے ساتھ انسان کو متصف گردانتا ہے۔ لہٰذا جو طالب صادق مخلص اور موفق من اللہ ہوتا ہے وہ تو صحیح راستہ پکڑ لیتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے اور جو لوگ اس درجہ کے نہیں ہوتے وہ اپنی راہ کچھ کھوٹی ہی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشائخ اپنے کو دھن دیتے ہیں لیکن ان کے پاس آنے جانے والے پورا خلوص نہیں اختیار کرتے تو اس میں مشائخ کا یا تصوف کا کیا قصور ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حقیقی تصوف شرع کے مزاحم نہیں ہے جیسا کہ حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ،

"بزرگو صوفیہ کے طریق کا منتہیٰ وہی ہے جو فقہاء کے طریق کا منتہیٰ ہے اور فقہاء کے طریق کا منتہا وہی ہے جو صوفیہ کے طریق کا منتہا ہے۔ جن گھاٹیوں میں پھنس کر فقہا مقصود کی طلب سے رہ جاتے ہیں انھیں گھاٹیوں میں صوفیہ بھی اپنے سلوک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دونوں کو مقصود سے روکنے والی ایک ہی چیز ہے یعنی غرض نفسانی اور حب دنیا و حب جاہ اور دونوں کو مقصود تک پہونچانے والی بھی ایک ہی چیز ہے یعنی اخلاص اور ماسوائے حق سے منہ پھیر لینا طریقت عین شریعت ہے اور شریعت عین طریقت ہے دونوں میں صرف لفظی فرق ہے اصل اور مقصود اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔"

(البنیان المشید ص۱۵۸)

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے ہر زمانہ میں علمائے ربانی کا احترام کیا ہے اور یہ سمجھ کر کہ جس طرح ہماری جماعت کے بہت سے لوگوں سے جو علوم شرعیہ پر حاوی نہیں تھے کچھ لغزشیں ہو گئیں ہیں اسی طرح جماعت علماء بھی چونکہ ہمارے حالات اور مقامات سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکی اس لئے انھوں نے بعض باتوں کو خلاف شرع سمجھتے ہوئے ہماری تکفیر تک کر دی تو ہم بھی ان کو اس میں معذور سمجھتے ہیں اور ان کے لئے ان کے اس فعل پر اجر تام کا حکم لگاتے ہیں چنانچہ امام الصوفیہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:—

وقد وقع لنا التکفیر مع علماء عصرنا ونحن نعذرھم فی ذلک لانہ ما قام عندھم دلیل علی صدق کل واحد من ھذہ الطائفۃ وھم مخاطبون بغلبۃ الظن وما اعتذروا بہ قولھم لو صدقت القوم فی کل ما

ہمارے لئے علماء عصر کے ساتھ واقعہ تکفیر کا پیش آیا (یعنی لوگوں نے ہماری تکفیر کی) اور ہم ان کو اس باب میں معذور قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس جماعت (صوفیہ) میں سے ہر ہر واحد کے صادق ہونے کی کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی (تو وہ ہر ایک کو صادق کیسے سمجھ لیں اور ان کو (شریعت سے) یہی خطاب ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کریں (اور ان کو غلبہ ظن اسی کا ہوا) اور منجملہ ان کے عذروں کے

يدعونه لدخل الخلل في الشريعة فلذلك سددنا الباب۔

اُنکا یہ مقولہ ہے کہ اگر ہم اس جماعت کی تمام دعووں میں تصدیق کرنے لگیں تو شریعت میں خلل واقع ہو جائے اسلئے ہم نے سدِ باب کرایا۔

قال الشيخ محي الدين ونعم ما فعلوه ونحن نسلم لهم ذلك ونصوبهم فيه ونحكم لهم بالاجر التام على ذلك ولكن اذا لم يقطعوا بان ذلك الولي مخطئ في مخالفتهم فان قطعوا بخطائه فلا عذر لهم فان اقل الاحوال ان ينزلوا الاولياء المذكورين منزلة اهل الكتاب لا يصدقوهم ولا يكذبوهم۔ اھ

(التنبيه الطربي ص۱۷)

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام خوب کیا اور ہم اس کو ان کے لئے مسلم رکھتے ہیں اور اس میں انکی تصویب کرتے ہیں اور اس میں انکے لئے اجر کامل کا حکم کرتے ہیں۔ لیکن اسی وقت وہ علماء اس بات کا حکم قطعی نہ کریں کہ یہ ولی انکے خلاف کرنے میں خطاوار ہے (کیونکہ انکے خلاف کرنے سے کسی نص قطعی کا خلاف لازم نہیں آتا جس پر قطعی حکم خطا کا کیا جاسکے) اور اگر اسکی خطا کا قطعی حکم کریں تو پھر انکے پاس (اسکا) کوئی عذر نہیں (کہ ظن کی مخالفت پر حکم قطعی کر دیا) کیونکہ ادنیٰ حالت یہ ہے کہ اولیاء مذکورین کو اہل کتاب ہی کے درجہ میں رکھیں کہ نہ انکی تصدیق کریں نہ تکذیب کریں (جیساکہ حدیث میں آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جو تکفیر میں معذور قرار دیا ہے اس سے بھی مراد تکفیر ظنی ہے نہ کہ تکفیر قطعی۔)

اب دیکھئے اس سے زیادہ شریعت اور اہل شریعت کی کیا عظمت ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ تو ان کی تکفیر کر رہے ہیں اور یہ حضرات ان کو معذور بلکہ ماجور قرار دیتے ہیں اور ان کے فتویٰ کو تسلیم اور ان کے فعل کی تصویب فرما رہے ہیں۔ محض اسوجہ سے کہ منشا ان کے اس حکم کا شریعت کی حفاظت تھی۔

اتباع شریعت اور اہتمام سنت میں ان حضرات کے واقعات بے شمار ہیں۔ ہم یہاں چند واقعات بیان کرتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ شریعت کا اہتمام یہ حضرات کس قدر فرماتے تھے۔

اتباع شریعت کے واقعات

(۱)

دلیل العارفین میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے حوالہ سے خواجہ معین الدین چشتی رح کا ملفوظ نقل کیا گیا ہے۔

فرمایا کہ ایک وقت ہم اور خواجہ اجل بیٹھے تھے۔ نماز مغرب کا وقت تھا خواجہ تازہ وضو کرنے

تھے انگلیوں میں خلال کرنا ان سے سہواً فراموش ہوگیا۔ ہاتف غیبی نے آواز دی اور ان کے کان مبارک میں کہا کہ اے اجل ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو اور ان کی امت سے کہلاتے ہو ان کی سنت کو تم نے ترک کیا۔ اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی کہ جس دن سے میں نے نداسنی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے متروک نہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک وقت خواجہ اجل کو بیحد متردد دیکھا۔ پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ جس روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے روز قیامت میں یہ منہ خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر دکھاؤں گا۔

(السنتہ الجلیہ ص۱۱)

ف :۔ دیکھئے خلال کے ترک پر اور وہ بھی سہواً پھر سنت مؤکدہ بھی نہیں صرف مستحب۔ کس قدر قلق ہوا ہے۔ کیا یہ حضرات احکام شریعت کے تارک ہو سکتے ہیں؟

(۲)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ راحت القلوب میں حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا ملفوظ نقل کرتے ہیں کہ پھر شیخ الاسلام نے دعاگو کی طرف منہ کیا اور فرمایا کہ اس راہ میں اصل دل کی حضوری ہے اور دل کی حضوری اس وقت میسر ہوگی جبکہ حرام لقمہ سے بچے گا اور اہل دنیا کی صحبت سے پرہیز کرے گا۔ (ص۱۹)

ف :۔ دیکھئے کھانے پینے میں اور صحبت نیک میں بھی پابندی شریعت کی کسقدر تاکید ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ جو مرید یا شیخ قانون مذہب اہل سنت والجماعت پر نہ ہوگا اور اسکی کیفیت وحالت وحکایت موافق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ نہ ہوگی وہ اس معنی میں راہزن ہے۔

ف :۔ کس تصریح کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے مذہب کے اتباع کی تاکید ہے جس سے تمام بدعات کا قلع قمع ہوتا ہے۔

دیکھئے ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کو شریعت کا کس قدر اہتمام تھا۔
ایک واقعہ اور سنئے :۔

(۳)

ایک بزرگ کتا پالے ہوئے تھے کوئی عالم صاحب ان کے یہاں تشریف لے گئے انھوں نے کہا حضرت حدیث شریف میں کتا پالنے کی ممانعت آئی ہے۔ یہ آتا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے اس میں رحمت کے فرشتے نہیں داخل ہوتے۔ حالانکہ حدیث شریف میں استثنا بھی آیا ہے، یعنی حراست کے لئے یا شکار وغیرہ کے لئے کتا پالنا جائز ہے۔ بہر حال ان عالم کی زبان سے ان بزرگ نے جونہی یہ سنا کتّے کو مخاطب کر کے کہا کہ بھیّا تم یہاں سے چلے جاؤ مولوی صاحب فرمارہے ہیں کہ نبی صاحب نے کتا پالنے کو منع فرمایا ہے یہ سننا تھا کہ کتا اٹھا اور ایک طرف کو چل دیا۔ پھر اس کے بعد کسی نے ان بزرگ کے یہاں اس کو نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں کہیں جاکر مرگیا یا کسی دوسرے شہر ہی چلا گیا۔ بہر حال ان بزرگ کا یہ عمل اور ان کی صحبت اور محبت کی وجہ سے کتے پر یہ اثر قابل عبرت ہے۔

(۴)

اسی طرح سے انوار العارفین میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں ہے کہ حضرت خواجہؒ کا حال کبھی جمال کا ہوتا تھا اور کبھی جلال کا۔ چنانچہ جب جمال کا غلبہ ہوتا تو اس میں اس قدر مستغرق ہو جاتے کہ اس دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر ہو جاتے۔ پس جب نماز کا وقت ہوتا تو حضرت خواجہ قطبؒ اور قاضی حمید الدینؒ ناگوری حضرت اقدسؒ کے سامنے دستہ بستہ کھڑے ہوکر بآواز بلند الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے۔ حضرت کو کچھ خبر نہ ہوتی دوبارہ خواجہؒ کے کان میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے اس پر بھی ہوش نہ آتا پھر یہ دونوں خدام حضرت کا کاندھا مبارک ہلاتے تب آنکھ کھولتے اور فرماتے سبحان اللہ شریعت محمدیؐ سے چارہ نہیں ہے۔ اللہ اللہ کہاں سے کہاں لے آئے یہ فرما کر وضو کرتے اور نماز ادا کرتے۔

فائدہ - دیکھئے ایسی مغلوبیت کی حالت میں بھی احکام شرعیہ میں کوتاہی نہیں کی۔ سبحان اللہ

(۵)

اسی طرح سے حضرت شیخ جلال الدینؒ پانی پتی کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ ایک بار سکر کے عالم میں ان کی زبان سے بعض الفاظ شطحیات کے نکلے جب صحو کے عالم میں آئے تو خادموں نے عرض کیا کہ زبان مبارک سے شریعت کے خلاف ایسی ایسی باتیں نکلی ہیں فرمایا کہ خدا کی پناہ میں تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گیا۔ اس کا کفارہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ جاڑوں کی ٹھنڈی ہوا تھی آدھی رات کے وقت دریائے سندھ کے کنارہ پر تشریف لے جاتے تھے اور برف کو توڑ کر جو پانی پر جما ہوتا تھا گلے تک پانی کے اندر ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر دوسرے کو ران پر رکھ کر یہ ذکر کرتے تھے۔ کہ دین محمدؐ قائم دائم۔ دین محمدؐ قائم دائم۔ جاڑے کی شدت سے تمام بدن پھٹ کر خون بہتا تھا۔

Scanned with CamScanner

مگر صبح کے وقت پھر غسل کر کے فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔ چھ ماہ تک اس مجاہدہ میں رہے حتی کہ حق تعالیٰ نے تسکین بخشی۔

سبحان اللہ کس قدر شریعت کا پاس ادب تھا۔ عظمت شرع کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔

(۶)

اسی طرح سے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں ہے کہ شیخ الاسلام شیخ فتح اودھی تین روز متواتر سماع میں مشغول رہے اور پانچوں وقت نمازیں ادا کرتے رہے تین دن کے بعد جب سکون ہوا تو احباب نے عرض کیا کہ تین دن گذرے ہیں دریافت فرمایا کہ نماز ادا ہوئی عرض کیا ادا ہوئی اسکے بعد شیخ محمد عیسیٰ جو حضرت کے خلیفہ تھے ان کے پاس یہ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ یہ نماز صحیح ہوئی یا نہیں شیخ محمد عیسیٰ نے جواب میں لکھا کہ حقیقت میں نماز تو وہی ہوئی جو حضرت مخدوم نے (اس حالت میں) ادا کی لیکن شریعت کی رعایت کیوجہ سے دوبارہ پڑھ لیں۔

دیکھا آپ نے ان حضرات کو شریعت کا کس قدر لحاظ تھا۔ حضرت شیخ کا یہ حال اور ان عالم کا یہ فتویٰ عدیم المثال ہے۔

(۷)

اسی طرح سیر الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ شرف الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے لب کے بال بہت بڑھ گئے تھے مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کو کاٹ دے۔ قاضی ضیاء الدین سنامی قدس سرہ نے چونکہ شریعت کا جوش دل میں رکھتے تھے ایک ہاتھ میں قینچی لی اور دوسرے ہاتھ سے ان کی ریش مبارک پکڑ کر ان کے لب کے بال کاٹ دیئے کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سے حضرت شیخ ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک بار شریعت محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے (اسلئے قابل قدر ہوگئی ہے) سبحان اللہ ان حضرات کو شریعت محمدی کے ساتھ کس درجہ شغف و تعلق تھا کہ جو چیز اسکی جانب منسوب ہو جاتی اس کا بھی یہ حضرات اس درجہ احترام فرماتے چنانچہ ان کا حال ہی یہ تھا کہ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔۔۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھ پر ناز کرتا ہوں کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے اپنے پاؤں پر گرتا ہوں کہ تیری گلی میں ہونچا ہے اور اپنے ہاتھوں کو ہر دم ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ اس نے تیرے دامن کو پکڑ کر تجھے میری جانب کھینچا ہے۔)

اس نوع کے صدہا واقعات ہیں جنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے قلوب میں شریعت کی عظمت علماء ظاہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اور یہ لوگ عمل بالشرع میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے اس لئے کہ صاحب دل ہوتے تھے

اور ان کے قلوب اخلاص سے معمور ہوتے تھے۔ اس جگہ ہم بس انہیں چند واقعات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

آخر میں ایک ضروری بات اور بیان کردینا چاہتے ہیں کہ اوپر جو مشائخ کے واقعات اتباع سنت کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں تو مشائخ محققین میں سے زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی رہی ہے۔ باقی کوئی کوئی بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جو اپنے عام احوال میں تو صادق ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی ان سے کوئی ایسا قول یا فعل بھی صادر ہو گیا ہے جس کو شریعت پر مطابق کرنا مشکل ہوا ہے بلکہ بعض تو نصوص شرعیہ کے صریح مزاحم معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً دہلی کے کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ رمضان شریف کا زمانہ تھا روزے سے تھے۔ کسی بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا لیکر پی گئے۔ اور یہ فرمایا کہ اس کی وجہ سے ساٹھ روزے کفارے کے رکھنے مجھے آسان معلوم ہوئے لیکن اسکی دل شکنی گوارہ نہیں ہوئی۔ یہاں بھی اشکال ہوتا ہے کہ مخلوق کی دل شکنی کا تو خیال آیا لیکن حق تعالیٰ کی حکم شکنی کی شناعت نظروں سے اوجھل رہی۔ یہ کب جائز تھا۔

غرض اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے عدم احترام شرع معلوم ہوتا ہے تو اس کے متعلق کلی جواب یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمان اس کا مکلف ہے کہ اپنے اقوال و افعال و احوال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا کرے اور ان سب کو شریعت پر پیش کر کے ان کو شریعت کے مطابق کرے شریعت کی نص خواہ اللہ تعالیٰ کی ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب پر مقدم ہے۔ حضرات مجتہدینؒ فرماتے ہیں کہ اترکوا قولی بخبر الرسول یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مقابلے میں میرے قول کو چھوڑ دو۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام العشاق یطوی ولا یروی یعنی اہل محبت اور مغلوب الحال بزرگوں کی باتیں انھیں کے لئے تہ کر کے رکھ دیجائیں گی۔ ان کی روایت اور اشاعت نہیں کی جائیگی۔

پس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ عشاق کے حال کو ان کے لئے مسلم رکھا جائے گا اور معذور قرار دیا جائے گا بشرطیکہ دلیل سے ان کا صدق معلوم ہو۔ ایسے حضرات کا اتباع نہ کیا جائے گا۔ اتباع نصوص ہی کا کیا جائے گا۔ ورنہ دین میں بڑا رخنہ پیدا ہو جائے گا۔ بلکہ اسی اصول کے پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ایک بڑا رخنہ پیدا ہوگیا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ اور اس میں شک نہیں کہ جامع شریعت و طریقت ہوتا ہے مشکل کام اور ایک اعلیٰ اور رفیع مقام ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے میں عشق کا سندان، پس ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے کہ دونوں کو باہم اچھا لے اور ٹکر نہ ہو)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

نسبت صوفیہ

(حصہ اول)

فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی کتاب القول الجمیل میں لکھا ہے کہ:-

ثم لصاحب المداومة علی السکینة احوال رفیعة تنوبه مرة ومرة فلیغتنمها السالک ولیعلم انها علامات قبول الطاعات وتاثیرها فی صمیم النفس وسویداء القلب۔

(شفاء العلیل ص۹۵)

جاننا چاہیئے کہ سکینہ پر مداومت کرنے والے کے لئے حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو نوبت بہ نوبت اسکو ملتے ہیں۔ لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ اپنے ان حالات رفیعہ کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعات کے عنداللہ مقبول ہونے اور ان کے باطن نفس میں اثر کرنے کی علامات ہیں۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سکینہ کسے کہتے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ سکینہ کو جانتے ہیں اور نہ صاحب سکینہ کو پہچانتے ہیں اور نہ احوال رفیعہ ہی سے واقف ہیں اور یہ اس لئے کہ آج اس طریق کو لوگوں نے بدنی سمجھ رکھا ہے۔ یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو پا جاؤ تو بس اس کے بدن پر گرو اسی سے کامیاب ہو جاؤ گے باقی اس میں کسی چیز کے جاننے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اس بات کو اکثر کہا کرتا ہوں اس لئے کہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں نے طریق کے علم و عمل کو بالائے طاق رکھدیا ہے اور لطف یہ کہ پیری و مریدی بھی باقی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کیونکہ مرید تو اسے کہتے ہیں جو اپنی رائے اور ارادہ کو فنا کر کے کسی کامل و مکمل شیخ سے اس لئے تعلق قائم کرے کہ وہ اسکو اس کے رعونت نفس (انانیت) سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا عارف بنادے اور شیخ کے متعلق ابن عربیؒ اپنے زمانہ کا حال لکھتے ہیں کہ:-

Scanned with CamScanner

ان الزمان مشحون بالدعاوی الکاذبۃ العریضۃ فلا مرید صادق ثابت القدم فی سلوکہ ولا شیخ محقق ینصحہ فیخرج من رعونۃ نفسہ واعجابہ برایہ ویعرب لہ عن طریق الحق فالمرید یدعی الشیخوخۃ والریاسۃ وھذا کلہ تخبیط وتلبیس +

زمانہ لمبے چوڑے جھوٹے دعووں سے بھرا ہوا ہے نہ کوئی مرید ہی صادق اور سلوک میں ثابت قدم نظر آتا ہے اور نہ کوئی شیخ ہی محقق نظر پڑتا ہے جو کہ مرید کی خیر خواہی کرے اور اس کو نفس کی رعونت اور خود رائی سے نکالے اور طریق حق اسکے سامنے ظاہر کرے (چنانچہ جب کوئی شیخ کامل نہیں رہ جاتا تو پھر) مرید ہی شیخوخت اور بڑائی کا مدعی ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب خبط و تلبیس ہے۔

(آداب الشیخ والمرید ص)

لہذا شیخ محقق جب اُس زمانہ میں نایاب تھا تو اب ظاہر ہے کہ اِس زمانہ میں جو کہ پہلے زمانہ سے یقیناً اچھا نہیں ہے شیخ کامل کے وجود کا کیا حال ہوگا۔ پھر جب شیخ ہی کا وجود نہیں ہوگا تو مرید کہاں سے آجائیں گے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں پیر بہت ہیں اور مرید کا پتہ نہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ مرید بہت ہیں اور پیر کا پتہ نہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے۔

اصل یہ ہے کہ طریق سے جہالت اور دین سے عدم مناسبت (بے مناسبتی) کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بھی خبر نہیں کہ طریق میں مقصود کیا ہے اور کون کون سی چیزیں غیر مقصود ہیں۔ اس نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مقصود کو تو چھوڑ ہی دیا اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا۔ اسی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شیخ اور پیر جو کہ وسیلہ اور ذریعہ تھا اسکو مقصود سمجھ لیا گیا۔ اور اس کے بدنی قرب کو کافی سمجھا گیا اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور شیخ جس نور اور دولت کا حامل ہوتا ہے اس کی جانب اصلاً توجہ نہیں ہی۔

طریق کا مقصد اور اس کا منتہا کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اسکے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی کتاب میں نہایت عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اسی سے آپ کو سکینت کی تعریف بھی معلوم ہو جائے گی جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا ہے۔ اس لئے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت نقل کرتا ہوں اس کے بعد اسکی مزید توضیح کرونگا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :-

مرجع الطرق کلھا الی تحصیل ھیأۃ نفسانیۃ تسمی عندھم

تمام مشائخ کے طریقوں کا مرجع یعنی مقصد منتہیٰ اور حاصل ایک ھیئت نفسانی کی تحصیل ہے جسکو صوفیہ سکینت کہتے ہیں (یہاں نفسانی

بالنسبۃ لانہا انتسابٌ وارتباطٌ بالله عزوجلّ وبالسکینۃ وبالنوّر وحقیقتہا کیفیۃٌ حالّۃٌ فی نفس الناطقۃ من باب التشبیہ بالملائکۃ او التطلع الی الجبروت (القول الجمیل)

سے مراد شہوانی نہیں ہے جو کہ روحانی کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ نفس سے مراد یہاں نفس ناطقہ انسانی ہے۔ پس ہیئت نفسانی کا مطلب ہوا کہ انسان کے نفس میں حاصل شدہ ایک کیفیت اور حالت) اسلئے کہ اس کے ذریعہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت اور ارتباط حاصل ہوتا ہے اسی نسبت کا ایک نام سکینہ ہے اور اسی کو نور بھی کہا جاتا ہے اور نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کیفیت کا نام ہے جو نفس ناطقہ میں حلول کرجاتی ہے جسکے سبب سے نفس کے اندر ایک ملکی شان پیدا ہو جاتی ہے اور عالم بالا سے باتیں اخذ کرنے کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات۔ طہارت اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اسکی وجہ سے اسکے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی ملکہ کا نام نسبت۔ سکینہ۔ اور نور ہے اور حصول نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہوگئی اور اسکو حق تعالیٰ سے تعلق ہوگیا۔ ورنہ حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے۔ جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال (یعنی نسبت) حاصل ہے جسکی نہ تو کیفیت کا بیان ہو سکتا ہے اور نہ کسی چیز پر اسکو قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن اس نسبت کے حصول کے طریقے الگ الگ ہیں اور نسبت بطور قدر مشترک کے سبھی طرق میں پائی جاتی ہے اور وہ ایک ہی ہے جیسا کہ شفاء العلیل میں ہے کہ :—

"حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق اور محبت اور کسر نفس کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ملکہ تو یہ حاصل ہوگا اور نسبتیں بے شمار ہیں چنانچہ اشغال قادریہ چشتیہ اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام و مواظبت اور اس کے اندر استغراق ہے تاکہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے (تاکہ اس کے بعد پھر غفلت اور ذھول کی گنجائش باقی نہ رہے اور ملکہ کیوجہ سے احکام شرعیہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے اور ملکات سیئہ کا اثر نہیں ہونے پاتا۔)

آگے شاہ صاحب بطور دفع دخل کے یہ فرماتے ہیں کہ سلاسل اربعہ میں اشغال صوفیہ سے مقصود نسبت

کی تحصیل ضرور ہے لیکن حصول نسبت ان میں منحصر نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

ولا تظنن ان النسبة لا تحصل الا بھذہ الاشغال بل ھذہ طریق لتحصیلھا من غیر حصر فیھا۔ وغالب الرای عندی ان الصحابة والتابعین کانوا یحصلون السکینة بطرق اخری فمنھا المواظبة علی الصلوات والتسبیحات فی الخلوة مع المحافظة علی شریطة الخشوع والحضور و منھا المواظبة علی الطھارة وذکر ھاذم اللذات وما اعد اللہ للمطیعین لہ من الثواب وللعاصین لہ من العذاب فیحصل انفکاک عن اللذات الحسیة وانقلاع عنھا ومنھا المواظبة علی تلاوة الکتاب والتدبر فیہ واستماع کلام المواعظ وما فی الحدیث من الرقاق +
(القول الجمیل)

یہ گمان نہ کرنا کہ نسبتِ مذکورہ کی تحصیل کا ذریعہ محض یہی اشغال صوفیہ ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال بھی تحصیل نسبت کا ایک طریقہ ہے جسطرح سے اسکے اور بھی طریقے ہیں چنانچہ ظن غالب اس فقیر کا یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس نسبت اور سکینہ کو دوسرے طریقوں سے حاصل کیا کرتے تھے مثلاً ایک طریق اس کا یہ تھا کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور خلوت میں تسبیحات کا التزام اور اہتمام فرماتے تھے اور ان تمام امور میں خشوع اور خضوع اور حضور قلب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ نیز ایک طریقہ تحصیل نسبت کا یہ بھی تھا کہ (ظاہری و باطنی) طہارات پر مداومت رکھتے تھے اسی طرح سے لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت کا ہمیشہ استحضار رکھتے تھے نیز اللہ تعالیٰ نے مطیعین کیلئے جو اجر و ثواب اور انعام و اکرام تیار کر رکھا ہے اور نافرمانوں کیلئے جو عذاب و شدائد مہیا کر رکھے ہیں۔ ان سب کو برابر پیش نظر رکھتے تھے جسکی وجہ سے لذات حسیہ سے وہ بالکلیہ چھوٹ جاتے تھے اور ان سب چیزوں نے انکے قلب سے عیش دنیا کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اسی طرح سے ایک طریقہ حصول نسبت کا پابندی کیساتھ کتاب اللہ کی تلاوت اور اسکے معنی میں غور کرنا اور واعظ و ناصح کی بات پر کان دھرنا اور صمیم قلب سے اس کا سننا تھا اسیطرح سے حدیث شریف کے وہ مضامین جن سے قلوب میں نرمی پیدا ہو ان کا سننا بھی تھا۔

دیکھئے شاہ صاحبؒ نے طرق تحصیل نسبت کی یہاں کیسی وضاحت فرما دی یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام نسبت کی تحصیل ان ہی تمام چیزوں سے فرماتے تھے ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی ہو رہی تھی کہ حصول نسبت کا ذریعہ صرف مشائخ کے اذکار و مراقبات ہی ہیں حالانکہ وہ بھی ایک طریق ہے اس میں انحصار نہیں ہے۔

اس سے قبل شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ :-

والغرض من الاشغال تحصیل نسبة والمواظبة علیھا والاستغراق

اشغال صوفیہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل اور اس پر دوام اور مواظبت اور اس میں مستغرق رہنا ہے تاآنکہ نفس

فیھا حتی تکتسب النفس منھا ملکۃً راسخۃً۔ اس مواظبت اور مداومت سے ملکہ راسخہ کسب کر لے۔

اور اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں (جہاں اُن امور کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ حضرات صحابہ وتابعین تحصیل نسبت فرماتے تھے) کہ:۔

وبالجملۃ فکانوا یواظبون علی ھذہ الاشیاء مدۃً کثیرۃً فتحصل ملکۃٌ راسخۃٌ وھیئۃٌ نفسانیۃٌ فیحافظون علیھا بقیۃ العمر وھذا المعنی ھو المتوارث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من طریق مشائخنا لا شک فی ذلک وان اختلف الالوان واختلفت طرق تحصیلھا+

حاصل کلام یہ کہ حضرات صحابہ وتابعین اشیاء مذکورہ (یعنی اعمال شرعیہ) پر ایک کثیر مدت تک مواظبت و دوام فرماتے تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر تقرب الی اللہ کا ایک ملکہ راسخہ اور ہیئت نفسانیہ حاصل ہوجاتی تھی۔ اسی پر یہ حضرات بقیہ عمر محافظت فرماتے تھے جسکا اثر یہ ہوتا تھا کہ کیفاً وہ نسبت اور بڑھتی جاتی تھی۔ یہی وہ نسبت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ کے واسطہ سے متوارث چلی آرہی ہے جس میں ذرا بھی شک نہیں۔ اگرچہ الوان اس کے مختلف و تحصیل کے طریقے رنگ برنگ ہیں۔

(القول الجمیل)

اس میں تصریح ہے کہ سلف ملکۂ راسخہ حاصل کرتے تھے اور بقیہ عمر اس پر مداومت کرتے تھے۔ فقط نماز۔ روزہ پر بدون اس ملکہ کی تحصیل کے قناعت کئے ہوئے نہ تھے جیسا کہ اب ہے۔ بلکہ جب تک یہ ملکہ ان کو حاصل نہ ہوجاتا اسکی طلب میں گرما گرمی رہتی تھی اور جب یہ حاصل ہوجاتا تھا تو یہ نہیں کہ ان کو سکون ہوجائے اور وہ غافل اور سست پڑجائیں ایسا نہیں تھا بلکہ اپنے امور باطنی میں اور زیادہ مستعد اور چاق و چوبند ہوجاتے تھے ؎

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اُسکو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

حضرت شاہ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تحصیل ملکہ راسخہ متوارث اور منقول چلا آرہا ہے جس طرح کہ نماز روزہ ملکہ کل دین منقول چلا آرہا ہے۔ اور فرما رہے ہیں کہ لا شک فی ذلک پس یہ قطعی اور اجماعی مسئلہ ہوا ہر قرن کا۔

اسی سلسلہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح سے یہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل چلی

آرہی ہے۔ اسی طرح سے اخلاق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث چلے آرہے ہیں یعنی آپ کے اخلاق سے صحابہ متخلق ہوئے اور پھر ان سے تابعین اور پھر ان سے تبع تابعین اسی طرح مسلسل۔

لہٰذا جس طرح نسبت کی تحصیل ضروری ہے اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بتائے ہوئے اخلاق کے ساتھ اتصاف بھی ضروری ہے اور میں تو اس چیز کو بہت دنوں سے سمجھ چکا ہوں بلکہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں دین اور دنیا دونوں کی فلاح حاصل کرنے کیلئے بجز تسنن بسنتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی صورت نہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی پر چل کر اور اُسے اختیار کر کے آج ہمیں دنیا کی بھی فلاح مل سکتی ہے ورنہ تو اہل دنیا پر فلاح کا دروازہ بند اور عافیت تنگ ہوگئی ہے اور ہوتی جائیگی۔ چنانچہ آج لوگ جو فساد منزل بلکہ فساد مدینہ کے فتنوں سے مفتون ہیں۔ اور یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس قدر عوام پریشان ہیں۔ خواص بھی اسی طرح سے پریشان ہیں۔ اور اسباب راحت کے موجود ہوتے ہوئے بھی سکون معدوم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خدائی عذاب ہے جو مخلوق پر ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں مسلط کیا گیا ہے لہٰذا اس عذاب اور ان فتن سے خلاصی کی صورت اور تدبیر اور حضرات کے نزدیک جو ہو اسکو وہ جانیں مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا فساد اور نظام عالم کی جملہ خرابیوں کی اصل یہ ہے کہ فلاح عالم کے خدائی اصول اور صلاح عالم کے نبوی طریق کا رشتہ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے اور وہ رشتہ یہی تھا کہ علاوہ دین کے دنیوی امور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کے ساتھ تسنن کیا جاتا (چنانچہ اس کے مخاطب وہی حضرات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں آپ کی تصدیق کرتے ہیں) یہ نقلاً تو ثابت تھا ہی کیونکہ یہ بھی اُن امور میں سے ہے جو متوارث چلے آرہے ہیں علاوہ ازیں عقلاً بھی، ہم آج اپنے حالات میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جو چیز اس درجہ ضروری تھی وہ متروک ہی نہیں بلکہ اس کا انکار ہو رہا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نماز روزہ باقی ہے اور یہ چیز باقی نہیں خون کے آنسو اس پر بہائے جائیں تو کم ہے کیا فقط نماز روزہ ظاہری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آرہا ہے خشک ہی۔ اس میں یہ برکا نہیں تھے یہ کیا خرابطہ ہے۔ یہ کہاں سے آیا؟ علماء نے اس کی تحصیل کو ضروری نہیں سمجھا اس لئے اس کا علم اور عمل ختم ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ حضرات صحابہ حسب مراتب سب کے سب اس نسبت کے حامل تھے اور ان کا باہمی تفاضل اور ان کے درجات کا تفاوت اسی نسبت کے تفاوت سے تھا جسے جسقدر زیادہ اور قوی نسبت حاصل ہوتی تھی اسی قدر وہ افضل اور بلند مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ نماز و روزہ ان کا عمل

Scanned with CamScanner

ظاہر تھا اور یہ نسبت اس کا باطن تھا اور یہ حضرات اس ظاہر و باطن دونوں ہی کے جامع تھے۔ اب صرف ظاہر دین تو کچھ ہے بھی مگر باطن اور روح ختم ہو چکی ہے۔

اور یہ جو فرمایا۔ کہ اس نسبت کے الوان اور طرق مختلف ہوتے ہیں تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سلف میں اس نسبت کی تحصیل کا طریق احکام شرعیہ کی پابندی تھی اور خلف میں اشغال وغیرہ اسکے لئے مقرر ہوئے مگر احکام شرعیہ ہر حال میں مقدم رہے۔

یعنی حضرات صحابہ تو اس نسبت کو مواظبت علی الصلوۃ و تسبیحات اور مواظبت علی الطہارۃ مراقبۂ موت اور ثواب مطیعین اور عذاب عاصیین کے استحضار وغیرہ سے حاصل کرتے تھے اور بعد کے مشائخ نے لوگوں کی استعداد کو ضعیف پایا۔ اور یہ دیکھا کہ محض ان امور کے کرنے سے اب یہ نسبت نہیں حاصل ہو رہی ہے تو انھوں نے اشغال و مراقبات کا اضافہ کر دیا۔ اور ان کے ذریعہ نسبت پیدا کرنی چاہی۔ یہ تو طرق کا اختلاف ہوا اور الوان کا اختلاف یہ تھا کہ مثلاً کسی نسبت میں محبت و شوق کا غلبہ ہوا اور کسی میں خوف کا، کسی میں فنا کا غلبہ رہا اور کسی میں بقا کا۔ تو بظاہر نسبت کے یہ سب الوان مختلف معلوم ہوتے تھے لیکن ان سب نے ہر ہر سالک کے اندر وہی حالت پیدا کر دی جس کا نام نسبت تھا چنانچہ جس میں محبت اور شوق کا غلبہ ہوا اس نے بھی معصیت ترک کیا اور اپنے تمام امور میں حق تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی اور جس کے اندر خوف کا غلبہ ہوا اس نے بھی معاصی سے نفرت اور طاعت سے رغبت کی یہی حال اور دوسرے الوان کا بھی ہوا۔ پس اس اختلاف کے باوجود مرجع سب کا واحد ہی رہا۔ یعنی ارتباط باللہ تعالیٰ جسکی تحصیل سب پر لازم تھی اور ہر شخص پر ضروری تھی۔ ان اشغال کے ذریعے نسبت کی تحصیل اور اس پر مواظبت اور اس میں استغراق اس درجہ کہ نفس ملکۂ راسخہ کا کسب کر لے اس لئے ضروری ٹھہری کہ جب نفس کو ملکۂ راسخہ حاصل ہو جائے گا تو پھر غفلت اور ذہول کی گنجائش باقی نہ رہ جائیگی اور اسی میں اسکی خیریت بھی ہے کیونکہ اگر ان اشغال کے ذریعے ملکۂ حسنہ طیبہ کا کسب نہ کیا گیا جس سے کہ طاعت میں سہولت اور معصیت سے نفرت ہو جائے تو اشغال دنیویہ میں انہماک کے سبب سے نفس ملکۂ خبیثہ سیئہ کسب کرے گا جس سے نجات ملنی دشوار ہو جائیگی۔ حتیٰ کہ یہ ظاہری طاعات (یعنی نماز روزہ) بھی اسکو اس سے نہ نکال سکیں گی کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ سب طاعات بھی کرتا رہے گا اور دوسری جانب اس کے نفس میں یہ ملکۂ خبیثہ بھی موجود رہے گا۔ جس سے خلاصی آخرت ہی میں ہو سکے گی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے نسبت کی توضیح اور اس کی ضرورت آپ کو معلوم ہو گئی، نیز یہ بھی

معلوم ہوگیا کہ اسی نسبت کا دوسرا نام سکینہ بھی ہے یہ مشائخ کی اصطلاح ہے باقی علمائے ظاہر بھی جو معنی نسبت سکینہ کے بیان کرتے ہیں وہ اسی کے قریب قریب ہے چنانچہ صاحب روح المعانی فانزل اللہ سکینتہٗ کے تحت لکھتے ہیں کہ وھی الطمانینۃ التی یسکن عندھا القلوب یعنی سکینہ اس اطمینان کا نام ہے جسے پاکر قلوب تسکین حاصل کریں اور پھر کچھ دور کے بعد باب الاشارہ میں لکھتے ہیں کہ :-

ثم انزل اللہ سکینتہٗ علی رسولہٖ وعلی المومنین الآیۃ ۔ وکانت سکینتہٗ علیہ الصلوٰۃ والسلام کما قال بعض العارفین من مشاھدۃ الذات وسکینۃ المومنین من معاینۃ الصفات +

حق تعالیٰ کے ارشاد ثم انزل اللہ سکینتہٗ علی رسولہٖ وعلی المومنین ۔ میں سکینہ جو آیا ہے اسکے متعلق بعض عارفین یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکینہ آپ کا مشاہدۂ ذات تھا اور مومنین کا سکینہ صفات کا معاینہ تھا۔ یعنی آپ اس حالت میں حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدے سے متلذذ تھے اور مومنین اللہ تعالیٰ کی صفات کا مراقبہ کرکے مطمئن تھے ۔ آگے فرماتے ہیں کہ ۔

ولھم فی تعریف السکینۃ عبارات کثیرۃ متقاربۃ المعنی فقیل ھی استحکام القلب عند جریان حکم الرب بنعت الطمانینۃ لخمود آثار البشریۃ بالکلیۃ والرضا بالبادی من الغیب من غیر معارضۃ واختیار +

مشائخ کیلئے سکینہ کی تعریف کے بیان میں مختلف تعبیرات ہیں ۔ عنوان مختلف ہیں لیکن معنی اور معنون قریب قریب کا ایک ہی ہے چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اس قوت قلبیہ کا نام ہے جسمیں اطمینان کی آمیزش ہو جو حق تعالیٰ کے حکم سننے کے وقت اور اس کی وجہ سے انسان کے بشری تقاضے بالکلیہ سوخت ہوجائیں اور پردۂ غیب سے جو چیز بھی ظاہر ہو بغیر کسی معارضہ کے اور بدون اپنا اختیار چلائے ہوئے انسان اس پر راضی ہو ۔

وقیل ھی القرار علی بساط الشھود بشواھد الصحو والتأدب باقامۃ صفاء العبودیۃ من غیر لحوق مشقۃ ولا تحرك عرق بمعارضۃ حکم وقیل ھی المقام مع اللہ تعالیٰ بفناء الحظوظ +

اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ حق تعالیٰ کے مشاہدے کی بساط پر فائز ہو اور خالص عبودیت کی اقامت کے ادب سے متأدب ہو اس طرح پر کہ اسکو ان کی ادائیگی میں نہ تو کچھ تعب ہو اور نہ کسی حکم سے معارضہ کی رگ پھڑکے اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے حظوظ کو فنا کرکے بقا باللہ حاصل کرلے ۔

(روح المعانی ص۹۴ ج۱۰)

اور جس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ و تابعین کے سلوک کا طریقہ اور تحصیل نسبت کے طرق اور ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے بھی نسبت احسان کے معنی بیان کئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

"ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر موجود جانکر حیا و شرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا۔ مقصد اصلی ہے اور یہی احسان ہے۔ باقی زوائد۔

اسی سلسلہ میں آگے صحابہ و تابعین کا سلوک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔

"سنو! کہ سلوک صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز محض عباد کا ہونا تھا۔ بندگی در بندگی عجز در عجز۔ توکل در توکل۔ ہمت اطاعت، و جان و مال کی بازی فی رضاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔ نہ استغراق تھا نہ فنا تھی —— متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہو جاوے۔ سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اسکے وجود سے موجود ہیں۔ بوحدت وجود یا بوحدت شہود علی خلاف بینہم۔

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہا راہ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالك الى حقيقة الحقائق واصل الاشياء۔ اور اس میں افناء اپنا اور اپنے علم انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔

اس راہ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے۔ گویا وہ کمالات اب کالعنقاء ہوگئے جس طرح سالک مجاہدہ کرکے کوئی مقام طے کرے ہنوز اس کے آثار کے سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی انکا حوصلہ و ملکہ ملاء اعلیٰ سے ناشی تھا اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں۔ مع ہذا راہ جذب ہے نہ درگاہ (یعنی جذب طریق ہے مقصد نہیں اسلئے) بعد طے راہ جذب کے وہی طریقہ صحابہ کہ عبدیت کا مقام ہے اختیار کرنا و عبادت و عاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے"

(مکتوبات رشیدیہ صفحہ ۲)

Scanned with CamScanner

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صحابہ کے سلوک کی جو تفصیل بیان فرمائی بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہوسکتا ہے بلا شبہہ حضرات صحابہ کا یہی حال تھا لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ وہاں نہ استغراق تھا نہ فنا تھی تو اسکی کچھ توضیح کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل ہوا حضرات صحابہ کا فنا اس قسم کا نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حضرات فنا سے عاری تھے۔ ایسا نہیں تھا۔ اُن حضرات نے بھی اپنے آپ کو کامل طور پر فنا کر دیا تھا۔ لیکن ان کے فنا میں سکر نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا۔ پورے فانی اور پوری طرح باہوش۔ اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے فنا میں سکر کا انداز تھا۔ آپ کے سامنے صحابہ کے فنا کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حضرت زید بن حارثہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی تھے ان کا نکاح حضرت زینبؓ کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن مزاج کی موافقت نہ ہوئی اور حضرت زیدؓ نے حضور سے شکایت کی اور کہا کہ میں ان کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضور نے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس نے میری خاطر سے اور اللہ اور رسول کے حکم سے تم کو اپنی طبیعت کے خلاف قبول کیا ہے اس لئے اب چھوڑ دینے کو وہ اور اس کے عزیز اپنی دوسری ذلت سمجھیں گے۔ اس لئے خدا سے ڈرو اور جہاں تک ہوسکے نباہ کی کوشش کرو لیکن موافقت نہ ہونی تھی نہ ہوئی اور آئے دن جھگڑے اور قضیے پیش آتے رہے ادھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ جاہلانہ رسم یعنی اپنے لے پالک کی بیوی کے ساتھ نکاح نہ کرسکنا اسکو اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے عملی طور سے ہدم کردے تاکہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا توحش باقی نہ رہے اس لئے جب زید نے ان کو طلاق دیدی اور عدت گذر گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان ہی پر کردیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا یعنی پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی

(بیان القرآن ص۱۵ ج ۹)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو یہ آیت سنائی اور پھر اس کے بعد ان کا شمار ازواج مطہرات میں ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

یہ واقعہ صحابہ کے سامنے پیش آیا اور اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب واقعہ تھا مگر وہ حضرات اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح فنا کر چکے تھے کہ اس کے متعلق زبان سے کچھ کہنا تو درکنار کسی کو خطرہ اور وسوسہ کے درجہ میں بھی کوئی خیال نہیں گذرا اس کی کوئی نظیر غیر صحابی میں تو مل ہی نہیں سکتی۔

اب اس سے بڑھ کر کیا فنا ہوگی کہ اپنی رائے کو اللہ اور رسول کی رائے اور ارادہ کے بالکل تابع کر دیا تھا اور فنا سے مراد حضرات مشائخ کی بھی ارادہ ہی کا فنا ہوتا ہے یا رذائل کا فنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں ان دونوں ہی کا بے مثال ثبوت موجود ہے۔

اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے جذب (یعنی نسبت) کے معنی یہ بیان فرمائے کہ رجوع السالک الی حقیقۃ الحقائق واصل الاشیاء اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس میں افنا، اپنا اور اپنے علم و انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔ نہایت عمدہ بات فرمائی۔ بلاشبہ نسبت میں فنا، علم اور فنا، ارادہ تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلقات سے بھی دل سرد ہو جاتا ہے۔ اور سالک کا مطلوب صرف ذات باری اور رضائے باری تعالیٰ ہو جاتا ہے اس مضمون کو حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ خلف الرشید حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے اپنے مکتوبات میں خوب خوب بیان فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طریق کو سالک کی نگاہوں میں محبوب کر دینے اور اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے اور حق تعالیٰ کی طلب میں سالک کو کھڑا کر دینے کا ان بزرگ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فنا کے مضمون کو تو اس دلکش عنوان سے بیان فرماتے ہیں کہ بس انسان کمر ہمت کس کر میدان میں کود ہی پڑے۔ چنانچہ مکتوب بست دوم مکتوبات جلد سوم میں صوفیا کرام کے طریق کی مدح فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اللہ تعالیٰ بہ جمعیت و عافیت دارد و برجادۂ شرع محمدی علیہ السلام و سنت احمدی مستقیم و مستدیم گرداند و از تعلقات دنیا و گرفتاری ماسوا محرر ساختہ در سراد قات معرفت و سراپردۂ قرب خویش انس و الفت دہد۔ ایں معنیٰ در عالم اسباب وابستہ بسلوکِ

اللہ تعالیٰ تمکو جمعیت خاطر کے ساتھ بعافیت رکھے اور شریعت محمدی اور سنت احمدی علیہ السلام پر مستقیم و مستدیم رکھے اور دنیوی تعلقات سے دور اور ماسوی اللہ کے علائق سے نفور رکھے اور اپنے قرب و معرفت کے سراپردہ کے ساتھ انس و محبت بخشے۔ (یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قرب خاص جسکا نام نسبت ہے) یہ چیز اس عالم اسباب میں حضرات صوفیہ علیہم ہی کے طریق

طریقۂ صوفیہ عالیہ است ایں بزرگواراں در محبت حق جل وعلا از خود و از غیر خود گسستہ اند و در عشق او از آفاق و انفس گذشتہ ماسوا را در راہ او درباختہ و باو ساختہ اند اگر حاصل دارند او را دارند اگر واصل اند باو واصل اند باطن شاں را بنہج انقطاع از دون او تعالیٰ روئے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند۔ بیاد شاں نیاید و از انانیت نفس بنوعے گذشتہ اند کہ عود کلمہ انا را بر خود تشرک می دارند۔ رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ و رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ خداوندا مرا ازیں قوم بگرداں یا از نظارگیان ایں قوم گرداں کہ قوم دیگر را طاقت ندارم۔ ہر کس کہ ہوس ایں راہ دارد و تخم ایں اندیشہ در دل می کارد باید کہ ہمہ چیز را گذاشتہ صحبت ایں اکابر اختیار نماید و جاں نثار لوازم طلبگاری کند و از ہر جا بوئے ازیں دولت بمشام جاں برسد از پئے آں شود خوش گفتہ بود ؎

بعد ازیں مصلحت کار دراں می بینم
کہ روم بر در میخانہ و خوش بنشینم

(مکتوبات ۴۸ ج ۳)

پر چلنے سے حاصل ہوسکتی ہے چنانچہ ان بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت میں نہ اپنے کو دیکھا اور نہ غیر کو بلکہ سب سے یک لخت خالی ہوگئے اور عشق مولیٰ میں اپنے نفس کو بلکہ سارے ہی جہان کو چھوڑ دیا اور ماسوی اللہ کو اللہ کے راستہ میں خیرباد کہہ کر خود کو ان کے ساتھ واصل کرلیا۔ اس طرح سے کہ اب اگر کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی سے واصل ہیں تو اسی سے واصل ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کے باطن کو ماسوی اللہ سے ایسا انقطاع کلی ہوجاتا ہے کہ اب اگر ماسوی کو سالہا سال یاد کریں تب بھی یاد نہ آوے اسی طرح سے نفس کی انانیت اور رعونت سے ایسا نکل جاتے ہیں کہ اب سے کے بعد لفظ 'انا' کا استعمال بھی ان کو شرک معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد باندھا تھا اسکو سچ کر دکھایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول نہیں کرتی۔ خداوندا تو مجھے بھی اسی قوم میں سے کردے یا کم از کم انکی زیارت کرنے والوں ہی میں سے بنادے کیونکہ ان دو کے علاوہ تیسری قوم میں ہونیکی طاقت نہیں رکھتا۔ اب جو شخص کہ طریق میں داخل ہونیکی ہوس رکھے اور طلب خدا کے خیال کا بیج اپنے دل میں بونا چاہے تو اسکو لازم ہے کہ تمام چیزوں کو ترک کرکے مشائخ طریق کی صحبت اختیار کرے اور لوازم طلب کے آگے اپنی جان نثار کردے اور جس جگہ سے بھی اس دولت کی خوشبو اسکے مشام جان میں پہونچے اسکی تحصیل کے درپے ہوجائے کسی نے خوب کہا ہے۔ اب اس کے بعد مصلحت کار اس میں سمجھتا ہوں کہ مے خانہ کے دروازہ پر جا پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گذار دوں۔ وقیل فی ہذا المعنیٰ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ایک دوسرے مقام پر قبض و بسط پر جو کہ سالک کے احوال میں سے ہیں اور طریق کے ارکان میں سے ہیں کلام کرتے ہوئے نسبت کے متعلق فرماتے ہیں کہ کبھی اس کا ضعف سالک کے قبض کا سبب

ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

گاہ بود کہ ایں بستگی بجہت ضعف نسبت باطن باشد وچوں نسبت قوت پیدا نہ کردہ است گاہے ظہور می کند وگاہے مستور می شود۔ درحالت بعد صوری وغیبت از مرشد پیش از ملکہ نہ شدن نسبت ایں ضعف روئے می دہد وعلاجِ آں صحبتِ راہبر است وتوجہ او تا نسبت قوت پذیرد وملکہ شود وبسر حد فنا رسد۔ (مکتوبات معصومیہ صفحہ ۱۶۴)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قبض کا منشا نسبت باطنی کا ضعف بن جاتا ہے کیونکہ نسبت جب قوی نہیں ہوتی تو کبھی اس کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی وہ مستور ہو جاتی ہے بالخصوص اس حالت میں جبکہ اپنے شیخ سے صوری اور ظاہری بعد بھی ہو چنانچہ جب تک نسبت کا رسوخ نہ ہو جائے یعنی وہ ملکہ نہ بنجائے اس سے پہلے شیخ سے جدائی اس قسم کے ضعف کا سبب بنجاتی ہے یعنی جب شیخ کی خدمت میں رہے گا تو نسبت میں قوت محسوس ہوگی اور جدا ہونے میں اس میں ضعف ہو جائیگا۔ اسکا علاج رہبر کامل کی صحبت اور اسکی توجہ ہے تاکہ نسبت قوی ہو کر ملکہ راسخہ ہو جائے اور سالک فنا کی حد تک پہونچ جائے۔

اس کے بعد توجہ شیخ اور صحبت کامل کو مدار کار (یعنی حصول نسبت اور ذریعہ تقویت نسبت) قرار دے کر اس پر نہایت ہی زور دار کلام کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نسبت کسی صاحب نسبت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

توجہ مرشد درصورت ثانیہ کہ بواسطۂ زلت ظلمتے طاری شدہ باشد نیز نافع است توجہ پیر کامل کوہ کوہ ظلمات وکدورات را از ہر راہ کہ پیدا شدہ باشد از مرید صادق بر میدارد وتطہیر باطن او می فرماید ودر قبض نیز ایں توجہ سود مند است بزودی در بسط می آرد وراہ ترقی را بروے می کشاید۔

مرشد کامل کی توجہ دوسری صورت میں بھی یعنی جبکہ کسی معصیت اور لغزش کے سبب نسبت میں تاریکی آجائے نافع ہوتی ہے اسلئے کہ شیخ کامل کی توجہ ایسی چیز ہے کہ اگر ظلمات کدورات کے پہاڑ کے پہاڑ ہر طرف سے نمودار ہو جائیں تو انکو بھی مرید صادق سے دفع کر کے اسکے باطن کی تطہیر کر سکتی ہے۔ اسی طرح سے شیخ کی یہ توجہ سالک کیلئے حالت قبض میں بھی مفید ہے چنانچہ بہت جلد اس میں بسط پیدا کر کے ترقی کا راستہ اس پر کھول سکتی ہے۔

وبالجملہ مدار کار بر صحبت وتوجہ است کہ با محبت وسپرد جمع شود از یکجانب محبت وسپرد واز جانب دیگر توجہ۔

حاصل کلام یہ کہ مدار کار وہ صحبت اور وہ توجہ ہے جو کہ محبت یعنی عقیدت اور سپردگی کے ساتھ جمع ہو جائے یعنی سالک کی جانب سے محبت اور حوالگی ہو اور شیخ کی جانب سے توجہ۔

محبت تنہا بے توجہ راہبر می تواند کہ نافع شود وترقی بخشد اما توجہ محض بے محبت

چنانچہ تنہا محبت بدون توجہ شیخ کے بھی راہبر بن سکتی ہے یعنی نافع ہو سکتی ہے اور ترقی دے سکتی ہے مگر محض توجہ شیخ بدون

قلیل النفع است۔

محبت طالب کے کچھ زیادہ نفع بخش نہیں۔

محبت است کہ معانی خفیہ پیر را جذب می نماید و کمالات مخصوصۂ او را بجذ دلی کشد و فنائی الشیخ بلکہ فنا فی اللہ پیدا می آرد و چوں از طرفین صفات مذکورہ پدید آید امید است کہ راہ ترقی کشادہ شود و بزودی بمنزل مقصود برسد و در راہ نماند

(ص ۱۶۵)

یہ محبت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ تنہا شیخ کی توجہ باطنی کو جذب کر لیتی ہے اور اسکے مخصوص کمالات کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور فنا فی الشیخ بلکہ فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرا دیتی ہے۔ اور اگر صفات مذکورہ یعنی محبت و توجہ جانبین سے ظاہر ہوتی ہیں تو اب حصول نسبت کے بعد امید قوی ہو جاتی ہے کہ ترقی کا راستہ کھل جائے اور جلد ہی منزل مقصود تک رسائی ہو جائے اور سالک راستہ ہی میں نہ رہ جائے۔

پھر آگے کچھ دور کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔

پس باعث توقف سالک و سد راہ او دریں طریق ہیچ نشد غیر از سستی طالب۔ طالب صادق کہ در صحبت کامل افتد و شرائط طلب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آورد امید است کہ البتہ واصل گردد۔

(مکتوبات معصومیہ ص ۱۶۶)

پس اس طریق میں سالک کے توقف کا سبب اور اس کے حق میں مانع اور سد راہ کوئی اور چیز نہیں ہے بجز سالک کی سستی کے چنانچہ جو طالب صادق کسی کامل کی صحبت میں پہونچ جائے اور وہ تمام شرائط بجا لائے جنھیں اکابر طریق نے مقرر کیا ہے۔ تو امید ہے کہ ضرور بالضرور واصل ہو جائے۔

اس میں اس امر پر تنبیہ فرمائی کہ شیخ کامل کو پا کر بھی اگر سالک کامیاب نہیں ہو رہا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ خود اس کے اندر کوئی علت اور مانع موجود ہے اور علی العموم وہ مانع طالب کی کاہلی اور سستی اور اس کا شرائط طلب کا نہ بجا لانا ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر سلوک کا مقصود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔

مقصود از سیر و سلوک شیخی و مریدگرفتن نیست مقصود ازان ادائے وظائف بندگی است بے منازعت نفس۔

سیر و سلوک سے مقصود پیر بننا اور مرید بنانا نہیں ہے بلکہ وظائف بندگی کا اس طرح سے ادا کرنا ہے کہ نفس کی آمیزش اور منازعت باقی نہ رہے۔

و نیز مقصود نیستی و گمنامی است و زوال رعونت و انانیت امارہ کہ معرفت بدان مربوط است ہر کہ باین کس رجوع

اسی طرح سے طریق کا مقصود نیستی اور گمنامی کی تحصیل اور نفس کی سرکشی اور خود رائی کو دور کرنا ہے اس لئے کہ معرفت کا حصول اسی کے ساتھ وابستہ ہے اور جب ایسا ہے تو جو

نمی کند و انابت می آرد اورا از حق باز داشتہ بخود مشغول می سازد و ہر کہ رجوع نمی آرد اورا بحق می دارد و ممنون او باید شد ۔

شخص ایسے شخص کی جانب رجوع ہو اور اس سے تعلق کا اظہار کرنے تو اس نے گویا اسکو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر کر اپنی جانب مشغول کر لیا اور جو شخص ایسے شخص کی جانب رجوع نہیں کرتا تو وہ اسکو حق تعالیٰ کے ساتھ رہنے کا موقع دیتا ہے لہذا اسکا شکر گذار ہونا چاہیئے ۔

یارب ہمہ خلق رابمن بد خو کن
واز جملہ جہانیان مرا یک سو کن
روئے دل من صرف کنی از ہر جہتے
در عشق خودم یکجہت و یک رو کن

اے اللہ تو ساری مخلوق کو مجھ سے برگشتہ کر دے
ایسا کہ وہ میری جانب رخ ہی نہ کریں اسطرح سے مجھے تمام دنیا والوں سے یکسو فرما دے
اور میرے دل کو ہر طرف سے پھیر دے
اور اپنے عشق میں مجھے یکسو اور ہمہ تن متوجہ فرما دے

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۶۸)

اس مکتوب میں حضرت خواجہ معصوم قدس سرہٗ نے اس امر پر تنبیہ فرمائی کہ سیر و سلوک کا مقصود یہ نہیں ہے کہ سالک بس پیری مریدی کرنے لگے اور اسی کو سلوک کا منتہیٰ سمجھ لے ۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کی منازعت و انانیت کو ترک کر کے وظائف بندگی کو ادا کرے اور حقوق عبودیت کو بغیر مشارک نفس کے انجام دے چونکہ وظائف بندگی (عبودیت کا ذکر آگیا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کچھ وضاحت کیجائے تو اس کے لئے شیخ ابو سعید کا کلام نقل کیا جاتا ہے ۔ وھو ھذا ۔

شیخ ابوسعید فرمودہ کہ سمعت الشیخ ابا الفضل محمد بن الحسن شیخ وقتہ الماضی لایذکر والمستقبل لاینتظر وما فی الوقت یعتبر وھذا صفۃ العبودیۃ ثم قال حقیقۃ العبودیۃ شیئان الافتقار الی اللہ تعالیٰ وھذا من اصل العبودیۃ وحسن القدوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو الذی لیس فی النفس نصیب ولا راحۃ ۔

حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے فرمایا کہ میں نے شیخ ابوالفضل محمد ابن حسن سے جو کہ اپنے وقت کے شیخ تھے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ گذرے ہوئے کو یاد نہ کرنا چاہیئے اور آئندہ کا انتظار نہ کرنا چاہیئے بس موجودہ حال کا اعتبار کرنا چاہیئے (اور اس کو غنیمت سمجھنا چاہیئے) اور یہی عبودیت کی صفت ہے پھر یہ فرمایا کہ عبودیت کی حقیقت دو چیزیں ہیں ایک تو افتقار الی اللہ تعالیٰ ہے اور یہی اصل بندگی اور اس کا اہم جزء ہے اور دوسری چیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا نہایت حسن خوبی کے ساتھ (یعنی اس سے مقصود امتثال اور فرمانبرداری ہو) نفس کا حظ اور اس کی راحت مطلوب نہ ہو ۔

توضیح اسکی یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھئے کہ ہر شئے کی ایک صفت ہوتی ہے اور اسکی ایک حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے ۔ صفت ایک خارجی چیز ہوتی ہے اور وہ چیز اسی صفت سے پہچانی جاتی ہے صفت ذات سے منفک ہوتی ہے

اور حقیقت عین شے ہوتی ہے جو کبھی منفک نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ ذاتیات کا ذات سے انفکاک محال ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سنئے۔ کہ عبودیت کی صفت یہ ہے کہ عبد ماضی و مستقبل سے قطع نظر کر کے مافی الوقت کا وظیفہ خواہ وہ جوارح سے متعلق ہو یا قلب سے ادا کرتا ہے یعنی عبادات، معاشرت، معاملات، اخلاق غرضیکہ جملہ طاعات میں سے جسکا وقت آئے اسکو فوراً ادا کرلے۔ اگر کبھی کہیں لغزش ہو جائے فوراً توبہ کرے۔ اسی کو کہا گیا ہے۔

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق نیست فردا گفتنش شرط طریق

اس کی مزید وضاحت اس عبارت سے ہوتی ہے کہ

حالات کی چار قسمیں ہیں۔ نعمت[۱] مصیبت[۲]۔ طاعت[۳]۔ معصیت[۴]۔ اسلئے کہ بندہ ان چار حالتوں میں سے کسی نہ کسی حال میں ضرور ہوگا۔ یا تو نعمت میں ہوگا یا مصیبت میں۔ یا عبادت میں یا معصیت میں اور ان چاروں حالتوں کے جو حقوق ہیں وہ حقوق اوقات کہلاتے ہیں۔ نعمت کا حق شکر۔ مصیبت کا حق صبر۔ عبادت و طاعت کا حق اللہ تعالیٰ کے فضل کا مشاہدہ۔ اور معصیت میں توبہ و استغفار و ندامت۔ پس کوئی وقت ایسا نہیں نکلے گا کہ اسمیں بندہ کے ذمہ حق نہ ہو۔ تو اگر یہ حقوق قضا ہو جاویں تو ان کی قضا ممکن نہیں ہے اسلئے کہ قضا کی حقیقت تو یہ ہے کہ عبادت کا جو اصلی وقت ہے وہ فوت ہو گیا ہے۔ اب ہم اپنے پاس سے وقت خرچ کر کے اس عبادت کو ادا کریں اور یہاں یہ صورت ممکن نہیں اسلئے کہ جس وقت کو تم نے ان حقوق کی قضا کیلئے تجویز کیا ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حق جدید اور امر محکم یعنی عبادت لازم ہے اسلئے کہ اس وقت میں بھی چار حالتوں میں سے کوئی حالت ہوگی اور حقوق وقت میں سے کوئی حق اللہ کا مثل صبر و شکر وغیرہ کے اس میں بھی لازم ہوگا اور جب اللہ کا حق جو اسوقت کے متعلق ہے تو اس میں ادا نہیں کر سکا تو غیر کا حق جو اسوقت کے سوا جو دوسرا وقت گزر گیا ہے جس کا وقت تو نے فوت کر دیا ہے۔ اسکا حق اس وقت میں کیسے ادا کریگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت کے اندر تم نے پہلے وقت کا حق قضا کرنا تجویز کیا ہے اس وقت کا بھی تو حق ہے جب تم اسکو ادا کروگے تو غیر وقت کا حق اس میں کیسے ادا کر سکتے ہو اور اگر غیر وقت کا حق ادا کروگے تو اس وقت کا حق فوت ہو جائیگا۔ غرض اس کی قضا کسی طرح ممکن نہیں پس بندہ کو لازم ہے کہ حق وقت کو فوت نہ کرے بلکہ ہر سانس پر حق وقت کو ادا کرتا رہے اگر نعمت ہے تو شکر میں قلب میں مشغول کرے اور اگر مصیبت ہے تو صبر میں لگے اور اگر عبادت و طاعت ہے تو اللہ کے فضل و احسان کا مشاہدہ کرے۔ اور اگر معصیت کی حالت ہے تو ندامت و استغفار میں مشغول ہو، اسی واسطے بزرگوں نے کہا ہے کہ صوفی ابن الوقت ہوتا ہے اور ابن الوقت ہونے کے یہی معنی ہیں کہ حقوق وقت ادا کرے۔ (اکمال الشیم ص۳۸)

یہانتک تو گفتگو صفت عبودیت سے متعلق تھی اب حقیقت عبودیت کو سمجھئے وہ یہ کہ یوں تو بندہ ہمہ وقت ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے ہی۔ یعنی کھانے میں، پینے میں، چلنے

ہیں، پھرنے میں، صحت میں، مرض میں، یسر میں، عسر میں، غرضکہ ہر ہر قدم پر اسکو افتقار ہے۔ اسی افتقار کا ہمہ وقت استحضار یعنی حقیقت عبودیت ہے۔ افتقار و احتیاج تو سبھی لوگوں کو ہوتی ہے مگر غافلین و منکرین کو اس کا استحضار و اعتراف نہیں ہوتا اسلئے وہ حقیقت عبودیت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہمہ وقت ہر چیز میں اپنے کو اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں اسلئے ان کو حقیقت عبودیت حاصل ہے۔ اس حقیقت عبودیت کا دوسرا جز حسن القدوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جز اول یعنی افتقار الی اللہ اس آیت سے ماخوذ ہے یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ ط واللہ ھو الغنی الحمید ۝ یعنی اے لوگو تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے۔ اور دوسرا جز اس آیت سے ماخوذ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

صاحب کشاف نے اس آیت کی دو تفسیر فرمائی ہے ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں اسوۂ حسنہ ہے یعنی آپ کی ذات بابرکات ہر اعتبار سے متوسّیٰ اور مقتدا بہ ہے۔ اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ آپ میں ایک ایسی خصلت ہے جس کا اقتداء اور اتباع کرنا چاہئے اور وہ مواسات بنفسہ ہے۔

اور دوسرے مفسرین نے بھی یہ دونوں تفسیریں نقل فرمائی ہیں مگر تفسیر ثانی میں آپکی اس خصلت اور صفت کی تعیین نہیں فرمائی۔ علامہ زمخشری نے اسکو متعین فرمادیا کہ وہ مواساۃ بنفسہ ہے۔ اور مراد اس سے جانی ہمدردی کرنا ہے یعنی آپ خود بنفس نفیس جہاد فرماتے تھے پھر کسی کی کیا مجال اور ہمت جو اس میں آپ کا اقتداء نہ کرے۔ چنانچہ حضرات صحابہ بھی اپنے جان پر کھیل گئے اور مالی قربانیوں کے ساتھ ساتھ جانی قربانیاں بھی جیسی کچھ پیش فرمائیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اس صفت میں تمام صحابہ سے بڑھے ہوئے حضرت صدیق اکبر رض تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خود ارشاد فرمایا کہ ما احد عندی اعظم یدا من ابی بکر آسانی بنفسہ ومالہ یعنی ابوبکر سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے۔ اسلئے کہ انھوں نے اپنی جان و مال دونوں سے میری ہمدردی کی۔ سبحان اللہ اس سے کسقدر فضیلت حضرت صدیق کی مفہوم ہوئی۔

تو جب حضور اقدس کی ذات شریف ہی قدوہ ہے پس ہر امر میں امت آپ کے اقتداء کی محتاج ہوگی۔ لہذا حقیقت عبودیت کا حصول اس وقت تک محال ہے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء نہ کی جائے گی سے

مپندار سعدی کہ راہ صفا ۔۔۔ تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اسلئے صفت افتقار میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ضروری و لازم ہوگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کا افتقار الی اللہ اور احتیاج باللہ حاصل تھی۔ جیسا کہ آپ کی دعاؤں سے ظاہر و باہر ہے:-

Scanned with CamScanner

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمارہے ہیں :- اللھم آت نفسی تقواھا وزکھا انت خیر من زکھا انت ولیھا ومولاھا۔ دوسری دعا یہ فرمارہے ہیں :- اللھم ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئاً فاذا فعلت ذلک بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل۔

ان ادعیہ میں آپ غور فرمائیے کہ کس انداز سے جناب قدس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عرض و معروض فرمارہے ہیں اور اپنی احتیاج و افتقار الی اللہ کا اظہار فرمارہے ہیں کہ دوسرا کوئی اسطرح کر ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ آدمی اپنے نفس و اعضاء (ہاتھ، پیر) کو اپنی ملک سمجھتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق بھی یہ فرماتے ہیں کہ لم تملکنا منھا شیئا یعنی آپ نے ان میں سے کسی کا ہمکو مالک نہیں بنایا۔ اسکے بعد ان سب کی ولایت اور سواء سبیل کی ہدایت کی درخواست فرماتے ہیں۔ یہ آپ کی انتہائی معرفت اور اعلیٰ درجہ کی انابت الی اللہ و فنا ہے۔ صوفیہ کے کلام میں فنا کا ذکر آتا ہے اور اس وصف کو انھیں حضرات کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے مگر اسکو کوئی فنا نہیں سمجھتا۔ حالانکہ فنا و بقا وغیرہ احوال جو صوفیہ کو ملے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے تو ملے ہیں۔ اس میں بھی یہ لوگ مستقل نہیں ہیں ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز ما چیز تست

یہ باتیں ضمناً آگئیں تھیں مگر تھیں مفید اور کارآمد اس لئے ان کا ذکر کیا گیا اب اصل مضمون سنیئے وہ یہ کہ خواجہ معصوم نے یہ فرمایا تھا کہ "مقصود از سیر و سلوک شیخی و مرید گرفتن نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعت نفس۔ تو میرے خیال میں یہ سکینہ ہی کی تعبیر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصود اور اس کا منتہیٰ تحصیل نسبت ہی ہے اور جب کسی میں یہ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ شخص خود کو فنا ہی کر دیتا ہے اور اسی میں انسان کی خیریت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے جیسا کہ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ :-

امید کہ آں برادر عزیز نیز بعافیت باشند و بجمعیت صوری و معنوی متحقق بوند واز لفظ بمعنی آیند و از ظل باصل گرایند و از ظل باصل شاہراہ است و مانع از وصول باصل توجہ ظل است بخود و اعراض او از اصل و چوں بسیر و سلوک بلکہ بمحض عنایت ازلی توجہ بخود در و بزوال آرد و بجائے

امید کرتا ہوں کہ برادر عزیز بھی بخیریت ہوں گے اور ظاہری و باطنی جمعیت کیساتھ متصف نیز الفاظ سے معنی میں اور ظل سے اصل کی طرف آ گئے ہونگے کیونکہ ظل سے اصل کی جانب شاہراہ لگی ہے۔ باقی اصل تک پہونچنے میں مانع جو چیز ہے وہ ظل کا خود اپنی جانب توجہ کرنا اور اصل سے اعراض کرنا ہے اور اگر سیر و سلوک کے ذریعہ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی عنایت ازلی کے سبب سالک کی توجہ ظل سے ہٹ کر اصل کی جانب ہو جائے اور بجائے

Scanned with CamScanner

اعراض اقبال با اصل پیدا آید سر رشتۂ
سعادت بدست افتد و متمسک بعروۂ
وثقی گردد ؎

چوں بدانستی کہ ظل کیستی
فارغی گر مردہی وار زیستی

بعد از وصول ظل باصل و لحوق آں
سالک را استہلاک و اضمحلال است و فنا و
نیستی و ایں معنی کمال است در حق او کمال
او در سلب کمال است و خیریت او در انتفائے
خیریت۔ معرفت وابستہ بایں فنا است و
قرب منوط بایں انتفا، اذا تجلی اللہ لشیٔ
خضع لہ۔

و بعد ازاں مستعد آں می شود کہ او را
از نزد خود حیات دہند و باخلاق خود متخلق
سازند من قتلتہ فانا دیتہ و بہ تکمیل ناقصاں
بازش گردانند کما قال و من کان میتا فاحییناہ
وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس
نشان حال او است آں زماں نعمت در
حق او تمام شود و معنی خلافت بظہور آید ؎
ایں کار دولت است کنوں تا کرا دہند

(مکتوبات معصومیہ ص۸۲)

اعراض کے اصل کی جانب اقبال ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ سعادت
کا رشتہ ہاتھ لگا اور سالک نے مضبوط کڑے کو ہاتھ سے
پکڑ لیا۔

جب تم نے یہ معلوم کر لیا کہ کس کے ظل ہو اور تمہاری اصل کون ہے؟
تو بس اب تم فارغ ہو گئے مر جاؤ چاہے زندہ رہو مقصود حاصل ہے۔

ظل جب اصل سے ملجاتا ہے اور اس کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے
تو سالک اپنے اندر اضمحلال استہلاک اور فنا اور نیستی کی کیفیت
محسوس کرتا ہے اور یہ چیز اس کے حق میں کمال ہے اسلئے کہ سالک کا
کمال ہی سلب کمال میں ہے اور اس کی خیریت ہی عدم
خیریت میں ہے معرفت جس چیز کا نام ہے وہ اسی فنا سے وابستہ
ہے اور قرب اسی انتفاء سے ملا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی جب کسی
چیز پر ہوتی ہے تو وہ اس کے سامنے پست اور خاضع ہو جاتا ہے۔

اس فنا اور نیستی کے بعد نفس کے اندر اس بات کی استعداد
پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کو اپنے پاس سے زندگی بخشیں اور
اپنے اخلاق کیساتھ اسکو متخلق بنا دیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ جسکو
میں قتل کردوں تو میں ہی اس کا خون بہا ہوں اور پھر اس کے بعد اس
شخص کو ناقصوں کی تکمیل کیلئے مقرر فرما دیتے ہیں دیکھو ارشاد فرماتے
ہیں کہ ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا ہم نے اسکو زندہ بنا دیا اور ہم نے اسکو ایک ایسا
نور دیا کہ وہ اسکو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے چنانچہ اس آیتہ میں اسی
شخص کے حال کی خبر ہے اب اسوقت جا کر اس کے حق میں نعمت تمام
ہوتی ہے اور خلافت کے معنی کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ دولت اور سلطنت
کا کام ہے اور ایک منصب عظیم ہے دیکھنا چاہیئے کہ کب اور کسے
عنایت فرماتے ہیں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ خلافت باطنی کس قدر زبردست منصب ہے اور اس کے کتنے شرائط
ہیں اب منصب تو لینا چاہتے ہیں لیکن شرائط اور آداب نہیں اختیار کرنا چاہتے۔ صحیح طور پر مرید بھی نہیں

Scanned with CamScanner

ہوتے اور پیر بن جانا چاہتے ہیں۔ ع

"بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا"

اسی طرح سے حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر نور باطن کی تحصیل کے لئے اتباع سنت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلہ پر کتنا زوردار کلام فرما رہے ہیں کسی طالب کو لکھتے ہیں کہ:۔

مخدوما وحدت وکثرت ضد یکدیگر اند طالب وحدت را ترک کثرت ناگزیر است ہر قدر جہاتِ کثرت باخود دارد ہماں قدر از وحدت حقیقی دور و مہجور است وحدانی باید بود ہم از روے طلب ومحبت وہم از روے علم وارادت تا مناسبت پیدا آید و مرآۃ وحدت گردد وبتوحید حقیقی رسد التوحید

مخدوم من! وحدت وکثرت ایک دوسرے کی ضد ہے طالب وحدت کیلئے ترک کثرت ناگزیر ہے جس قدر کثرت کے علائق اپنے سے رکھے گا اسی قدر وحدت حقیقی سے دور اور مہجور رہے گا۔ سالک کو وحدانی ہونا چاہیئے۔ طلب اور محبت کے اعتبار سے بھی اور علم وارادت کے اعتبار سے بھی۔ تاکہ مناسبت پیدا ہو جائے اور آئینہ وحدت بنجائے اور توحید حقیقی تک سالک کی رسائی ہو جائے کیونکہ توحید تعلقات کے ساقط ہی کرنے کا نام ہے۔

اسقاط الاضافات

اوقات را بذکر وفکر معمور دارند و در تنویر باطن کوشند کہ محل نظر مولی است و تنویر باطن منوط بدوام ذکر ومراقبہ است و مربوط باداے وظائف بندگی واداے فرائض وسنن وواجبات واجتناب از بدعات و محرمات ومکروہات بر قدر کہ در اتباع شریعت وسنت واجتناب از بدعت کوشیدہ آید نور باطن بیفزاید وراہے بجناب قدس بکشاید اتباع سنت البتہ منجی است ونتیجہ بخش ورفع درجات، احتمال تخلف ندارد وماوراے آں خطر در خطر است دراہ شیطان فالحذر کل الحذر فماذا بعد الحق الا الضلال

اپنے اوقات کو ذکر وفکر سے معمور اور آباد رکھو اور باطن کو روشن کرنے میں کوشش کرو۔ اسلئے کہ وہی نظر مولی کا محل ہے اور یہ سمجھ لو کہ تنویر باطن کا تعلق ان امور کے ساتھ ہے۔ دوام ذکر۔ مراقبہ۔ وظائف بندگی کی ادائیگی یعنی اداے فرض وسنن وواجبات۔ نیز بدعات ودیگر محرمات ومکروہات سے اجتناب۔

چنانچہ جو شخص جس قدر بھی اتباع سنت اور عمل بالشریعۃ اور اجتناب بدعت میں زیادہ کوشش کریگا اتنا ہی زیادہ اسے نور باطن حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ کی راہ اس پر کھلے گی۔

بلاشبہ اتباع سنت نجات دینے والی چیز ہے ہر صورت نفع بخش اور درجات کو بلند کرنیوالی اس میں خلاف کا تو احتمال ہی نہیں ہے۔

لیکن اسکے ماسوا جو چیزیں ہیں ان میں خطرہ ہی خطرہ ہے بلکہ وہ شیطانی راستہ ہے لہذا ان سے بہت اجتناب کرو اور احتیاط کلی رکھو اسلئے کہ حق کے بعد بجز گمراہی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

دین قویم را کہ بوحی قطعی ثابت شدہ است بترہات اوہام وخیال نمی داشت برداشت۔ دینِ متین کو جو کہ وحی قطعی سے ثابت ہے محض لغو باتوں اور اوھام وخیالات سے تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

وما علی الرسول الا البلاغ۔ بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔

حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کا کلام آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طریق کو کتنا سمجھے ہوئے ہیں چنانچہ کیسا ہی کوئی شخص کم ہمت ہو حضرت کے بیان کے بعد ایک مرتبہ تو کمر ہمت کس کر راہ خدا میں کھڑا ہی ہو جائے گا۔ تاہم طریق کی غرض وغایت کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کا جو کلام القول الجمیل سے نقل کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے جس کا حاصل یہی تھا کہ سارے طرق کا مرجع ھیئت نفسانیہ (یعنی نسبت) کی تحصیل ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ارتباط وانتساب حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرات صوفیاء نے جو اشغال و مراقبات تعلیم کئے ان سے مقصود نفس میں اسی ملکہ کو پیدا کرنا اور راسخ کرنا تھا۔ اگرچہ نسبت کی تحصیل کچھ ان اشغال پر موقوف بھی نہیں۔ کیونکہ حضرات صحابہ وتابعین اس نسبت وسکینہ کو دوسرے طرق سے حاصل کیا کرتے تھے۔ مثلاً صلوٰۃ وتسبیحات پر حضور قلب کے ساتھ مواظبت نیز طہارت پر مداومت۔ موت کی یاد، جنت، دوزخ کا پیش نظر رکھنا اسی طرح تلاوت قرآن پر مواظبت اور اس کے معانی میں تدبر وغیرہ کرنا۔

غرض ان سب امور پر یہ سب حضرات ایک مدت تک مواظبت فرماتے تھے جس کی وجہ سے قلب میں ایک ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور تادم آخر اسکی محافظت فرماتے تھے اور یہی وہ نسبت مسلسلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ مشائخ متوارث چلی آرہی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اسی کو شاہ صاحب نے طریق کا مرجع اور اس کا حاصل کہا ہے۔ اور ایک اور مقام پر اسکو غنیمت کبریٰ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نسبتہائے صوفیا غنیمتے است کبریٰ ورسوم ایشاں ہیچ نمی ارزد۔

آخر میں صوفیہ کے اشغال ومراقبات کے متعلق ایک بات میں بھی کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ان حضرات نے نسبت ہی کی تحصیل اور اسکی تکمیل کیلئے بطور معاونت کے اشغال وغیرہ تجویز فرمائے اگرچہ حضرات صحابہ اسی نسبت کو صرف اعمال شرعیہ ہی سے حاصل کر لیتے تھے تو جب اعمال شرعیہ کو تحصیل نسبت کیلئے بعد کے لوگوں نے کافی نہ بنایا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اشغال کی بھی ضرورت سمجھی گئی کیونکہ دیکھا گیا کہ لوگوں میں نماز وروزہ موجود ہے مگر نسبت غائب تو اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ نے جن چیزوں کا اضافہ فرمایا تھا اب ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی صرف صورت ہی

صورت رہ گئی ہو اور اثر اور مقصود ان سے ختم ہو چکا ہو چنانچہ اس زمانہ میں لوگوں کا حال یہی دیکھ رہا ہوں کہ طریق کی چیزوں کے صرف ظاہر کو لے رکھا ہے اور اس کے باطن سے نظر پھیرے ہوئے ہیں جس طرح سے کہ عام لوگوں کا حال ہے کہ نماز و روزہ پر تو عمل ہے مگر اس سے جو مقصود تھا تحصیل نسبت اور اس پر مواظبت اور اسکی محافظت ان سب باتوں کی جانب ذرا بھی توجہ نہیں۔ اور وجہ کلی اس کی یہ ہے کہ مقصود اور غیر مقصود میں امتیاز نہیں باقی رہا۔ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کی جزئی یہ بھی ہے کہ مشائخ کو مقصود سمجھا جاتا ہے اور ان کے پاس جو دولت ہے یعنی نسبت سلسلہ اور نور اور سکینہ اس کے تحصیل کی فکر نہیں۔ اس زمانہ میں طریق کے اندر یہ ایک بہت بڑی بدعت داخل ہو گئی ہے جس نے طریق کو فاسد کر دیا۔ اور وہ یہی کہ نہ مقصود کی خبر ہے اور نہ غیر مقصود کا علم۔

اسی چیز کو آپ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر اس ایک بات کو سمجھ لیجئے گا تو بہت بڑے مخمصہ سے نکل جائیے گا۔ اور دین خالص سے قدر مقدر نصیب ہو ہی جائیے گا۔ ورنہ ساری عمر بھی کہیں آئیے جائیے گا اور کچھ بھی کشود کار نہ ہوگا۔

احوال رفیعہ

یہاں تک تو کلام نسبت کی تشریح و تفصیل اور اس کے ذریعۂ تحصیل سے متعلق تھا اب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے دوسرے جزکی بھی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں یعنی یہ کہ مداوم علی السکینہ کو جو احوال رفیعہ ملا کرتے ہیں وہ کیا ہیں اور اس مضمون کو میں ایک عجیب و غریب مضمون سمجھتا ہوں۔ یوں تو یہ مضمون قرآن و حدیث میں آیا ہے اور علماء نے بھی اسکو بیان فرمایا ہے اس لئے ایسا کچھ عجیب بھی نہیں ہے لیکن ہماری معلومات چونکہ محدود ہیں اور نظر سطحی ہے اس لئے اسکو عجیب و غریب ہی کہا جائیگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمانے کے بعد کہ سکینہ پر مداومت کرنیوالے کے لئے کچھ حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو اسے نوبت بنوبت ملتے ہیں پس سالک کو چاہیئے کہ ان حالات کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعت کے عند اللہ مقبول ہونے اور باطن نفس اور سویدائے قلب میں اثر کرنے کی علامات ہیں، آگے بعض احوال رفیعہ کو شمار کرایا ہے جو کہ مداوم علی السکینہ کو حق تعالے کی جانب سے مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔

(۱) مثلاً ایک حال اسکو یہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کو تمام ماسوا پر ترجیح دیتا ہے۔

(۲) اسی طرح سے ایک حال اسکو یہ ملتا ہے کہ اس پر خوف و خشیت کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے

Scanned with CamScanner

کہ قلب سے نکل کر بدن اور جوارح پر بھی اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۳) اسی طرح سے ایک انعام مُواظب علی السکینہ کو اس دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اسے عمدہ عمدہ خواب نظر آتے ہیں جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ رجل صالح کا رویاء صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت سے صرف مبشرات رہ جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ مبشرات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی رجل صالح دیکھے یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جاوے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لَھُمُ الْبُشْریٰ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا میں بشریٰ کی تفسیر رویاء صالحہ ہی سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح سے ایک حال صاحب سکینہ کو اس دار دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اسکو فراست صحیحہ حاصل ہوتی ہے۔ یعنی ایسا خاطر جو واقع کے مطابق ہو اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔ یعنی مومن کی فراست سے ڈرو اسلئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

صاحب شفاء العلیل نے فراست صادقہ کے معنی لکھے ہیں ٹھیک اٹکل یعنی مداوم علی السکینہ کو ایک انعام یہ ملتا ہے کہ جس چیز کے متعلق کچھ غور کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب میں واقعہ کے مطابق القاء کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں جو اسلاف کے حالات میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

۱۔ رسالہ قشیریہ میں حضرت ابراہیم خواص کا یہ واقعہ منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں بغداد کی جامع مسجد میں تھا وہاں فقراء کی بھی ایک جماعت موجود تھی اتنے میں ایک جوان نہایت ہی ہنس مکھ باوقار، خوبصورت اور نہایت ہی عمدہ خوشبو لگائے ہوئے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اپنے اصحاب سے کہا کہ میرے قلب میں یہ آرہا ہے کہ یہ شخص یہودی ہے حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ فکلھم کرھوا ذلک۔ یعنی میری اس بات کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا۔ تاہم میں تو یہ کہہ کر مجلس سے اٹھ گیا اور وہ جوان آیا اور حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ میرے متعلق شیخ نے کیا فرمایا۔ اس پر بھی لوگوں کی ہمت شیخ کے مقولہ کو اس سے نقل کرنے کی نہیں ہوئی بلکہ اس کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو گئے اس نے اصرار کیا کہ بتائیے شیخ نے کیا فرمایا ہے اس پر لوگوں کو کہنا پڑا کہ شیخ نے یہ فرمایا ہے کہ تم یہودی ہو۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی وہ جوان میرے پاس آیا۔ اور

میرے ہاتھوں پر سر رکھدیا اور مسلمان ہوگیا کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے اسلام کا سبب کیا ہوا اس نے کہا کہ ہم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ صدیق کی فراست خطا نہیں کرتی۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ مسلمانوں کا امتحان کروں گا پھر میں نے غور و تامل کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ اہل اسلام میں بھی صدیق اگر ہوسکتے ہیں تو اسی طائفہ صوفیہ ہی میں ہو سکتے ہیں اس لئے کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ میں نے تمہارے اوپر التباس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی باوجود اس کے جب تمہارے شیخ نے اپنے نور فراست سے مجھ کو تاڑلیا اور پہچان لیا کہ میرے اس ظاہر میں باطن کچھ اور ہے تو مجھے اب یقین ہوگیا کہ بس یہی صدیق ہیں۔ چنانچہ وہ جوان ان کی خدمت میں رہا اور کبار صوفیہ میں سے ہوا۔

۱۶- اسی کے مثل ایک اور واقعہ سنئے مالا بد میں کتاب الاحسان میں ہے کہ:-

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را	پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویشوں کے
از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ	سینے سے تلاش کرنا چاہیئے اور اس نور سے اپنا سینہ روشن کرنا چاہیئے
خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست	تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو اور اس کے ذریعہ ہر خیر و شر کو معلوم
صحیحہ دریافت شود۔	کیا جا سکے۔ (مالا بد منہ ص۱۲۳)

اس فراست صحیحہ پر حاشیہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور اس پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:-

ایک شخص درویشوں کا جبہ اور دلق پہنے ہوئے حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رح کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ جب حضرت لوگوں کو پند و نصیحت کرنے سے فارغ ہو چکے تو اس شخص نے اٹھ کر حضرت سے یہ سوال کیا کہ اتقوا فراسۃ المومن کا کیا مطلب ہے اور وہ فراست کیا چیز ہوتی ہے حضرت نے فرمایا کہ وہ فراست یہ ہے کہ تم اپنا زُنّار توڑ ڈالو یہ سن کر اس نے شور مچایا اور کہا کہ معاذ اللہ مجھے زُنّار سے کیا مطلب۔ اسی اثناء میں ایک مرید نے شیخ کا اشارہ پاکر اس کے دلق ریائی کو اس کے بدن سے الگ کردیا تو اس کے نیچے زُنّار نکلا یہ واقعہ دیکھ کر وہ شخص مسلمان ہوگیا۔ اصل واقعہ تو ختم ہوا اس کے بعد شیخ نے اپنے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ دوستو! آؤ جس طرح اس نے اپنے ظاہری زُنّار کو توڑا ہے اور مسلمان ہوگیا ہے یارو آؤ ہم سب بھی اپنے اپنے باطنی زنار کو توڑ ڈالیں اور اس وقت سے حق تعالیٰ کے ساتھ نیا عہد باندھیں شیخ کے اس کہنے پر لوگوں کے درمیان سے ایک شور اٹھا اور سب نے اسی وقت بیعت کی تجدید کی۔ (حاشیہ مالا بد منہ)

سبحان اللہ! عجیب واقعہ ہے ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے کیسا کچھ عہد باندھا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

اجابتِ دُعا

۶۔ اسی طرح سے منجملہ ان احوال رفیعہ کے جو حق تعالیٰ کی جانب سے مداوم علی السکینہ کو مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔ ایک عظیم الشان حال اجابتِ دعا بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی نسبت اور ایسا تعلق بندہ کا قائم ہو جائے کہ اب اس کے بعد اپنی جس ضرورت کو یہ طالب اپنی بھرپور ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیں جس طرح سے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی تھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ مستجاب الدعوات ہیں۔ ایک مرتبہ کسی جنگ میں یہ بھی شریک تھے۔ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھاکر دعا کی۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالدیا اور سب نے ہتھیار ڈالدیئے۔ یہ تھی اجابت دعا جو مومن کو ملا کرتی ہے۔

۷۔ اسی طرح سے اسکو یہ مرتبہ بھی عطا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر توکل کرکے کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کردیتے ہیں تاکہ اس کا صدق ظاہر ہو۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رُبَّ اَغْبَرَ اَشْعَثَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَہُ لَہٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ۔ یعنی بہت سے شخص غبار آلود۔ پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے جن کو کوئی خاطر میں بھی نہ لاتا ہو (یعنی لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہو لیکن اللہ تعالےٰ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتا ہے کہ) اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرمادیں۔ مطلب یہ کہ ظاہر حال تو اس کا ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا تک گوارا نہ کریں مگر خدا کے نزدیک اس کا ایسا درجہ کہ وہ جو کچھ زبان سے نکالدے تو اس کے تعلق اور مقبولیت کی لاج رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ فرمادیں۔ سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس دارِ دنیا میں اپنے بندوں کو کیا کیا دیتے ہیں۔

اس توکل اور لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ کی ایک مثال حدیث شریف کے ایک واقعہ سے دیتا ہوں :-

ابن ماجہ میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ میری پھوپھی رُبیّع نے ایک باندی کے سامنے کے دانت توڑ دیئے لوگوں نے کوشش کی کہ وہ معاف کردے مگر اس کے قبیلہ والوں نے صاف انکار کردیا پھر لوگوں نے چاہا کہ ارش یعنی اس کی قیمت ہی لے لے اور قصاص سے باز آجائے مگر خاندان والوں نے اسے بھی نہ مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں مقدمہ پیش کردیا۔ حضور نے شرعی حکم یعنی قصاص کا فیصلہ فرمادیا۔ یعنی یہ کہ اس کے بدلے میں ان کے بھی دانت توڑے جائیں آپ کا یہ فیصلہ سنکر انس بن نضر نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا میری پھوپھی کے دانت ٹوٹ ہی جائیں گے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بناکر بھیجا ہے اس کے دانت تو نہیں ٹوٹیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے انس کیسی باتیں کرتے ہو کتاب اللہ میں قصاص کی تصریح موجود ہے (مراد اس سے آپ کی یہ آیت تھی وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ) حضرت انس کہتے ہیں کہ پھر اس جاریہ کی قوم راضی ہوگئی۔ اور انھوں نے قصاص معاف کردیا۔ (اور میری پھوپھی کے دانت صحیح وسالم رہ گئے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان من عباد اللہ من لو اقسم علی اللہ لَاَبَرَّهٗ یعنی اللہ تعالے کے بندوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ انکی قسم کے مطابق معاملہ فرمادیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد حضرت انس کا یہ کہنا کہ دانت تو نہیں ٹوٹیں گے اللہ ورسول کے حکم کا (معاذ اللہ) رد کرنا نہ تھا بلکہ محض توکلاً علی اللہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ خصم کو راضی فرمادیں اور وہ قصاص کو معاف کردے ایک آئندہ ہونیوالی بات کی خبر دینا تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ان احوال اور صاحب سکینہ کو مرحمت فرمائے جانے والے انعامات کا ذکر کرکے حضرت شاہ صاحب آخر میں پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وبالجملہ فھٰذہ الوقائعُ و امثالُھا دالّۃٌ علی صحۃِ ایمان الرجل وقبولِ طاعاتہ وسرایۃ النور فی صمیم قلبہ فلیغتنمھا۔ یعنی خلاصہ کلام یہ کہ ایسے حالات رفیعہ جو مذکور ہوئے اور انھیں کے مانند اور دیگر حالات عالیہ یہ سب دلالت کرتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے اور اس کی طاعات عنداللہ مقبول ہیں اور نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل اور دنیا میں بھی اسکے لئے تسلی کا باعث بن سکتے ہیں ایمان کی صحت اور طاعات کا قبول ہونا یہ کیا کچھ کم رتبہ رکھتا ہے۔ یہ سب علامات مذکورہ اسی کی فرع ہیں۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ اجابت دعا بھی انھیں احوال رفیعہ

میں سے ہے جو صحت ایمان اور قبول طاعات پر ملتے ہیں اور انکی اصل یعنی سکینہ کی تحصیل اور اسکی مداومت پر یہ عطا ہوتے ہیں جیسا کہ آپ نے صحابہ کے واقعات میں ملاحظہ فرمایا چنانچہ یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات اسلاف کے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو ان کے دوام علی السکینہ کے صلہ میں اجابت دعا کا مقام عطا فرماتے ہیں کس قدر قدر دانی ہے ایمان مومن کی سبحان اللہ!

اسی مضمون کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

توچنیں خواہی خدا خواہد چنیں می دہد یزداں مراد متقیں

یعنی تم یوں چاہتے ہو تو خدا بھی یوں ہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں۔ آخر میں ایک بات یہ کہتا ہوں کہ یہی وہ احوال تھے جن پر اہل اللہ نے دنیا کو تج دیا تھا چنانچہ ان کے حصول کے بعد دنیا کی کچھ بھی وقعت اور قدر ان کے قلوب میں باقی نہیں رہ گئی تھی حضرت مولانا قدس سرہٗ کبھی کبھی مجلس میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے اور کچھ اس ذوق سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر عجیب کیف طاری ہو جاتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

(تھوڑی دیر فراغت قلبی اور کسی ماہ رو پر نظر رکھتے ہوئے اس سے کہیں بہتر ہے کہ چتر شاہی سر پر ہو اور تمام دن ہاؤ ہو میں گذرے)

اس وقت آپ کے سامنے اجابت دعا کے سلسلہ میں چند واقعات اور بیان کرتا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی عبرت کے واقعات ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں۔

رسالہ قشیریہ میں ہے کہ حذیفہ مرعشی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم ابن ادھم کی خدمت میں بہت دنوں تک رہا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ ان کا سب سے عجیب تر واقعہ جس کا تم نے مشاہدہ کیا ہو بیان کرو۔

حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ مکہ شریف کے سفر میں تھے کئی دنوں سے کھانے کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی تھی کہ اسی اثناء میں ہم کوفہ پہنچے اور وہاں ایک ویران وشکستہ مسجد میں قیام کیا حضرت ابراہیم ابن ادھم نے میری جانب دیکھا اور فرمایا کہ حذیفہ تم پر تو بھوک کا اثر دیکھ رہا ہوں ؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت نے بجا ارشاد فرمایا۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا ذرا قلم دوات اور کاغذ تو لے آؤ میں نے لاکر پیش کیا تو اس پر تحریر فرمایا کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ انت المقصود الیہ بکل حال

والمشار الیہ بکل معنی یعنی ہر حال میں آپ ہی مقصود ہیں اور ہر معنی سے آپ ہی مراد ہیں اور اس کے بعد یہ اشعار لکھے۔

انا حامد انا شاکر انا ذاکر انا جائع انا نائع انا عاری

میں آپ کی حمد کرنے والا ہوں اور آپ کا شکر کرنے والا ہوں اور آپ کی یاد کرنے والا ہوں۔ میں بھوکا ہوں میں پیاسا ہوں اور میرے بدن پر کپڑا نہیں ہے۔

ھی ستۃ وانا الضمین لنصفھا فکن الضمین لنصفھا یا باری

یہ کل چھ چیزیں ہیں یعنی حمد و شکر و ذکر بھوک پیاس، عریانی تو میں ان میں اول تین کا ضامن ہوتا ہوں۔ پس اے باری بقیہ نصف کے آپ ضامن ہو جائیے۔

مدحی لغیرک لھب نار خضتھا فأجر عبیدک من دخول النار

(اور آپ سے یہ درخواست اسلئے کرتا ہوں کہ) میرا آپ کے علاوہ کسی اور کی تعریف کرنا گویا آگ کی لپیٹ میں داخل ہونا ہے لہٰذا اپنے اس مسکین بندے کو دخول نار سے بچا لیجئے۔

والنار عندی کالسوال فھل تری ان لا تکلفنی دخول النار

اور یہ میں نے دخول نار اسلئے کہا کہ کسی سے سوال کرنا میرے نزدیک بمنزلہ دخول نار ہی کے ہے تو کیا آپ اپنے کرم سے مجھے دخول نار سے بچالیں گے؟

یہ لکھ کر مجھے رقعہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ اور خبردار اپنے قلب کو غیر اللہ سے متعلق نہ کرنا اور سب سے پہلے جس شخص سے تمہاری ملاقات ہو اسے یہ رقعہ دیدینا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں رقعہ لیکر چلا تو میری ملاقات سب سے پہلے ایک خچر سوار سے ہوئی میں نے اسی کو وہ پرچہ دیدیا اس نے لیا پڑھا اور رونے لگا اور مجھ سے پوچھا کہ جن بزرگ نے یہ پرچہ لکھا ہے وہ کہاں ہیں میں نے کہا کہ وہ تو فلاں مسجد میں مقیم ہیں یہ سن کر اس نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار تھے اور دیکر چلدیا پھر میری ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ خچر پر جو شخص جا رہا ہے آپ بتا سکتے ہیں یہ کون ہے اس نے کہا کہ ہاں یہ تو ایک نصرانی ہے اس کے بعد میں حضرت ابراہیمؒ ابن ادھم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا قصہ سنایا انھوں نے فرمایا کہ اچھا ان تھیلی کو اسی طرح سے رہنے دو ابھی وہ خود آتا ہے تھوڑی ہی دیر گذری ہو گی کہ وہ نصرانی آیا اور منہ کے بل حضرت ابراہیم ابن ادھم کے سامنے گرا اور مشرف باسلام ہو گیا۔

سبحان اللہ ایمان تازہ کر دینے والا واقعہ ہے کبھی آپ کا ایسا بھی زمانہ تھا"

Scanned with CamScanner

دوسرا واقعہ سنئے :-

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ میں ایک بستی میں پہونچا وہاں میں نے ایک نصرانی کو دیکھا جسکی کمر میں زنار بندھی ہوئی تھی اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اسکو بھی اپنے ہمراہ لے لوں چنانچہ ساتھ ہولیا اس کے بعد ہم دونوں سات دن تک سفر کرتے رہے پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اے اسلام کے درویش ہمیں بھوک لگی ہے کچھ اپنی کرامت ظاہر فرمائیے۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے (اللہ اس کافر کے سامنے مجھے رسوانہ کیجئے (اپنے فضل وکرم سے کھانا عطا فرمائیے) یہ دعا کرنا تھا کہ دیکھا کہ ایک طباق نازل ہوا جس میں روٹی، بھنا ہوا گوشت کچھ کھجوریں، اور پانی کا کوزہ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا اور پھر ہفتہ بھر چلتے رہے اس کے بعد اب کی دفعہ میں نے سبقت کی اور اس سے کہا کہ اے نصاریٰ کے راہب اب تیری باری ہے تو بھی اپنی بزرگی دکھلا، یہ سنکر اس نے اپنی لاٹھی پر سر ٹیک لیا اور اللہ تعالیٰ سے کچھ دعا کی پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دو طباق سامنے رکھے ہوئے ہیں اور ان پر میرے طباق سے کہیں زیادہ کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں۔ ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ مجھے یہ منظر دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی (یہ خیال کرکے کہ یہ کافر سمجھے گا کہ نصرانیت اسلام سے بڑھ گئی) چنانچہ اسی رنج وغم میں میں نے کھانے سے انکار کردیا اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے وہ کھانا نہیں کھایا۔ بالآخر اس نے کہا (کہ میں آپ کے نہ کھانے کی وجہ سمجھ گیا ہوں) اچھا کھائیے اور آپ کو میں دو خوشخبریاں سناتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمہ اسلام پڑھتا ہوں۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ۔ یہ پڑھ کر زنار توڑ کر پھینکدی۔

اور دوسری خوشخبری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ، یا اللہ اگر آپ کے اس بندے کا (یعنی آپ کا) تیرے نزدیک کوئی مرتبہ ہو تو اس کی برکت سے میرے اوپر فتح فرما دیجئے (چنانچہ یہ سب جو آپ دیکھ رہے ہیں، آپ ہی کی برکت ہے۔)

ابراھیم خواص کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم نے کھانا کھا لیا اور پھر ہم دونوں نے اپنا راستہ لیا۔

چنانچہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں ایک سال تک ہم دونوں مقیم رہے۔ پھر اس شخص کا وہیں انتقال ہوگیا اور بطحا میں دفن ہوا۔

اسی رسالہ قشیریہ باب الدعا میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص تھا جو بغرض تجارت بلاد شام سے مدینہ اور مدینہ سے شام کا سفر کیا کرتا تھا اور اپنے سفر میں قافلوں کے ساتھ نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے تنہا سفر کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شام سے مدینہ آرہا تھا کہ راستہ میں اسکو ایک چور ملا جو گھوڑے پر سوار تھا اس نے تاجر کو آواز دی کہ ٹھہر جاؤ۔ تاجر ٹھہر گیا۔ اور چور نے کہا کہ تم میرا مال لیلو اور مجھے جانے دو۔ چور نے جواب دیا کہ یہ مال تو میرا ہے ہی میں تمہاری جان لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تاجر نے اس سے کہا کہ میری جان لے لینے سے تم کو کیا نفع کی امید ہے میرا مال لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ چور نے پھر وہی پہلی بات کہی تو تاجر نے اس سے یہ کہا کہ اچھا مجھ کو اتنی مہلت دیدو کہ میں وضو کرکے نماز پڑھ لوں اور اپنے رب عزوجل سے دعا کرلوں۔ چور نے جواب دیا کہ ہاں تم جو چاہو کرلو۔ تاجر وضو کرکے کھڑا ہوا۔ اور چار رکعت نماز پڑھی۔ پھر اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:۔

یَاوَدُوْدُ یَاوَدُوْدُ یَاذَاالْعَرْشِ الْمَجِیْدِ یَامُبْدِئُ یَامُعِیْدُ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ اَسْئَلُكَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ مَلَأَ اَرْکَانَ عَرْشِكَ وَاَسْئَلُكَ بِقُدْرَتِكَ الَّتِیْ قَدَرْتَ بِهَا عَلٰی خَلْقِكَ وَبِرَحْمَتِكَ الَّتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ یَامُغِیْثُ اَغِثْنِیْ + یہ دعا اس نے تین مرتبہ پڑھی جب دعا سے فارغ ہوا تو اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ جو چمکتے ہوئے گھوڑے پر سوار تھا۔ اور سبز کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسکے ہاتھ میں نور کا ایک حربہ تھا۔ جب چور نے اس سوار کو دیکھا تو تاجر کو چھوڑ کر اسکی طرف بڑھا۔ جب اسکے قریب پہنچا تو اس سوار نے چور پر حملہ کیا اور نیزے سے مار کر اسکو اسکے گھوڑے سے گرادیا۔ پھر تاجر کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اٹھو اور چلکر اس چور کو تم ہی قتل کرو۔ تاجر نے اس سے کہا کہ تم کون ہو؟ میں نے تو کبھی کسی کو بھی قتل نہیں کیا اور نہ میرا جی اسکو قتل کرکے خوش ہوگا۔ بس وہ سوار لوٹ کر چور کے پاس آیا اور اس کا کام تمام کردیا۔ پھر تاجر کے پاس واپس آیا اور اس سے کہا کہ سنو میں تیسرے آسمان کا ایک فرشتہ ہوں جب تم نے پہلی مرتبہ دعا کی تو ہم لوگوں نے آسمان کے دروازوں سے حرکت کی آواز سنی اور آپس میں ہم لوگوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی امر حادث ہوا ہے پھر جب تم نے دوبارہ دعا کی تو آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور اس سے آگ کی چنگاریوں کی طرح شرارے نکلنے لگے۔ پھر جب تم نے تیسری مرتبہ دعا کی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اوپر سے ہمارے پاس تشریف لائے اور یہ ندا کررہے تھے کہ مَنْ لِّهٰذَا الْمَکْرُوْبِ کون اس مصیبت زدہ کے کام آئیگا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھ کو اس چور کے قتل کا متولی بنادیجئے۔ اور یہ کہا کہ اے عبداللہ تم یہ جان لو کہ جو شخص تمہاری اس دعا کو کرب اور مصیبت اور شدت کے وقت میں پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اسکی مصیبت اور پریشانی کو دور فرمادینگے۔ اس کے بعد وہ تاجر اپنا مال لیکر سلامتی کے ساتھ مدینہ شریف پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اس واقعہ کی نیز اس دعا کی اطلاع

Scanned with CamScanner

دی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لقد لقنك الله عزوجل عن اسمائه الحسنى التى اذا دعى بها اجاب و اذا سئل بها اعطى۔ یعنی البتہ تحقیق اللہ عزوجل نے تم کو اپنے ان اسماء حسنہ کی تلقین فرمائی ہے کہ جب انکے واسطے سے کوئی دعا کی جائیگی تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے اور جب ان کے وسیلے سے سوال کیا جائیگا تو اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

نیز صاحب سالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ میں نے استاد ابوعلی سے سنا وہ فرماتے تھے کہ یعقوب ابن لیث کو کوئی بیماری ایسی لاحق ہوئی کہ تمام اطباء اسکے علاج سے عاجز ہو گئے تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ کی ولایت میں ایک صالح شخص ہیں جنکا نام سہیل بن عبداللہ ہے اگر وہ آپ کے لئے دعا فرما دیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے چنانچہ بادشاہ نے ان کو بلا بھیجا اور درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا فرما دیجئے تو حضرت سہیل نے فرمایا کہ تمہارے حق میں میری دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ تمہارے قیدخانہ میں بہت سے مظلومین موجود ہیں بادشاہ نے اسی وقت جتنے لوگ اسکے قیدخانہ میں تھے سب کو رہا کر دیا۔ تب حضرت سہیل نے اس کے لئے ان الفاظ سے دعا فرمائی۔ اللهم كما اريته ذل المعصية فاره عز الطاعة وفرج عنه یعنی یا اللہ جیسا کہ آپنے اسکو معصیت کی ذلت دکھایا ایسے ہی طاعت کی عزت دکھا دیجئے اور اسکی تکلیف دور فرما دیجئے۔

پس وہ فوراً اچھا ہو گیا اور حضرت سہیلؒ کی خدمت میں کچھ مال پیش کیا۔ انھوں نے اسکو قبول کرنے سے انکار فرمایا تو لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اگر اسکو قبول فرمالیتے اور فقراء کو دیدیتے تو کیا حرج تھا۔ پس انھوں نے صحرا کی کنکریوں کی طرف ایک نظر فرمائی اور وہ اسی وقت جواہر ہو گئیں۔ تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایسی دولت عطا فرمائی ہو کیا وہ یعقوب ابن لیث کے مال کا محتاج ہو سکتا ہے؟

اسی طرح حضرت لیثؒ سے منقول ہے انھوں نے کہا کہ میں نے ابن نافع کو نابینا دیکھا پھر کچھ دنوں بعد ان کو دیکھا کہ آنکھ والے ہو گئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کی بینائی کس طرح آپ کو واپس ملی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہا گیا کہ یہ دعا پڑھو:۔

یا قریب یا مجیب یا سمیع الدعاء یا لطیفا لما یشاء رد علی بصری۔ چنانچہ میں نے یہ دعا پڑھی تو اللہ عزوجل نے میری بینائی لوٹا دی۔

سبحان اللہ یہ ہے اجابت دعا جو اللہ تعالیٰ اپنے مداوم علی السکینہ بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں۔

فرعونؑ کی دُعا کا قبول ہونا

اجابت دعا کے سلسلے کے یہ وہ واقعات ہیں جو مومنین صالحین سے متعلق ہیں۔ اب آپ کے سامنے فرعون کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جسے صاحب روح المعانی نے (ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات) کے تحت لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ہی عبرت اور نصیحت کا واقعہ ہے۔ وھی ھذا۔

اخرج الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول وابن ابی حاتم عن ابن عباسؓ قال لما اخذ اللہ تعالیٰ آل فرعون بالسنین یبس کل شئ لھم وذھبت مواشیھم حتی یبس نیل مصر فاجتمعوا الی فرعون وقالوا لہ ان کنت کما تزعم فأتنا فی نیل مصر بماء فقال غدوۃ یصبحکم الماء فلما خرجوا من عندہ قال ای شئ صنعت انا لا اقدر علی ذلک نغدا یکذبوننی فلما کان جوف اللیل قام واغتسل ولبس مدرعۃ صوف ثم خرج حافیا حتی اتی النیل فقام فی بطنہ فقال اللھم انک تعلم انی اعلم انک تقدر علی ان تملأ نیل مصر ماءً فاملأہ ماءً فما علم الا بخریر الماء یقبل فخرج واقبل النیل مطر غابالماء لما اراد اللہ تعالیٰ بھم من الھلکۃ۔

(روح المعانی ص۲ پ ۹)

حکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کو قحط میں مبتلا کیا تو ان کے یہاں کی ہر چیز خشک ہوگئی۔ تمام جانور اور مویشی مر گئے۔ یہاں تک کہ مصر کا مشہور دریا نیل بھی خشک ہوگیا یہ دیکھ کر قوم کے سب لوگ فرعون کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرا گمان ہے (یعنی معاذ اللہ خدا ہے) تو ہمارے دریائے نیل میں پانی لے آ۔ اس نے کہا اچھی بات ہے کل صبح اس میں پانی آجائیگا۔ جب لوگ اس کے پاس سے واپس چلے گئے (اور فرعون تنہا ہوا) تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کرونگا میں تو پانی لانے پر قادر نہیں نتیجہ یہی ہوگا کہ یہ لوگ کل صبح میری تکذیب کردینگے (اور میں رسوا ہوجاؤں گا) چنانچہ جب آدھی رات ہوئی تو فرعون اٹھا، غسل کیا اور صوف کا جبہ پہنا اور ننگے پاؤں نیل کے پاس آیا اور دریا کے بیچ میں کھڑے ہوکر یہ دعا کی کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں تجھ کو اس بات پر قادر سمجھتا ہوں کہ دریائے نیل کو تو پانی سے بھر سکتا ہے لہذا تو اسے پانی سے بھردے۔ اس کا اتنا کہنا تھا کہ اسے پانی کے آنے کا شور محسوس ہوا۔ فوراً دریا سے باہر نکل آیا اور دریائے نیل پانی سے لبریز ہوکر رواں ہوگیا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں فرعون اور اسکی قوم کی ہلاکت اسی نیل میں غرق ہوکر مقدر تھی۔

Scanned with CamScanner

سبحان اللہ یہ روایت عجیب روایت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کافر کی دعا بھی قبول فرما لیتے ہیں دیکھئے فرعون کی دعا کو بھی شرف قبول بخشا حالانکہ وہ خدائی کا مدعی تھا لیکن جب تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کیا اور معاملہ کو اسی کے حوالے کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی شان قدرت دکھائی کہ دریا کو جاری فرما دیا۔ اور اسکی پرواہ تک نہیں کی کہ یہ کافر ہے میری ہمسری کا دعویدار ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خدائی ہی اخلاق تھے جو دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ روا رکھا گیا دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جب کافر کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ فرما دیا تو اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی مومن موحد اور اللہ تعالیٰ کا ماننے والا خلوص کے ساتھ صدق دل سے حالت اضطرار میں اپنی کوئی حاجت طلب کریگا تو کیا اللہ تعالیٰ اسے قبول نہ فرمائیں گے ضرور قبول کرینگے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم ۔۔۔ توکہ با دشمنان نظر داری

میں اپنے احباب کو وصیت کرتا ہوں کہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں اور اسے ذہن میں مستحضر کرلیں اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر بھی نظر ہو جائیگی اور انشاء اللہ تعالیٰ معرفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی نصیب ہو جائیگا۔

تاخیر اجابت کا سبب

آخر میں ایک ضروری بات بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مومن اخلاص کے ساتھ دعا کرتا ہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہو رہی ہے۔ اس وقت ظاہر ہے کہ انسان اسکی وجہ سے دل شکستہ ہوتا ہے۔ پس اس تاخیر کا سبب مولانا رومؒ نے مثنوی میں بہت ہی عمدہ بیان فرمایا ہے۔ ایسا کہ ہر مومن کو اس کے سننے کے بعد تو بالکل تسلی اور اطمینان ہی ہو جاتا ہے۔ ایک مقام پر یہ سرخی قائم فرمائی ہے کہ سبب تاخیر اجابت دعائے مومن اور اس کے تحت یہ فرمایا کہ :۔

اے بسا مخلص کہ نالد در دعا ۔۔۔ دود اخلاصش برآید تا سما

بسا مخلص ایسے ہیں کہ اپنی دعا میں اسطرح سے نالہ و فریاد کرتے ہیں کہ انکے اخلاص کا دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔

تا رود بالائے ایں سقف بریں ۔۔۔ بوئے مجمر از انین المذنبیں

یہانتک کہ گنہگاروں کی فریاد کرنیکی وجہ سے انکے قلب کی انگیٹھی کی خوشبو اس آسمان سے اوپر تک جاتی ہے

پس ملائک با خدا نالند زار ۔۔۔ کائے مجیب ہر دعا و مستجار

یہ دیکھ کر فرشتے اللہ تعالیٰ سے زار زار نالہ کرتے ہیں کہ اے دعاؤں کی اجابت کرنیوالے اور اے وہ ذات جسکی پناہ طلب کیجاتی ہے

بندۂ مومن تضرع میکند او نمی داند بجز تو مستند

یہ مومن بندہ تجھ سے تضرع وزاری کر رہا ہے اور سوا آپکے کسی اور کو تکیہ گاہ اور اپنا سہارا نہیں سمجھتا

تو عطا بیگانگاں را می دہی از تو دارد آرزو ہر مشتہی

آپ تو بیگانوں کو بھی عطا فرماتے ہیں اور آپ سے تو ہر خواہش مند آرزو رکھتا ہے۔

مومن مخلص کی دعا اور ملائکہ کی سفارش نقل کرکے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ آگے حق تعالیٰ کا جواب نقل فرماتے ہیں اور وہی سبب ہے تاخیر اجابت کا جوکہ مقصود بیان ہے فرماتے ہیں کہ ؎

حق بفرماید نہ از خواری اوست عین تاخیر عطا یاری اوست

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری یہ تاخیر اجابت کچھ اس کی بے قدری کے سبب سے نہیں بلکہ وہی تاخیر اسکے حق میں عین کرم ہے اور اس کی اعانت ہے۔

نالۂ مومن ہمی داریم دوست گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست

بات یہ ہے کہ ہمکو مومن کی یہ آہ وفغاں پسند ہے اس سے کہو کہ اور گریہ وزاری کرے کیونکہ اس میں اسکا اعزاز ہے۔

حاجت آوردش زغفلت سوئے من آں کشیدش موکشاں در کوئے من

اسلئے کہ وہ تو غفلت میں پڑا ہوا تھا اسکی حاجت ہی اسکو میری طرف لائی اسی نے اسکی چوٹی پکڑ کر میرے کوچہ میں اسے پہونچایا۔

گر برآرم حاجتش او وا رود ہم دراں بازیچہ مستغرق شود

اگر میں فوراً اسکی حاجت پوری کردوں تو پھر اپنی پرانی حالت پر لوٹ جاویگا اور اسی سابقہ کھیل میں مشغول ہوجاوے گا۔

گرچہ می نالد بجان یا مستجار دل شکستہ سینہ خستہ سوگوار
خوش ہمی آید مرا آواز او واں خدایا گفتن واں راز او

یہ جانتا ہوں کہ جان ودل سے نالہ کر رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے دل اس کا شکستہ ہے سینہ خستہ ہے اور خود غمزدہ ہے بایں ہمہ دواعی میں جو اسکی دعا قبول نہیں کر رہا ہوں تو اسلئے کہ مجھے اسکی آواز ہی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کا یا خدا یا خدا کہنا اور مجھے ہمراز بنانا پسند آتا ہے۔

زانکہ اندر لابہ و در ماجرا می فریباند بہر نوعے مرا

اور اسکی یہ بات بھی مجھے پسند ہے کہ وہ اپنے عرض مدعا میں طرح طرح سے تملق وچاپلوسی کرکے مجھے پھسلاتا ہے۔

طوطیان و بلبلاں را از پسند از خوش آوازی قفس درمیکشند

دیکھو! بلبل اور طوطی کو جو قفس میں بند کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی خوش آوازی کی وجہ سے لوگوں کو پسند ہوتی ہیں

Scanned with CamScanner

زاغ را و چغد را اندر قفص ؎ کے کنند ایں خود نیامد در قصص

اور اُلّو اور کوّے کے بارے میں کسی داستان میں یا کسی کی زبان سے نہ سنا ہوگا کہ کسی نے انھیں بھی پنجڑے میں پالا ہو۔

آگے مولانا روم رح تاخیر اجابت مومن بوجہ پسندیدگی کی ایک مثال بیان کرتے کہ:۔

پیش شاہد باز چوں آید دو تن ؎ آں یکے کمپیر و دیگر خوش ذقن

دیکھو کسی حسن پسند کے سامنے جب دو شخص آویں ایک تو ان میں بڑھیا ہو اور دوسری قبول صورت ہو

ہر دو ناں خواہند او زود تر فطیر ؎ آرد و کمپیر را گوید کہ گیر

اور دونوں اس سے روٹی طلب کریں تو وہ جلدی سے روٹی لاوے گا اور بڑھیا کو تو دے کر رخصت کردیگا۔

واں دگر را کہ خوشستش قد و خد ؎ کے دہد ناں بل بتاخیر افگند

اور اس دوسری کو جس کا قد اور خد خوبصورت ہے اور اسکو پسند ہے اس کو روٹی دینے میں تاخیر کریگا۔

گویدش بنشیں زمانے بے گزند ؎ کہ بخانہ نان تازہ می پزند

یعنی اس سے کہے گا کہ آرام سے ذرا دیر بیٹھو ؎ گھر میں تازی روٹی پک ہی ہے پک جائے تو دوں

چوں رسد آں نان گرمش بعد کد ؎ گویدش بنشیں کہ حلوا میرسد

پھر جب بہت دیر کے بعد گرم روٹی لے آویگا تو اس سے کہے گا کہ اچھا تھوڑی دیر اور بیٹھ حلوا آتا ہے اسکے ساتھ کھانا

ہم بدیں فن وا دارش میکند ؎ وز رہ پنہاں شکارش میکند

غرض اسی تدبیر سے اسکو ذرا اور ٹھہرو ذرا اور ٹھہرو کہتا رہتا ہے اور مقصد پنہانی اسکو شکار کرنا ہوتا ہے۔

کہ مرا کاریست با تو یک زماں ؎ منتظر می باش اے خوب جہاں

آخر میں کہتا ہے کہ مجھ کو تجھ سے ایک کام ہے تھوڑی دیر اور انتظار کر اے حسین جہاں

تا بدیں حیلت فریبا ندورا ؎ تا مطیع و رام گرداند ورا

اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بہانہ سے اسکو پھسلاوے تا کہ اس کو اپنا مطیع و مسخر کرلے

اس کے بعد مولانا روم رح دعائے مومن میں بھی حق تعالیٰ کی تاخیر اجابت کا اس مثال کیساتھ

انطباق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

مثل آں کمپیر داں بیگانگاں ؎ شاہد خوش روئے مثل مومناں

بس اسی بڑھیا کی طرح بیگانوں کو سمجھو (کہ ان کو فوراً دیکر دفع کردیا جاتا ہے) اور شاہد خوش رو مثل مومنوں کے ہے

(جسکو دینے میں تاخیر کیجاتی ہے اور مقصود اسکے جمال کا دیکھنا ہوتا ہے)

ایں جہاں زندان مومن زیں بود کافراں راجنت حالے شود

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا سجن مومن کہلاتی ہے کہ اسکی حاجات کم پوری ہوتی ہیں جس سے وہ تنگ بھی ہوتا ہے اور کافروں کیلئے جنت ہے کہ ان کی اکثر حاجات مرضی کے موافق پوری ہو جاتی ہیں۔

بیمرادی مومناں از نیک و بد تو یقیں میداں کہ بہر ایں بود

حاصل کلام یہ کہ مومن خواہ نیک ہو یا بد وہ جو کبھی اپنی مراد کو نہیں پاتا تو یقین کر لو کہ اسکی وجہ یہی ہے یعنی اسکی گفتگو کا پسند ہونا باقی حق تعالیٰ کی ناراضگی یا بندے کی خواری ہرگز اس کا منشا نہیں ہے۔

سبحان اللہ کیا تسلی بخش مضمون ہے اب اس کے دیکھنے کے بعد بجائے اس کے کہ تاخیر اجابت کی وجہ سے طبیعت ملول ہو حق تعالیٰ کے اس کرم اور عنایت پر نظر کرکے اور اس امر کا تصور کرکے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی دعا کو سننا چاہتے ہیں۔ فدا ہونے کو جی چاہتا ہے!

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم کو مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا ورنہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کو اس دار دنیا میں بھی بہت کچھ دیا ہے۔

(اللہ تعالیٰ ان صالحین کی برکات ہم سب کو نصیب فرمائے ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهُ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

اللّٰهُمَّ اٰتِنِيْ اَفْضَلَ مَا تُؤْتِيْ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ)

(از مرتب)

ضمیمہ نسبت صوفیہ

(حصہ اول)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولایت کا ثبوت تو خود کتاب و سنت سے ہے۔ قال اللہ تعالیٰ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ و قال تعالیٰ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ لیکن یہ کہ اس کے مصداق کون لوگ ہیں؟ اور کون سی جماعت اس صفت کے ساتھ متصف ہے؟ اسکو بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ولایت تو ایک باطنی چیز ہے اور جب باطنی چیز ہے تو اس کا مصداق متعین ہونا چاہیئے ورنہ یا تو عام مومنین کو اس کا مصداق سمجھ لیا جائے گا یا کوئی مصداق ہی اس کا ذہن میں نہیں رہے گا۔

اس کے متعلق اسوقت آپ کے سامنے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کے رسالہ ارشاد الطالبین سے ایک مضمون نقل کرتا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصداق حضرات صوفیہ ہیں (حضرت قاضی صاحب کی ہستی مشہور و معروف ہے آپ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تلمیذ رشید اور حضرت مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ ہیں۔ محدث۔ مفسر۔ متکلم اور صوفی گذرے ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ آپ کو بیہقی وقت فرمایا کرتے تھے۔) آپ فرماتے ہیں کہ:۔

پس معلوم شد کہ سوائے کمالات ظاہری کمال است باطنی کہ اں تفاوت درجات بسیار وارد۔ چنانچہ حدیث قدسی براں دلالت میکند کہ حق تعالیٰ می فرماید۔ ہر کہ بمن یک وجب نزدیکی جوید من بوے یک گز نزدیکی جویم و ہر کہ بمن یک گز نزدیکی	معلوم ہوا کہ کمالات ظاہری کے علاوہ ایک کمال باطنی بھی ہوتا ہے اور اس کے درجات مختلف ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بندہ میری جانب ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں اس کی جانب ایک گز قریب ہوتا ہوں۔ اور جو شخص میری طرف ایک گز قریب ہوتا ہے میں اس کی جانب ایک باع قریب

جوید من بوے یک باع کہ سہ ونیم گز باشد نزدیکی جویم۔

ہوتا ہوں اور ایک باع ساڑھے تین گز کا ہوتا ہے۔

وفرماید کہ بندہ ہمیشہ بمن نزدیکی می جوید بہ عبادت نافلہ تا آنکہ من او را دوست می دارم و چون اورا دوست میدارم بینائی و شنوائی و قدرت او من می شوم

اور فرمایا کہ بندہ ہمیشہ میری جانب عبادات نافلہ کے ذریعہ قرب تلاش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اسکو محبوب بنالیتا ہوں اور جب اسکو محبوب بنالیتا ہوں تو اسکی آنکھ۔ کان اور ہاتھ بن جاتا ہوں کہ میرے ہی ذریعے اس کے سب کام انجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت قاضی صاحب نہایت محکم دلیل اس پر قائم فرماتے ہیں کہ حضرات مشائخ اس کمال باطنی کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

جماعتے بے نہایت کہ اتفاق شان برکذب عقل محال می داند۔

بیشمار لوگوں کی ایک جماعت جسکے جھوٹ پر متفق ہونیکو عقل محال سمجھتی ہے (بسبب انکے بے نہایت ہونیکے اور بسبب انکے تمام اکناف عالم میں منتشر ہونیکے یہ تواتر کیطرف اشارہ ہے کہ یہ تواتر ہے اور بوجہ تواتر کے اس کا علم قطعی ہے)

وآں جماعتے بقسمے است کہ ہر ہر فرو شاں بسبب تقوی وعلم بقسمے است کہ تہمت تکذیب بروے روا نباشد۔

اور وہ جماعت اس قسم کی ہے کہ اس کا ہر ہر فرد بسبب اپنے تقویٰ اور علم کے ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ (کذب) کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے۔

(ف) یہ دلیل نقلی ہے کہ شرعًا ایسوں پر اتہام جائز نہیں۔ غرض ان دونوں دلیلوں سے یہ مضمون جسکو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں ثابت ہے۔

بزبان قلم وقلم زبان خبر می دہند کہ مارا بسبب صحبت مشائخ کہ سلسلۂ صحبت شاں برسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرسد در باطن حالتے پیدا آمدہ سوائے عقائد وفقہ کہ قبل از صحبت شاں بداں متحلی بودند

ایسی جماعت زبان قلم اور قلم زبان سے یعنی تحریرًا وتقریرًا خبر دیتی ہے کہ ہمکو مشائخ کی صحبت سے جن کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے۔ عقائد و فقہ کے سوا جن سے وہ ان کی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے۔ باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے۔

وازیں حالت کہ حاصل شدہ محبت با خدا و دوستانِ خدا و اعمال صالحہ و توفیقات حسنات و رسوخ در اعتقادات زائد شدہ ۔	(جس سے وہ پہلے آشنا بھی نہ تھے (اور جس چیز سے آدمی آشنا تک نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کا انکار کرے۔ چنانچہ آجکل کثرت طریق باطن کا جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں انکار ہو رہا ہے اور انکار کے بعد اسکے برکات سے کیا حصہ نصیب ہو سکتا ہے اور اسی حالت کے انکار سے جو حضرات اسکے حامل ہیں انکا بھی انکار ہو رہا ہے) اور اس حاصل شدہ حالت سے انکے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمال صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہو گئے ہیں۔

اس حالت کے یہ ثمرات و برکات ہیں۔ خدا کی محبت۔ دوستان خدا کی محبت۔ اعمال صالحہ کی محبت اور توفیق اور سابق اعتقادات میں رسوخ کہ جس سے شکوک اور وساوس واہیہ کا جو در باب اعتقادات آیا کرتے ہیں قلع قمع ہو جاتا ہے

چنانچہ یہ حضرات اکابر ان لوگوں کو جو اس حالت سے متصف نہیں ہیں خشک کہتے ہیں جیسا کہ کتب تصوف سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ آگے قاضی صاحب فرماتے ہیں۔

وایں حالت کہ البتہ کمال است موجب کمال است +	اور اس میں شک نہیں کہ یہ حالت خود بھی کمال ہے اور دیگر کمالات کے (جنکا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے) حصول کا ذریعہ بھی ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اس حالت سے متصف ہو وہ کامل ہے اور اس کا فیض چونکہ دوسروں تک متعدی بھی ہوتا ہے لہذا وہ مکمل بھی کہلاتا ہے۔

قاضی صاحبؒ نے اس طرح سے جو اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اور اس سے ولایت کا اثبات فرمایا ہے تو یقیناً یہ الہامی مضمون ہے اور بلاشبہ اس سے ولایت کا اثبات ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہم سب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

جناب قاضی صاحب کا امت پر یہ احسان عظیم ہے کہ اتنی بڑی چیز جو مسلسل چلی آرہی تھی وہ مفقود ہو رہی تھی۔ اور صرف فقہ اور اعتقادات کو لوگ دین سمجھتے تھے جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کی جانب امت کو متوجہ فرمایا۔ یہ احیاء اور تجدید ہے۔ قاضی صاحب کو دربار رسالت سے اسی خدمت کیوجہ

سے کیا کچھ ملا ہوگا۔ میں حضرات علماء کی توجہ کو اس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں اور آج صوفیہ کی اسی نسبت مسلسلہ کی جانب توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ہم ایک بڑی دولت سے محروم ہیں اور ایک بڑی سنت کے تارک ہو رہے ہیں۔ قاضی صاحبؒ نے اپنے اس بیان کے ذریعہ علماء اور صوفیہ کے ایک قدیمی نزاع ہی کو ختم کر دیا۔ ورنہ تو بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے باہم ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک خلیج نزاع کی حائل ہوگئی تھی۔ قاضی صاحبؒ نے تواتراً اسکو ثابت فرمایا کہ علماء ربانی نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ مشائخ کی صحبت سے ہم نے اپنے باطن میں ایک نئی کیفیت محسوس کی ہے جس نے ہمارے سابق علوم واعمال میں ایک روح ڈالدی ورنہ اس سے پہلے ہمارے اعمال حال سے اور ہمارے جملہ مشاغل کیف سے خالی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے پاس کوئی دولت ہے جس سے علماء بھی مستغنی نہیں ہیں اور ہر زمانہ میں اس کے طالب ہوئے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ علماء اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ظاہری کے حامل ہیں تو صوفیائے کرام بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کے وارث ہیں۔ جیسا کہ یہی قاضی صاحبؒ اپنے ایک دوسرے رسالہ "مالا بد منہ" میں فرماتے ہیں کہ:۔

بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان واسلام وشریعت است ومغز وحقیقت او درخدمت درویشاں باید جست۔ وخیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت است کہ ایں سخن جہل وکفر است۔ (مالا بد منہ)	جانو: اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے کہ یہ بیان جو گذرا یہ تو ایمان واسلام اور شریعت کی ظاہری صورت تھی۔ باقی اسکا مغز اور حقیقت درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہیئے اور یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ حقیقت، شریعت کے خلاف (یعنی مقابل) کوئی چیز ہے کیونکہ ایسی بات زبان سے نکالنا جہالت بلکہ کفر ہے۔

پھر ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:۔

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینہ درویشاں باید جست وبداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر وشر بفراست صحیحہ دریافت شود۔ (مالا بد منہ)	پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو بزرگوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہیئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن اور منور کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہر خیر اور شر فراست صحیحہ کے ذریعہ معلوم ہو سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نور باطن (یعنی نسبتہ اور سکینتہ) کے حامل یہی حضرات ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ قاضی صاحب نے فرمایا ہے اسکی وجہ سے ان کے اندر فراست اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب سے بہت سی چیزیں جو دوسروں پر مخفی ہوتی ہیں ان حضرات پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

یہی مطلب ہے اس حدیث شریف کا کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ یعنی مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ حاشیہ مالابد میں حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی کا اس پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ :-

"ایک شخص درویشوں کا سا لباس جبہ و دستار پہنے ہوئے حضرت کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ جب حضرت خواجہ اپنے پند و نصائح سے فارغ ہوئے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا اور کہا کہ حضرت "اتقوا فراسة المومن" کا کیا مطلب ہے؟ اور اس فراست کا ذرا نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

فرمایا کہ وہ فراست یہی ہے کہ تم اپنی زُنّار توڑ دو۔ یہ سنکر وہ چلایا کہ معاذ اللہ زُنّار سے مجھے کیا سروکار۔ حضرت کا اشارہ پاکر ایک مرید نے بڑھ کر اسکی ریائی گدڑی کو الٹ دیا تو اس کے نیچے زُنّار نکلی۔ اسکے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ یارو! آؤ ہم سب بھی اپنے باطنی زنّار کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھیں۔ اس پر مجمع سے ایک شور اٹھا اور سب نے تجدید بیعت کی۔ سبحان اللہ

(حاشیہ مالابد منہ)

دیکھا آپ نے یہ تھا نور جو اللہ تعالیٰ اپنے مقبولین کو عطا فرماتے ہیں۔

بزرگوں نے اس نور اور نسبتہ سے کیا کیا کام لئے ہیں اس سلسلہ کے واقعات سے کتابیں پُر ہیں چنانچہ مجھے اس موقع پر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رح کا ایک واقعہ نہیں بھولتا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب و غریب واقعہ ہے اسی نور باطن سے متعلق۔ اس واقعہ کے سننے کے بعد حضرت شاہ صاحب سے عقیدت اور محبت بہت زیادہ ہو گئی۔ آپ بھی سنیئے اور ایمان تازہ کیجئے۔

(۱) "ایک شخص نے کسی آریہ کی کتاب دیکھی جس میں اس نے اسلام پر اعتراضات کئے تھے اس کے قلب میں بھی اس کے اعتراض کرنے سے شبہہ پیدا ہو گیا۔ اسلام سے بدعقیدہ ہو گیا۔ رمضان شریف

کا زمانہ تھا روزہ رکھے ہوئے تھا مگر خیال کیا کہ جب اسلام ہی ٹھیک نہیں ہے (معاذ اللہ) تو پھر اس کے احکام پر عمل کیسا؟ یہ کہہ کر روزہ بھی توڑ دیا۔ شام کو اپنے ایک دوست کے گھر اس سے ملنے گیا افطار کا وقت قریب تھا وہ افطاری وغیرہ سامنے رکھے ہوئے تیار ہی بیٹھا تھا اسکو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ آؤ بھائی، خوب آئے آؤ آج ہمارے ساتھ افطار کرو۔

اس نے جواب دیا کہ افطار کیا کریں۔ اگر میرا حال تم کو معلوم ہو جائے تو تم مجھ سے بات کرنا اور مجھ کو پاس بٹھانا تک گوارا نہ کرو۔ وہ شخص سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ کسی بدعقیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ بیش از بیش یہی نا کہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو بھائی ایمان اور کفر کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ ہماری تمہاری تو دوستی ہے اس لئے آؤ ہمارے ساتھ افطار میں تو شریک ہی ہو جاؤ۔ اور دوسرا کام یہ کرو کہ صبح ہی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب کی خدمت میں گنج مراد آباد چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں اسکی ہدایت کا وقت آگیا تھا بات سمجھ میں آگئی چنانچہ اگلے روز سویرے ہی گنج مراد آباد روانہ ہوا۔ خانقاہ میں پہونچا حضرت کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی بس اپنی جگہ سے کود کر اسکی جانب جھپٹے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منکشف ہو گیا تھا کہ ایک شخص بگڑ گیا ہے اور آپ کے پاس جا رہا ہے اسکو ٹھیک کیجئے) اور اسکے سینہ پر بڑی زور سے ہاتھ مار مار کر فرمانے لگے کہ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہہ ہے۔ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہہ ہے۔ یعنی اسکو کچھ کہنے اور سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ از خود اس سے پوچھنے لگے اب جو وہ اپنے اندر غور کرتا ہے تو شبہہ کے ساتھ ساتھ قلب میں اس کا جواب بھی موجود۔ چنانچہ اسلام کی جانب سے سینہ بالکل صاف ہو گیا اور اس کی حقانیت پر شرح صدر ہو گیا۔ پھر حضرت ہی کے ہاتھ پر اس نے توبہ کی اور نہایت پاک و صاف سینہ والا ہو گیا اور اسکے بعد سے تاحیات کبھی اس کے قلب میں اسلام کے کسی مسئلہ کے متعلق ذرا بھی وسوسہ نہیں پیدا ہوا۔

سبحان اللہ کیسا سینہ تھا اور کیا نور تھا۔ یہ ہے بزرگوں کا فیض اور ان کی تاثیر صحبت جس سے یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے تعلق اور ان سے نسبت صحیحہ پیدا کرنے کی بدولت نوازے جاتے ہیں۔

اسی قلبی نور اور فراست پر ایک اور واقعہ سنئے :-

Scanned with CamScanner

(۲) ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت چاند شاہ صاحب بڑے صاحب کشف اور روشن ضمیر بزرگ ہوئے ہیں۔ ایک شخص ان کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آیا۔ اپنے باغ سے کچھ کچے آم ہدیہ کیلئے ہمراہ لایا۔ راستہ میں ایک درخت کے نیچے ایک بڑا سا آم پڑا تھا اس نے اسکو بھی اٹھا کر جھولے میں ڈال لیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچکر وہ ہدیہ پیش کیا حضرت نے اسی وقت جھولے کو الٹا اور اس بڑے والے آم کو لیکر اس سے کہا کہ بھیا اری ھُو ہم ہی کا دے کے رہا (اس قسم کے حرام مال دینے کے لئے ہمارا ہی انتخاب تم نے کیا) یہ کہہ کر اس کے سب آم واپس کر دیئے اور فرمایا جاؤ تمہارا ہدیہ نہ لیں گے۔

(۳) انھیں بزرگ کا ایک اور واقعہ ہے کہ اسی طرح سے ایک شخص مرید ہونے کی نیت سے آیا اور جیسا کہ دیہاتیوں کی عادت ہوتی ہے دوسرے کے کھیت سے گنا توڑ کر چوستا ہوا چلا آیا۔ حضرت کی خدمت میں جب ملاقات کے لئے آیا تو فرمایا کہ بھیا کیسے آئیو۔ اس نے عرض کیا کہ مرید ہونے کے لئے فرمایا کہ اور راستہ میں او کھیا کاہے توڑے رہیو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ جاؤ تم کو مرید نہ کریں گے۔

یہ سب واقعات مشائخ کے ہیں۔ اس پر سنا رہا ہوں کہ ان حضرات کے خلوص کی برکت سے اللہ تعالیٰ شانہٗ ان کو کوئی دولت بخشتا ہے اور ان کے قلوب میں نور ہوتا ہے اور یہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی سلطنت کے وارث ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر زمانہ میں علماء ربانی نے ان کی قدر کی اور جب کسی کو پہچان لیا ہے تو پھر اس کے آگے اپنے کو فنا ہی کر دیا ہے۔

یہ ضرور ہوا کہ طریق کا اور مشائخ کا لوگوں نے انکار بھی کیا ہے لیکن علماء نے جب کسی کو مانا ہے تو اس میں شک نہیں کہ پھر ان سے زیادہ بزرگوں کو کسی نے مانا بھی نہیں ہے۔

حضرت سید احمد رفاعیؒ نے بھی اپنے زمانہ میں علماء ظاہر کو جماعت صوفیہ کی جانب نہایت موثر عنوان سے متوجہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

عزیز من! ان غریب علماء سے بھی جو حجاب میں پڑے ہوئے ہیں پوچھو! کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے شہروں میں کوئی ایسا شخص رہے جو زبردست کرامتوں سے منکروں گمراہوں (اسلام کے مخالفوں) معاندوں کو دبا دے اور مغلوب کر دے جن کو دیکھ کر مخالفین اسلام خود ہی بول

اٹھیں کہ واقعی اسلام سچا مذہب ہے۔ بحث و تکرار کی نوبت ہی نہ آئے۔

کیا تمہارا دل یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی زبان کا سلسلہ بند ہو جائے تمہارے نفس یہ خواہش کرتے ہیں کہ معجزات نبویہ کی سلطنت جاتی رہے (اگر تمہاری یہی تمنا ہے تو اپنے ایمان کی خیر مناؤ) اگر نہیں تو بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی ترجمان کون ہے؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا نمونہ کس کے پاس ہے؟ تمہارے پاس ہے یا صوفیہ کے؟ اگر یہ لوگ نہ رہے تو حضور کے روحانی اور باطنی کمالات کا نمونہ دنیا کو کون دکھلائے گا؟

(ص ۱۶۰ البنیان المشید)

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کا تعلق ایسا نہیں ہے کہ مومن اس سے صبر کر سکے ؎

الصبر یحمد فی المواطن کلها الا علیک فانه مذموم

(صبر ہر جگہ محمود ہے بجز تیرے کہ تجھ سے صبر کرنا بہت ہی عیب کی بات ہے)

اسی لئے اللہ تعالیٰ سے نسبت صحیحہ ہر زمانہ میں ایک جماعت نے پیدا کیا ہے اور بعد والوں کو ترغیب دے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ نسبت وہ ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے ابتک مسلسل چلی آرہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء کرام تک سب اس کے حامل رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نہ اس سے لوگ مستغنی ہی ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ حضرات اہل اللہ نے اس کو سمجھا اور اس کی تحصیل کے لئے کمر باندھ لی اور جان کی بازی لگا دی۔ اسی کو کسی اہل دل نے خوب کہا ہے ؎

میں بھی اس پر مر مٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کے عشق کو قلب میں پیوست کر دینے والا یہ مضمون ہے۔

نسبتِ صوفیہ حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ـــــــــــــ

الحمد للہ کہ میرا رسالہ "تصوف اور نسبت صوفیہ" شائع ہوا اور اہل علم کو عوام وخواص سب نے پسند کیا۔ اہل علم جب کسی تصنیف کو پسند فرمالیں تو اس سے امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وہ مقبول اور پسندیدہ ہی ہوگی۔

چنانچہ احباب میں سے بعض اہل علم اور اہل قلم حضرات جن سے میں محبت بھی کرتا ہوں اور انکا پاس ادب بھی ملحوظ رکھتا ہوں۔ ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس کو رسالہ "معرفت حق" سے علیحدہ کر کے مستقل کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ الحمد للہ کہ یہ بھی ہو گیا پھر اس کے بعد ان مولوی صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنا اور اپنے بعض احباب کا ایک اور خیال ظاہر فرمایا وہ یہ کہ اس رسالہ کو عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ کرا دیا جائے تو اسکا نفع اور عام ہو جائے۔ میں نے اجازت دیدی اور یہ کہا کہ ترجمہ کسی ایسے شخص سے کرایا جائے جو اس زبان اور اس فن دونوں سے مناسبت رکھتا ہو تاکہ مفہوم کی ادائیگی میں رد و بدل نہ ہو جائے۔

غرض میں نے جب علماء کو اس کی جانب اسقدر متوجہ دیکھا تو ان مولوی صاحب[1] کے پاس یہ کہلا بھیجا کہ۔

چونکہ آپ کو میری کتاب "نسبت صوفیہ" بہت پسند ہے اسلئے آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ فرمائیں تو اس نسبت صوفیہ کی دوسری قسط پیش

[1] یہ مولوی صاحب مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی تھے۔

کردں اور وہ ہو گی "نفس کی بحث" اس لئے کہ تمام مشائخ جو مشائخ ہوئے ہیں تو اسی لئے کہ انھوں نے اپنے نفس کو مارا ہے اور اس کو رام کیا ہے لہٰذا ان حضرات کے یہاں کی یہ خاص بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ آدمی کو اپنے نفس سے نسبت باقی رہتی ہے۔

آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے ؟ اس کی بحث چھیڑوں یا نہیں ؟

انھوں نے جواب میں فرمایا کہ حضرت! ضرور اس کی بحث فرمائیں اس زمانہ میں اسی کی تو بحث نہیں رہ گئی ہے۔ یا تو ماضی بعید میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ہی شد و مد کے ساتھ اس کی بحث فرمائی تھی جس پر ان کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم دال ہے اور یہ انکے اخلاص ہی کی برکت ہے کہ آج تک ان کی کتاب اہل سلوک کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہے۔ یا پھر ادھر ابھی ماضی قریب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بحث فرمائی ہے اور صلاح کی ہے اور اب حضرت والا کا دم غنیمت ہے کہ نفس کی بحث فرما کر اصلاح فرما رہے ہیں اس لئے میری تو رائے ہے کہ اس کی بحث ہونی چاہیئے انشاء اللہ تعالیٰ حالات زمانہ اور اہل زمانہ کے مطابق ہوگی اور مفید ہوگی۔ سب ہی لوگوں کو خاص کر طلبہ اور علماء کو اس سے بہت نفع پہونچے گا " انتہیٰ

اہل علم کی اس تائید کے بعد مزید ہمت اور جدید عزم پیدا ہو گیا۔

اتباع سنت کے سلسلہ میں جب کلام کر رہا تھا اس وقت مجھے بھی یہ خیال ہوا تھا گو ذرا مضمحل اور ضمنی کہ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفس کا ترک کرنا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کو۔ پاخانے جانے میں بایاں پیر پہلے رکھنے کو۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے داہنا پیر رکھنے کو تو لوگ سنت سمجھتے ہیں مگر نفس کے مارنے کو کوئی سنت سمجھتا ہی نہیں۔ حالانکہ یہ سنت ہے۔ تمام انبیاء و مرسلین کی اور یہ سیرت ہے اولیاء صالحین کی۔ اس لئے اس سے پھر

کبھی الگ مستقل بحث کرونگا۔

چنانچہ اس وقت اسی کی بحث کرنا چاہتا ہوں اگرچہ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ وقت ان سب باتوں کا ہے نہیں تاہم جب اس کی بحث اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے بزرگوں نے کی ہے تو ہم بھی کریں گے۔ ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

سنئے!

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَ آثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○

یعنی جس نے حق سے سرکشی کی ہوگی اور آخرت کا منکر ہوکر دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی۔ سو دوزخ اسکا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا۔ سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ آخرت کی سعادت یعنی دخول جنت اور وہاں کی شقاوت یعنی دخول نار ان دونوں کا مدار اسی نفس پر ہے۔

چنانچہ ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○

یعنی قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا۔ پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اس کو القاء کیا۔ یقیناً مراد کو پہونچا جس نے اس نفس کو پاک کرلیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اس کو فجور میں دبادیا۔

(بیان القرآن)

Scanned with CamScanner

غرض نفس کے اور نفس کی سرکشیوں کے تذکرہ سے تو قرآن شریف بھرا ہوا ہے ہم نے یہاں بطور نمونہ دو آیتیں لکھ دی ہیں۔ اب حدیث شریف سنئے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر خطبہ میں یہ پڑھا کرتے تھے اور آپ کا کوئی خطبہ اس سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ کہ

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفوس کے شروں سے اور اپنے سوء عمل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس کا بھی شر ہوتا ہے اور اس سے پناہ بھی مانگنا چاہئے۔
اسی طرح اپنی ایک دعا میں آپ دعا کے رنگ میں ارشاد فرماتے ہیں۔
اَللّٰھُمَّ قِنِی شَرَّ نَفْسِی ـــــ یا اللہ محفوظ رکھ مجھے نفس کی برائی سے۔ اور دوسری جگہ استعاذہ کے صیغہ میں فرمایا۔
اللھم انی اعوذ بک من شرّ نفسی۔ یعنی اے اللہ! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں اپنے نفس کی برائی سے۔
اسی طرح سے نفس کے شر کے متعلق حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کا قول اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے اور اسکا تذکرہ ہے کہ
جب ان کے پاس قاصد پہونچا اور ملک کا فرمان طلبی سنایا۔ تو آپ نے اس سے فرمایا کہ ملک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے ان کا کیا واقعہ ہے؟ پہلے اس کی تحقیق کرو ـــــ چنانچہ اس کی تحقیق کی یہ دیکھ کر زلیخا نے کہا کہ۔

اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝

یعنی اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی میں نے ہی ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی اور بیشک وہی سچے ہیں۔
تو سیدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ۔

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ۔

Scanned with CamScanner

یعنی یہ اہتمام محض اسوجہ سے ہے تاکہ اس کو یعنی عزیز مصر کو یقین کے ساتھ معلوم ہوجاوے کہ میں نے ان کی عدم موجودگی میں اسکی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

فرمانے کو تو حضرت یوسف علیہ السلام یہ فرما گئے لیکن چونکہ عارف کامل تھے بلکہ سید العارفین تھے اسلئے معاً قلب اطہر میں اپنا یہ تبریہ اور تزکیہ کھٹکا اس لئے فوراً کلام کا رُخ بدل کر فرمایا کہ:-

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

یعنی اور میں اپنے نفس کو بالذات بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس تو ہر ایک کا بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس نفس کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ بلاشبہہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔

دیکھا آپ نے حضرات انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے نفس کے متعلق کیا رائے رکھتے اور نفس سے کتنا ڈرتے تھے۔ برابر اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگتے رہتے تھے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں اور استعاذے اس سلسلہ میں منقول ہیں (جیسا ابھی بیان کیا گیا) وہ اسی لئے ہیں کہ آپ کے بعد آپکی اُمت اس کو اپنا شعار بنالے اور نفس کے کید اور شرور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔

اللہ و رسول کے ان ارشادات سے آپ کو اب نفس کی کچھ اہمیت محسوس ہوئی ہوگی اب اسکے متعلق مشائخ کے ارشادات بھی سنئے:-

صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ

اعلم ان مخالفۃ النفس رأس العبادۃ

یعنی جانو کہ نفس کی مخالفت کرنا جملہ عبادات سے بڑھ کر بلکہ انکی اصل ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ عبادت کی کنجی فکر ہے اور انسان کے معیب ہونے

کی علامت نفس اور ہوٰی کی مخالفت کرنا ہے اور ان دونوں کی مخالفت یہ کہ ان کی خواہشات کی مخالفت کیجائے۔

ابن عطاؒ کہتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ فرماتے تھے کہ ایک شب مجھے نیند نہ آئی۔ اٹھا کہ اپنا ورد ہی پورا کرلوں مگر اس میں بھی وہ حلاوت نہ نصیب ہوئی جو اور دنوں ملتی تھی۔ میں نے چاہا کہ سو ہی رہوں تو نیند بھی نہ آئی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا تو بیٹھا بھی نہ گیا دروازہ کھول کر باہر چلا تو دیکھا کہ ایک شخص چادر اوڑھے راستہ ہی میں پڑا ہوا ہے۔ میری آہٹ سن کر سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کر کہا کہ اے ابو القاسم اس وقت کہاں؛ میں نے جواب دیا کہ اے میرے سید بس یوں ہی بلا ارادہ ہی باہر نکل آیا ہوں فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے محرک القلوب (یعنی حق تعالیٰ) سے دعا مانگی تھی کہ آپ کے قلب کو میری طرف متوجہ فرمادے۔

میں نے کہا کہ پھر ہوا تو ایسا ہی۔ اچھا تو آپ کو کیا ضرورت پیش آئی ہے۔ فرمایئے۔ انھوں نے کہا کہ بس میرے ایک سوال کا جواب دیدو وہ یہ کہ متی یصیر داء النفس دواھا۔ یعنی نفس کی بیماری ہی خود اس نفس کے حق میں دوا کب بن جاتی ہے۔ حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً یہ جواب دیا کہ اذا خالفت النفس ھواھا۔ صار داءھا دواھا۔ (یعنی نفس جب اپنی مخالفت خود کرنے لگ جائے تو پھر اسکا مرض ہی اسکی دوا بنجاتا ہے)

یہ سن کر اس نے اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہا کہ اب تو تو نے سن لیا۔ میں نے سات مرتبہ تجھے یہی جواب دیا تھا لیکن تو نے نہ مانا اور یہی کہا کہ حضرت جنیدؒ کہدیں گے تو مانوں گا تو اب تو تو نے ان کی زبان سے بھی سن لیا۔ یہ کہکر وہ چلدیا میں نہ اس کو پہلے سے جانتا تھا اور نہ بعد ہی میں واقف ہو سکا کہ یہ کون شخص تھا اور کہاں گیا۔

(قشیریہ ص)

دیکھا آپ نے نفس کے بارے میں بزرگوں نے کیسا کیسا فرمایا ہے۔ حضرت جنیدؒ جو اس طائفہ کے امام ہیں وہ فرما رہے ہیں کہ نفس کی بیماری ہی خود اپنی دوا بن جاتی ہے لیکن کب؟ جب کہ نفس اپنی خواہشات کا اتباع ترک کردے اسی کو کہا ہے کہ

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا

چنانچہ اس سلسلہ میں کیسے کیسے مجاہدے کئے ہیں اور جب انھیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے ملاقات نفس کے چھوڑنے اور فنا کرنے ہی پر موقوف ہے تو پھر اسکے لئے انھوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگادی اور اس کو ختم ہی کر کے رہے اور اللہ و رسول سے اپنا تعلق صحیح اور سچا قائم کر ہی لیا اسی لئے میں نے یہ چاہا کہ اس سے بحث کروں اور "نسبت صوفیہ" کی قسط ثانی اسی کو بناؤں کیونکہ یہ اتنی ضروری بحث ہے کہ بزرگان دین نے ہر زمانہ میں اس کی بحث سے اعتناء کیا ہے بلکہ ان کا موضوع فن ہی یہی رہا ہے اور اس زمانہ میں نفس سے نکلنا اور اس کی اصلاح تو الگ رہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی گفتگو کا سننا تک پسند نہیں۔ جب حال یہ ہوجائے اسوقت تو اس کی بحث چھیڑنا بلاشبہ من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد کا مصداق ہوگا۔

اس لئے مصلح کو چاہیئے کہ اس کی بحث کرے اور لوگوں کو اُنکا اصلی مرض سمجھائے۔

چنانچہ میں کہتا ہوں کہ مشائخ محققین فرماتے ہیں کہ اول قدم للمريد فی هذه الطريقة ينبغي ان يكون على الصدق۔

یعنی مرید کا پہلا قدم اس طریق میں یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صدق پر ہوتاکہ ایک اصل صحیح پر بناء ہوسکے۔

اگرچہ یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن اگر اسی کو یوں کہدیا جائے کہ اول قدم للمريد فی هذه الطريقه ينبغي ان يكون على النفس تو بھی غلط نہ ہوگا بلکہ کچھ زیادہ ہی واضح ہوگا۔ اور میں اس کی تائید میں عارفین کا یہ قول پیش کرسکتا ہوں۔

فرماتے ہیں کہ ؎

یعلم اللہ تا بجانان دو قدم رہ بیش نیست
آں یکے بر نفس خود نہ داں دگر در کوئے دوست

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر قدم رکھا جاتا ہے اور وہ پہلا قدم ہے اور دوسرا قدم کوئے دوست میں پڑتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دوسرا قدم سالک کو رکھنا ہی نہیں پڑتا بلکہ وہ ادھر ہی سے جذب کرلیا جاتا ہے جو اسکے اختیار میں بھی نہیں ہے مگر اسکے امور اختیاریہ یعنی طاعت وغیرہ ہی پر وہ مرتب ہوتا ہے۔

میں نے جو یہاں اصلاح نفس کو پہلا قدم کہا تو یہ سلوک کے بھی عین مناسب ہے کیونکہ از ابتدا تا انتہا جو چیز سالک کے ساتھ رہتی ہے وہ اسکا نفس ہی ہوتا ہے اور مشائخ فرماتے ہیں کہ

"لطائف ستہ میں سے سب سے آخر میں جو چیز درست ہوتی ہے وہ یہی نفس ہے" اور ہوتا تو ہے یہ دراصل کثیف اس لئے کہ مادی ہے لیکن دیگر لطائف کی برکت سے اس پر جو نور پڑتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ بھی منور ہوجاتا ہے اس لئے اس کو بھی لطیفہ کہا جاتا ہے۔

انسان کو پریشان تو کرتا ہے یہ بلوغ ہی کے وقت سے مگر ٹھیک ہوتا ہے سب سے آخر میں جاکر۔ اور مشائخ یہ بھی فرماتے ہیں کہ گو یہ آخر میں درست ہوتا ہے تاہم اسکی جانب توجہ اول ہی میں کی جاوے گی واقعی یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو اس کی فکر نہیں ہوتی وہ اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ اور کام کا حصہ ضائع کرکے تب اسمیں ہاتھ لگاتے ہیں اور اپنے کئے پر بہت پچھتاتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی کیوں آنے دو کہ یہ کہنا پڑے کہ ؎

نیم عمرت در پریشانی گذشت نیم دیگر در پشیمانی گذشت

یعنی آدھی عمر تو غفلت اور ہو ہا ہو میں گزاری اور بقیہ آدھی اسکے افسوس میں۔ (یہ کیا حماقت ہے جو وقت ملا ہے اب اس میں کام کر لو!)

اور جب یہ درست ہوتا ہے سب سے آخر میں تو اس کی بحث سب سے پہلے ہی ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ جو چیز آخر میں ہوتی ہے وہ اول بھی ہوتی ہے کیونکہ اگر اول میں نہ ہو تو آخر میں کہاں سے آجائے گی۔ (دیکھئے اگر آپ کسی نقطہ سے ایک دائرہ کھینچئے تو خاتمہ اس دائرہ

کا اسی نقطہ پر ہوگا جس سے وہ شروع ہوا تھا اور یہی نقطہ ایک اعتبار سے اگر اول تھا تو دوسرے اعتبار سے آخر بھی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ جو چیز آخر ہوتی ہے وہ اول بھی ہوتی ہے

چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ ما النہایۃ یعنی سلوک کی انتہا کہاں پر ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا الرجوع الی البدایۃ۔ یعنی جہاں سے سفر شروع کیا ہے جب آدمی وہیں پہونچ جائے یہی اس کی انتہا ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ نفس ہی سے کام کو شروع کرو اور اسی پر سلوک کو ختم کرو یہ مانا کہ مبتدی ابتدا میں نفس کو ایک منتہی کے برابر نہ سمجھ سکے گا تاہم کچھ تو اس کو سمجھ ہی لیگا اور بہت کچھ اس کی برائیوں سے بچا رہے گا۔

میں نے ان مولوی صاحب سے یہ بھی کہا تھا کہ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں اَللّٰھُمَّ قِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ فرما رہے ہیں وہیں یہ بھی فرما رہے ہیں کہ و من شر مَنِيِّيْ یعنی اے اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اپنی منی کی شر سے۔

میں نے اُن سے کہا کہ دیکھئے خواہشات نفس کا ایک بڑا حصہ انسان اسی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے نقصانات اور فسادات لازم اور متعدی رونما ہوتے ہیں اور آج ہمارے والدین اور استاد تو شرم کی وجہ سے اس لفظ کو زبان پر نہیں لاتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم پر ہمارے والدین سے بھی زیادہ شفیق ہیں آپ نے اس چیز کے اثرات بد سے حفاظت کے لئے ایک دعا ہی تعلیم فرمادی اور باوجودیکہ من شر نفسی کے عموم میں یہ بھی داخل تھا مگر آپ نے اس کے فساد کو نفس کے فسادات میں اعلیٰ سمجھتے ہوئے صراحۃً اس سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم فرمائی۔ تاکہ آپ کی اُمت کے نوجوان لوگ اس کو اپنا وظیفہ بنائیں اور اس کے شر سے خود کو بچائیں۔

غرض نفس کا معاملہ چونکہ اہم تھا اس لئے مصلحین اُمت نے ہر زمانہ میں اس سے بحث فرمائی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وصف چونکہ "تزکیہ قلوب" بھی تھا اس لئے خواص اُمت نے اس جانب توجہ فرمائی ہے اور خود نفس سے نکلے ہیں اور دوسروں کو نکالا ہے اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ سُنئے :-

اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والی جو چیز ہے وہ یہی نفس ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِنَّ اَعدیٰ عَدُوِّکَ نَفسُکَ الَّتِی بَینَ جَنبَیکَ یعنی تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے پہلو میں ہے۔

انسان اپنے ہوائے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اس کی وجہ سے شریعت کا اتباع ترک کر دیتا ہے۔ یہ مرض چونکہ عام ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کے اتباع کا امر اور اہل ہویٰ کے اتباع سے منع فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:۔

ثُمَّ جَعَلنٰکَ عَلیٰ شَرِیعَۃٍ مِّنَ الاَمرِ فَاتَّبِعھَا وَلَا تَتَّبِع اَھوَآءَ الَّذِینَ لَا یَعلَمُونَ۔

یعنی ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا ہے تو آپ اسی طریقہ پر چلے چلئے اور جہلا کی خواہشوں پر نہ چلئے۔

دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے اتباع شریعت کی اور نہی فرمائی گئی ہے اتباع ہوا سے پس اس آیت کی رو سے شریعت کا اتباع واجب ہوا اور اتباع ہوا حرام ٹھہرا۔

اسی طرح سے ایک اور مقام پر نص ہے کہ ہویٰ کی اتباع اللہ تعالیٰ کے راستہ کی بالکل ضد ہے۔ انسان اس کی وجہ سے راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلنٰکَ خَلِیفَۃً فِی الاَرضِ فَاحکُم بَینَ النَّاسِ بِالحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَن سَبِیلِ اللّٰہِ۔

یعنی اے داؤد ہم نے تم کو زمین کا حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔

دیکھئے حضرت داؤد علیہ السلام اولوالعزم پیغمبر تھے مگر ان کو بھی نہی فرمائی گئی کہ

ولا تتبع الھویٰ ۔ تا بدیگراں چہ رسد۔

انہیں نصوص کو دیکھ کر حضرات صوفیائے کرام نے ہوائے نفس کی اہمیت کو سمجھا اور نفس کی اصلاح کی فکر میں پڑ گئے۔ اور لوگوں کو اس کے غوائل سے متنبہ فرمایا جیسا کہ ان حضرات کے کلام سے ظاہر ہے چنانچہ مولانا رومؒ نے مثنوی میں جگہ جگہ اس پر گفتگو فرمائی ہے۔ مثلاً۔ ایک جگہ ہوائے نفس سے تحذیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

با ہوا و آرزو کم باش دوست
چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

یعنی ہوائے نفسانی اور اپنی امانی یعنی آرزو اور خوش آیند خیالات سے دوستی ہرگز نہ کرنا اسی لئے کہ اسکا حال یہ ہے کہ یہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بھٹکادیگی اسی طرح سے ایک اور مقام پر ہوا سے تخویف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

تازہ کن ایماں نہ از گفتِ زباں　　اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں
تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست　　کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

یعنی ایمان کو صدق دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں تم نے باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے۔ سو جب تک ہوائے نفسانی تازہ ہے ایمان تازہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ۔ کیونکہ یہ ہوائے نفسانی اس دروازہ (یعنی علوم و حقائق) کا قفل ہے جس سے اسکے حقائق منکشف نہیں ہوسکتے۔

کردہ تاویل لفظِ بکر را　　خویش را تاویل کن نے ذکر را
فکر تو تاویل کردہ ذکر را　　ذکر را مان و بگرداں فکر را

بر ہویٰ تاویل قرآں میکنی
پست و کژ شد از تو معنیِ سنی

یعنی تم محفوظ الفاظ میں تاویلیں کرنے لگے (محفوظ الفاظ سے مراد قرآن و حدیث کے صحیح الفاظ ہیں) اور ان کو بوجہ محفوظ ہونے کے بکر کہا کیونکہ بکر یعنی ناکتخدا بھی محفوظ

Scanned with CamScanner

ہوتی ہے) سو تم کو چاہیئے کہ خود اپنی "تاویل کر دو یعنی اپنے اندر تغیر پیدا کر دو۔ الفاظِ قرآن کی تاویل مت کرو یعنی ان کو ان کے اصل معنی سے مت بدلو تمھاری قوتِ فکریہ نے لفظِ قرآن کی تاویل کر رکھی ہے تم کو چاہیئے کہ قرآن کو تو اس کی اصل حقیقت پر رہنے دو اور اپنی قوتِ فکریہ کو بدلو کہ اسکا فساد مبدل بہ صحت ہو۔ تم محض ہوائے نفسانی پر قرآن کی تاویل کرتے ہو جس سے تمھاری "تاویل کی بدولت قرآن کے روشن معنی جو بہت صاف اور واضح تھے کج اور متغیر ہو گئے۔

دیکھیے مولانا رومؒ بھی ہوائے نفس کی کیسی مذمت بیان فرما رہے ہیں اور امت کو اس سے کس طرح سے ڈرا رہے ہیں۔ اسی طرح سے مشائخ نے ہر زمانہ میں لوگوں کو اس سے بچانے کی سعی فرمائی ہے لیکن اہلِ نفس بھی اپنے ہوائے نفسانی کی ایسی اتباع کرتے ہیں جیسی اہل حق نص کی کیا کرتے ہیں۔ ہوی کی مذمت کے لئے یہ کافی ہے کہ جس طرح سے اللہ کی اطاعت کرنے والے کو خدا پرست کہا جاتا ہے اسی طرح سے جو شخص احکام خداوندی کی پابندی نہیں کرتا اور اس کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے اس کو ہوی پرست کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں ایسے شخص کو ہوی پرست ہی فرمایا ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ ۔ اس مضمون کو مکتوبات معصومیہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :۔

"باید دانست کہ صورتِ ایماں چنانچہ موقوف است بر نفی الہۂ آفاقی کہ اصنام و سائر معبودات کفرہ است حقیقت ایمان موقوف ست بر نفی الہۂ انفسی کہ عبارت از ہوائے نفسانی ست و گرفتاری ست بمرادون حق جل و علا آیہ کریمہ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ شاہد ایں معنی ست بزرگان گفتہ اند ہرچہ مقصود تست معبود تست۔"

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۴۲)

دیکھیے اس سے معلوم ہوا کہ ہوائے نفسانی کو بھی لوگ الٰہ کا درجہ دیدیا کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

جس کا شرک ہونا ظاہر ہے۔ اسی شرک سے بچانے کے لئے بزرگان دین سب سے پہلے ہوائے نفسانی سے لوگوں کو نکالتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں یہ حضرات طالبین راہِ خدا سے بڑے بڑے مجاہدے کراتے ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے طالب ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان مجاہدات کو برداشت کرتے ہیں اور نفس سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنے عیوب کی جستجو میں رہتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اپنے عیوب سے واقف ہونے کے چند طرق بیان فرمائے ہیں۔ طالبین کے افادہ کے لئے ہم اس کو یہاں درج کرتے ہیں، امام فرماتے ہیں کہ۔

(اُن طرق کا بیان جن کے ذریعہ آدمی اپنے نفس کا عیب جان سکتا ہے)

جانو! کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنے نفس کے عیوب کا بصیر بنا دیتے ہیں چنانچہ جس شخص کی نظر دور رس ہوتی ہے اس کے عیوب اس پر مخفی نہیں ہوتے اور جب انسان اپنے عیوب کو جان لیتا ہے تو اس کے لئے اپنا علاج آسان ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ اپنے عیوب نفس سے ناواقف ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو تو دیکھ لیتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر اسکو نظر نہیں آتا۔ لہذا جو شخص یہ چاہے کہ اپنے نفس کے عیوب پر واقف ہو تو اسکے لئے یہ چار طریقے ہیں:۔

(اول یہ کہ) کسی ایسے شیخ کی صحبت اختیار کرے جو نفس کے عیوب سے اچھی طرح واقف ہو اور اس کے پوشیدہ مکائد سے خوب باخبر ہو۔ اور اُس کو اپنے نفس پر حاکم بنا دے اور معالجۂ نفس میں اس کی ہدایات کا اتباع کرے۔ ابتک شیخ اور مرید اور استاد اور شاگردوں میں یہی طریقہ رائج تھا کہ شاگرد کو اسکا استاد اور مرید کو اسکا شیخ اسکے نفس کے عیوب کو پہنچواتا تھا اور ان کے علاج کا طریقہ بتاتا تھا۔ مگر اس زمانے میں تو یہ سلسلہ قریب قریب ختم ہی کے ہو گیا ہے شاذ و نادر ہی کہیں اس کا وجود باقی ہوگا۔

(دوسرا طریقہ) اپنے نفس کے عیوب پر مطلع ہونے کا یہ ہے کہ کوئی سچا مخلص۔ ہوشیار وسمجھدار اور دیندار و دیانت دار دوست تلاش کرے اور اس کو اپنے اوپر نگران بنالے تاکہ وہ برابر اس کے حالات اور افعال کا جائزہ لیتا رہے اور اس کے اخلاق وافعال اور ظاہری اور باطنی خصائل میں سے جس خصلت کو ناپسند کرے اس پر اس کو ٹوکا کرے یہی طریقہ تھا عقلاء کا اور اکابر ائمہ دین کا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو میری جانب میرے عیوب کا ہدیہ پیش کرے اور آپ حضرت سلمانؓ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے۔ ایک بار حضرت سلمان آئے اور پوچھا کہ میری جانب سے آپ کو کیا شکایات پہونچی ہیں جو باعثِ تکدر مزاج بنیں۔ آپ نے کچھ نہیں فرمایا انھوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ مجھے تمھاری یہ بات پہونچی ہے کہ تم دسترخوان پر دو سالن کو جمع کرتے ہو اور تمھارے پاس رات کا لباس الگ ہے اور دن کا الگ۔

حضرت سلمان نے عرض کیا بس یہی شکایت پہونچی ہے یا اس کے سوا کچھ اور فرمایا کہ نہیں بس یہی مگر یہ دونوں بھی تمھارے مرتبہ کے اعتبار سے کچھ کم نہیں ہیں یعنی بڑا جرم ہے۔

اور یہی حضرت عمرؓ ہیں کہ حضرت حذیفہؓ سے دریافت کرتے تھے کہ تم تو صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ منافقین کے بارے میں آپ کے رازوں سے واقف ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ مجھ میں تو کچھ نفاق کے آثار نہیں دیکھتے ہو۔

دیکھو حضرت عمرؓ باوجود جلالتِ شان وعلو منصب اپنے نفس کو ایسا متہم سمجھتے تھے۔ پس جو شخص زیادہ عقل والا اور عالی منصب والا ہوگا وہ اعجاب میں کم ہوگا اور اپنے نفس کو متہم سمجھنے میں زیادہ ہوگا مگر یہ کہ اس زمانہ میں یہ طریقہ بھی نادر ہے کیونکہ دوستوں میں بھی ایسے بہت کم ملیں گے جو مداہنت سے نہ پیش آئیں اور عیب پر مطلع کردیا کریں یا حسد نہ کریں اور قدرِ واجب ہی پر اکتفا کریں مبالغہ نہ کریں پس دوستوں میں یا تو اہل حسد ہوں گے یا صاحب غرض ہونگے جو کہ غیر عیب کو بھی عیب شمار کرلیں گے اور یا مداہن ہونگے کہ بعضے عیوب تمھارے تم سے مخفی رکھیں گے

یہی وجہ تھی کہ حضرت داؤد طائی نے لوگوں کے ساتھ رہنا سہنا اُٹھنا بیٹھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں سے کیوں نہیں ملتے جلتے فرمایا کہ میں اُس جماعت کو لیکر کیا کرونگا جو مجھ کو میرے عیب تک نہ بتائے بلکہ اُنکو مجھ سے چھپائے پس ایک دیندار کی تو خواہش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے عیوب پر دوسروں کے تنبیہ کرنے سے متنبہ ہو جائے اور ہمارے زمانے میں معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ ہم کو وہی شخص سب سے زیادہ مبغوض ہوتا ہے جو ہمارا ناصح ہوتا ہے یعنی ہمارے عیوب کو ہم سے بتاتا ہے اور قریب ہے کہ اس وصف کو ضعف ایمان سے تعبیر کر دیا جائے اس لئے کہ اخلاق سیئہ سانپ اور بچھو ہیں جو انسان کو باطنی طور پر ڈستے رہتے ہیں تو اگر کوئی تنبیہ کرنے والا ہم کو اس بات پر متنبہ کرے کہ ہمارے کپڑے کے اندر بچھو موجود ہے تو ہم اسکا احسان مانیں گے اور اُس سے خوش ہونگے اور اُس بچھو کو کپڑے سے نکالنے کی کوشش کریں گے یہانتک کہ اُس کو نکال کر مار ڈالیں گے۔ حالانکہ اس کی تکلیف صرف بدن کو ہوتی اور وہ بھی ایک آدھ دن سے زیادہ نہ ہوتی مگر اخلاق ردیہ کا اثر تو قلب پر پڑتا ہے اور اسکا اندیشہ ہوتا ہے کہ موت کے بعد بھی ہمیشہ ہمیش باقی رہے یا ہزاروں سال تک باقی رہے مگر ہم اُس شخص سے خوش نہیں ہوتے جو ہمارے اِن سانپ بچھوؤں پر (یعنی اخلاق رذیلہ پر) ہم کو متنبہ کرتا ہے اور نہ ہمیں اُن کے ازالہ کی فکر ہوتی ہے بلکہ اُلٹے ناصح ہی سے مقابلہ کر بیٹھتے ہیں یعنی جو بات اُس نے ہمیں کہی ہے اس کے مثل (یا اس سے بڑھ کر) الزام اُس پر لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ تم نے بھی تو ایسا ایسا کیا ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ عداوت ٹھان کر ہم اس کی نصیحت سے منتفع نہیں ہو پاتے اور انسان کی یہ حالت مشابہ ہے قساوت قلبی کے جیسے کثرتِ ذنوب اُسکے اندر پیدا کر دیتے ہیں باقی ان سب کی اصل وہی ضعفِ ایمان ہے پس ہم اللہ عزوجل سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں رشد الہام فرمائے اور ہم کو ہمارے عیوب کا بصیر بنا دے اور ہمیں اس کے علاج اور معالجہ میں لگا دے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے (اپنے فضل وکرم سے) کہ ہم اُس شخص کے شکر گزار ہوں جو کہ ہمیں ہمارے عیوب پر مطلع کرے۔

(تیسرا طریقہ) اپنے نفس کے عیوب پر مطلع ہونے کا یہ ہے کہ اپنے عیوب کو اپنے مخالفین کی زبان سے معلوم کرے اس لئے کہ ناراضگی کی آنکھ عیوب کو ظاہر کیا کرتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے ایک کینہ پرور دشمن کے ذریعہ اپنے عیوب اُس سے کہیں زیادہ جان لے جتنا کہ اپنے ایک صدیق مداہن کے ذریعہ اپنے عیوب کو جان سکتا ہے اور مداہن کا مطلب یہ ہے کہ جو ہر وقت اس کی تعریف اور خوشامد ہی کرتا رہے۔ اُس کے عیوب دیکھے اور ٹال جائے (پس ایسے عیوب کے معلوم کرنے کا ایک ذریعہ اپنا دشمن بھی ہے) مگر یہ کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے دشمن کی تکذیب ہی کرتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے (خواہ وہ حق اور صحیح ہی کیوں نہ ہو) اُس کو حسد پر محمول کرتا ہے۔ لیکن جو شخص کہ صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ اپنے دشمنوں کے اقوال سے بھی سبق لے لیتا ہے اس لئے کہ کسی شخص کی برائیاں اُسکے مخالفین کی زبان پر آشکارا ہو ہی جاتی ہیں۔

چوتھا طریقہ اپنے نفس کے عیوب معلوم کرنے کا یہ ہے کہ لوگوں سے خوب ملو جلو اور جس خُلق کو دیکھو کہ لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں تو اپنے نفس سے اُس خلق کے ترک کرنے کا مطالبہ کرو اور اپنے اندر اُس رذیلہ کو سمجھو اس لئے کہ مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے تو چاہیے کہ اپنے غیر کے عیب کو اپنا عیب جانے اور یہ سمجھ لے کہ اتباع ہوئی کے باب میں طبائع ایک دوسرے کے قریب ہی قریب ہوتی ہیں پس ساتھیوں میں سے جس وصف کیساتھ ایک متصف ہوگا تو دوسرے ساتھی کے اندر یا تو اُس خلق کا اصل منشا موجود ہوگا یا وہی خُلق اُس سے زیادہ موجود ہوگا یا کچھ نہ کچھ اس کا حصہ تو ضرور موجود ہوگا اسلئے اپنے نفس میں بھی اُسکو تلاش کرے اور اُسے پاک وصاف کرلے ہر اُس چیز سے جس کو اپنے غیر میں ہونیکو بُرا جانتا ہے اور اپنے نفس کو مہذب اور مودب بنانے کیلئے یہ طریقہ کافی ووافی ہے کیونکہ اگر سب کے سب لوگ اُن چیزوں کو چھوڑ دیں جن کو اپنے غیر کے لئے مکروہ سمجھتے ہیں تو کسی مودِب کی حاجت ہی نہ پیش آئے۔

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ آپ کو کس نے ادب سکھلایا فرمایا کہ کسی نے نہیں۔ میں نے جاہل کی جہالت میں عیب دیکھا لہٰذا اُس سے اجتناب کیا۔ (مطلب یہ کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اچھے بُرے کی تمیز تو عطا فرمائی ہی ہے اس کو

عقل دی ہے فہم سے نوازا ہے لہذا بہت سے مواقع پر انسان اگر ذرا توجہ کرے تو اسکو ہی اپنا مؤدب اور معلم بنالے)

اور یہ تمام طرق اصلاح نفس کے اُن لوگوں کے لئے ہیں جنھیں کوئی شیخ عارف ذکی۔ بصیر بعیوب النفس۔ مشفق۔ ناصح فی الدین اور ایسا جو کہ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکا ہو اور بندگان خدا کی اصلاح و تربیت میں خیر خواہی کے ساتھ مشغول ہونہ ملا ہو لیکن جسے ایسا شیخ میسر آجائے تو گویا اُس نے طبیب کو پالیا لہذا اُس سے لپٹ جائے وہی اسے اس کے مرض سے بچالے گا۔ اور جس ہلاکت میں یہ پڑا ہوا ہے اُس سے اُسے نجات دلائیگا۔

(احیاء العلوم صفحہ ج ۳)

دیکھا آپ نے علماء نے نفس کی کیسی کیسی بحث فرمائی ہے اس سے نکلنے کے طرق بتلائے ہیں۔ آخر نفس سے نکلنے کی ان حضرات کے یہاں کچھ اہمیت تو ہوگی نا تب تو ایسی بحث فرمارہے ہیں یہ امام غزالیؒ ہیں مسلم بزرگ لوگوں نے انکو انکی انھیں خدمات کیوجہ سے مانا ہے اور امام گردانا ہے کہ انھوں نے نفس کی معرفت کرائی ہے جو کہ ایک عظیم الشان خدمت ہے۔ آدمی جو ترقی نہیں کرتا تو اسی لئے کہ وہ اپنے نفس کو نہیں پہچانتا یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے نقص کو نہیں پہچانتا جیسا کہ ایک دوسرے بزرگ عارف باللہ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

ہر کہ نقص خویش را دید و شناخت ‫ ‫ اندر استکمال خود دو اسپہ تاخت

زاں نمی پرد بسوئے ذوالجلال ‫ ‫ کو گمانے می برد خود را کمال

علتے بدتر ز پندار کمال ‫ ‫ نیست اندر جانت اے مغرور ضال

یعنی جو شخص اپنے نقص کو شناخت کرلے گا وہ تو اپنی تکمیل میں نہایت اہتمام سے سعی کریگا اور جس کو حق تعالیٰ کی طرف عروج روحانی نہیں ہوتا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے کو کامل سمجھتا ہے (اس لئے تحصیل کمال میں سعی نہیں کرتا) اور سچ یہ ہے کہ پندار کمال سے بڑھکر اور اس سے بدتر کوئی علت (یعنی مرض اور عیب) انسان میں نہیں ہے (اور اس کبر و پندار کا نکالنا کوئی ہنسی اور کھیل بھی نہیں ہے)۔

Scanned with CamScanner

دیکھئے فرمارہے ہیں کہ اسی نفس کے بہکانے کی وجہ سے اور اپنے کو پُر از کمال سمجھنے ہی کی وجہ سے انسان محروم رہتا ہے اور حق تعالیٰ کی جانب ایک قدم بھی راہ نہیں طے کرتا اور راہ طے کرنے کا طریقہ بھی بتلادیا کہ وہ اپنے نقص کا دیکھنا ہے۔ چنانچہ اپنے نفس کے رذائل معلوم کرکے انکا ازالہ کرنا اور غیر اللہ سے التفات قطع کر لینا یہی طریق کی اصل ہے۔ جسے یہ حضرات فنا سے تعبیر کرتے ہیں اور قولاً اور فعلاً اسی کی تلقین فرماتے ہیں اور طالبین خدا کو نہایت ہی ناصحانہ عنوان سے اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ چنانچہ یہی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ ؎

آئینہ ہستی چہ باشد نیستی　　نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

یعنی جس طرح سے آئینہ حسن ظاہری کے لئے مظہر ہوتا ہے اسی طرح ہستی حقیقی یعنی کمالات و فیوض حق کا آئینہ اور مظہر سالک کی نیستی اور اسکا فنا و اضمحلال ہے یعنی رذائل کے ازالہ سے انصباغ بانوار الٰہیہ و اتصاف بصفات حق کہ عبارت ہے بقا سے نصیب ہوتا ہے پس تم نیستی کو اختیار کرو اگر بے عقل نہیں ہو کیونکہ ہستی اور کمال کا ظہور نیستی اور نقص ہی سے ہوتا ہے۔ پس جب غیر اللہ سے فارغ ہو جاؤگے اور سائلانہ تہیدست ہو کر حضرت کبریا میں جاؤگے تو وہ اپنے فضل و کرم سے تم کو انوار ہستی عطا فرمائیں گے۔

سبحان اللہ کیا عارفانہ کلام ہے اور حق تعالیٰ تک پہونچنے کا کتنا آسان راستہ ہے وہ یہ کہ انسان اپنے نفس کو چھوڑ دے اور حق تعالیٰ تک پہونچ جاوے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ سوال کیا کہ اے میرے پروردگار آپ تک پہونچنے کا اقرب ترین راستہ کونسا ہے فرمایا کہ یا احمد دع نفسك وتعال۔ یعنی اسے احمد مجھ تک پہونچنا بہت آسان ہے بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور آجاؤ۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ جس قدر یہ راستہ مختصر ہے اسی قدر اہل نفس کے لئے یہ مشکل بھی ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں اہل علم کو اللہ تعالیٰ تک پہونچنے میں یہی امر مانع ہوا جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ امام احمدؒ جیسے جلیل القدر عالم سے بھی

حق تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ دع نفسک و تعال۔
اس سے معلوم ہوا کہ محض علم انسان کے لئے نفس سے چھوٹنے کے لئے کافی نہیں بلکہ بعض دفعہ تو یہی علم اپنے صاحب کے لئے وبال جان ہوجاتا ہے۔ یعنی جب کہ وہ علم رسمی ہو جیسا کہ مولنا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

علم ہائے اہل دل حمالِ شان ... علمہائے اہل تن احمالِ شان

یعنی اہل دل کے علوم تو ان کے حمال (یعنی بوجھ لے جانے والے) ہیں اور تن پروروں کے علوم ان کے احمال (یعنی اُن پر لدے ہوئے بوجھ اور بار) ہیں ؎

علم چوں بر دل زند یارے شود ... علم چوں بر تن زند مارے شود

یعنی علم کا جب قلب پر اثر ہوگا کہ خشیت و خلوص پیدا ہوجاوے تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہوا یعنی صرف زبان پر تقریر رہی یا یہ کہ اسکو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو نرا بوجھ اور وبال ہوگا۔

آگے فرماتے ہیں کہ ؎

علم کاں نبود ز ہو بے واسطہ ... آں نپاید ہمچو رنگ ماشطہ
لیک چو ایں بار را نیکو کشی ... بار برگیرند و بخشندت خوشی

یعنی جو علم حق تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو وہ بار ہی ہے۔ یعنی جو علم اُدھر سے بلاواسطہ نہ ہو اس کو ثبات نہیں ہوتا جیسا کہ مشاطہ کا لگایا ہوا روغن کہ اُسوقت تو چمک دمک نظر آتی ہے بعد چندے زائل ہوجاتا ہے اسی طرح ایسے علم کا اثر قلب میں نہیں رہتا۔ لیکن اگر اس بار کو اچھی طرح برداشت کرو یعنی تحصیل علم میں نیت خالص رکھو اور اس پر عمل کرتے رہو تو تمہارا بوجھ اُتار دیا جائیگا۔ اور تم کو خوشی دی جائے گی یعنی اب وہ علم تمھارا محمول نہ رہے گا بلکہ اس کو حامل بنا دیا جائے گا کہ تم اس کے سوار ہوگے اور وہ تمھاری سواری۔

آگے اس نیکو کش کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

ہیں مکش بہرِ ہوا ایں بار علم تا شوی راکب تو بر رہوارِ علم
ہیں مکش بہرِ خدا ایں یارِ علم تا بہ بینی در درون انبارِ علم
چونکہ بر رہوارِ علم آئی سوار بعد ازاں اُفتد تُرا از دوش بار

یعنی خبردار رہو ہوائے نفسانی کی تحصیل کی غرض سے اس بارِ علم کو مت اُٹھانا تاکہ تم رہوارِ علم پر سوار ہو جاؤ بلکہ اس کو خدا کی رضا کے لئے برداشت کرنا تاکہ اپنے قلب میں ڈھیروں علم دیکھو چنانچہ جب تم رہوارِ علم پر سوار ہو جاؤ گے تو سارے بار سے سبکدوش ہو جاؤ گے یعنی حامل نہ ہوگے محمول بن جاؤ گے۔

ان اشعار میں علم مکسوب کے وسیلۂ وصول الی اللہ ہو جانے کا طریقہ بتایا ہے کہ وہ ترک ہوی اور ابتغاء رضا ہے اب اس کی شرح فرماتے ہیں کہ ؎

از ہوا ہا کے رہی بے جام ہو اے ز ہو قانع شدہ با نام ہو
از صفت وز نام چہ زاید خیال واں خیالش ہست دلالِ وصال
ہیچ نامے بے حقیقت دیدۂ یا ز گاف و لام گل گل چیدۂ
اسم خواندی رو مسمی را بجو مہ ببالا دان نہ اندر آب جو

یعنی ہوائے نفسانی سے بدون جامِ محبت حق نجات نہیں ہوتی اور تم صرف نام حق پر قناعت کئے ہوئے ہو (مطلب یہ کہ صرف ذکر و طاعت ظاہری تصفیہ و وصول کے لئے کافی نہیں ہے جب تک کہ محبت نہ ہو لیکن اس سے ذکر زبانی و طاعت ظاہری کو عبث مت سمجھ لینا کیونکہ قناعت کی شکایت کی گئی ہے نہ ذکر کی ورنہ تو خود طریقۂ محبت یہی ذکر ہے (اس طرح سے کہ صفت اور اسم کے ذکر سے جب کہ بقصد اثر باطنی کیا جاوے تصور اور خیال مسمی اور موصوف کا پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ تصور رہبر وصال بن جاتا ہے اس طرح سے کہ شدہ شدہ وہ تصور غالب ہوتا جاتا ہے اور دوسرے تصورات کم ہوتے جاتے ہیں اور تصورات کی کمی سے تعلقات گھٹتے جاتے ہیں اور سب سے فصل ہو جانا یہی وصل ہے) آگے خیال کے دلالِ وصال ہونے کی توضیح ہے یعنی کبھی تم نے کوئی اسم بلا مسمیٰ کے دیکھا ہے اسی طرح سے نام و خیالِ حق کا کوئی مدلول ضرور ہوگا اور دلائل سے اسکا موجود واقعی ہونا

ثابت ہے۔ پس دال سے مدلول کی طرف ضرور انتقال ہوگا پھر اُس سے تعلق ہوجاویگا۔ اور یہی وصول ہے پس ذکر زبانی میں یہ نفع ہوا لیکن اس پر قناعت نہ کرنا چاہئے اس لئے آگے بطور عطف تردیدی سوال ہے کہ یا کبھی لفظ گل کے حروف سے واقعی گل حاصل کرسکے ہو اسی طرح سے صرف الفاظ و اسماء پر قناعت کرنے سے وصول الی الحقیقت نہیں ہوسکتا۔ آگے فرماتے ہیں کہ نام تو لے چکے اب مسمی کو ڈھونڈو کیونکہ چاند اوپر ہوتا ہے ندی کے اندر نہیں ہوتا۔

آگے مسمی کے ڈھونڈھنے کا طریقہ بتاتے ہیں کہ ؎

گر ز نام و حرف خواہی بگذری   پاک کن خود را ز خود ہیں یکسری
ہمچو آہن ز آہنی بے رنگ شو   در ریاضت آئینۂ بے زنگ شو

یعنی اگر نام اور حرف یعنی ذکر لسانی سے مسمی کی طرف بڑھنا چاہتے ہو تو اپنے کو اپنی ہستی سے بالکل پاک کرلو یعنی اوصاف ذمیمہ سے اور اپنی طرف التفات سے یہی جس کو فنا کہتے ہیں اور لوہے کی طرح آہن ہونے کی صفت سے بے رنگ ہوجاؤ اور ریاضت کرکے آئینۂ بے زنگ ہوجاؤ۔ پس جس طرح آہن میں صیقل سے اس کی صفت ظلمت نہیں رہتی اور اس میں انعکاس صور ہونے لگتا ہے اسی طرح ریاضت و فنا سے تم میں تجلی حقیقت ہونے لگے گی یہی حصول ہے مسمیٰ کا۔

آگے فرماتے ہیں کہ ؎

خویش را صافی کن از اوصاف خود   تا بہ بینی ذات پاکِ صاف خود
بینی اندر خود علوم انبیا   بے کتاب و بے معید و اوستا

پس اپنے آپ کو اوصاف خودی سے صاف کرلو تاکہ تم اپنی ذات کو اس حالت پر پاؤ کہ باطن میں بلاواسطہ کتاب اور تکرار کرنے والے ہم سبق اور استاد کے علوم نبوت موجود ہوں۔

پھر ان میں جو علوم حالیہ ہیں وہ تو بعد صفائے باطن سینۂ نبوت سے اکثر بلا اکتساب فائض ہوتے ہیں اور احیاناً علوم مکتسبہ منقولہ بھی بطور خرق عادت حاصل

ہوجاتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ ہست از اُمتم — کہ بود ہم گوہر و ہم ہمتم

مر مرا زان نور بیند جان شان — کہ من ایشاں را ہمی بینم بداں

چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری اُمت میں بعض ایسے لوگ ہونگے جو میرے ساتھ جوہر علم اور ہمت عمل میں مناسبت رکھتے ہونگے اور انکی روح مجھ کو اس نور سے مشاہدہ کریگی جس نور سے میں انکو دیکھتا ہوں (یعنی جس طرح میں اوصاف ولایت کا اپنے نور باطن سے مشاہدہ کرتا ہوں وہ میرے اوصاف کمالات نبوت کا اپنے نور باطن سے مشاہدہ کریں گے چنانچہ اہل باطن کو آپ کے نبوت و کمالات کا علم یقینی اور تحقیقی بطور شرح صدر کے حاصل ہوتا ہے) ؎

بے صحیحین و احادیث و روات — بلکہ اندر مشرب آب حیات

یعنی اس مشاہدہ میں نہ صحیحین کا واسطہ ہوگا نہ احادیث کا نہ راویوں کا بلکہ محض مشرب عشق میں جو کہ بقاء ابدی بخشنے میں مشابہ آب حیات کے ہے یہ مشاہدہ ہوگا۔ یعنی میری معرفت ذوقیہ میں محض محبت انکے لئے کافی ہوگی اس میں دلائل نقلیہ کے محتاج نہ ہونگے کیونکہ نقلیات ذوق کے لئے کافی نہیں اور یہ لازم نہیں آتا کہ احکام میں بھی دلائل کے محتاج نہ ہونگے۔ یہ مضمون روایت بالمعنیٰ ہے اس حدیث کی سیکون فی اُمتی رجال محدثون ای ملہمون۔ (ص ۲۲۶ کلید دفتر اول حصہ دوم)

علم رسمی اور علم حقیقی کی بحث درمیان میں طویل ہوگئی۔ میں یہ بیان کررہا تھا کہ آج باوجود علم و عمل کی کثرت کے جو ہم لوگ کامیاب نہیں نظر آتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے سب سے بڑے موذی دشمن کو ہم نہیں پہچانتے اور وہی ہماری راہ مارے رہتا ہے میری مراد اس سے یہی نفس ہے۔ حدیث شریف میں اسے بڑا دشمن فرمایا گیا ہے مگر اسکی معرفت تو درکنار آج لوگوں نے اس کی بحث کی بساط ہی کو تہ کرکے رکھدیا ہے چنانچہ آپ کسی عالم کی زبان سے نہ سنئے گا کہ جس طرح سے وہ الصلوٰۃ فریضۃٌ اور الخمر حرامٌ کا وعظ کہتا ہے اس طرح سے کبھی الریاء شرکٌ التجسس حرامٌ اور الغیبۃ

ناسق کا بھی وعظ کہتا ہو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس گاؤں جانا نہیں اسکا راستہ کیا پوچھنا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ خامی اساتذہ و اکابرین میں ہوگی تو وہی تلامذہ و اصاغر کی جانب بھی منتقل ہوگی۔ چنانچہ یہی اس زمانہ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسائل کا تو کچھ علم بھی ہے لیکن رذائل نفس کی جانب اصلا توجہ نہیں ہے۔ بس بالکل اسی کے مصداق ہوگئے ہیں کہ ؎

ریا حلال شمار ند و جام بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے طریقت کیش

اور جب کسی علم کا تذکرہ اور چرچا ہی باقی نہ رہیگا تو وہ علم تو رخصت ہی ہوجائیگا اور جب تک کسی چیز کی برائی کا ذکر زبان پر باقی رہیگا تو پھر لوگ اس کے ساتھ اتصاف سے بھی اجتناب کریں گے اسی لئے علماء مصلحین نے ہر دور میں نفس کی بحث کی ہے چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں :۔

واغمض انواع علوم المعاملة الوقوف علی خدع النفس و مکائد الشیطان وذلک فرض عین علی کل عبد و قد اھملته الخلق و اشتغلوا بعلوم تستجر الیھم الوسواس وتسلط علیھم الشیطان تنسیھم عداوته وطریق الاحتراز عنه۔

یعنی علوم معاملہ میں سب سے زیادہ غامض اور دقیق علم نفس کے دھوکوں اور شیطان کے مکائد پر مطلع ہونا ہے جو کہ ہر انسان پر فرض عین ہے اور حال یہ ہے کہ لوگوں نے اسکی طرف سے بے التفاتی برت رکھی ہے اور ان امور میں مشغول ہوگئے ہیں جو ان کے قلوب میں وساوس پیدا کرتے ہیں اور شیطان کو ان پر مسلط کر دیتے ہیں اور اس کی عداوت اور اس سے احتراز کے طریقوں کو بھلا دیتے ہیں۔

(احیاء العلوم صفحہ ۳۳ جلد دوم)

دیکھئے امام رحمۃ اللہ علیہ رعونات نفس اور مکائد شیطان کے علم کو اغمض و اخفیٰ اور ادق فرما رہے ہیں اور یہ فرمارہے ہیں کہ یہ ناشد نما زور وزہ کے

ہر شخص پر فرض ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ۔ اور اس کے تحت فرماتے ہیں کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ جو علم کہ ہر مسلم پر فرض ہے وہ کونسا علم ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق علماء کے بیس سے زیادہ اقوال ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر فریق نے وجوب کا محل اسی علم کو گردانا ہے جس میں وہ مشغول ہے۔ چنانچہ متکلمین نے فرمایا کہ وہ علم کلام ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم ہوتا ہے۔ فقہاء نے فرمایا کہ وہ علم فقہ ہے اس لئے کہ اس سے حرام وحلال اور عبادات ومعاملات کا علم ہوتا ہے مفسرین اور محدثین نے فرمایا کہ وہ کتاب وسنت کا علم ہے اور حضرات صوفیہ نے فرمایا کہ وہ یہی اخلاص اور آفاتِ نفوس کا علم ہے۔

(احیاء صفحہ ۱۴ جلد اول)

میں کہتا ہوں کہ ضروریات دین کا علم فرض ہے۔ چنانچہ صوفیہ جن اُمور سے بحث کرتے ہیں۔ یعنی اخلاص واخلاق وغیرہ تو یہ بہت ضروری ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء بھی اس کی فرضیت کے قائل ہیں۔ چنانچہ شامی جو کہ فقہ حنفی کی مستند کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ :-

ان علم الاخلاص والعجب والحسد والرّیاء فرض عینٍ ومثلها غیرها من آفات النفوس کالکبر والشُّحّ والحقد والغش والغضب والعداوۃ والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلاء والخیانۃ والمداھنۃ والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعۃ والقسوۃ وطول الامل ونحوھا

یعنی اخلاص و عُجب اور حسد و ریار کا علم فرض عین ہے۔

اسی طرح سے اس کے علاوہ جو اور آفات نفوس ہیں۔ مثلاً کبر، بخل، خیانت، غصہ، عداوت، بغض، طمع، بطر خیلاء، مداہنت، حق سے تکبر، مکر، خداع قسوت، طول امل اور اس کے مثل اور دوسرے امراض جو انسان کے قلوب میں پیدا ہوجاتے ہیں ان سب کا جاننا فرض ہے۔ اس لئے کہ قلب سے انکا ازالہ فرض ہے جو کہ بدون علم کے ناممکن ہے۔ اس لئے کہ جب آدمی کسی چیز کو جانے گا ہی نہیں تو اس کے شر سے اپنے کو بچا بھی نہیں سکیگا کسی نے خوب کہا ہے ؎

عرفت الشر لا للشر لکن للتوقیہ

ومن لم یعرف الشر من الخیر یقع فیہ

یعنی میں نے شر کی معلومات حاصل کیں لیکن شر پر عمل کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود کو اس سے بچانے کے لئے۔ اس لئے کہ جس کو خیر اور شر میں تمیز نہ ہوگی تو وہ شر میں تو واقع ہو ہی جائے گا۔

غرض علماء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ نفس کا معاملہ اہم ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ عوام تو خیر عوام ہی ہیں آج خواص تک اس کی بحث اور اس کی ضرورت سے ناآشنا ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ علم میں ایک لذت ہوتی ہے اور عمل میں کچھ نہ کچھ تلخی ہوتی ہے۔ چنانچہ مشائخ محققین نے اس سلسلہ میں علماء کو نصیحتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً سیدنا رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ:-

اے علماء تم ایسا نہ کرو کہ علم کی حلاوت کو تو لے لو اور عمل کی تلخی اور مشقت کو چھوڑ بیٹھو کیونکہ یہ حلاوت بدون اس تلخی کے نافع نہیں ہے اور اس تلخی کا ثمرہ ہمیشہ ہمیشہ کی حلاوت ہے۔ (یعنی جنت کی راحت جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے)

انا لا نضیع اجر من احسن عملاً نص قرآنی ہے۔

(یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کا ثواب ضائع نہیں کریں گے جس نے اچھی

Scanned with CamScanner

طرح عمل کیا اور اچھی طرح عمل کرنا یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ کیا جائے) ۔ یہ آیت تم کو بتلاتی ہے کہ اعمال کا بدلہ ضرور ملیگا جب کہ ان میں اخلاص ہو اور اخلاص یہ ہے کہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو نہ دنیا کے لئے ہو اور نہ آخرت کے لئے ہو اور اس کے ساتھ ہر حالت میں ہر عمل میں ہر بات میں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عمل میں کوشش کرو اور اللہ سے امید رکھو کہ جب وہ راضی ہونگے تو تم کو بھی پوری طرح راضی کردیں گے۔

تو اب بتلاؤ کہ عمل اور اخلاص کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ یقیناً ضرورت ہے جس کا انکار کوئی عالم نہیں کرسکتا۔ پھر تم صوفیہ سے الگ کیونکر ہوسکتے ہو اور ان کے طریقہ کو شریعت سے جدا کس لئے سمجھتے ہو؟ وہ بھی تو صرف یہی کہتے ہیں کہ عمل میں کوشش کرنا اور اخلاص حاصل کرنا ضروری ہے چنانچہ جس قدر ریاضات و مجاہدات اور اشتغال صوفیہ کرتے ہیں سب سے عمل کی تکمیل اور اخلاص کی تحصیل ہی تو مقصود ہوتی ہے۔　　انتہیٰ (البیان المشید ص۱۰۱)

دیکھا آپ نے حضرت رفاعیؒ کی تشخیص کے مطابق علماء کو جو نفع نہیں ہوتا تو اسکی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ علوم کی لذت میں منہمک ہوکر عمل کی جانب توجہ نہیں کرتے اور عمل کیجانب توجہ کرنے سے مانع انکا یہی نفس ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایک مجلس میں ایک صاحب نے جو بڑے شخص تھے لوگوں سے کہا کہ جانتے ہو علماء کیوں محروم رہتے ہیں اور واصل کیوں نہیں ہوتے پھر خود ہی کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مراقبات نہیں کرتے، میں بھی اس مجلس میں موجود تھا مگر اسوقت بچہ تھا بڑے لوگوں کی باتوں میں کیا دخل دیتا سن کر خاموش ہوگیا۔ لیکن بعد میں جب ان چیزوں کو سمجھنے لگا تو معلوم ہوا کہ انکا یہ کہنا صحیح نہ تھا۔ علماء کے محرومی کی وجہ ترک مراقبہ نہیں ہے بلکہ عدم ترک نفس ہے یعنی یہ لوگ نفس کو ترک نہیں کرتے۔ چنانچہ نفس اور نفسانیت کے اعتبار سے انکا حال عوام الناس کے حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا بلکہ بہت سی باتوں میں یہ ان سے آگے ہی

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں اس لئے کہ صرف علم ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پر عمل بھی ہو جائے اور عمل کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں اخلاص بھی ہو اس کی خبر ہم کو صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

چنانچہ صاحب روح المعانی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ محمد بن واسعؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ جنت میں کچھ لوگ بعض اہل نار کو دیکھیں گے تو اُن سے کہیں گے کہ تم لوگوں نے تو ہمیں کچھ باتیں بتائی تھیں جن پر عمل کرکے ہم تو جنت میں داخل ہو گئے (تو پھر تم لوگ وہاں دوزخ میں کیسے پڑے ہو؟) وہ جواب دیں گے "جن باتوں کا ہم تمہیں حکم کرتے تھے خود ہمارا عمل ان کے خلاف تھا۔ (اس لئے آج ہمارا یہ حشر ہوا)۔

(روح المعانی صفحہ ۲۸۷ جلد ۱)

دیکھا آپ نے یہ ان علماء واعظین اور مبلغین کا حشر بیان کیا گیا ہے جو دنیا میں دوسروں کو تو نیکی کی تاکید کرتے تھے اور اپنے آپ کو بھلائے رکھتے تھے ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں ناصح خود یافتم کم در جہاں

ایسے ہی علماء کو ایک مقام پر سیدنا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

"بزرگو تمہارے اندر بعضے فقہاء اور علماء بھی ہیں۔ تم وعظ کی مجلسیں بھی منعقد کرتے ہو درس بھی دیتے ہو۔ احکام شرعیہ بھی بیان کرتے ہو۔ لوگوں کو مفتی بن کر احکام بھی بتلاتے ہو (دیکھو) خبردار چھلنی کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ عمدہ آٹا تو نکال دیتی ہے (جو دوسروں کے کام آتا ہے) اور بھوسی اپنے پاس رہنے دیتی ہے اس طرح (تمہارا یہ حال نہ ہونا چاہیے کہ) تم اپنے منہ سے تو حکمت کی باتیں نکالتے رہو اور دلوں میں بس کھوٹ کھوٹ رہ جائے کہ اس وقت تم سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر کہ:-

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (یعنی کیا دوسروں کو تو نیکی کی تاکید کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھلائے دیتے ہو) عمل نہ کرنے کا مطالبہ کیا جائیگا۔

سنو! اللہ تعالیٰ جس بندے سے محبت کرتے ہیں اُس کو وہ عیوب دکھلا دیتے ہیں۔

جو خود اس کے اندر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس بندے سے محبت کرتے ہیں اسکے دل میں تمام مخلوقات کی محبت اور شفقت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ کو سخاوت کا عادی بنا دیتے ہیں اور اس کے نفس میں بلند ہمتی (اور چشم پوشی) پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے عیوب پر نظر کرنے کی توفیق دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے کو سب سے کم دیکھنے لگے اور خود کو کسی قابل نہ سمجھے۔

(البیان المشید ص۸۹)

دیکھئے حضرت سیدنا رفاعیؒ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی بندے سے جب محبت ہو جاتی ہے تو اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ اپنے عیوب پر اس کو نظر کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے چنانچہ جب اپنے معائب پیش نظر ہو جاتے ہیں تو یہی امر اس کے لئے ترقی باطن کا زینہ بن جاتا ہے اسلئے کہ اس وقت اس میں غایت درجہ کسر و انکسار پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ وہ اپنے کو سب سے کم سمجھنے لگتا ہے اور ہمیشہ اپنے خالق کے سامنے اس کی وجہ سے سرنگوں رہتا ہے اور مخلوق کے اعتبار سے عجب و کبر کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اس لئے کہ رشد و ہدایت کا چراغ اس کے قلب میں روشن ہو جاتا ہے اور اسکی باطنی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنجِ عیوب دیکھا

پس جب اسباب ہدایت جمع ہو جاتے ہیں اور موانع کا ارتفاع ہو جاتا ہے تو پھر اب کامیابی میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔ صاحبِ ترصیع نے اس موقعہ کا اپنا ایک حال لکھا ہے اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ صحیح بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

فانی کنت فی حال السلوک کلما اعجبتنی نفسی یبتلینی الحق تعالیٰ بمعصیة صغیرة انکسر لها راسی وانکسر ولا اری لی مقاماً ولا شاناً واقول ما شأن العاصی فتلک لمعصیة رحمة بحقی فمعصیةٌ اورثت ذلاً وانکساراً خیرٌ من طاعةٍ اورثت عزاً واستکباراً۔ انتہی

یعنی حالت سلوک میں میرا یہ حال تھا کہ جب بھی میرے نفس پر عجب کا غلبہ ہوتا تو

حق تعالیٰ کسی نہ کسی گناہ صغیرہ میں مجھے ضرور مبتلا فرما دیتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ میرا سر شرم سے جھک جاتا تھا اور پھر اس کے تصور سے نفس پاش پاش ہو جاتا تھا اور اسکے بعد میری نظروں میں نہ تو اپنا کوئی مقام ہوتا اور نہ کوئی شان باقی رہ جاتی اور میں اپنے نفس کو مخاطب کر کے یہی کہتا تھا کہ بھلا عاصی کے لئے بھی کوئی مرتبہ اور مقام ہوتا ہے چنانچہ وہ معصیتہ میرے حق میں تو رحمت ہو جاتی تھی۔ یہیں سے کہا گیا ہے کہ جو معصیتہ انسان میں ذلت و انکسار پیدا کرے وہ اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو آدمی میں بڑائی اور استکبار پیدا کرے۔ (حاشیہ ترصیع صفحہ ۴۶)

غرض انسان اپنے عیوب نفس کا بصیر ہو جائے۔ یہ حق تعالیٰ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے اور جب اپنے عیوب اس کے پیش نظر ہو جاتے ہیں تو پھر دوسروں کے عیوب پر نظر نہیں جاتی علماء نے فرمایا ہے کہ

من ابصر محاسن نفسہ ابتلی بمساوی الناس و من ابصر عیوب نفسہ سلم من رؤیۃ مساوی الناس۔ (تصوف قلمی)

جس کی نظر اپنے محاسن پر ہوتی ہے وہ لوگوں کے عیوب دیکھنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور جو شخص خود اپنے عیوب کا بصیر ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے عیوب کے دیکھنے سے سالم رہتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتیں مشائخ ہی کے یہاں ہوتی ہیں کیونکہ یہی حضرات نفس سے اور کید نفس سے بحث کرتے ہیں اور رعونات نفس سے اہل نفس کو نکالتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو طلب طریق کی ہوتی ہے اور جنھوں نے اصلاح نفس کو ضروری جانا ہے وہ مشائخ کے یہاں گئے ہیں اور کامیاب ہوئے ہیں۔ الیواقیت والجواہر میں حافظ ابن حجرؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ شیخ مدین کی خدمت میں انکے پہونچنے کا بہانہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ انھوں نے ابن فارض رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ تائیہ کے بعض اشعار کی شرح کر کے انھیں شیخ مدین کی خدمت میں پیش کیا تاکہ وہ اس کی تصویب و تائید فرما دیں۔ انھوں نے کیا یہ کہ اسی کاغذ کی پشت پر لکھ دیا کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

سارت مشرقتہ و سرت مغربا   شتان بین مشرق و مغرب

یعنی محبوبہ تو مشرق کو چلی گئی اور میں نے مغرب کا رخ کیا۔ ظاہر ہے کہ مشرق کے جانے والے میں اور مغرب کے جانے والے میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔ شیخ کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ تو علوم ظاہرہ کے حامل ہیں باطن کے کوچہ میں آپ نے قدم بھی نہیں رکھا۔ پھر آپ ایک صوفی صاحب باطن کے کلام کی کیا شرح کرنے چلے ہیں۔ یہ لکھ کر اس شرح کو حافظ ابن حجر کے پاس واپس کر دیا۔ چنانچہ حافظؒ اب تک جس چیز سے غافل تھے اس کی جانب متوجہ ہوگئے اور اہل طریق کے قائل ہوگئے اور پھر انھیں بزرگ کی خدمت میں ساری زندگی ہی گذار دی۔

اسی چیز کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ دیکھئے راستہ یہ ہے۔ اب جن لوگوں نے اپنے کو اس راہ پر ڈالدیا ہے اور مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ہیں ان کے اندر ایک نئی روح پیدا ہوگئی ہے اور جن لوگوں نے طریق ہی کا انکار کیا ہے یا بزرگوں کے پاس جانے سے عار کیا وہ اس دولت سے محروم رہے۔ اور محبت کی تری نہ ہونے کی وجہ سے ملائے خشک ہی کہلائے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ بچپن سے ان کو عبادت ریاضت میں دلچسپی تھی۔ انکے والد ماجد نے ہدایت کی تھی کہ ملائے خشک و ناہموار نہ باشی۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر انسان محض تحصیل علم تک اپنے کو محدود رکھتا ہے اور نفس کو قلب کی جانب متوجہ نہیں کرتا تو بقول اکبرؒ ع

زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

اس لئے کہ علم کا مقصود اور ہے اور فقر کا مقصود اور ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد   فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

(از ناقل)

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دفعہ جونپور میں وعظ فرمایا۔ علماء کا مجمع تھا حضرت نے فرمایا کہ میں حضرات علماء سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھیں مشائخ کے یہاں جانے سے عار

Scanned with CamScanner

ہے کہ نہیں اگر عار نہیں ہے تو پھر اصلاح موجود ہے اب انکے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر عار موجود ہے تو پھر عار جیسے رذیلہ کے ہوتے ہوئے پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر مولانا ابوبکر صاحب نے بڑی زور سے اسی مجمع میں کہا کہ واہ مولانا خوب رگ پکڑی۔

تو بات یہی ہے کہ اصلاح کی ضرورت عوام کو بھی ہے اور علماء کو بھی ہے اس لئے کہ اصلاح نفس کی ہوتی ہے اور نفس وہاں بھی موجود ہے اور یہاں بھی فرق صرف یہ ہے کہ عوام جاہل ہوتے ہیں اس لئے ان میں کچھ علم کی روشنی پیدا کرتے کرتے ایک زمانہ صرف ہو جاتا ہے اور اہل علم اگر توجہ کریں تو انکے لئے ایک اشارہ بھی کافی ہو جاتا ہے اور برسوں کی راہ منٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ باقی اگر کسی عالم میں طلب ہی نہ ہو یا طریق اور اہل طریق ہی کا انکار موجود ہو تو اس میں شک نہیں کہ یہ منزل دشوار ہے اور ایسے شخص کی اصلاح مشکل ہے۔ چنانچہ آج بھی جو علماء اس طرف نہیں آتے تو اس لئے کہ انکے نفس نے انکے لئے انکار کو مزین کر دیا ہے کہ کسی کی اتباع میں اپنا استقلال ختم ہوتا ہے اور اپنی رائے اور اپنے ارادے اور اپنی خواہش کا ترک کرنا آسان نہیں ہے خصوصاً اہل نفس کے لئے کیونکہ یہ سب تو انکے حق میں موت ہے۔

طلب جاہ اور طلب استقلال اور کبر و عار یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو تحصیل کمال سے روک دیتی ہیں انھیں رذائل نے کفار قریش کی راہ ماری تھی اور انھیں کی وجہ سے علماء یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کیا اور انھیں صفات نے ہر زمانہ میں لوگوں کو اہل کمال کے آگے جھکنے سے باز رکھا بالآخر کمال سے محروم رکھا۔ میں نے الہ آباد میں ایک مرتبہ لوگوں سے یہ کہدیا کہ سنو!

اب اتنے دنوں کے بعد بڑھاپے میں جب کہ کسی چیز کی تحصیل کا وقت نہیں رہا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ انسان کو کسی کمال کی تحصیل سے جو چیز مانع ہوتی ہے وہ اس کا کبر نفس اور عار ہے۔ آدمی اپنے انھیں رذائل کیوجہ سے کمال حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے کیونکہ یہی چیز اس کو کسی کے آگے جھکنے سے منع کرتی ہے ورنہ تو زمانہ میں کیسے

کیسے اہل کمال ہوئے ہیں لیکن ان سے کچھ بھی فیض نہیں حاصل کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ان سے کچھ فیض ہی حاصل کر لیا تو ہمارا کبر اور ہماری عار کہاں محفوظ رہی۔

میں حضرات اہل علم کو خصوصاً اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج علماء اور طلباء کو کوئی کمال جو حاصل نہیں ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہی انکا عار اور تکبر ہے یہی ان کی راہ مارے رہتا ہے اس کو اگر سمجھ لیں اور ہمت کر کے اس کو ترک کر دیں تو کمال کے درجہ کو پہونچ سکتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے کو مٹاتے اور کسی کے آگے خود کو گرانے اور اپنے کبر و عار کو ختم کرنے ہی سے حاصل ہوا ہے۔

یہاں ناقل اس سلسلہ میں ایک طالب کا خط اور حضرت والا کا جواب نقل کرتا ہے اُمید ہے کہ سالکین کے لئے مفید ہوگا۔ وھو ھذا

نقل خط سالک بنام حضرت والا دامت کاتہم

ایک مولوی صاحب سے جو بہت دنوں سے حضرت والا سے تعلق رکھتے ہیں اور باطنی اُمور میں کچھ سست سے تھے حضرت والا نے سوال فرمایا کہ اب پہلے کیطرح تو نہیں ہیں یعنی طریق سے کچھ تعلق زیادہ ہوا یا نہیں اسکے متعلق لکھ کر دیجئے اسپر انھوں نے اپنا یہ حال لکھ کر پیش کیا۔

"حضرت والا نے میری جس سابقہ جہالت کا ذکر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ طریق سے ناواقفیت اور نفس کا اپنے اوپر غلبہ ہونے کی وجہ سے ادھر سے (یعنی طریق سے) طبیعت شروع شروع میں بھاگتی تھی۔ لیکن اب الحمد للہ حضرت کی توجہ کی برکت سے باطن کی اہمیت اور اس کی ضرورت ذہن نشین بلکہ کسی قدر قلب نشین ہو گئی یعنی اب قلب پہلے کی طرح غافل نہیں ہے اور معمولات میں بھی الحمد للہ دلچسپی اور بہت کچھ استقامت آگئی ہے۔"

حضرت مصلح الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کا محققانہ و مصلحانہ جواب

اس پر حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا کہ:-

جانتے ہو کیا بات ہے۔ عالم اپنے کو مستقل رکھنا چاہتا ہے۔ حالات کی اطلاع اور مشورہ کی حاجت نہیں سمجھتا (جس کو سید نار فاعیؒ ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں کہ (اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو۔ شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔ یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کر رہا ہو۔ شریعت کے مطابق نہ چلتا ہو تو پھر ایک دوسرے کو بُرا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں) یہ بتاؤ کہ کیا سمجھے؟

اس کے بعد حضرت والا نے اور دوسرے اہل علم حضرات سے فرمایا کہ

آپ لوگ بھی ان مولوی صاحب کا خط دیکھئے اور یہ میں نے جو سوال کیا ہے (کہ کیا سمجھے) اسکا جواب آپ سب لوگ بھی اپنے لفظوں میں دیجئے۔ چنانچہ سب حضرات نے اپنی اپنی فہم و استعداد کے مطابق جواب لکھا اور صحیح لکھا۔ اُن میں سے ایک مولوی صاحب کا جواب جو نہایت جامع تھا حضرت کو پسند ہوا۔ اس لئے یہاں اسی کو پیش کرتا ہوں۔

انھوں نے لکھا کہ:-

"حضرت والا نے جو اہل علم کے حرمان کی وجہ تحریر فرمائی ہے کہ —— عالم اپنے کو مستقل رکھنا چاہتا ہے۔ حالات کی اطلاع اور مشورہ کی حاجت نہیں سمجھتا۔ آپ زر سے لکھنے اور اہل علم کے پیش نظر رکھنے کے قابل ہے اسلئے کہ جب تک استقلال کی خو بو رہیگی کبھی بھی کامل اتباع اپنے مرشد کی نہ ہو سکے گی اس لئے ضروری ہے کہ طالب علم میں عمل میں ظاہر میں باطن میں

غرض ہر امر میں اپنے استقلال کو ترک کرکے شیخ کی اتباع کرے کیونکہ اتباع میں جس قدر کمی ہوگی اسی قدر نقص سمجھا جائیگا اور یہ اتباع واجب ہے اور عین اتباع ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس پر نص وارد ہے۔ طالب جتنا شیخ کے سامنے تواضع اور انکسار اختیار کریگا اسی قدر استفادہ ہوگا۔ ع

ہرکجا پستی است آب آنجا رود

حضرتِ والا نے اس تحریر میں ہم لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہر کہ کسی مرشد و بزرگ کے پاس لوگ ظاہر سے جمع ہو جائیں تو باطن میں بھی جھکاؤ ہو اور دل سے اپنے استقلال کو ترک نہیں کرتے جس کی وجہ سے کورے کے کورے رہ جاتے ہیں اور اسکو گوارا کرلیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ سرے سے طلب ہی نہیں ہے ورنہ اذا ثبت الشئی ثبت بلوازمہ کے قاعدہ سے طلب کے لئے جو ظاہری امور ہیں وہ ظاہر ہوتے۔ علماء جو طالب صادق ہوئے ہیں انھوں نے اہل نسبت اور متبع سنت بزرگ کو پاکر اپنے کو انکے سامنے مٹا دیا ہے اور ان سے حاصل کیا ہے اور خود اہل نسبت ہوئے ہیں مگر اسی طلب کے نہ ہونے سے سب خرابیاں ہیں۔ اب علم جیسا علم بھی نہیں تاہم حجاب اکبر بنا ہوا ہے۔ بہت افسوس کی بات ہے۔

فقط والسلام

میں کہتا ہوں کہ اور جس طرح سے نفس دونوں کے اندر ہوتا ہے یعنی عالم میں بھی اور جاہل میں بھی اسی طرح سے شیطان بھی دونوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے عالم کو بھی اور جاہل کو بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ آلات اور طریقے دونوں کے گمراہ کرنے کے لئے الگ الگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ عامی کو وہ اور طریقہ سے گمراہ کرتا ہے اور عالم کو اور کسی سالک طریق کو اور طریقہ سے گمراہ کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے بہت بڑا نور نظر آیا جو کہ سارے اُفق کو گھیرے ہوئے تھا پھر اُس کے اندر مجھے ایک صورت نظر آئی جس نے مجھے پکار کر کہا کہ اے عبدالقادر میں تمھارا رب ہوں۔ میں نے تم سے تکالیف شرعیہ کو ساقط کر دیا۔ اب تمھارا جی چاہے میری عبادت کرو اور چاہو ترک کردو۔

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے اُس سے کہا کہ جا دور ہو اے لعین۔ چنانچہ اُس کے بعد وہ نور تاریکی سے بدل گیا اور وہ شکل دھواں بن گئی۔ پھر اس ملعون نے مجھ سے کہا کہ اے عبدالقادر چونکہ تم اپنے رب کے احکام کا علم رکھتے ہو اور منازلِ طریق کے احوال سے واقف ہو اس کی وجہ سے میری چال سے بچ گئے ورنہ تو میں نے اہلِ طریق میں سے ستر آدمیوں کو اسیطرح سے گمراہ کیا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت آپ نے کیسے جان لیا کہ وہ شیطان ہے۔ فرمایا کہ اُس کے حلال بتلانے کی وجہ سے۔ ایسی چیز کو جس کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حرام فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے کہ رسولوں کی زبان پر ایک چیز کو حرام فرمادیں اور پھر چپکے سے کسی کے لئے اُس کو حلال کردیں۔ اللہ تعالیٰ ایسا کبھی نہیں کرتے۔

(الیواقیت ص۱۸۵ ج ۱)

اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ نفس کی طرح ابلیس کے کید بھی بہت پوشیدہ اور غامض ہوتے ہیں۔ مشائخ کے یہاں اسی کی معرفت کرائی جاتی ہے اور شارع کا وضع شرائع سے جو مقصد ہے اُس کی تکمیل کرائی جاتی ہے اور وہ غرض یہی ہے کہ نفس کو اُس کی خواہشات سے نکال کر شریعت کے تابع بنایا جائے۔ چنانچہ صاحب موافقات لکھتے ہیں کہ

قصد الشارع من وضع الشرائع اخراج النفوس عن اهوائها وعوائدها۔

یعنی شارع کا شریعت کے نازل فرمانے سے مقصد ہی نفوس کو ان کی خواہشات اور عادات رسمیہ سے نکالنا ہے اور ایمان و عمل صالح کے ذریعہ حیات طیبہ حاصل کرانا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ۔ من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ و ھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ۔

وروی عن جعفر الصادق انہ قال فی الحیاۃ الطیبۃ۔

ھی المعرفۃ باللہ وصدق المقام مع اللہ وصدق الوقوف علی امر اللہ وقال ابن عطاء العیش مع اللہ والاعراض عما سوی اللہ۔

یعنی حضرت جعفر صادق سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حیات طیبہ نام ہے معرفت باللہ کا (میں کہتا ہوں کہ حضرت جعفرؓ کی مراد اس سے صرف معرفت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں محبت۔ قرب اور انس باللہ بھی داخل ہے) اور حیات طیبہ نام ہے صدق مقام مع اللہ کا۔ اور صدق وقوف علی امر اللہ کا۔ اور حضرت ابن عطا فرماتے ہیں کہ حیات طیبہ نام ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندگانی کرنے کا اور اس کے ماسوی سے اعراض کرنے۔

(موافقات ص۲۲۳ ج ۱)

صاحب روح المعانی نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں تحریض ہے تمام مومنین کو ہر عمل صالح پر اور من ذکر اور انثیٰ کہہ کر ذکور کی تخصیص کا وہم دور فرمادیا اور حکم کو عام کردیا۔ اس کی تفسیر آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائی یہ آیت اپنے مضمون میں بے مثال ہے۔

مفسرین تو اس سے مراد جنت وغیرہ لیتے ہیں مگر حضرت جعفر صادقؓ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ یہ حیات طیبہ اس دار دنیا میں بھی انسان کو نصیب ہوتی ہے چنانچہ یہ معرفت۔ محبت۔ قرب۔ انس۔ شوق مقام مع اللہ اور وقوف علی امر اللہ وغیرہ اسی دنیا ہی

کی توجہیں ہیں یہیں حاصل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اہل اللہ نے اس کی تحصیل میں اپنے کو فنا کر دیا ہے۔ اور اسی کے لئے وہ مرمٹے ہیں اور یہ مرمٹنا اور فنا کرنا نفس ہی کا مارنا ہے تو خدا کی محبت میں انھوں نے اپنے نفس کو مارا ہے اور پھر اس پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب حال بزرگ کہتے ہیں کہ ؎

میں جو اس پر مرمٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

یعنی جتنے اولیا انبیاء ہوئے ہیں سب کا اللہ تعالیٰ سے تعلق تھا اور اُن سب حضرات نے اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کے آگے کچھ نہ جانا پھر اگر میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تو اس میں میں نے کیا غلطی کی۔ اور اسی مقام کی جانب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنے اس کلام میں اشارہ فرماتے ہیں ؎

تم نے گمنام وہاں پاؤں جمائے اپنے پا فرشتہ کا بھی جس جا پہ پھسلتے دیکھا

اور ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

وسعتِ دل کی کیا کرتے ہیں سیر اے امداد
کہ یہی باغ ہے اپنا یہی میدان اپنا

ان حضرات کے دل میں یہ وسعت نفس کے مارنے کے بعد ہی پیدا ہوئی ہے اور رذائل کے خس و خاشاک کو صاف کرکے ہی یہ حضرات باغ کی صفائی حاصل کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو کسی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔ حضرتؒ اسکو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے ؎

پر تو حسنت نہ گنجد در زمین و آسمان
در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

یعنی تیرے حسن کی سمائی تو زمین آسمان تک میں نہ ہو سکی پھر تو میرے قلب اور سینہ میں کیونکر موجود ہے مجھے اس پر بڑی حیرت ہے۔

دیکھا آپ نے اولیاء اللہ کی مسرت کو کہ نفس کو مار کر انھیں کیا دولت ملتی ہے اسکا

کچھ سراغ اُن کے اسی قسم کے کلمات سے لگتا ہے۔ آپ کو نہ معلوم ہوتا ہوگا کہ انھیں کیا ملا مگر جن کو ملتا ہے وہ خوب جانتے ہیں اور اس پر خوش ہیں۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ مشائخ کے پاس جو دولت ہوتی ہے اگر سلاطین کو معلوم ہوجائے تو وہ فوج لے کر ان پر چڑھائی کریں تاکہ اس دولت کو ان سے چھین لیں لیکن یہ ان کے بس میں کہاں۔ تاہم بزرگوں کے سکون قلبی اور ان کے اطمینان نفس کو دیکھ کر اہل دنیا کے منہ میں بھی پانی آتا ہے۔ مگر یہ کہ اس کی تحصیل کے لئے مجاہدہ کریں اور نفس کو ترک کریں۔ اس کی ان اہل نفس اور اہل ہوس کو ہمت نہیں۔

میں نے شروع میں یہ بیان کیا تھا کہ یہ مضمون میرے ایک سابق مضمون یعنی نسبت صوفیہ کی دوسری قسط ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ بزرگی کامل جانا اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت حاصل ہوجانا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جن بخششوں اور عطایا سے اپنے بندوں کو نوازتے ہیں وہ سب کچھ بری چیزیں نہیں ہیں بلکہ نہایت لذیذ ہیں لیکن اس سے پہلے انسان کو کیا کرنا پڑتا ہے اور بزرگوں نے کس کس طرح سے اپنے نفس کو مارا ہے۔ اس کی جانب سے بالعموم لوگ غافل ہیں۔ اس لئے میں نے یہ چاہا کہ نفس کے متعلق بھی کچھ بحث کردوں تاکہ نسبت کی تحصیل کا اگر داعیہ اور خیال پیدا ہو تو اسکا طریق بھی معلوم ہوجائے ... اور ایک طالب کے لئے راہ حق آسان ہوجائے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ نفس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں اور علماء و مشائخ بھی اس سے بحث کرتے ہیں۔ خدا پرستی کے لئے اگر حاجب اور مانع کوئی شے ہے تو یہی نفس پرستی۔ اسی کو زیر کرلینا انسان کے لئے سعادات حقیقیہ کا فتح باب ہے اور یہی وہ دشمن ہے جس کی موت پر انسان کی حیات کا دار و مدار ہے چنانچہ اسکا مارنا نہنگ و اژدہا کے مارنے سے بھی زیادہ مشکل ہے ؎

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

چنانچہ جو لوگ کہ طالب خدا ہوئے ہیں انھوں نے خدا کی محبت کی خاطر اپنے نفس سے دشمنی کی ہے اور پھر اس کے صلہ میں یہ نہیں کہ انھوں نے آخرت ہی کا اجر پایا بلکہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کو بہت بہت نوازا ہے تاکہ انکے اخلاص اور حسن عمل کی قدر دانی ہو اور دوسروں کو ترغیب ہو کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ پر چلنے کی ہمت باندھیں اور ان اللہ والوں کو حقیر و ذلیل سمجھ کر اور ان کا ادب ترک کر کے اپنے کو حق تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب نہ ٹھہرائیں۔ سنئے

میرے ایک دوست نے جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمادیا ہے۔ یعنی ان کی لائن بدل چکی تھی مگر اب ان کو نماز و روزہ کی توفیق ہونے لگی ہے خود اپنا واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ میرے ایک پرانے ساتھی جو سید تھے آج میرے مکان پر آئے اور ازراہِ ہمدردی مجھ سے کہنے لگے کہ بھائی تم اس طرف کیوں چلے گئے ہم نے بھی نمازیں بہت پڑھی ہیں تہجد بھی پڑھا ہے مگر کچھ پایا نہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ اب مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کرو۔ اور اگر کرنا ہی چاہتے ہو تو آؤ بیٹھو تبادلۂ خیال کرلیا جائے۔ تم مجھے سمجھا دو یا میں ہی تم کو سمجھا دوں۔

میں نے جب ان سے یہ سنا۔ تو کہا کہ یہ صاحب جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں پایا تو انھوں نے نہ پایا ہوگا اپنی نسبت کہہ سکتے ہیں مگر اسکا یہ جواب ہے کہ ہم نے بھی تو تہجد پڑھا ہے اور اس میں بہت کچھ پایا ہے۔ دنیا بھی پائی ہے دین بھی پایا ہے اور ایک میں نے ہی نہیں بلکہ بہت سے اللہ کے بندوں نے پایا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ہر رات کے پچھلے حصہ میں کچھ دولت لٹتی ہوتی ہے
جو سوتا ہے سو کھوتا ہے جو جاگتا ہے سو پاتا ہے

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ؎

کب رات ہو کب ان سنے ہوں خلوت میں پھر ہم   رہتی ہے دھن یہی ہمیں دن بھر لگی ہوئی

پس یہ جوان صاحب نے کہا کہ ہم نے کچھ نہیں پایا یہ قضیہ شخصیہ ہے اور قضیہ شخصیہ کا جواب قضیہ شخصیہ ہے۔ اور اگر اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح کسی کو کچھ نہ ملتا ہوگا تو اس پر اس کے خلاف صدہا اور ہزارہا شواہد موجود ہیں کہ لوگوں نے بہت بہت پایا ہے اور اپنا پانا بیان کیا ہے۔ اسی مضمون کی تصدیق میں رسالہ قشیریہ باب الکرامات سے اس باب کے چند واقعات نقل کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابراہیمؒ کا واقعہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک بستی میں پہونچا وہاں ایک نصرانی کو دیکھا کہ اس کے کمر میں زنار بندھی ہوئی تھی اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو اپنے ہمراہ لے لوں۔ غرضکہ ساتھ ہو لیا اور ہم سات دن تک سفر کرتے رہے اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ اے اسلام کے درویش ہم کو بھوک لگی ہے۔ اب کچھ اپنی کرامت ظاہر کیجئے۔

میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اس کافر کے سامنے مجھے رسوا نہ کیجئے۔ یہ دعا کرنا تھا کہ دیکھا کہ آسمان سے ایک طباق نازل ہوا اور اس پر چند روٹی۔ کچھ بھنا ہوا گوشت اور کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک کوزہ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے خوب کھایا اور پیا اور پھر ہفتہ بھر چلتے رہے۔

اس کے بعد میں نے سبقت کی اور کہا کہ اے نصاریٰ کے راہب ابکی تیری باری ہے اب تو بھی اپنی بزرگی دکھلا۔ یہ سن کر اس نے اپنی لاٹھی پر ٹیک لگایا اور اللہ تعالیٰ سے کچھ دعا کی دیکھا تو دو طباق سامنے رکھے ہیں اور ان پر میرے طباق سے کہیں زیادہ چیزیں موجود ہیں۔

ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی۔ ندامت اس پر کہ یہ کافر سمجھے گا کہ نصرانیت اسلام سے بڑھ گئی) چنانچہ اسی رنج و غم میں میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے وہ کھانا نہیں کھایا۔ بالآخر اس نے کہا (کہ آپ کے نہ کھانے کی وجہ سمجھ گیا ہوں) اچھا کھائیے اور میں آپ کو دو خوشخبریاں سناتا ہوں۔ (اور امید کرتا ہوں کہ اسکی وجہ سے آپ جس الجھن میں مبتلا

ہو گئے ہیں وہ کافور ہو جائیگی اور جس شرم سے آپ دوچار ہیں وہ دور ہو جائیگی۔ اور اگر شرکت طعام پہلے ان کے سن لینے ہی پر موقوف ہے تو سنیئے) :-

ایک تو یہ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمۂ اسلام پڑھتا ہوں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ اشھد ان محمداً رسول اللہ۔ یہ کہہ کر زنار توڑ کر پھینک دیا۔ اور دوسری خوشخبری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ اگر آپ کے اس بندے کا (یعنی آپ کا) تیرے نزدیک کوئی مرتبہ ہو تو اس کی برکت سے میرے اوپر فتح فرمایئے۔ چنانچہ یہ جو دیکھ رہے ہیں یہ آپ ہی کا طفیل ہے ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم نے کھانا کھالیا اور پھر چلے۔

چنانچہ ہم دونوں نے حج بیت اللہ کیا اور مکہ میں ایک سال مقیم رہے پھر وہ شخص وہیں مرگیا اور بطحاء میں دفن ہوا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ یہ کیا تھا کیا یہ پانا نہیں تھا، جس کو آپ پانا سمجھتے ہیں یعنی کھانا۔ ان حضرات نے اسکو بھی پالیا ہے۔

اور سنیئے :-

حضرت ذوالنون کا تو آپ نے نام سنا ہوگا۔ کیا اولیا اللہ میں سے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ کشتی میں سوار ہو کر جارہا تھا کہ کسی مسافر کی چادر چوری ہوگئی۔ ان لوگوں نے ایک شخص پر شبہہ کیا کہ اس نے چرائی ہے، میں نے کہا اچھا ٹھہرو مجھے ان سے بات کرنے دو۔ میں نرمی کے ساتھ ان سے پوچھ لیتا ہوں۔ وہ جوان اپنا عبا منہ پر رکھے ہوئے سو رہا تھا۔ آواز سن کر کپڑے سے منہ نکالا۔ حضرت ذوالنون نے مناسب عنوان سے واقعہ کے متعلق اس سے گفتگو کی۔ حضرت ذوالنون کہتے ہیں کہ یہ سن کر اسنے مجھ سے کہا کہ آپ بھی یہ کہتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے قسم کھا کر درخواست کی کہ اے اللہ دریا کی تمام مچھلیوں کو حکم دیجئے کہ اپنے اپنے منہ میں ایک ایک جوہر (موتی) لے کر اوپر آویں حضرت ذوالنون فرماتے ہیں کہ اس شخص کا یہ کہنا تھا کہ ہم نے دیکھا کہ پانی کی سطح مچھلیوں سے بھر گئی اور سب کے منہ میں ایک ایک موتی تھا۔ اسکے بعد اس جوان نے اپنے کو دریا میں

ڈال دیا اور ساحل کی طرف چلدیا (اس نے ان کے ساتھ سفر ہی پسند نہ کیا کہ جب یہ لوگ مجھے چور سمجھ رہے ہیں پھر ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہیے)۔

دیکھیے اتنا بڑا شخص تھا۔ اللہ کا مقرب اور ولی اور اسے ہی چور سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس کی کرامت سے جو مال سب کو ملا اسکا انکار نہ کیا ہوگا بلکہ اسکو بڑے شوق سے لوٹا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ دنیا دار اسی کو تو پانا سمجھتے ہیں اور جس کی برکت سے یہ سب کچھ حاصل ہوا۔ اسکے متعلق یہ کہتے ہیں کہ کیا پایا۔ حالانکہ معمولی عقل وفہم والا اس واقعہ سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ والوں نے ایسی کوئی چیز ضرور پائی ہے جس کے مقابلہ میں یہ دنیا اُن کے سامنے ہیچ تھی۔ اور سنئے

حضرت ذوالنون مصریؒ کا دوسرا ایک واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک نوجوان کو کعبہ کے پاس کثرت سے رکوع وسجود کرتے دیکھا تو میں اسکے قریب گیا اور کہا کہ بہت زیادہ نماز پڑھی جارہی ہے۔

اس نے جواب دیا کہ اپنے رب کی جانب سے واپسی کی اجازت کے انتظار میں ہوں حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک پرچہ گرا جس میں لکھا تھا۔

مِنَ العزیز الغفور الی عبدی الصادق۔

یعنی اس ذات کی طرف سے جو غالب ہے بخشنے والی ہے اس کے ایک سچے بندے کی جانب۔

آگے یہ مضمون تھا کہ مغفورۃ لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر انصرف۔

یعنی جا سکتے ہو اس حال میں کہ تمہارے اگلے پچھلے سب گناہ بخشدیے گئے۔

دیکھا آپ نے۔ اب بھی شبہہ ہے کہ نماز وروزے سے لوگوں نے کیا پایا ہے۔ ان بزرگوں نے کچھ پایا تھا کہ نہیں یہ سب بزرگوں کے صحیح وسچے واقعات ہیں۔ چھوٹے قصے نہیں ہیں۔ علماء نے کتابوں میں بیان فرمایا ہے۔ ان سب کتابوں کو جھوٹ کہئے گا۔

Scanned with CamScanner

تو پھر آپ کی کتاب کو کون مانے گا۔

اور سنئے:۔

محمد بن مبارکؒ صوری کہتے ہیں کہ میں ابراہیم بن ادہمؒ کے ساتھ بیت المقدس جا رہا تھا۔ ہم لوگ قیلولہ کے وقت ایک انار کے درخت کے نیچے اترے اور چند رکعت نماز ادا کی۔ میں نے انار کے درخت کی جڑ سے ایک آواز سنی کہ

اے ابو اسحاق ہم پر کرم کیجئے یعنی ہمارے پھل میں سے کچھ نوش فرمالیجئے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس درخت نے یہ درخواست تین بار کی پھر محمد بن مبارکؒ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ بھی سفارش کر دیجئے کہ حضرت کچھ کھالیں۔ محمد بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے ابو اسحاق آپ نے تو سن ہی لیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اٹھے اور دو انار توڑے۔ ایک خود کھایا دوسرا مجھے دیا۔ میں نے جو کھایا کھٹا تھا اور درخت بھی چھوٹا اور مختصر سا تھا۔ پھر جب ہم اس سفر سے واپس ہوئے اور اس درخت کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ نہایت بلند اور عالیشان درخت ہو گیا ہے اور پھل بھی شیریں ہو گئے تھے۔ اور سال میں دو بار پھلتا تھا اس کے سایہ میں عابدین ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ نام اس کا لوگوں نے رمان العابدین رکھ دیا۔

سبحان اللہ عجیب واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کا کس کس طرح اکرام کیا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ نماز و روزہ میں کسی نے کچھ پایا ہی نہیں ہے۔

اور سنئے:۔

حضرت جنیدؒ سے مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر خصاف سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ جابر رحبی نے یہ بیان کیا کہ اکثر اہل رحبہ کرامات کے بارے میں میرے اوپر انکار کیا کرتے تھے۔ ایک دن شیر پر سوار ہو کر رحبہ میں داخل ہوا اور یہ کہنا شروع کیا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو اولیاء کی تکذیب کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سے سب کے منہ بند ہو گئے۔ پھر کسی نے انکار نہیں کیا۔

اور سنئے :-

حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ ہم حضرت ذوالنون مصری کے ساتھ جنگل میں چلے جارہے تھے ایک جگہ ببول کے درخت کے نیچے ہم ٹھہرے۔ ہم نے کہا کیا اچھی یہ جگہ ہے اور کیسا عمدہ یہ درخت ہے کاش اس میں پختہ کھجور لگے ہوتے۔ یہ سن کر حضرت ذوالنون مسکرائے اور فرمایا کہ کھجور کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اچھا تو لو کھاؤ۔ یہ کہا اور اس درخت کی ڈال پکڑی اور کہا کہ تجھے اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے تجھے پیدا کیا ہے اور ایسا شاداب درخت بنایا ہے کہ تو ہم پر کھجور گرا۔ چنانچہ یہ کہہ کر ڈالی جو ہلائی تو واقعی اس میں سے پختہ کھجور گرے۔ چنانچہ ہم سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پھر سو رہے۔ پھر جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے بھی تجربہ کے طور پر اس کو ہلایا تو اسمیں سے حسب معمول ببول کے کانٹے گرے۔

اسی طرح سے ابراہیم آجریؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کے پاس ایک یہودی اپنا قرض وصول کرنے کے لئے آیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کی بھٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اثنائے گفتگو میں اس یہودی نے کہا کہ ابراہیم کوئی کرامت وغیرہ دکھلاؤ تو میں مسلمان ہو جاؤں۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا، کیا واقعی مسلمان ہو جاؤ گے۔ اس نے کہا کہ ہاں، ہاں ضرور۔ تب میں نے اس سے کہا کہ اچھا اپنے کپڑے اتارو۔ اسنے اتار دیے۔ میں نے اسے لپیٹا اور اس بنڈل کے اوپر اپنا ایک کپڑا لپیٹ دیا اور اس بنڈل کو آگ میں ڈالدیا۔ پھر میں اس بھٹی میں گھسا اور اس کپڑے کی گٹھری کو آگ میں سے نکال کر دوسری جانب سے باہر نکل آیا۔ پھر اس کو کھولا تو میرا کپڑا تو بجنسہٖ محفوظ تھا حالانکہ اوپر تھا اور اسکا کپڑا جو کہ اندر تھا جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس یہودی نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

سبحان اللہ! اب اسکو کیا کہئے گا۔ حضرت ذوالنون مصری اور ابراہیم آجری نے اس راستہ میں کچھ پایا تھا یا نہیں۔

Scanned with CamScanner

اور سنئے :-

ایک آقا اور اسکا ایک غلام دونوں کہیں جارہے تھے۔ راستہ میں غلام نے کہا ذرا میں اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ لوں تو چلوں، یہ کہہ کر وہ مسجد کے اندر چلا گیا اور بہت دیر لگا دی۔ آقا انتظار کرتے کرتے جب گھبرا گیا تو وہیں سے آواز دی کہ او بھائی بہت دیر ہو رہی ہے۔

یہ سن کر غلام نے اندر ہی سے جواب دیا کہ کیسے آؤں آنے ہی نہیں دیتے۔ اس نے کہا کون باہر آنے نہیں دیتا، خادم نے کہا وہی جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتا۔ یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا۔

دیکھا آپ نے کبھی آپکا ایسا وقت بھی تھا کہ آپ کے نوکر اور خادم بھی ایسے ہوتے تھے اور نماز میں کچھ پاتے تھے۔ اب یہ سب باتیں سمجھ میں آرہی ہیں یا نہیں۔

اور سنئے :-

شیخ سعدیؒ ایک دفعہ اپنے ایک رفیق کے ساتھ سفر میں جارہے تھے راستہ میں دریا پڑا پار ہونے کے لئے کشتی میں سوار ہوئے انکے رفیق کے پاس کرایہ نہیں تھا اس لئے وہ رفیق کشتی پر سوار نہیں ہو سکے رفیق کی جدائی کا شیخ سعدی کو بہت رنج تھا۔ مگر کیا کرتے بالآخر کشتی روانہ ہو گئی۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ بزرگ بھی ساتھ ساتھ پانی پر چل رہے ہیں۔ شیخؒ کو بہت تعجب ہوا۔ ان بزرگ نے اسے محسوس کیا چنانچہ دریافت کیا سعدی تعجب کی کیا بات ہے۔ تم کو کشتی لیجارہی ہے ہم کو خدا لے جارہا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔

یعنی بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں اور محسنین کے ساتھ ہے اور وہی اپنے ولی کی مدد کرتا ہے۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ۔

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی نصیحت سے اندھا بن جائے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اور سنئے :-

ایک آدمی کے یہاں ایک بزرگ مہمان ہوئے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ آج ایک مرغی ذبح کردو۔ اس پر انھیں کچھ خیال گذرا کہ کون صاحب آگئے ہیں کہ انکی وجہ سے ہماری ایک مرغی جاتی رہی۔ بہرحال طوعاً و کرہاً ذبح کیا۔ ان بزرگ کو کشف کے ذریعہ یہ معلوم ہوگیا کہ بیوی صاحبہ راضی نہیں ہیں۔ جب کھانا سامنے آیا تو ان بزرگ نے پیالہ کیطرف منہ کرکے کہا کہ "ہش" یہ کہتے ہی سب بوٹیاں جمع ہوکر مرغی بن گئی اور وہ دسترخوان پر سے کود کر بولتی ہوئی اندر کو بھاگی اور صاحب خانہ سے فرمایا کہ کچھ خیال نہ کیجئے۔ نمک مصالحہ اور پانی وغیرہ یہ سب بھی تو آپ ہی کے گھر کا ہے اور روٹی شوربے سے بھی کھائی جاسکتی ہے یہ منظر دیکھ کر ان صاحب کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ سمجھ گئے کہ عورت نے کوئی برا خیال کیا ہوگا۔ یہ بزرگ اس پر مطلع ہوگئے۔ اندر ہی اندر بیوی پر بہت غصہ بھی آیا کہ آج اس نے تو آبرو لے لی اور اس طرح سے مجھے رسوا کردیا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ آخر ان بزرگ نے کچھ تو پایا ہوگا جب تو ان سے ایسی بڑی کرامت صادر ہوئی۔ اور سنئے :-

ایک ڈپٹی صاحب کی اہلیہ نہایت ہی دیندار تھیں اور نمازی بھی تھیں۔ ڈپٹی صاحب انکو اکثر چھیڑا کرتے تھے۔ ان سے کہتے تھے تم کو نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے وہ بیچاری خاموش ہوجاتی۔

حضرت مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ اگر مجھ سے پوچھتے تو میں یہ جواب دیتا کہ نماز پڑھنے سے نماز ملتی ہے اسلئے کہ جو چیز مقصود بالذات ہو اس میں یہ سوال ہی نہیں ہوتا کہ کیا ملتا ہے، یہ سوال وسیلہ میں کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص کہیں جارہا ہو تو اس سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ تم وہاں کیوں جارہے تم کو وہاں جانے سے کیا ملتا ہے اس لئے کہ چلنا تو مقصود بالذات ہے نہیں مقصود تو کوئی اور ہی شی ہوتی ہے یہ تو محض حصول مقصود کا ذریعہ ہوتا ہے تو یہاں یہ سوال برمحل ہے کہ اس سے کیا ملتا ہے مگر کوئی شخص کھانا کھا رہا ہو یا پانی پی رہا ہو تو اس سے یہ پوچھنا حماقت ہے کہ تم کو کھانے میں کیا ملتا ہے۔ پانی میں کیا ملتا ہے۔ اسی

طرح سے نماز بھی مقصود بالذات ہے اور فرض عین ہے اس لئے یہاں یہ سوال ہی لغو ہے۔ کہ اس سے کیا ملتا ہے۔ ہاں وضو میں یہ سوال کر سکتے ہیں تو اس کے متعلق سنئے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وضو کر کے دیکھو تو۔ جلد اور صفائی باطن کے اعتبار سے اپنے قلب کی کیفیت بدلی ہوئی پاؤ گے۔ گناہ ہو جائے اس کے بعد وضو کر کے دیکھو تو قلب کی حالت بدل جاتی ہے یا نہیں۔

ایک اور بزرگ کا واقعہ سنئے، اپنے چند لوگوں کے ہمراہ ایک امیر شخص کے یہاں گئے جو برابر انکو اپنے یہاں ٹھہراتا تھا اور بہت خاطر مدارت کرتا تھا۔ اس دفعہ یہ کیا کہ انھیں آتے دیکھا تو گھر کے اندر چلا گیا اور پھر نکلا ہی نہیں جب بہت زیادہ دیر ہو گئی تو یہ بزرگ سمجھ گئے کہ ہمارا آنا اسے شاق گذرا۔ انھوں نے اس کی حویلی کے نیچے کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھ دیا ؎

خانقاہے بلند و ہمت پست ۔۔۔ اے خدا ہر دو را برابر کن

یہ پڑھ کر وہاں سے چلے آئے۔ لوگ بیان کرتے ہیں یا تو نہایت امیر کبیر آدمی تھا یا اس کے بعد ایسا زوال آیا کہ نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا۔

دیکھا آپ نے یہ بھی ملتا ہے۔ آپ اگر کسی خاص شخص کا انکار کر دیں تو کر سکتے ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ولایت ہی کوئی شے نہیں۔ اور کبھی کوئی ولی ہوا ہی نہیں ہے۔ آپ نہ ہوں یہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ آپ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اور ولایت حاصل کرنے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے ؎

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا
وما اراھم رضوا فی العیش بالدون

یعنی میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ ادنی دین پر قناعت کئے ہوئے

ہیں۔ لیکن دنیا وی عیش سے ادنیٰ پر راضی نہیں ہیں۔ یعنی دین تو انکے نزدیک ادنی اور اقل درجہ کا بھی کافی ہے اور دنیا کے بارے ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر بھی قانع نہیں ہیں۔

آگے فرماتے ہیں ؎

فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما

استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

یعنی تم ایسا نہ کرنا بلکہ معاملہ کو برعکس رکھنا یعنی دین اختیار کرکے بادشاہوں کی دنیا سے مستغنی ہو جانا جس طرح سے کہ بادشاہ لوگ اپنی دنیا کو لے کر دین سے مستغنی ہوگئے ہیں۔ سبحان اللہ کیسی عمدہ بات بیان فرمائی۔ آخر امام غزالیؒ کی بات کو لوگ کیوں سراہتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے کچھ پایا تھا۔ انھوں نے نور پایا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ پایا تھا۔

ایک شخص بہت دیندار تھا جیل خانہ میں سپاہی کے عہدہ پر مقرر تھا۔ ایک دفعہ وہ ایک قیدی کو لے کر کہیں دوسری جگہ پہونچانے چلا۔ راستہ میں مغرب کا وقت ہوگیا اس نے قیدی سے کہا تم ذرا یہیں بیٹھ جاؤ نماز پڑھ لیں تو چلیں۔ یہ کہہ کر نماز شروع کردی اور فرض وسنت سے فارغ ہوکر پیچھے جو مڑ کر دیکھا تو قیدی غائب اس نے کچھ اسے زیادہ تلاش بھی نہیں کیا اور نہ پریشان ہوا اور جاکر اپنے افسر سے کہدیا کہ جو قیدی میرے حوالہ کیا گیا تھا وہ مجھ سے بھاگ گیا۔ لہذا آپ مجھے جو سزا چاہئے دے دیجئے ان لوگوں نے کہا کہ ابھی ہم کچھ کارروائی نہ کریں گے روزنامچہ خالی رکھیں گے۔ جاؤ تم اسے تلاش کرو۔ سپاہی چلا آیا اس نے سوچا اب میں کہاں اسے تلاش کروں معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ یہ خیال کرکے سیدھا اپنے گھر چلا آیا۔ اور وہاں جاکر نماز پڑھنے لگا۔ رات کو جب بارہ بجے تو کسی نے آکر دروازے پر دستک دی اس نے اندر سے دریافت کیا کون؟ اس نے کہا کہ میں ہوں آپ کا بھاگا ہوا قیدی۔ (جس نے آپ جیسے اللہ والے سے بے وفائی کی اور آپ کو نماز میں

مشغول دیکھ کر آپ سے کئے ہوئے عہد کے خلاف کیا یعنی موقع پاکر فرار ہو گیا)

اس نے جاکر دروازہ کھولا اور اس سے پوچھا تم کیسے واپس آگئے۔ اس نے کہا وجہ یہ ہوئی کہ جب میں دوسری طرف کو بھاگتا تھا تو اندھا ہو جاتا تھا۔ اور جب آپ کی طرف آتا تھا تو آنکھ ہو جاتی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ اگر بھاگ جاتا ہوں تو ساری عمر اندھا رہونگا اور اگر آجاؤں گا تو آنکھ تو رہے گی۔ رہی سزا تو وہ تو ختم ہی ہو جائیگی پھر چھوٹ جاؤنگا اسلئے میں چلا آیا۔

تو دیکھا آپ نے نماز سے یہ ملتا ہے۔ انکا قیدی نماز ہی میں بھاگا تھا اس لئے ان سپاہی میاں نے یہ سوچا کہ نماز ہی سے اسے وصول کرونگا۔ اس لئے آکر پھر نماز پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی نماز کی لاج رکھنی تھی اس لئے یہ صورت پیدا فرمادی کہ اس کی برکت سے قیدی بھی مل گیا اور ان کی کرامت بھی ظاہر ہو گئی اور وہ بزرگ مشہور بھی ہو گئے۔ چنانچہ اس کے دفتر والوں کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہو گیا کہ ان سے کہا کہ آپ حاضری بھر دیا کیجئے اور بیٹھے رہا کیجئے آپ کا کام ہم سب کر دیا کریں گے لوگوں کے دل میں ان کا رعب بیٹھ گیا۔ سب لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بزرگ آدمی ہیں۔ اور سنئے۔

ایک بزرگ مزدوروں کی صف میں جاکر بیٹھ گئے، لوگ مزدوروں کی تلاش میں آئے اور سب کو لے گئے اور انکو کسی نے نہ پوچھا لوگوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ کام کیا کریں گے انھوں نے یہ کیا کہ جنگل میں جاکر نماز پڑھنی شروع کی اور دن بھر نماز پڑھتے رہے اور شام کو جب گھر واپس آئے تو بیوی بچے منتظر تھے کہ کمانے گئے ہیں کچھ لے کر آئینگے انھوں نے یوں تسلی دی کہ کہا کہ ہم نے جس کے یہاں ملازمت کی ہے وہ مہینہ پر تنخواہ دیگا اس طرح سے گھر والوں کے مطالبہ سے ایک مہینہ کے لئے بچ گئے۔ لیکن جب مہینہ ختم ہوا اور پہلی تاریخ آئی اور شام کو حسب معمول گھر کو واپس آنے لگے تو خیال ہوا کہ آج کیا جواب دینگے یہ سوچا کہ لاؤ جنگل سے کچھ جنگلی پھل اور جھڑبیری وغیرہ لیتے چلیں تاکہ بچوں کو کچھ تو تسلی رہے کیونکہ دور ہی سے جب خالی ہاتھ آتا ہوا دیکھیں گے تو دل شکستہ ہو جائیں گے وہاں

یہ ہوا کہ جیسے ہی یہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے ایک آدمی نے آکر دروازہ پر دستک دی اور کہا کہ تمھارے میاں نے جہاں نوکری کی تھی یہ تنخواہ بھیجی ہے آکر لیجاؤ۔ سب بچے خوشی خوشی دوڑے اور سب سامان اٹھاکر اندر لے گئے۔

شام کے وقت وہ بزرگ تو افسوس اور رنج کے ساتھ واپس ہو رہے تھے اور یہاں گھر میں عید ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی دیکھا کہ گھر سے دھواں اٹھ رہا ہے اور جب قریب آئے تو سنا کہ دیگچی میں کفگیر کے کھڑکھڑانے کی آواز آرہی ہے اور کسی کو اپنے انتظار میں کھڑا ہوا بھی نہیں پایا بہت تعجب کیا کیا بات ہے۔ اسی حالت میں گھر میں داخل ہوئے تو بیوی صاحبہ نے فوراً یہ خوشخبری سنائی کہ آپ نے جن صاحب کی نوکری کی تھی انھوں نے تنخواہ بھیجدی ہے۔ یہ سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نماز قبول ہوگئی

دیکھئے نماز سے یہ بھی ملتا ہے آپ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نماز و روزہ سب بیکار ہے تو ایسا نہیں ہے اسی کی وجہ سے لوگوں نے بہت بہت پایا ہے۔

ایک بادشاہ نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح کسی دیندار شخص سے کریگا۔ ایک دن کہیں جارہا تھا ایک مسجد میں ایک جوان کو نماز پڑھتے دیکھا۔ اسکی نماز پسند آگئی کھڑا دیکھتا رہا جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس سے کہا کہ اگر شاہ شجاع کرمانی اپنی لڑکی کا نکاح تمھارے ساتھ کرے تو تم قبول کروگے۔ اس نے کہا میاں چپ بھی رہو کیسی باتیں کرتے ہو بڑاؤ گے کیا۔ اس نے کہا نہیں بیٹے گا کون میں ہی شاہ شجاع کرمانی ہوں مجھے تمھاری نماز پسند آگئی اسلئے میں اپنی لڑکی کو تمھارے عقد میں دینا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ دیکھئے نماز کی وجہ سے بادشاہ نے اپنی لڑکی کا نکاح کرنا طے کرلیا۔ حالانکہ بڑے بڑے امیرزادے اور رئیس زادے کوشش کرکے تھک چکے تھے غرض نماز کی وجہ سے دین بھی ملتا ہے اور دنیا بھی ملتی ہے پھر لوگ کیسے کہتے ہیں کہ نماز سے کیا ملتا ہے۔ جن لوگوں نے خدا کے لئے نماز پڑھی ہے یا دین اختیار کیا ہے انھیں

ہر زمانہ میں ملا ہے۔

اس پر بڑے پیر صاحب کا واقعہ سنئے۔ ایک دن مجلس میں تشریف لائے اور بیٹھتے ہی بیان فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن المبارک کے پاس ایک دن کوئی سائل آیا اور ان سے کچھ کھانا طلب کیا۔ حضرت کے پاس اس دن دس انڈوں کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔ خادمہ کو حکم دیا کہ وہ سب انڈے اسکو دیدو۔ اس نے نو ہی انڈے سائل کو دے اور ایک بچاکر رکھ لیا۔ غروب آفتاب کے وقت کسی شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ یہ ٹوکری لیجائیے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ خود باہر تشریف لائے اور ٹوکری لے کر دیکھا تو اس میں انڈے تھے اور اسکو شمار کیا تو اسمیں نوے ہی نکلے۔ آپ نے خادمہ کو بلایا اور اس سے دریافت کیا کہ تو نے سائل کو کتنے انڈے دیئے تھے اس نے کہا نو دیئے تھے۔ ایک کو اسلئے بچا لیا تھا کہ شام کو ہم لوگ اس سے افطار کریں گے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ ارے تو نے میرے دس انڈوں کا نقصان کرادیا۔

اس قصہ کو بیان کر کے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ یہ معاملہ تھا ہمارے اسلاف کا اپنے پروردگار کے ساتھ۔ جو چیزیں کتاب و سنت میں وارد ہیں اس پر دل سے ایمان و تصدیق رکھتے تھے۔ ان حضرات کا عمل قرآن پر تھا اس لئے اپنی حرکات و سکنات میں دین کی ذرا بھی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے رب سے ایک معاملہ کیا تھا جس میں نفع دیکھا تو اسکو لازم پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ کے دروازے کو کھلا ہوا دیکھا تو اس میں داخل ہو گئے اور دوسروں کا دروازہ بند پایا اس لئے اسکو چھوڑ دیا۔ ان حضرات نے غیر اللہ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں غیروں کی کچھ پروا نہیں کی جس سے اللہ تعالیٰ بغض رکھتے ہیں ان سے بغض رکھنے میں اس کی موافقت کی اور جس سے اللہ تعالیٰ موافقت فرماتے ہیں ان سے محبت رکھنے میں پوری موافقت کی۔

سبحان اللہ! کیا عمدہ ایمان و ایقان اور تصدیق کامل کا نمونہ ہے۔ یہ تھے

Scanned with CamScanner

ہمارے اکابر جو اپنے نفس کو خدا کے لئے مارتے تھے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اسطرح سے نوازتے تھے وہ تو یہ فرماتے ہیں اور آپ ابھی تک اسی خیال میں ہیں کہ دین میں کچھ ہے ہی نہیں۔

اس قسم کے واقعات بزرگوں کے بیشمار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی نماز و روزے میں بہت کچھ پایا ہے اور یہ سب باتیں جھوٹ نہیں ہیں ایک شخص کہتا ہے کہ ہم نے نہیں پایا۔ اس کے مقابلہ میں ہزاروں آدمی معتبر کہتے ہیں کہ ہم نے پایا ہے۔ پھر اسی ایک کی بات کیوں صحیح مانی جائے سب کی بات کیوں صحیح نہیں ہے۔ آخر اسی دنیا میں ہم بھی رہتے ہیں تو ہماری رائے اس بارے میں کیوں معتبر نہیں۔ بات یہ ہے کہ جہالت کا دور۔ دورہ ہے خود تو سمجھتے بوجھتے نہیں اور نہ کسی سے دریافت کرتے ہیں اس لئے طرح طرح کے شک و شبہات میں پڑے رہتے ہیں اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ کسی کو اپنا رہبر ضرور بنالے۔ کیونکہ جب انسان طریق میں چلتا ہے تو اس کو قبض ضرور پیش آتا ہے اس موقعہ پر شیخ کامل کی ضرورت پڑتی ہے وہی اس کو اس عقبہ سے نکالتا ہے ورنہ آدمی اس حال میں بہت تکلیف اٹھاتا ہے۔ شیخ ہی اسکو تسلی دیتا رہتا ہے یہانتک کہ اس سے وہ نکل جاتا ہے اور قبض کا ہونا طریق میں ضروری اسلئے ہے کہ اسی کیوجہ سے اعتدال قائم رہتا ہے ورنہ اگر قبض نہ ہو تو بسط ہوگا اور آدمی اُسمیں نہ جانے کیا سے کیا بک دے۔ شیطان جو گمراہ ہوا وہ بسط ہی میں ہوا۔ اسلئے ضرورت ہے کہ آدمی قبض اور بسط کو پہچانے اور اسکو سمجھے اور کسی حال میں اپنے کو خراب نہ ہونے دے۔

غرض ملتا سب کو ہے مگر کبھی آدمی اپنی نحوست اعمال سے اس کو ضائع کر دیتا ہے۔ شاہی عطیہ کا بڑا حق اور ادب ہوتا ہے جب اس کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی ہے تو وہ چھن بھی لیجاتی ہے۔

ایک بادشاہ نے ارکان دولت کو خلعت تقسیم کیا اتفاقاً ایک وزیر کو چھینک آگئی اس نے اُسی دی ہوئی خلعت کے ایک گوشہ سے ناک صاف کرلی۔ بادشاہ نے

اس کو دیکھ لیا بہت ناراض ہوا۔ خلعت اس سے واپس لے لیا اور اس کو معطل کر دیا۔

دیکھا آپ نے مقربان را بیش بود حیرانی۔ بڑا ہی نازک معاملہ ہے اگر ذرا حق میں کمی ہوئی اور دولت سلب ہوئی۔

ایک بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ صبح و شام دو روٹی مجھے مل جایا کرے بس مجھے اور کچھ نہ چاہیئے۔ چنانچہ قید ہو کر جیل خانہ چلے گئے اور صبح و شام دو روٹیاں آنے لگیں۔ عرض کیا یا اللہ یہ کیا ہوا؟ ادھر سے حکم ہوا کہ تم نے تو دو روٹیوں ہی کے لئے مجھ سے کہا تھا دو روٹی دیدی گئی۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ عافیت کے ساتھ ملے۔

دیکھا آپ نے اسی لئے کہتا ہوں کہ ہر چیز کے ساتھ آداب کو سمجھنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ظاہری آداب سے آراستہ ہو مگر باطنی آداب نہ کرتا ہو اس لئے محروم رہتا ہو۔

عوام الناس جو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں تو اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ بہت لوگ وظیفہ وغیرہ بہت پڑھتے ہیں مگر شرک تک میں مبتلا ہیں کسی شیخ کے پاس جاتے نہیں اس لئے خراب ہو جاتے ہیں ایسوں ہی کو دیکھ کر یہ لوگ عام حکم لگا دیتے ہیں کہ کچھ پایا ہی نہیں اور اس قسم کے وساوس کبھی شیطان بھی ڈالتا ہے۔

ایک شخص شب میں اُٹھا کرتا تھا۔ ایک دن شیطان نے قلب میں یہ ڈالا کہ یہ تم کیا اندھیرے میں تیر مارتے ہو۔ بلا وجہ ہی اتنی مشقت اُٹھاتے ہو۔ مگر ادھر سے نہ سلام ہے نہ پیام ہے پھر تمھارے ذکر کرنے سے فائدہ۔

بات ان کے دل کو لگ گئی سو گئے۔ اس رات کو نہیں اُٹھے۔ اللہ تعالیٰ کیجانب سے ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا ہے کہ تم آج اُٹھے کیوں نہیں۔ اس سے بھی یہی کہا کہ کیا اُٹھیں اور کیا ذکر کریں۔ ادھر سے پیام ہے نہ سلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے ذریعہ کہلوایا کہ اس سے کہدو کہ یہ

Scanned with CamScanner

اللہ اللہ کہنا ہی ہمارا جواب ہے اور تمہارا سوز و درد ہی ہمارا قاصد ہے۔[۵]

یہ سب واقعات میں اس پر سنا رہا ہوں کہ اللہ والوں نے اللہ تعالیٰ سے صحیح اور سچا تعلق پیدا کرنے کے بعد اس دنیا میں بھی بہت کچھ پایا ہے۔ دین بھی پایا ہے اور دنیا بھی پائی ہے۔ دین کے متعلق سنئے کہ ایسے لوگوں کو کیا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

یعنی یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے۔ اللہ کی باتوں میں کچھ فرق نہیں ہوا کرتا یہ بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ایمان پایا ہے تقویٰ پایا ہے بشریٰ پایا ہے اور فوز عظیم پائی ہے۔ اور بشریٰ کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ ھی الرؤیۃ الصالحۃ یرھا المومن او تری لہ یعنی اچھے اچھے خواب جسکو مومن خود دیکھے یا اس کے بارے میں کسی کو دکھا یا جائے۔ یہ بشارت تو دنیوی ہوئی۔ اور آخرت کی بشارت یہ کہ مومن کو موت کے وقت یہ خوشخبری دیجائے گی کہ اللہ تعالےٰ نے تیری مغفرت کردی۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ دنیوی بشارت یہ ہے کہ موت کے وقت رحمت کے فرشتے بشارت دیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

اور آخرت کی بشارت یہ ہے کہ فرشتے فوز و کرامت کی خوشخبری دیں گے نیز ان لوگوں کے چہرے روشن ہوں گے اور اعمالنامے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔

[۵] مطلب یہ کہ تم ایک بار اللہ کہنے کے بعد دوسری بار جو اللہ کہتے ہو یہی ہمارا اسلام ہے۔ اگر تمہارا پہلی بار کا اللہ کہنا قبول نہ ہوتا تو تمہیں دوسری ار نام لینے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیوی بشریٰ یہ چیزیں ہیں۔ نصر۔ فتح۔ غنیمت۔ ثنائر حسن۔ ذکر جمیل اور لوگوں کے قلوب میں محبت اور رہی آخرت کی بشارت تو اسکے بیان کرنے سے تو زبان قاصر ہے۔

دیکھا آپ نے کتاب وسنت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پایا ہے اور جس طرح سے ہم نے پایا ہے اسی طرح سے ہمارے شیخ حضرت مولانا تھانویؒ نے بھی پایا تھا اور ان کے شیخ حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے بھی پایا تھا اور انکے شیخ کے شیخ حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پایا تھا۔ اسی طرح سے یہ سلسلہ پانے والوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک چلا گیا ہے۔ اگر آپنے نہ پایا ہو تو اس کے ذمہ دار آپ ہیں لیکن اس سے دوسروں پر نہ پانے کا حکم آپ کیسے لگا سکتے ہیں۔

آج اہل علم کو اس قسم کے مضامین بھی پہونچانے چاہئیں۔ مگر یہی لوگ ڈرتے ہیں اور عوام الناس سے یہ باتیں بیان ہی نہیں کرتے اگر بیان کریں تو لوگ ڈریں۔ آج کام یہیں سے بگڑا ہے۔

دیکھئے ایک شخص عذاب قبر کا منکر تھا۔ ایک مولوی صاحب نے دلائل سے اسکو سمجھانا چاہا وہ نہیں مانا اس پر وہ مولوی صاحب رونے لگے اور پھر اپنے دوست سے کہا کہ آپ اسکو سمجھا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب میں ایک موقعہ کی بات ڈالدی۔ وہ یہ کہ انھوں نے اس شخص سے کہا اچھا جاؤ۔ نہا دھو کر کپڑے پہن کر آؤ۔ اور میرے ساتھ قبرستان چلو تم کو عذاب قبر کا مشاہدہ کرادوں گا۔ تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے مگر یہ ہوسکتا ہے کہ تم وہاں سے بچ کر نہ آؤ اسکو تم جانو۔ اس بات کو انھوں نے کچھ اس عنوان اور یقین کے ساتھ کہا کہ وہ ڈر گیا اور جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اور اپنے خیال فاسد سے تائب ہوگیا اور انھیں صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بیعت کرلیجئے۔ انکا تعلق چونکہ مجھ سے تھا یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان کیا اور کہنے لگے کہ مجھے بیعت کرنے کی اجازت تو تھی نہیں تاہم میں نے اسکو تو بیعت کرہی

Scanned with CamScanner

لیا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک کیا۔

اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں اور اس کی وجہ دین سے جاہل ہونا ہے۔ نہ خود دین کا علم حاصل کرتے ہیں اور نہ کسی جاننے والے سے پوچھتے ہیں اور نہ انھیں کوئی بتاتا ہے اس لئے طرح طرح کے شک و شبہات میں مبتلا رہتے ہیں. اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ سب کیا کر رہے ہو اور ابھی کیا ہے جب عذاب کا فرشتہ دیکھو گے تو بہت ڈر جاؤ گے مگر اُسوقت کا ڈرنا کچھ کام نہ آئے گا۔ ڈرنا ہے تو اس سے پہلے ڈر لو۔

ایک آزاد شاعر خود تو شراب پیتا تھا اور نیک لوگوں کی ہجو کرتا تھا۔ ایک مولوی صاحب نے خواجہ صاحبؒ سے کہا کہ آپ ذرا اسکا جواب دیجئے۔ خواجہ صاحب تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان لوگوں کی ایک ایک بات کو لے کر اسی انداز سے اُس پر کلام کرنا شروع کیا جس طرح سے کہ زاہدوں پر رد کیا کرتا تھا۔ یہانتک کہ اس کی فحش کلامی کا بھی جواب دیا۔ جب اس نے یہ دیکھا تو خواجہ صاحب سے معافی مانگی اور صلح کر لی کہ نہ آپ کچھ کہیں اور نہ میں اب کچھ کہوں۔ خواجہ صاحب کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ اس کی زبان بند کردوں اور وہ حاصل ہو گیا۔

تم کہتے ہو کہ تہجد میں کچھ نہیں پایا ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو پایا ہے ہدیہ پایا ہے عزت پائی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا پائی ہے۔ مگر یہ سب چیزیں ماننے والوں کے لئے اور معتقد کو ملا کرتی ہیں اور جو منکر ہوتا ہے اسکو انکار ملتا ہے اہل اللہ پر اعتراض ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ملتی ہے خیانت نفس ملتی ہے اور سوءِ ظن ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ یہ سب چیزیں مومن کے لئے ہیں منافق کے لئے نہیں ہیں۔ یعنی باوجود نماز و تہجد پڑھنے کے کسی کو جو نہیں ملتا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نماز و تہجد میں کچھ نہیں ہے بلکہ تمہاری بد اعتقادی کی وجہ سے تم کو کچھ نہیں ملتا۔ (اسلئے کہ کسی کو جو کچھ ملتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے

سبب ہی ملتا ہے اور اسکے حصول کا ذریعہ خدا سے لگاؤ، محبت، حسن ظن اور حسن اعتقاد ہے۔ جب یہ سب نہیں تو وہ بھی نہیں۔)

یہ لوگ بظاہر مسلمانوں میں داخل ہیں مگر فاسد العقیدہ ہیں اور ضعیف الایمان ہیں۔ مسلمانوں کو جتنا ضرر ایسے لوگوں سے پہونچتا ہے مشرکین سے بھی نہیں پہونچتا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی امت پر نہ تو کسی مومن کی طرف سے خوف کرتا ہوں اور نہ کسی مشرک کیجانب سے۔ اس لئے کہ مومن کو اس کا ایمان خلاف باتوں سے روک دیگا اور مشرک کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کا کفر ہی کافی ہے لیکن مجھے تم پر جو خوف ہے تو اس منافق کا جو زبان کا عالم ہوگا بات ایسی کہے گا جو تمھارے نزدیک پسندیدہ اور معروف ہوگی اور اسکا عمل ایسا ہوگا جس کو تم ناپسند اور منکر سمجھتے ہوگے یعنی فاسد العمل والعقیدہ ہوگا۔

تو بات یہ ہے کہ آپ میں اخلاص نہیں ہے اس لئے آپکو نہیں ملتا اور جو مخلص ہیں انکو ملتا ہے۔ یہ دنیا ہے اس میں کسی کو ایمان ملتا ہے کسی کو ولایت ملتی ہے کسی کو دین ملتا ہے اور کسی کو بداخلاقی ملتی ہے۔ کسی کو نفاق ملتا ہے اور کسی کو وساوس و خطرات ملتے ہیں۔ دماغ کی پریشانی ملتی ہے غرض ملتا سب کو ہے باقی یہ خدا کی تقسیم ہے اب جس کا جو جی چاہے لے لے۔

ایک بزرگ نے مسجد میں شب کو نماز تہجد پڑھی۔ صبح لوگوں نے وہاں ایک رسی پڑی دیکھی۔ ان سے دریافت کیا کہ حضرت یہ رسی کیسی ہے۔ فرمایا کہ بھائی اور تو میں کچھ جانتا نہیں میرا ہاتھ کسی لجلجی چیز پر پڑ گیا میں نے اسے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ یہ کیا ہے، رسی ہے۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ کوئی سانپ آگیا تھا حضرت کے رسی فرما دینے کیوجہ سے وہ رسی ہی ہو گیا۔

دیکھا آپ نے تہجد پڑھنے والوں کو یہ ملا ہے۔ مگر آپ کو نہیں ملیگا اس لئے کہ آپ نے اسلاف کا دین اور اُن کا طریقہ چھوڑ رکھا ہے۔ پس دین آپ سے ناراض

ہوگیا ہے اور فتوحات کے دروازے آپ پر بند ہیں. جس تہجد کے متعلق آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اس میں کچھ نہیں پایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے احوال ملتے ہیں مقامات ملتے ہیں. اللہ تعالیٰ کا قرب ملتا ہے اور آپکی خاطر سے کہتا ہوں کہ دنیا بھی ملتی ہے چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کوئی متوکل آج تک فاقہ کی وجہ سے نہیں مرا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ تم کہتے ہو کہ دین میں کچھ ہے ہی نہیں. اب بھی مکہ شریف اور مدینہ شریف میں جاکر دیکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا شرف اور کیسی عزت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ (اتنا روپیہ اور اتنا سامان وہاں پہونچتا ہے کہ شاید ہی کہیں جاتا ہو۔

آپ دین کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم نے اسمیں کچھ نہیں پایا. میں کہتا ہوں کہ کفر ہی میں لوگوں نے کیا پالیا ہے سوائے لذات وشہوات ومعاصی میں انہماک کے. اور اولیاء اللہ کو ان سب سے نجات مل گئی۔ یہ حضرات کھانے پینے کی طرف رخ نہیں کرتے۔ مگر چونکہ نص میں وارد ہے لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ اسلئے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کچھ کھا پی لیتے ہیں ورنہ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت میں دنیا کی ہر شے سے زیادہ لذت ملتی ہے اور چونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنے کو اور اپنی خواہش کو ختم کردیتے ہیں اسی لئے موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملائکہ کی لسان پر یہ بشارت دیجاتی ہے کہ

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيَآؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِیْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے نفس کی لذات اور خواہشات کو ترک کیا تھا تو اس کا بدلہ آخرت میں یہ دیا جائیگا کہ جو انکی خواہش ہوگی وہی ملیگا۔

موت کے وقت اس بشارت کو سن کر مومن کی روح مشتاق ہوجاتی ہے جسکی وجہ سے اس کی تمام بدنی تکالیف ختم ہوجاتی ہیں اس کی مثال حضرت مولانا رحم کلو و نام

سے دیا کرتے تھے یعنی جس طرح سے اسکو سنگھانے کے بعد آپریشن کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اسی طرح سے موت کے وقت جو کہ ایک سخت وقت ہوتا ہے مومن جب یہ بشارت سن لیتا ہے تو اس کی سب تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں اور موت اسے لذیذ ہو جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

مزا جو موت کا عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

تو دیکھا آپ نے مومن کو ایسے وقت میں یہ ملتا ہے۔ آپ نے کیسے سمجھ لیا ہے کہ دین بالکل خشک چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرما رہے ہیں کہ خشک نہیں ہے۔ یہ مولوی فاروق صاحب بیٹھے ہیں میں ایک دفعہ انکے یہاں گیا ہوا تھا تو یہ مجھے قریب کے ایک دیہات میں لے گئے۔ دیکھا تو وہاں ایک عالیشان مسجد اور ایک پختہ خانقاہ اور ایک شاندار مقبرہ بنا ہوا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی تاریخ یہ ہے کہ یہاں ایک بزرگ تھے۔ انکے پاس ایک پٹواری دعا کے لیے آیا۔ دنیوی مناصب کی دعا چاہی ہوگی۔ انھوں نے اپنا قلمدان اس کی جانب بڑھا دیا کہ تو اس کو لے جاؤ اشارہ اس طرف تھا کہ جاؤ تم وزیر ہو جاؤ گے قلمدان وزارت تمھارے حوالے کرتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس نے بہت ترقی کی اور اسی نے یہ مسجد بنوائی اور ان بزرگ کے وصال کے بعد انکا مقبرہ تعمیر کرایا۔

دیکھئے دین اختیار کرنے سے یہ ملتا ہے کہ یہ حضرات وزارت تک تقسیم کیا کرتے تھے۔

ایک انگریز خواجہ اجمیری رحؒ کی بابت کہتا تھا کہ یہ ایسا شخص ہے کہ دنیا سے گزر چکا ہے مگر اب بھی لوگوں کے قلوب پر سلطنت کر رہا ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ جس کو کسی عالم کی عظمت و شوکت دیکھنا ہو تو گنج مرادآباد جاکر دیکھ لے۔ واقعی اس قریبی زمانہ میں نہایت شان و شوکت کے بزرگ ہوئے ہیں۔ کسی امیر و وزیر کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان حضرات کو کچھ ملا

نہیں تھا تو کیسے ایسے ہو گئے۔

جانتے ہو لوگ کہاں سے بگڑے۔ کافروں کی صحبت سے۔ یہ لوگ ان پر تو اثر ڈال نہیں سکتے البتہ ان سے متأثر ہو جاتے ہیں اور اپنے کو خراب کر لیتے ہیں ورنہ تو ہم لوگ اگر ذرا سا دین اختیار کریں اور اخلاق درست کریں تو وہی لوگ جن کو آپ اپنا مخالف سمجھتے ہیں آپ کا قدم دھو کر پئیں۔ میں ایک جگہ تھا جس طرف سے گذرتا تھا دیکھتا تھا کہ غیر مسلم قدموں پر گرے پڑتے ہیں۔ حالانکہ ہم کچھ ہیں نہیں۔ اگر کچھ ہوتے تو آپ لوگوں کو نہ ٹھیک کر دیتے! مثلاً ناپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ اسمیں لوگوں نے بہت کچھ پایا ہے۔ جب کوئی شخص اس قسم کی باتیں کرے (یعنی یوں کہے کہ ہم نے نماز وغیرہ میں کچھ پایا نہیں) تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ خود ٹھیک ہو جاؤ اور دینداری میں پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہو جاؤ اور اس کو بتا دو کہ ہم نے دین میں کچھ پایا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہر شخص دس دس آدمیوں کو ٹھیک کرنا اپنے ذمہ لے لے یعنی انکو ایمان اور اسلام پر لگا دے۔ پس جب تم اس دلیل کو اختیار کرو گے تو اسکی سمجھ میں کچھ آجائیگا ورنہ کتابی دلیل کو اس زمانہ میں پوچھتا کون ہے۔ اور آدمی جب دین اختیار کرتا ہے تو اسکے لئے مقبولیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر اترتی ہے چنانچہ مخلوق بھی اس کے مرتبہ کو پہچان لیتی ہے۔

حضرت مولانا ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے کچھ مٹھائی تقسیم فرما رہے تھے۔ اس مجمع میں ایک غیر مسلم بھی موجود تھا حضرت نے اسے قصداً نہیں دیا۔ اس پر اس نے کہا حضرت آپ نے مجھ کو کیوں نہیں دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں نے اس لئے نہیں دیا کہ شاید تمہیں چھوت کا خیال ہو۔ اس پر اس نے کہا نہیں حضرت بھلا سب ہاتھ برابر ہوتے ہیں۔ آپ سے چھوت چھات نہیں ہے۔ آپ دیجئے ہم لیں گے۔

ادھر مخلوق تو ان حضرات کو اتنا زیادہ مانتی ہے لیکن انکا یہ حال ہوتا ہے کہ مخلوق پر انکی ذرا نظر نہیں ہوتی۔ چنانچہ رزق کے بارے میں بھی نظر بس اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے

اسباب پر نہیں ہوتی۔ بزرگان دین گھر میں بیٹھ گئے ہیں اور دروازہ بند کر لیا ہے۔ مگر رزق ان کو وہیں پہونچا۔ چنانچہ اس کی تصدیق۔ بزرگوں کے یہاں رہنے ہی میں خوب ہوتی ہے۔

تھانہ بھون میں رہتا تھا ایک دفعہ کہیں سے منی آرڈر آیا۔ خلاف اصول ..... ہونے کی وجہ سے حضرتؒ نے واپس فرما دیا اور ہم لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو یہ رقم واپس کر رہا ہوں اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو یہی روپیہ شرط کے مطابق ہوکر دوبارہ واپس آجائیگا نہیں تو دوسرا اس کی جگہ پر آجائے گا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوتا اتنی ہی رقم کہیں سے اور آجاتی۔ اور جب دوسرا منی آرڈر آتا تو پھر بلاتے اور فرماتے دیکھو میں نے وہ رقم واپس کردی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی رقم دوسری جگہ سے بھجوا دی۔ اس طریقہ سے ہم لوگوں کو سکھلاتے تھے کہ دُنیا کی خاطر دین کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے۔

خود حضرتؒ کا واقعہ ہے شورش کے زمانہ میں علیگڈھ سے ایک صاحب حضرتؒ سے ملنے گئے۔ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے حضرت کو بہت صدمہ ہوگا اس لئے مارے فکر کے بہت دُبلے ہوگئے ہونگے اور مغموم ہونگے مگر جاکر دیکھا تو حضرت خوب خوش وخرم تھے۔ سب سے ہنستے بولتے تھے۔ ان کو بہت تعجب ہوا۔ حضرت سے اُس کے متعلق دریافت کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی مجھے رنج کرنے کی کیا ضرورت میرا تو ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس لئے کہ لوگ جو مجھے گالی دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے قیامت میں انکی نیکیاں مجھ کو ملجائیں گی یہ تو آخرت کا فائدہ ہوا۔ اور دنیا کا نفع یہ ہے کہ میری آمدنی پہلے سے اور زیادہ ہوگئی ہے۔ ہدایا اور زیادہ آنے لگے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہی حیاۃ طیبہ ہے۔ اسکا نقشہ آنکھوں سے دیکھا روح المعانی میں ہے کہ حیاۃ طیبہ وہ ہے جو لقاء محبوب کے وقت انسان کو حاصل ہوتی ہے چنانچہ اولیاء اللہ کو یہ حالت دنیا میں بھی میسر ہوجاتی ہے کہ کسی لذت حاصل کرنے والے

Scanned with CamScanner

نے اس سے بڑھ کر کوئی لذت حاصل نہیں کی۔ اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ جس کو یہ دولت ملی ہوگی تو آخر اس نے کچھ پایا ہوگا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جسے حق تعالیٰ کا ایسا قرب نصیب ہوجائے گا پھر وہ کسی مخلوق سے کیوں خوف کریگا۔ اور خلق کے طعن کی اس کو کیا پرواہ ہوگی ؎

ناصحا منع بروئت چہ اثر خواہد داد
کاندرونِ دلِ من دلولہ فرمائے ہست

مومن کامل کے قلب میں اللہ تعالیٰ کا تعلق ہوتا ہے۔ اور باہر لوگوں کا طعن ہوتا ہے تو اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ اسی کو متنبی شاعر کہتا ہے کہ ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ
وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

یعنی ملامت گروں کی ملامت تو قلب کے اوپر اوپر تک رہتی ہے اور محبوبوں کی محبت سویدائے قلب میں جاگزیں ہے لہذا ان ملامتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے کیونکہ جہاں ملامت پہونچتی ہے وہاں محبت نہیں اور جو محبت کا مقام ہے وہاں تک ملامت کی رسائی نہیں۔

چنانچہ یہی تعلق جب راسخ ہوجاتا ہے تو انسان نفس کی حکومت سے چھوٹ کر خدا کے حکم کے ماتحت ہوجاتا ہے۔ قلب میں اخلاص آجاتا ہے اور غیر اللہ کا ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔ نفسانیت اور خلوص میں تمیز پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ جہاں اخلاص سے ذرا قدم ہٹا اور اس کو احساس ہوجاتا ہے ــــ جیسا کہ نصاب الاحتساب میں ہے کہ

ابوبکر شبلیؒ نے ایک کشتی دیکھی جو شراب کے مٹکوں سے بھری ہوئی خلیفہ کے لئے مصر سے آرہی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو کشتی میں ڈالدیا اور ان مٹکوں کو ایک ایک کرکے توڑنا شروع کیا یہانتک کہ سب کو توڑ کر بہا دیا۔ صرف ایک مٹکا رہ گیا کشتی والے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے حضرت کے رعب و ہیبت سے دم بخود تھے

ان دنوں خلیفہ معتصم باللہ تھا۔
لوگ شیخ کو اس کے پاس لے گئے۔ اس نے حضرت شبلیؒ سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ خلیفہ کی تائید فرمائے) اگر میں جانتا کہ آپ کے پیٹ میں شراب ہے تو میں اسی نیزہ سے اسے بھی پھوڑ دیتا۔ یہ سن کر معتصم نے کہا کہ اچھا بس آپکا ارادہ مجھے معلوم ہو گیا آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ میں غصہ میں آکر آپ کو قتل کرادوں تاکہ آپ شہادت کا مرتبہ پا جائیں تو میں آپ کے اس قصد کو کبھی پورا نہ کرونگا۔ اس کے بعد اس نے دریافت کیا کہ اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ نے اس ایک مٹکے کو کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ بھائی جب میں ان مٹکوں کو توڑ رہا تھا تو قلب کا نہایت ہی اچھا حال تھا محض حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی میرے پیش نظر تھی لیکن جب ایک مٹکا رہ گیا تو قلب کا خیال بدلا نفس کی آمیزش ہو گئی (یہ خیال ہو گیا ہوگا کہ تم کتنے بڑے بہادر ہو کہ نہی عن المنکر میں خلیفۂ وقت کو بھی کچھ نہیں سمجھتے) اس لئے اپنے نفس کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس مٹکے کو چھوڑ دیا۔
دیکھا آپ نے یہ ہوتا ہے نفس کا مارنا اور نفس پر قابو پانا۔ آدمی سراسر نفسانیت سے کام لے یہ بھی آسان ہے۔ اور شروع سے آخر تک اخلاص اختیار کئے رہے یہ بھی آسان ہے مگر اخلاص کے ساتھ کوئی کام کرے اور درمیان میں خلوص جاتا رہے تو اسکو سمجھ بھی لے اور اب اس کام کو ترک کردے یہ بہت مشکل ہے۔
مشائخ کے یہاں نفس میں بھی تمیز پیدا کرائی جاتی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر سالک کے پیش نظر صرف خدا کی رضا اور عدم رضا ہی رہ جاتی ہے۔ اور وہ جس کام کو کرتا یا چھوڑتا ہے تو خدا ہی کے لئے۔ اس حالت میں اس کا نفس یا تو مزاحم ہوتا ہی نہیں یا کچھ مزاحمت کرتا ہے تو بالآخر مغلوب ہو جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی بزرگوں کے عجیب و غریب واقعات ہیں جن کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔
نصاب الاحتساب میں ہے کہ ابو غیاث زاہد بخارہ کے قبرستان میں رہا کرتے

تھے۔ ایک دفعہ اپنے کسی دینی بھائی کی ملاقات کے لئے شہر آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ امیر وقت نصیر الدین احمد کے محل سے بہت سے غلام اور ایک جماعت گانے بجانے والوں کی نکل رہی ہے جن کے ساتھ باجا وغیرہ بھی تھا۔ امیر کے یہاں کوئی تقریب تھی اسیں شرکت کے لئے جماعت آئی تھی جشن سے فارغ ہوکر واپس جارہی تھی۔

جب ان بزرگ نے انھیں شاہی محل سے نکلتے ہوئے دیکھا تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا کہ اے نفس آج ہی تو قبرستان سے نکل کر شہر کی طرف آیا، اور آج ہی تو امتحان میں پڑگیا اور امتحان بھی بڑا سخت یعنی امیر المومنین سے تیرا مقابلہ ہے اس لئے کہ تو نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا ہے اب اگر تو خاموش رہتا ہے تو تو بھی اس میں شریک سمجھا جائے گا اور اگر زبان سے کچھ کہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ معاملہ بادشاہِ وقت کا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے سر کو آسمان کی طرف اُٹھایا۔ اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی۔ اس کے بعد اپنی لاٹھی اُٹھائی اور ایک دم سے ان پر حملہ کردیا۔ سب کے سب شکست کھاکر اور پشت پھیر کر قصر شاہی کی طرف بھاگے۔ آگے آگے تو وہ لوگ تھے اور پیچھے پیچھے یہ زاہد۔ جب بادشاہ کے سامنے پہونچے تو اس نے اُن سے پوچھا کہ تم نے بڑی جسارت کی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جو شخص سلطان پر خروج یعنی بغاوت کرتا ہے تو وہ صبح قید خانہ میں کرتا ہے۔ یہ سن کر ابوغیاث زاہد نے برجستہ جواب دیا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ جو رحمان پر خروج کرتا ہے وہ شام دوزخ میں کرتا ہے۔

پھر امیر نے ان سے پوچھا کہ اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کو محاسب کس نے بنایا ہے فرمایا کہ جس نے تجھے امیر بنایا ہے۔ کہا کہ امیر تو مجھے خلیفہ نے بنایا ہے۔ فرمایا کہ پھر مجھے محتسب رب الخلیفہ نے بنایا ہے۔ امیر نے کہا کہ بہتر ہے تو میں آپ کو واقعی سمرقند کا محتسب بناتا ہوں۔ فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اس سے معزول کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ ان بزرگ نے یہ دیکھا کہ امیر کا خیال آج میری جانب سے ایسا ہے جو عہدہ دیا جارہا ہے، کل کو ہو سکتا ہے کہ خیال بدل جائے تو قبل اسکے کہ وہ معزول کرے میں خود ہی

کیوں نہ اسکو قبول نکروں کہ عقلمندوں نے فرمایا ہے کہ " از تلون مزاجی پادشاہاں پر حذر باید بود")

امیر نے کہا کہ مجھے آپ کے حال پر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں محتسب نہیں مقرر کیے گئے وہاں تو آپ احتساب فرماتے ہیں اور جہاں مقرر کیے جاتے ہیں وہاں اس منصب کو قبول نہیں کرتے انھوں نے فرمایا کہ ہاں یہ صحیح ہے اور ایسا اس لئے ہے کہ جب تم کسی کو محتسب بنا سکتے ہو تو اس منصب سے اس کو معزول بھی کر سکتے ہو پس اس کا کیا اعتبار۔ اور جب مجھے میرا رب محتسب بنائے گا تو کسی کی مجال نہیں کہ مجھے معزول کر سکے اس کے بعد امیر نے کہا کہ اچھا مجھ سے اپنی کسی حاجت کا سوال کیجئے۔ کہا کہ بہت اچھا۔ میری جوانی لوٹا دیجئے۔ امیر نے کہا یہ تو میرے بس میں نہیں ہے کچھ اور فرمائیے کہا اچھا مالک کے نام جو خازنِ جہنم ہے ایک سفارش لکھ دو کہ مجھے جہنم میں عذاب نہ دے کہا کہ یہ بھی میرے اختیار سے باہر ہے۔ کسی اور چیز کا سوال کیجئے۔ کہا کہ اچھا پھر رضواں کے نام ہی ایک خط لکھ دو جو کہ داروغۂ جنت ہے کہ مجھے جنت میں داخل کر دے۔ کہا یہ بھی میرے اختیار کی بات نہیں ہے کہا (جب تمھارے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں تو) پھر اپنے رب ہی کے ساتھ کیوں نہ رہوں جو جملہ حوائج کا مالک ہے۔ چنانچہ میں اس سے جس حاجت کا بھی سوال کرتا ہوں وہ میری اجابت فرماتا ہے یہ سُن کر امیر نے انھیں چھوڑ دیا اور انھوں نے اپنی راہ لی۔

دیکھئے یہ بزرگ کیسے امتحان میں پڑ گئے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق تھا ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی برکت سے انھیں کامیاب کر دیا۔ مخلصین کے اس قسم کے واقعات بہت ہیں۔ یہ حضرات اپنے نفس کو چھوڑ کر حق تعالیٰ سے اپنی نسبت کو صحیح کر لیتے ہیں اس لئے ہر موقعہ پر ادھر سے ان کی نصرت کی جاتی ہے اور مخلوق کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں پھر مخلوق میں سے انسان تو انسان ہی ہے حیوانات بلکہ درندے بھی ان سے مانوس ہو جاتے ہیں چنانچہ نصاب الاحتساب میں ہے کہ ایک بزرگ نے جو تابعین میں سے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مروان ابن حکم کے آلاتِ لہو ولعب

اور سامانِ عیش وطرب کو توڑ ڈالا۔ لوگ انھیں پکڑ کر مروان کے پاس لے گئے اور ان کی شکایت کی۔ مروان کو بہت غصہ آیا۔ سزائے موت کا حکم دیا اور اس کی صورت یہ تجویز کی کہ کہا کہ ان کو شیروں کے کٹہرے میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ رات کو اس میں ڈال دیا گیا۔ جب یہ اندر پہونچے تو ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ایک شیر ان کے پاس آیا اور وہیں کھڑے ہو کر اپنی دم ہلانے لگا (یہ علامت ہوا کرتی ہے ان سب کے محبت کی) یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں جتنے شیر اس مکان میں تھے سب ان کے پاس جمع ہو گئے اور وہ سب بھی اپنی زبانوں سے ان کو چاٹنے لگے اور یہ بلا خوف وخطر اپنی نماز میں مشغول رہے۔ صبح ہوئی تو مروان نے ملازمین سے پوچھا کہ ان بزرگ کا کیا حشر ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم تو رات انھیں شیروں کے کمرہ میں ڈال آئے تھے۔ پھر اب معلوم نہیں کہ ان کا کیا حال ہے۔ مروان نے کہا کہ جا کر دیکھو کہ شیروں نے ان کو کھا لیا یا نہیں۔ لوگ آئے اور دیکھا کہ شیر تو ان سے خوب مانوس ہیں۔ کوئی ان کے پاس آ کر دم ہلا رہا ہے۔ کوئی ان کے بدن اور قدم کو چاٹ رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ان سبھوں کو بہت تعجب ہوا۔ انھیں کٹہرے سے نکالا اور خلیفہ کے سامنے پیش کیا اس نے پوچھا تمھیں شیر سے ڈر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا کہ نہیں بلکہ میں تو ساری رات ایک دوسری ہی فکر میں پڑا رہا ڈرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔ مروان نے پوچھا کہ وہ کیا فکر تھی جو آپ کو لاحق رہی۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ خیال پریشان کیے رہا کہ یہ سب شیر درندے ہیں ان کا گوشت حرام ہے جھوٹا بھی حرام ہے لعاب بھی نجس ہے اور یہ سب آ آ کر میرے کپڑوں کو چاٹ رہے ہیں مجھے ساری رات یہ فکر دامن گیر رہی کہ آیا ان کا لعاب پاک ہے یا ناپاک اور میں جو یہ نمازیں پڑھ رہا ہوں یہ صحیح بھی ہوئی ہیں یا نہیں بس اسی سوچ نے مجھے ان سے ڈرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ مروان کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا اور انھیں چھوڑ دیا۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان بزرگ کے متعلق کیا کہئے گا انھوں نے بھی کچھ پایا تھا یا نہیں۔ باقی آپ کو اس لئے نہیں ملتا اور آپ اس لئے نہیں پاتے کہ آپ

دوسری چیز پائے ہوئے ہیں اور وہ ہے آپ کا نفس۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ اس راہ میں جو کچھ کسی کو ملا کرتا ہے وہ نفس کو فنا کرنے سے ملتا ہے۔ کیوں کہ فیضِ رحمانی اور عنایتِ ربانی کے ورود کے لئے نفس اور اس کی خواہشات کو بزرگوں نے موانع میں سے شمار فرمایا ہے چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

از قوی ترین موانع نزولِ فیض رحمانی و ورود عنایات یزدانی بر سالکین راہ حق تلوثِ نفوس بہیمیہ ایشاں ست بہ رذائل اخلاق مثل بخل وحسد وکبر و حرام وغیبت وکینہ و ریا وکذب وطمع وحرص وسلف صالح تزکیہ ازین رذائل مقدم تر وہم تر میدانستند۔

یعنی فیوض رحمانی اور عنایاتِ یزدانی جو کہ سالکین راہ حق پر ہوا کرتی ہیں ان کے قوی ترین موانع میں سے ایک مانع یہ بھی ہے کہ لوگوں کے نفوس بہیمیہ رذائل اخلاق کے ساتھ متصف ہوتے ہیں۔ مثلاً بخل وحسد وکبر چنانچہ سلف صالحین ان رذائل سے تزکیہ کو اہم اور مقدم تر سمجھتے تھے۔

وآن را صرف بنا بہ رضا جوئے حق از دل خود منقلع ومنقمع میکردہ اند تا اثرے ازاں باقی نمی ماند ودلہائے ایشاں مصفی میگردید لہذا مورد عنایات بے غایت می شدند۔ وباہمی تصفیہ کہ ارضاء للہ باعلی سیال ورد ند مقبول میگشتند۔

یعنی یہ حضرات ان رذائل کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اپنے قلوب سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا ذرا بھی اثر باقی نہیں رہتا تھا اور ان کے قلوب بالکل پاک وصاف ہو جاتے تھے۔

یہی وجہ تھی جس کی بناء پر یہ حضرات بے انتہا عنایات کے مورد بنے اور اپنے اسی تصفیۂ قلب کی بدولت جسے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر اختیار کیا تھا مخلوق کے نزدیک بھی مقبول ہوئے۔

وہر کہ باوجود طے مراتب سلوک منضبط مورد آثار عنایات نشود آثار این ہمہ رذائل یا بعض آں دروے البتہ محسوس خواہد بود۔ پس وجود این رذائل مانع

ورود عنایات الٰہی است۔

یعنی اور جو شخص کہ باوجود سلوک کے منضبط مراتب طے کرنے کے عنایاتِ ربانی کے آثار کا مورد نہ بنے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان تمام رذائل کے آثار یا ان میں سے بعض اس میں بلاشبہ موجود ہیں چنانچہ انھیں رذائل کا قلب میں موجود ہونا عنایات الٰہی کے ورود سے مانع ہو رہا ہے۔

اب آپ کو بزرگوں کی کرامات اور ان کی حکایات کیسی اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ ان حضرات نے اس سے پہلے کیا کیا ہے۔ نفس سے دشمنی مول لی ہے اور خواہشات سے جنگ کی ہے اپنی عادات کو ترک کیا ہے تب اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو خرق عادات سے نوازا ہے۔ یہ ہے نفس اور اس کا نام ہے مجاہدہ نفس۔ خواجہ صاحب رح اسی کو فرماتے ہیں کہ ؎

مَے یہ ملی نہیں ہے یوں قلب و جگر ہوئے ہیں خون

کیوں میں کسی کو مفت دوں مے مری مفت کی نہیں

اور اسی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نفس کی خواہشات کو جبتک بندہ میری شریعت کے تابع نہ کرے گا وہ مومن ہی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث آئی ہے جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات اور اس کا میلان نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائے۔

اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے حضرت ملا علی قاری رح مرقات میں لکھتے ہیں کہ "ہوسکتا ہے کہ یہاں حدیث میں اصل ایمان ہی کی نفی مراد ہو اور مطلب یہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خوشی خوشی اعتقاد کے ساتھ احکام شرعیہ کا اتباع نہ کرے۔ جبراً اور تلوار کے خوف سے اتباع کرنے کا اعتبار نہیں جیسا کہ منافقین کا طریقہ تھا۔

Scanned with CamScanner

...... اور ایک قول یہ ہے کہ مراد کمال کی نفی ہو یعنی تم میں سے کسی کا ایمان کامل نہیں ہوگا یہاں تک کہ اسکا میل نفس اور اسکی خواہشات شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔ مطلب یہ کہ اگر احکام شرعیہ نفس کے موافق بھی ہوں تو اسکا ان پر عمل کرنا اس جہت سے ہو کہ یہ خدا کا حکم ہے نہ اس حیثیت سے کہ میرے نفس کی خواہش ہے اور اگر احکام نفس کے خلاف ہوں تو نفس کو اپنی خواہشات پر عمل نہ کرنے دے۔ ایسا کرے گا تو مومن کامل ہو جائیگا۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب مرقات کی شرح کا حاصل یہ ہے کہ حدیث کے دو محمل ہیں ایک صورت میں اس امر کا اعتقاد ہی نہیں ہوتا کہ یہ حکم حق تعالیٰ کا بھیجا ہوا اور رسول کا لایا ہوا ہے۔ پس ان احکام کو ترک کرنے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ انکا منکر ہی ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایمان کہاں اسلئے لا یومن فرمانا اپنی حقیقت پر ہے۔

اور دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی کا اعتقاد اللہ و رسول پر ہو اور وہ یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ خدائی احکام ہیں مگر عمل میں اس سے کوتاہی ہو رہی ہے یعنی اس بات کے ظاہری یا باطنی آداب و شروط کا لحاظ نہیں کیا تو ایسا شخص مومن تو ہوگا مگر اسکا ایمان ناقص ہوگا کامل الایمان نہ ہوگا۔ پہلی صورت اعتقاد سے متعلق ہوئی اور دوسری عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ ایک چیز ہے شریعت اور دوسری چیز اسکے بالمقابل ہے ہوائے نفس اور ان دونوں میں بالکل تضاد ہے۔ جو شخص نفس کا بندہ ہے وہ شریعت کا مطیع اور اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہوسکتا اور جو شخص شریعت کا مطیع ہو وہ شخص نفس کا بندہ کبھی نہیں بن سکتا۔

ہر زمانہ میں قبول حق کا سب سے بڑا مانع انسان کا نفس اور اسکی خواہشات ہوتی ہیں انبیاء کی دعوت کی حقانیت کو کبھی معاندین کا دل بھی قبول کر لیتا ہے مگر اسکی خواہش نفس مزاحم بنکر قبول حق سے انھیں روک دیتی ہے۔ اسی لئے کتاب و سنت میں ہوائے نفس کو ترک کرنے اور اسکے مکائد سے بچنے کی بہت تاکید فرمائی ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (جاثیہ)

سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت کو بھی دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ جو جی میں آتا ہے علماً و عملاً اُسی کا اتباع کرتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اسکو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے اور اسکے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے سوایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے۔

دیکھئے اس آیت میں تصریح ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو اپنا خدا بنا لیتا ہے اور پھر خدا کے حکم پر چلنے کے بجائے اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی ہدایت نہیں فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خدا کے اوامر ونواہی کے مقابلہ میں اپنے نفس کے اوامر ونواہی پر عمل کرتا ہے وہ گویا نفس ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور اپنی زندگی میں اسکو وہی مرتبہ دیتا ہے جو خدا تعالیٰ کا ہونا چاہیئے۔ اسطرح وہ عملاً و اختیاراً عبداللہ کے بجائے عبدالنفس اور عبدالہوی بنجاتا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

(النازعات)

یعنی جس شخص نے حق سے سرکشی کی ہوگی اور آخرت کا منکر ہو کر دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ اسکا ٹھکانا ہوگا۔ اور جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا (یعنی اعتقاد کے ساتھ ساتھ عمل بھی اسکا صالح ہوگا سو جنت اسکا ٹھکانا ہوگا)۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ آخرت کی سعادت یعنی دخول جنت اور وہاں کی شقاوت یعنی دخول نار ان دونوں ہی کا مدار اسی نفس پر ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ۔

یعنی اس شخص سے بڑھکر گمراہ کون ہوگا جو اپنی ہی خواہشات کا اتباع کرے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ہدیٰ کا مقابل اور اسکی ضد یہی ہوئی ہے۔ اسی کو شریعت کے موافق بنانا اور مارنا اور اللہ اور اسکے رسول کے احکام کے سامنے رام کرنا ہی انسان کا

Scanned with CamScanner

اصل کمال ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس)

یعنی اور قسم ہے انسان کے جان کی اور اس ذات کی جس نے اسکو درست بنایا پھر اسکی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اسکو القا کیا۔ یقیناً مراد کو پہونچا وہ جس نے اسکو پاک کرلیا۔ اور نامراد رہا وہ جس نے اسکو فجور میں دبا دیا۔

اسی طرح سے ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص رکوع ۲)

یعنی اے داؤد ہم نے تمکو زمین کا حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تمکو بھٹکا دیگی۔

اسمیں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک امر فرمایا فاحکم اور ایک نہی فرمائی ولا تتبع الھوی اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا ہے اسلئے اسکی رُو سے اس امت کے لیے بھی شریعت کا اتباع واجب اور اتباع نفس حرام ٹھہرا چنانچہ ایک دوسری جگہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (جاثیہ)

یعنی ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا تو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے اور جہلار کی خواہشوں پر نہ چلئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والی جو چیز ہے وہ یہی ہوئی ہے۔ اسی کی وجہ سے آدمی کتاب اللہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ سنت رسول اللہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ علماء اور مشائخ کا اتباع ترک کردیتا ہے اور اسکے اتباع کے بعد پھر وہ جو کچھ بھی نہ کرگذرے وہ کم ہے۔ غرض نفس اور اسکی سرکشیوں کے تذکرے سے تو قرآن شریف بھرا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو میں نے شروع میں بیان کیا وہ کتاب اللہ ہی کی شرح ہے۔

انھیں نصوص کے پیش نظر صوفیائے کرام نے بھی نفس کی اہمیت محسوس فرما کر اسی کو اپنے فن کا موضوع قرار دیا اور علمائے امت نے تو یہ فرمادیا کہ شریعت کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو اسکی خواہشات نفس سے نکالا جائے ۔ چنانچہ علامہ شاطبیؒ (جو کہ مسلک مالکیہ کے ایک جلیل القدر عالم ہیں انھوں نے اصول فقہ پر "الموافقات" جیسی عظیم الشان کتاب لکھی اور حکمت شریعت پر "الاعتصام" جیسی کتاب تصنیف کی انکی یہ دونوں کتابیں اہل علم کے نزدیک مقبول ہوئیں) وہ اپنی کتاب "الاعتصام" میں فرماتے ہیں

اِنَّ الشَّرِیْعَۃَ مَوْضُوْعَۃٌ لِاِخْرَاجِ الْمُکَلَّفِ عَنْ دَاعِیَۃِ ھَوَاہُ حَتّٰی یَکُوْنَ عَبْدُ اللّٰہِ (الاعتصام ج ۱ ص ۳۴)

یعنی سن لو کہ یہ شریعت بنی ہی اسلئے ہے کہ ہر مکلف کو اسکی ہوٰی کے تقاضے اور خواہش نفس سے نکالے تاکہ وہ خدا کا بندہ بنجائے ۔

اسی طرح سے 'موافقات' میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

قصد الشارع من وضع الشرائع اخراج النفوس عن اھوائھا وعوائدھا (الموافقات ص ۳۳۶)

یعنی شارع کا مقصود شریعت کے وضع فرمانے سے دراصل نفوس کو ان کی خواہشات اور عادات سے نکالنا ہے ۔

اسی طرح سے دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ

نَعَمْ وُضِعَ الشَّرِیْعَۃُ عَلٰی اَنْ تَکُوْنَ اَھْوَاءُ النُّفُوْسِ تَابِعَۃً لِمَقْصُوْدِ الشَّارِعِ فِیْھَا

یعنی شریعت بھیجی ہی اس لیے گئی ہے کہ اہوائے نفس مقاصد شرع میں شارع کے مقصود کے تابع ہو کر رہیں ۔

دیکھئے یہاں اخراج کا لفظ استعمال فرمایا ہے شاید اس سے اشارہ اس طرف کرنا مقصود ہو کہ انسان طبعی طور پر ہوٰی میں جکڑا رہتا ہے اور اسکی خواہشات اس سے چھوٹنا نہیں چاہتیں مگر وہ جب احکام شرع پر عمل کرتا ہے تو ہوٰی اس سے اس طریقہ سے جدا ہوتی ہے جیسے کسی چیز کو بجبر دھکا دیکر نکالدیا جائے جس کا حاصل یہ ہوا کہ شریعت میں اور ہوٰی میں مقابلہ سا رہتا ہے اور انسان کو اس سے نکلنے کے لئے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے تب جاکر کہیں اس سے ایک ذیلہ

Scanned with CamScanner

نفسانی دور ہوتا ہے۔

علامہ شاطبی نے "اعتصام" میں تو کم لیکن "الموافقات" میں اس پر مفصل گفتگو فرمائی ہے اور بہت اچھا کلام کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

اَلْمَقْصِدُ الشَّرْعِیُّ مِنْ وَضْعِ الشَّرِیْعَةِ اِخْرَاجُ الْمُکَلَّفِ عَنْ دَاعِیَةِ هَوَاهُ حَتّٰی یَکُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ اِخْتِیَارًا کَمَا هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ اِضْطِرَارًا۔

(الموافقات ص ۱۶۸/۲)

یعنی شریعت کا مقصد احکام شرعیہ مقرر کرنے سے مکلف کو اسکی ہوی کے داعیہ اور تقاضہ سے نکالنا ہے تاکہ وہ جواب تک اضطراری طور پر یعنی تکوینی اور قصری اور جبری اور قہری طور پر عبداللہ یعنی (خدا کا بندہ) تھا تو اب ان احکام پر عمل کرکے وہ اختیاری اور تشریعی طور پر بھی خدا کا بندہ ہو جائے۔ یعنی خدا کی بندگی طوعاً اور رغبتاً اختیار کرے نہ صرف اضطراری اور جبری طور پر۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا یہ علامہ شاطبی بڑے شخص ہیں۔ علماء نے انکی تصانیف کو تلقی بالقبول کیا ہے۔ یہ فرما رہے ہیں کہ ہوائے نفسانی کا اتباع کرنا جملہ بدعات کی اصل ہے اور اسکے بالمقابل اپنی ہوئی اور خواہشات کو ترک کرکے نصوص کو اختیار کرنا یہ سنت ہے۔ اس میں علامہ شاطبی نے یہ جو فرمایا کہ حَتّٰی یَکُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ اِخْتِیَارًا تو اسکا مطلب یہ ہے۔

اَیْ طَوْعًا وَّ رَغْبَتًا وَّ تَشْرِیْعًا وَ فَانِیًا عَنْ هَوَاهُ وَ فَانِیًا عَنْ سُوْءِ اِخْتِیَارِ نَفْسِهٖ وَبَاقِیًا بِاَمْرِ رَبِّهٖ وَنَهْیِهٖ وَبَاقِیًا بِشَرِیْعَتِهٖ وَبِحُسْنِ اِخْتِیَارِهٖ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا تکوینی و قصری اور جبری و قہری بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اب شریعت پر عمل کرکے اپنے طوع و اختیار اور رغبت سے اپنے کو اسکی بندگی میں داخل کرلے اور اسکی صورت یہ ہے کہ اپنی خواہشات سے فانی ہو جائے اور اپنے نفس کے سوء اختیار سے فانی ہو جائے اور اپنے رب کے اوامر اور نواہی کے ساتھ باقی ہو جائے، اسکی شریعت کے ساتھ باقی ہو جائے۔

مطلب یہ کہ کوئی شخص اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نہیں ہے۔ ہر فعل اسکا اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ کے تحت ہی واقع ہوتا ہے چنانچہ امور تکوینیہ میں تو انسان اللہ تعالیٰ

Scanned with CamScanner

کے حکم کے امتثال پر مجبور بھی ہے یعنی وہ اگر بیمار ڈالدیں تو بیمار ہونا پڑیگا، روزی تنگ کردیں تو فاقہ کرنا ہوگا۔ ان تمام امور میں تو ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی ہی پڑتی ہے گو کافر ہی کیوں نہ ہو مگر شریعت اسلئے آئی ہے کہ جن امور میں اسکو نیک و بد، بھلے برُے، جائز و ناجائز، حلال و حرام غرض دونوں پہلوؤں پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہو تو وہاں شریعت ہی کی بتائی ہوئی باتوں پر چلے اور نفس کے تقاضہ کو ترک کرے تاکہ اختیاری طور پر بھی وہ اپنے آپ کو خدا کی اطاعت اور بندگی کے لئے پیش کرکے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق اختیاراً بھی عبد اللہ یعنی خدا کا بندہ ہو جائے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کا جو نظام انسان کو دیا گیا ہے یعنی شریعت، انسان اسکا اتباع کرے اور اپنے نفس کا اتباع نہ کرے۔ اسلئے کہ اگر اپنے نفس کا اتباع کریگا تو مُہان اور ذلیل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت سے دور ہو جائیگا اور اگرچہ وہ عبد اللہ اب بھی ہے مگر اسکی یہ بندگی اضطراری اور تکوینی ہے، قہری ہے اور جبری اور قہری ہے۔ یہ معتبر نہیں۔ہاں اگر شریعت کا اتباع کریگا تو معزز اور مقبول ہوگا۔ اللہ و رسول کی رضا اسے حاصل ہوگی اور اسوقت میں طوعاً و رغبتاً اور اختیاراً اور تشریعاً عبد اللہ یعنی خدا کا بندہ ہوگا اور شریعت میں یہی مطلوب و مقصود ہے۔

نفس اور شریعت کے متعلق علماء ظاہر نے جو کچھ فرمایا اسے آپ نے سنا اب صوفیہ اور علماء باطن اسکے متعلق کیا فرماتے ہیں، سنیئے

ملا علی قاری نے حدیث مذکور کے تحت بعض عارفین کا قول نقل کیا ہے۔ اچھی بات فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص مومن نہ ہوگا جب تک کہ اسکی ہویٰ شریعت کے تابع نہ ہو جائے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکی وہ ہویٰ جو اسکی جملہ صفاتِ نفسانیہ یعنی رذائل کی اصل ہے بلکہ ایک معبود باطل ہے اور اسکا مطاع و محبوب ہے۔ جب تک وہ ہویٰ میری لائی ہوئی روشن سنت اور صاف ستھری واضح ملت کے تابع نہ ہو جائے (وہ شخص مومن نہ ہوگا) اور اسکی علامت یہ ہے کہ اسکے ہموم مختلفہ اور خواطر متفرقہ جو ہوائے نفس اور میلان طبع سے ناشی ہوتے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی ہم اور ایک ہی فکر بن جائیں اور وہ فکر وہ ہے جو حق تعالیٰ کے امر سے متعلق ہو اور اسکی شریعت کے اتباع سے متعلق ہو۔ جس کا مقصود ایک جانب تو حق تعالیٰ کی تعظیم ہو اور دوسری جانب اسکی مخلوق پر مہربانی، جیسا کہ کسی نے

کہا ہے ؎

كَانَتْ لِقَلْبِيَ أَهْوَاءٌ مُفَرَّقَةٌ فَاسْتَجْمَعَتْ إِذْ رَأَتْكَ الْعَيْنُ أَهْوَائِي

وَصَارَ يَحْسُدُنِي مَنْ كُنْتُ أَحْسُدُهُ وَصِرْتُ مَوْلَى الْوَرَى إِذْ صِرْتَ مَوْلَائِي

تَرَكْتُ لِلْخَلْقِ دُنْيَاهُمْ وَدِينَهُمْ شُغْلاً بِحُبِّكَ يَا دِينِي وَدُنْيَائِي

(ترجمہ) میرے قلب کے لئے بہت سی متفرق خواہشات تھیں لیکن وہ سب کی سب سمٹ کر ایک خواہش ہوگئیں جبکہ آپ کو میری آنکھوں نے دیکھا اور اپنا محبوب بنا لیا۔ پھر مجھ پر حسد کرنے لگا وہ شخص جس پر کبھی میں حسد کیا کرتا تھا اسلئے کہ میں مخلوق کا منظور نظر ہوگیا جبکہ آپ میرے مطلوب و محبوب ہو گئے میں نے مخلوق کے لئے انکی دنیا اور انکے دین کو چھوڑ دیا اور قبلہ مقصود آپ کو بنا کر آپ ہی کی محبت میں مشغول ہوگیا اور یہ سمجھ لیا کہ بس اب آپ ہی میرے دین ہیں اور آپ ہی میری دنیا ہیں۔

پس جب اس شخص کے ہموم مختلفہ ہم واحد ہوگئے اور وہ ہم ہے امتثال امر رب اور اتباع شریعت۔ تو پھر اب ایسا شخص دین سے پھرتا نہیں مگر دین ہی کے حکم سے اور مرتا نہیں مگر شریعت ہی کے امر فرمانے سے۔ پس یہ شخص ہے جو مومن کامل ہے اور فرید وحید ہے جسکی توحید عند اللہ مقبول ہے اور جو شخص اس سے اعراض کرے اور اپنی ہوئی کا اتباع کرے، نفس اور نفس کی رضا کا طالب ہو تو وہ کافر ہے۔ یعنی دین و دنیا میں خاسر ہے۔ اور جو شخص اصول شریعت کا تو اتباع کرے اور اسکی فروع کا تارک ہو تو یہ شخص فاسق ہے اور جو اسکے برعکس کرے یعنی فروع پر تو عامل ہو اور اسکے اصول ہی کا منکر ہو تو وہ منافق ہے۔ بہر حال جبکہ انسان کی یہی ہوئی ہدیٰ کے موافق ہو جائے تو یہ ایسا ہے جیسے شہد اور مکھن مل جائے اور نور سے نور مل جائے اور سرور کے قرین سرور ہو جائے۔

یہاں صاحب مرقات نے ایک اشکال اور اسکا جواب بھی نقل کیا ہے۔ اس کا بیان کر دینا بھی افادہ سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ

اگر تم یہ کہو کہ رسول علیہ السلام جو شریعت اللہ تعالیٰ کے یہاں سے لائے ہیں وہ تو سراپا نور اور ضیاء ہے اور ہوائے نفس باطنی ظلمت کا نام ہے جو طبیعت ترابیہ (یعنی بشریت) سے ناشی ہے پس ہوائے ظلمانی دین نورانی کے تابع کیونکر ہو سکتی ہے (حالانکہ اس حدیث میں اسی کا مطالبہ ہے) جواب اسکا یہ ہے کہ نفس جسم کے اندر ایک لطیفہ کا نام ہے جو روح اور بدن کے امتزاج اور اتصال سے پیدا ہوتا ہے انہیں سے روح تو لطیف اور روحانی ہے اور جسم کثیف اور ظلمانی ہے اور نفس ان دونوں کے بین بین ہے یعنی لطافت روحانیہ کو بھی قبول کرتا ہے اور کثافت جسمانیہ کو بھی چنانچہ

یہی نفس کا وہ تسویہ (یعنی بنانا اور درست کرنا) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا یعنی قسم ہے نفس کی اور اسکے درست کرنے کی۔ یعنی اسطرح سے درست کرنا کہ روح حیوانی ظلمانی میں روح روحانی کو اس طرح قائم کیا جس طرح روشنی آنکھوں کی پتلی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی تسویہ اور درستی کی بنا پر نفس خیر اور شر فجور اور تقویٰ دونوں کا قبول کرنیوالا ہوگیا۔ چنانچہ جب امور تقویٰ کا اس پر غلبہ ہوتا ہے تو یہ گندگیوں سے پاک صاف ہو کر دین کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے اور یقین کو قبول کرلیتا ہے اور جب امور فجور کا اس پر غلبہ ہوتا ہے تو پھر یہی نفس اپنی خواہشات کا بندہ ہوجاتا ہے اور انسان کو ہلاکت کی راہ لیجاتا ہے۔ اسی کو ایک عربی شاعر نے بطور لطیفہ کے یوں کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

نُوْنُ الْهَوَانِ مِنَ الْهَوٰى مَسْرُوْقَةٌ فَصَرِيْعُ كُلِّ هَوًى صَرِيْعُ هَوَانٍ

(یعنی ہوان اور ہویٰ یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں چنانچہ حروف بھی دونوں کے یکساں ہی ہیں صرف ہوان میں ایک نون زائد ہے تو اسکو یوں سمجھو کہ یہ ہویٰ سے چرایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہویٰ کا مارا ذلت کا مارا ہوتا ہے)۔

مطلب یہ کہ جو شخص مبتلائے ہویٰ ہوتا ہے اسکے لئے دارین میں ہوان اور ذلت لازم ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ انسان کو گمراہ کرنے والی چیز یہی ہویٰ ہے۔ اعمال وغیرہ کی اصلاح تو بہت جلد ہوجاتی ہے۔ دقت جو ہوتی وہ اسی کی اصلاح میں ہوتی ہے۔ انسان جب اسکو سمجھ لیتا ہے اور اپنے نفس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر اسکی اصلاح آسان ہوجاتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تک انسان کی ہویٰ میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائے اسوقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا۔ اسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہویٰ ہی کو خاص طور پر ذکر فرمایا ہے اس لئے کہ اسی کے تابع ہونے نہ ہونے پر انسان کی سعادت وشقاوت موقوف ہے۔

صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ

"اِعْلَمْ اَنَّ مُخَالَفَةَ النَّفْسِ رَأْسُ الْعِبَادَةِ" (تم جان لو کہ نفس کی مخالفت کرنا جملہ عبادات سے بڑھکر ہے۔ بلکہ عبادت کی اصل ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ

"عبادت کی کنجی فکر ہے۔ اور انسان کے مصیب ہونے کی علامت یہ ہے کہ نفس اور ہویٰ کی مخالفت کرے اور دونوں کی مخالفت یہ ہے کہ انکی خواہشات کی مخالفت کیجائے"۔

Scanned with CamScanner

مولانا روم نے بھی مثنوی میں جگہ جگہ اس پر گفتگو فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ہوائے نفس سے تحذیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؂

با ہوی و آرزو کم باش دوست　　چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

یعنی ہوائے نفس اور اپنی آرزو اور خوش آیند خیالات سے دوستی ہرگز نہ کرنا اسلئے کہ یہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بھٹکا دینگے۔

اسی طرح سے ایک اور مقام پر ہویٰ سے تخویف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؂

تازہ کن ایماں نہ از قول زباں　　اے ہوی را تازہ کردہ در نہاں

تا ہوا تازہ ست ایماں تازہ نیست　　کایں ہوی جز قفل ایں دروازہ نیست

یعنی ایمان کو صدق دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں۔ تم نے تو باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے۔ سو جب تک ہویٰ تازہ ہے ایمان نہیں تازہ ہو سکتا (جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ) کیونکہ یہ ہوائے نفسانی اس دروازہ (علوم و حقائق) کا قفل ہے جسکی وجہ سے حقائق منکشف نہیں ہو سکتے۔

کردہ تاویل لفظ بکر را　　خویش را تاویل کن نے ذکر را

فکر تو تاویل کردہ ذکر را　　ذکر را مان و بگرداں فکر را

بر ہوی تاویل قرآن می کنی　　پست و کژ شد از تو معنی سنی

یعنی تم قرآن و حدیث کے صحیح اور محفوظ الفاظ میں تاویلیں کرتے ہو۔ تم کو چاہئے کہ اپنی تاویل کرو یعنی اپنے اندر تغیر پیدا کرو۔ الفاظ قرآن کی تاویل مت کرو یعنی انکو انکے اصلی معنی سے مت بدلو۔ تمھاری قوتِ فکریہ نے لفظ قرآنی کی تاویل کر رکھی ہے۔ تمکو چاہیئے کہ قرآن کو تو اس کی اصلی حقیقت پر رہنے دو اور اپنی قوت فکریہ کو بدلو کہ اسکا فساد مبدل بصحت ہو۔ تم محض ہوائے نفسانی پر قرآن کی تاویل کرتے ہو جسکی بدولت قرآن کے روشن اور صاف معنی بھی کج اور متغیر ہوگئے۔

دیکھئے مولانا رومؒ نے ہویٰ کی کیسی مذمت فرمائی ہے اور یہاں امت کو اس سے کسطرح ڈرا رہے ہیں۔ اسی طرح سے ہر زمانہ میں مشائخ نے لوگوں کو اس سے بچایا اور نکالا ہے لیکن چونکہ اہل نفس ہوائے نفس کی ایسی اتباع کرتے ہیں جیسی اہل حق نصوص کی کیا کرتے ہیں اس لئے اسکا چھوڑنا انکے لئے آسان نہیں ہوتا۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ اسکا اتباع ہے نہایت ہی مذموم شے اور اسکی مذمت کے لئے یہ کافی ہے کہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے کو

خدا پرست کہا جاتا ہے اسی طرح سے جو شخص احکام خداوندی کی پابندی نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو اسکو نفس پرست اور ہوئی پرست کہا جاتا ہے۔

اس مضمون کو حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے مکتوبات میں اسطرح بیان فرمایا ہے۔

"باید دانست کہ صورت ایمان چنانچہ موقوف است بر نفی آلہہ آفاقی کہ اصنام و سائر معبودات کفرہ است۔ حقیقت ایمان موقوف است بر نفی آلہۂ انفسی کہ عبارت از ہوائے نفسانی است و گرفتاری است بما دون حق جل وعلا وآیت کریمہ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ شاہد این معنی است و بزرگاں گفتہ اند ہرچہ مقصود تست معبود تست"۔

فرماتے ہیں، جاننا چاہیئے کہ جسطرح صورت ایمان موقوف ہے الٰہ آفاقی یعنی کافروں کے بت اور دوسرے معبودات کی نفی پر۔ اسی طرح حقیقت ایمان موقوف ہے الٰہ انفسی کی نفی پر یعنی اپنے کو ہوائے نفسانی سے اور غیر اللہ کے ساتھ قلب کے تعلق سے بچانے پر (کیونکہ ہوئی بھی بمنزلہ الٰہ کے ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہشات نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ اس آیت میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ یہیں سے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "جو تمہارا مقصود ہے وہی تمہارا معبود ہے"۔

اسی طرح سے شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ

فَالْعِبَادَةُ كُلُّ الْعِبَادَةِ فِي مُخَالَفَةِ نَفْسِكَ وَهَوَاكَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالَ لِدَاوُدَ اُهْجُرْ هَوَاكَ فَاِنَّهَا لَا مُنَازِعَ يُنَازِعُنِيْ فِيْ مُلْكِيْ غَيْرُ الْهَوٰى وَالْحِكَايَةُ الْمَشْهُوْرَةُ عَنْ اَبِيْ يَزِيْدَ الْبُسْطَامِيْ لَمَّا رَاَى رَبَّ الْعِزَّةِ فِي الْمَنَامِ فَقَالَ لَهُ كَيْفَ الطَّرِيْقُ اِلَيْكَ قَالَ اُتْرُكْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ فَقَالَ فَانْسَلَخْتُ مِنْ نَفْسِيْ كَمَا تَنْسَلِخُ الْحَيَّةُ مِنْ جِلْدِهَا۔ (فتوح الغیب ص ۶۵)

پس عبدیت اور پوری عبدیت اپنے نفس اور اپنی ہوئی کی مخالفت میں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا کہ دیکھو ہوئی کا اتباع نہ کرنے لگنا ورنہ وہ تم کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے بھٹکا دیگی۔ اسکے علاوہ حدیث قدسی میں حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا اپنی ہوئی کو چھوڑ دو کیونکہ میری سلطنت میں میرا کوئی حریف اور مقابل نہیں ہے جو مجھ سے منازعت کر سکے بجز اس ہوائے نفس کے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کی حکایت مشہور ہے کہ انھوں نے

خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا پوچھا کہ آپ تک پہونچنے کا راستہ کونسا ہے فرمایا کہ اپنے نفس کو چھوڑ دو
اور میرے پاس چلے آؤ۔ حضرت بسطامی فرماتے ہیں کہ پھر اسکے بعد تو میں اپنے نفس سے اسطرح
سے نکل گیا جیسے سانپ اپنی کینچل سے نکل جاتا ہے۔

دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ کے طالبین کیسے کیسے ہوئے ہیں۔ جب یہ سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ سے
تعلق کا مانع یہی نفس ہے تو پھر اسکو اسطرح سے چھوڑ دیا جیسے سانپ اپنی کینچل کو چھوڑ دیتا ہے۔
اور اسمیں شک نہیں کہ یہ ان حضرات کے خلوص اور للٰہیت ہی کا ثمرہ ہے کہ نفس جیسے شاطر اور سرکش
دشمن کو یہ لوگ رام کر لیتے ہیں ورنہ تو یہ نفس انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اسے گمراہ کر کے
رہتا ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے ڈرایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ
اِنَّ اَعْدَی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ یعنی تمہارا سب سے بڑا دشمن
وہ نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

نیز آپ نے اسی نفس کی خواہشات کے شریعت کے ماتحت ہونے کو ایمان کی علامت قرار
دیا ہے۔ چنانچہ یہ فرمایا کہ

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ

مگر یہ سمجھئے کہ اس نفس سے نکلنا اور اسکا چھوڑنا چونکہ محض حق تعالیٰ کے فضل پر موقوف تھا
اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان عبدیت کے تقاضے سے نیز امت کی تعلیم کے لئے
اللہ تعالیٰ سے مختلف عنوان سے دعائیں مانگی ہیں چنانچہ اپنی ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ تَوَکَّلَ عَلَیْكَ فَكَفَیْتَهٗ وَ اسْتَهْدَاكَ
فَهَدَیْتَهٗ وَ اسْتَنْصَرَكَ فَنَصَرْتَهٗ یعنی یا اللہ کر دے مجھے ان لوگوں میں سے کہ انھوں
نے توکل کیا تجھ پر پس تو کافی ہو گیا انھیں اور ہدایت مانگی تجھ سے پس تو نے ہدایت کر دی انھیں
اور انھوں نے مدد چاہی تجھ سے پس تو نے مدد دی انھیں۔

اسکے بعد فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَكَ وَ ذِکْرَكَ وَاجْعَلْ هِمَّتِیْ
وَهَوَایَ فِیْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔ یعنی اے اللہ کر دے میرے دل کے خیالات کو اپنا خوف
اور اپنی یاد اور کر دے میری ہمت اور توجہ کو اور میری خواہشات کو اپنی مرضیات۔ اور

اپنی محبوبات ہیں۔ یعنی میری خواہشات کو اپنی مرضیات کے تابع بنا دیجئے۔
دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا فرمائی کہ وہ ہوائے نفس کو اپنی مرضیات کے تابع فرما دیں۔
اسی طرح ایک دوسری دعا میں فرماتے ہیں کہ

اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوَاھَا وَ زَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَ مَوْلَاھَا۔ یعنی اے اللہ میرے نفس کو اسکا تقویٰ اور پرہیزگاری عطا فرما اور پاک کر دے تو اسے (بیشک) تو ہی سب سے بہتر اُسے پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اسکا مالک ہے اور اسکا آقا ہے۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفس کا تقویٰ اور اسکا تزکیہ اللہ تعالیٰ ہی سے طلب فرما رہے ہیں۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ جنھوں نے نفس کو پیدا کیا ہے اور اسکی خواہشات کو پیدا کیا ہے جسطرح انسان کو مال دیدیتے ہیں یا اور طرح طرح کے انعامات عطا فرماتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے اگر کسی کو نفس کا تقویٰ عطا فرما دیں تو یہ انکے لئے کیا مشکل ہے اور جب کسی کو نفس کا تقویٰ مل گیا یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ اسکی ہویٰ شریعت کے تابع ہو گئی تو آپ اس ہویٰ کو مذموم نہیں کہینگے بلکہ یہ محمود ہے۔ اور اللہ و رسول کی عین مرضی ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان دعاؤں کے ذریعہ امت کو یہ تعلیم فرمائی کہ نفس اور اسکی خواہشات سے بچنا بجز اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے آسان نہیں ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کا قول اسکے متعلق نقل فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ۝ یعنی آپ نے یہ فرمایا کہ یہ اہتمام (میں نے) اسلئے کیا کہ اسکو (یعنی عزیز مصر کو) یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ میں نے انکی عدم موجودگی میں اسکی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتے۔

اسکے بعد فرماتے ہیں

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ باقی میں اپنے نفس کو بالذات بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس تو ہر ایک کو بُری بات بتلاتا ہے بجز اس نفس کے جس پر میرا رب رحم کرے، بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے

دیکھا آپ نے حضرات انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے نفس کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے اور نفس سے کتنا ڈرتے تھے اور کس طرح برابر اللہ تعالیٰ سے اسکے شر سے پناہ مانگتے رہتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ آدمی اسکو اپنی قوت بازو سے نہیں مار سکتا۔ اسکا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس خدا نے نفس کو پیدا کیا ہے اور اسمیں خواہشیں رکھی ہیں آدمی اپنے کو بس انہیں کے آگے گرا دے اور اپنے عجز کا اقرار کرے اور انہیں سے عرض و معروض کرے کہ میں تو عاجز و قاصر ہوں بس آپ ہی اپنے فضل و کرم سے نفس کی رعونتوں سے مجھکو نکالئے اور اس کے رذائل کو مبدل بہ فضائل کر دیجئے۔ سبحان اللہ کس قدر آسان اور سہل نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم فرمایا ہے۔ اگر اسپر عمل کیا جائے تو راستہ بالکل نزدیک اور سہل ہو جائے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ اپنے ہر خطبہ و تقریر سے قبل یہ دعا ضرور پڑھا کرتے تھے۔

... وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفوس کے شرور سے اور اپنے سوء اعمال سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس کا بھی شر ہوتا ہے اور اس سے پناہ بھی مانگنا چاہیئے۔ ایک دوسری دعا یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ قِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ۔ یا اللہ محفوظ رکھ مجھے میرے نفس کی برائی سے۔

دوسری جگہ استعاذہ کے صیغہ میں فرمایا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَشَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ

اے اللہ میں آپ کی پناہ لیتا ہوں اپنے نفس کی برائی سے اور شیطان کے شر سے اور اسکے شرک سے۔

آپ کی دعا کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ اَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ وَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔ اے زندہ رہنے والے۔ اے سبکو تھامنے والے۔ میں آپ کی رحمت کی دہائی دیتا ہوں۔ میری ہر حالت سدھار دیجئے۔ اور مجھے پلک جھپکانے بھر کے لئے بھی میرے نفس کے سپرد نہ کیجئے۔

دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے نفس کے شرور

سے کس طرح سے پناہ مانگی ہے مقصد اس سے امت کو تعلیم فرمانا ہے کہ جب معصوم ہو کر نبی اسطرح سے نفس سے پناہ مانگتے ہیں تو غیر معصوم کو اس باب میں کتنا ڈرنا چاہیئے اور کس درجہ نفس سے اور اسکی شہوات سے بچنا چاہیئے۔

نیز آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ اپنے اس دشمن سے بچنے کے لئے حضرات صوفیہ نے کیسے کیسے مجاہدات اختیار کیئے اور کس کس طرح سے اپنے کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ مشائخ کے تمام مشاغل سے مقصد اسی نفس کو پامال کرنا ہوتا ہے۔

یہاں میں آپ کو یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اسکا سب سے آسان طریقہ اتباع سنت ہے خاص کر دعا کے باب میں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ سے سوال فرمایا ہے اور جن امور سے آپؐ نے استعاذہ فرمایا ہے اگر ہم بھی آج دل سے اللہ تعالیٰ سے انھیں طلب کریں تو بہت کچھ پا جائیں۔ یعنی نفس سے چھوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے طریق پر لگ سکتے ہیں اور پھر اسکے بعد حقیقی ایمان سے متصف ہو سکتے ہیں۔ اور حصول ایمان کے بعد دین و دنیا کی ہر قسم کی فلاح و انعام کے مورد بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کی ترقیوں کا سرچشمہ ایمان ہے اور عبداللہ بن عمرؓ کی مذکورۃ الصدر حدیث سے معلوم ہوا کہ حقیقی ایمان کی تحصیل کا ذریعہ اپنے نفس و خواہش کا چھوڑنا ہے جس کا طریقہ اتباع سنت ہے۔

یوں تو اتباع سنت کا باب نہایت ہی وسیع ہے۔ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ موجود ہے۔ اور وہ سب امت کی تعلیم اور ترغیب ہی کے لئے ہے تاہم انھیں طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ اور باب دعا کا بھی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں بھی ہمارے لیئے ایک طویل و عریض باب مفتوح فرمادیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ملنے اور وصال حق کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اگر آج ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ادعیہ ہی سے اپنا تعلق جوڑلیں تو ہمارا رشتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جائے اور نسبۃ مطلوبہ جو کہ ایک مومن کی حقیقی دولت اور اصلی پونجی ہے ہاتھ لگ جائے۔ اس سلسلہ میں آپکے سامنے آپؐ کا ایک تعوذ پیش کرتا ہوں، دیکھیئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسمیں اللہ تعالیٰ سے کن کن چیزوں سے پناہ مانگی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

Scanned with CamScanner

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَاْثَمِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَشَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَشَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَمِنَ الْقَسْوَةِ وَالْغَفْلَةِ وَالْعَیْلَةِ وَالذِّلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ وَالْكُفْرِ وَالْفُسُوْقِ وَالشِّقَاقِ وَالسُّمْعَةِ وَالرِّیَاءِ وَمِنَ الصَّمَمِ وَالْبَكَمِ وَالْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَسَیِّئِ الْاَسْقَامِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَمِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْبُخْلِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ وَمِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْیَا وَمِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا یُسْتَجَابُ لَهَا۔

(مناجات مقبول ص ۱۹)

یعنی یا اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی سے اور بزدلی سے اور بڑھاپے سے اور قرض سے اور گناہ سے اور دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے اور قبر کے فتنہ سے اور قبر کے عذاب سے اور مالداری کے برے فتنہ سے اور محتاجی کے برے فتنہ سے اور مسیح دجال کے برے فتنہ سے اور زندگی اور موت کے فتنہ سے اور سخت دلی سے اور غفلت سے اور تنگ دستی سے اور ذلت سے اور خواری سے اور کفر سے اور فسق سے اور سنانے سے اور دکھانے سے اور بہرے ہونے سے اور گونگے ہونے سے اور جنون سے اور جذام سے اور بری بیماریوں سے اور قرضہ کے بار سے اور فکر سے اور غم سے اور بخل سے اور لوگوں کے دبا لینے سے اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے اور اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل سے جسمیں خشوع نہ ہو اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو مقبول نہو۔

دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی چیزوں سے پناہ مانگی ہے

حالانکہ آپ نبی تھے معصوم تھے لیکن محض امت کی تعلیم کی خاطر پناہ مانگنے والی چیزوں کی ایک فہرست ہی بیان فرمادی ایسی کہ اگر ہم لوگ چاہیں تو اتنی چیزیں ہمارے ذہن ہی میں نہ آدیں۔ اسمیں آپ نے عجز سے اور کسل سے پناہ مانگی ہے۔ عجز میں یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اعضا رہی صحیح نہیں ہوتے جسکی بنا پر وہ کسی کام کے کرنے سے قاصر ہوجاتا ہے اور کسل میں یہ ہوتا ہے کہ اعضا تو صحیح سالم ہوتے لیکن ایمان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے آدمی سستی کرتا ہے۔ اسی طرح سے آپ نے بزدلی اور بڑھاپے سے پناہ مانگی ہے اور قرض اور گناہ سے پناہ مانگی ہے۔ کیونکہ قرض سے انسان دنیا میں ذلیل ہوجاتا ہے اور گناہ کی وجہ سے آخرت میں رسوا ہوگا۔ اسی طرح آپ نے دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنے سے پناہ مانگی ہے۔ نیز قبر کے فتنے اور عذاب سے پناہ مانگی ہے۔ سنا آپ نے قبر کا بھی فتنہ ہوتا ہے اور عذاب ہوتا ہے چنانچہ قبر مردے کو دباتی ہے اور اس سے نیک لوگ بھی مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابیؓ تھے انکا انتقال ہوگیا ایسے رتبہ کے تھے کہ ان کے انتقال کیوجہ سے عرش تک ہل گیا مگر قبر نے انکو بھی دبا دیا وہ صحابی مقبول تھے مگر ضغطۂ قبر سے وہ بھی نہ بچ سکے علماء نے اسکے متعلق فرمایا ہے کہ قبر کا دبانا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو ہوتا ہے عذاب دینے کے لئے اور ایک ایسا ہوتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کو سینے سے لگا کر زور سے دباتی ہے تو اگرچہ یہ دبانا محبت کا ہوتا ہے تاہم تکلیف تو اسمیں بھی ہوتی ہے۔

میں یہ باتیں آپ کو اسلئے سنا رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ مستحضر ہوجائے کہ ایک دن یہ بھی ہونا ہے اور صرف یہ دنیا ہی نہیں ہے آخرت بھی ہے۔ اسکے لئے تیاری کرو اور یہ اسلئے سناتا ہوں کہ دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو اسکی فکر ہی نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ استعاذہ اسی لئے فرمایا تاکہ امت کو اسکا استحضار رہے کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہمارے پیش نظر رہیں تو پھر تو کام ہی بنجائے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے پناہ مانگی ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ

کا یہ عالم تھا کہ جب قبرستان سے گذرتے تھے تو بہت روتے تھے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت اور چیزوں کا ذکر ہوتا ہے تو آپ اسقدر نہیں روتے لیکن قبرستان میں پہونچکر بہت روتے ہیں۔ فرمایا بھائی یہ پہلی منزل ہے آخرت کی اگر یہ ٹھیک ہوگئی تو اگلی سب منزلوں کے ٹھیک ہونے کی امید کیجا سکتی ہے اور اگر خدا نخواستہ یہی نہ ٹھیک ہوئی تو اور منزلیں اس سے سخت ہونگی۔ اب ہم لوگ ان مضامین کو نہیں بیان کرتے اگر بیان کریں تو اب بھی لوگ اس سے اثر لیں۔

ایک عورت مجذوبہ تھی باہر سے چلاتی ہوئی پریشان حال بستی میں آئی لوگوں نے سمجھا نہیں کہ کیا بات ہے بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ قبرستان سے گذری ہے وہاں کا عذاب قبر اسکو مکشوف ہوا لوگوں سے آکر کہا کہ وہاں چلگوھار (چیخ و پکار) مچا ہوا ہے۔ ہر جمعہ کو قبر میں مردے صبح ہی سے پریشان رہتے ہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید آج حشر قائم ہوجائے اسلئے کہ قیامت جمعہ ہی کو آئے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک یہودی عورت آئی اور پوچھا کہ کیا قبر میں بھی عذاب ہوتا ہے؟ حضرت عائشہ رض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا آپ نے فرمایا کہ ہاں' اور اسکے بعد سے آپ برابر اس سے پناہ مانگتے رہے۔ میں یہ اسلئے سنا رہا ہوں کہ یہ سب چیزیں بھی ہیں انکو سنیئے تو ہوش اڑ جائیں۔

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداری اور فقر ان دونوں کے فتنوں سے بھی پناہ مانگی ہے اسلئے کہ مالداری کا بھی ایک فتنہ ہوتا ہے جس کا بیان کئی دنوں سے کر رہا ہوں۔ ایک فتنہ یہی ہے کہ مال کیوجہ سے لوگ دشمن ہوجاتے ہیں کبھی تو محض حسد کی بنا پر اور کبھی اس وجہ سے کہ اس سے کوئی ظلم وغیرہ صادر ہوجاتا ہے چنانچہ ایک جگہ کچھ لوگ ایک شخص کے دشمن ہوگئے پھر اس نے اپنی بہت حفاظت کی باہر سوتا نہیں تھا مگر ایک دن مطمئن تھا باہر سوگیا اسی دن ان لوگوں نے اسکو مار دیا یہ مال کا فتنہ ہے۔ اسی طرح ایک فتنہ مال کا یہ ہے کہ اسکی وجہ سے انسان کے اندر کبر آجاتا ہے اور وہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور جاہ اور مال کا تو یہ خاصہ ہی ہے کہ آدمی کے اندر

Scanned with CamScanner

ترفع اور بڑائی پیدا ہو جاتی ہے اسلئے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ مانگ رہے ہیں۔ مال اور جاہ حضرات صحابہؓ کو بھی ملا ہے لیکن اسکے فتنے سے وہ حضرات محفوظ تھے چنانچہ کوئی صحابی اگر امیر لشکر ہوتا اور ان سے کوئی پوچھتا کہ آپ سردار ہیں تو یہی فرماتے کہ ہاں! اگر میں خدا کی نافرمانی نہ کروں مطلب یہ ہوتا تھا کہ سرداری کیوجہ سے ماتحتوں کے کچھ حقوق انکے ذمہ عائد ہو جاتے ہیں لہٰذا سرداری اسی وقت باعث شرف وفخر ہے جبکہ سردار اللہ تعالےٰ کا فرمانبردار بھی ہو اگر فرمانبردار ہی نہ ہوا تو یہ سرداری پھر کس کام کی؟ یہ حال تھا آپ کے اسلاف کا کہ انکے پاس مال ہوتا تھا تو خدا سے ڈرتے تھے اور کوئی منصب اور مرتبہ ملتا تھا تو آخرت کی بازپرس پیش نظر ہوتی تھی۔ اب دیکھتا ہوں کہ یہ حال ہو گیا ہے کہ جس شخص کو کوئی عہدہ ملا ہوتا ہے تو اسکو یہ یقین نہیں ہوتا کہ صبح کو اس پر قائم بھی رہیگا یا نہیں ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ دیکھو کب یہ عہدہ مجھ سے سلب ہو جاتا ہے۔ حالت تو یہ ہے اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں بلکہ کسی سے کچھ معاملہ ہو جاتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ تم مجھکو نہیں جانتے کہ میں فلاں ہوں، میں تم کو سمجھ لونگا۔ میں کہتا ہوں کیا سمجھ لوگے جس چیز کے اوپر پھولتے ہو اسی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ اسی لئے دیکھ رہا ہوں کہ آج نہ کوئی چھوٹا چھوٹا رہ گیا اور نہ بڑا بڑا رہ گیا ہے۔ بلکہ میں نے پہلے اسی بات کو یوں بیان کیا تھا جسے لوگوں نے پسند بھی کیا تھا کہ اس زمانہ میں جتنے بڑے ہیں درآنحالیکہ بڑے ہیں چھوٹے ہو گئے ہیں اور جتنے چھوٹے ہیں وہ درآنحالیکہ چھوٹے ہیں بڑے ہو گئے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ معرفت کی بات کہہ رہا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ اور نہ بچا تو خدا کو اور اللہ تعالےٰ کے احکام کی خوب نافرمانی کرو وہ دنیا ہی کو دوزخ نہ بنا دیں تب کہنا۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے اللہ زندگی کے اور موت کے فتنے سے پناہ دے اور سخت دلی اور غفلت سے پناہ دے اور تنگدستی اور ذلت سے پناہ دے۔ اب لوگ ان سب چیزوں کو فتنہ سمجھتے ہی نہیں اور نہ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں سے پناہ مانگی ہے۔ چنانچہ آپ نے ذلت وخواری سے پناہ مانگی ہے اور شقاق اور خلاف سے پناہ مانگی ہے۔ ایک دوسری حدیث

Scanned with CamScanner

ہیں آتا ہے کہ اِرْحَمُوْا ثَلَاثَۃً عَزِیْزَ قَوْمٍ ذَلَّ وَغَنِیَّ قَوْمٍ اِفْتَقَرَ وَعَالِمًا یَلْعَبُ بِہِ الْجُھَّالُ
یعنی تین شخصوں پر رحم کرو کیونکہ یہ لوگ واجب الرحم ہیں ایک تو وہ شخص جو کسی قوم میں معزز رہا ہو اور پھر ذلیل ہو گیا ہو۔ دوسرے وہ شخص جو اپنی قوم میں غنی رہا ہو پھر فقیر ہو گیا ہو۔ اور تیسرا شخص وہ عالم جس کے ساتھ جہال ہنسی مذاق کرتے ہوں۔ دیکھئے آپ نے ایسے عالم کو بھی واجب الرحم فرمایا ہے جس کو جاہل کھیل تفریح بنا لیں۔ نام کا تو عالم ہے نائب رسول ہے مگر حال یہ ہے کہ عوام اسکا مسخرہ بنائے ہوئے ہیں اور اسکا مذاق اڑارہے ہیں کس قدر افسوس کی بات ہے۔

یہ عوام الناس کبھی ہم لوگوں کا کھیل بنا لیتے ہیں معرفت تو ہوتی نہیں کہ کسی کو پہچانیں کہ کون کس مرتبہ کا ہے اسی میں کبھی کسی اللہ والے کے ساتھ بھی بے ادبی کا برتاؤ کر بیٹھتے ہیں جو بہت برا ہے۔ ایک عالم تھے بزرگ تھے اقطاب وقت میں شمار ہوتے تھے مگر انکو ابتداءً لوگوں نے گاؤں سے تالیاں بجا کر نکال دیا اور لطف یہ کہ ان تالی بجانے والوں میں انکا لڑکا بھی تھا کس قدر ایذا رہوئی ہوگی مگر کچھ نہیں کہا سر جھکائے ہوئے سیدھے سے بستی چھوڑدی سمجھا ہوگا کہ یہ خدا کیجانب سے ابتلا ہے جو تمام انبیاء و اولیا کو پیش آیا ہے صبر کرو وقت بدلے گا، دوسری جگہ چلے گئے وہاں ایک خانصاحب تھے وہ حضرت کو اپنے مکان لے گئے اور عرض کیا کہ حضرت یہ کمرہ حاضر ہے آپ اسمیں قیام فرمایئے اور پھر اپنی لڑکی سے شادی بھی کردی۔ دیکھتے ہیں آپ جس وقت کہ ایک جگہ یہ تھا کہ پیچھے تالیاں بج رہی تھیں وہیں دوسری جگہ یہ بھی تھا کہ لوگ عقیدت کا ثبوت دے رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ دنیا دار الابتلا ہے یہاں مجرم اور مخلص سب باہم خلط ملط ہیں یہ تو آخرت ہی میں کہا جائے گا وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ اے مجرمو آج کے دن تم نکوکاروں سے جدا ہو جاؤ اسوقت علیٰ رؤس الاشہاد معلوم ہو جائے گا کہ کون مجرم ہے اور کون غیر مجرم ہے کون مقبول ہے اور کون مردود ہے مگر اس دنیا میں تو سب ملے جلے ہیں یہاں فاسق و متقی اور حق و ناحق میں تمیز دشوار ہے پھر بھی آثار و حالات سے لوگ معلوم کر ہی لیا کرتے ہیں۔ آخر خانصاحب نے حالات ہی سے تو جانا ہوگا کہ

بڑے شخص ہونے والے ہیں ان بزرگ کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے یہاں انکے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے کیا تو لوگ تالی بجاتے تھے اور یہ خاموش سر جھکائے چلے جارہے تھے یا ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ وائسرائے تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ڈانٹ دیتے تھے اور نکال دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ رعب عطا فرمایا تھا ان بزرگ کا ایک واقعہ سناتا ہوں ایک شخص نے کسی آریہ کی کتاب دیکھی جس کی وجہ سے اسلام میں شبہ پڑ گیا، بدعقیدہ ہو گیا، رمضان شریف کا زمانہ تھا سوچا کہ جب اسلام ہی ٹھیک نہیں ہے تو روزہ کیسا؟ یہ خیال کر کے روزہ بھی توڑ دیا۔ وسوسہ رہا ہوگا اسکی جانب التفات ہی نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اول تو یہی غلطی کی کہ غیر مذہب کی کتاب دیکھی پھر کچھ شبہ وسوسہ ہو گیا تھا تو اسکو کسی عالم محقق سے دریافت کر کے تسلی کر لیتا۔ وسوسہ کو تصدیق جانکر یہ سمجھا کہ میں مرتد ہو گیا چنانچہ روزہ بھی توڑ دیا، یہ غلطی کی مگر دن بھر پریشان رہا شام کو اپنے ایک دوست سے ملنے اسکے گھر گیا وہ افطاری کا سامان لئے بیٹھا ہی تھا کہ اسکو دیکھکر بہت خوش ہوا کہا کہ آؤ بھائی! خوب آئے آؤ آج ہمارے ساتھ افطار کرو۔ اس نے جواب دیا کہ افطار کیا کریں اگر میرے دل کا حال تم کو معلوم ہو جائے تو تم مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہ کرو۔ اسنے سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ کسی بدعقیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے نیک آدمی تھا، صاحبدل تھا معاملہ کی تہ کو پہونچ گیا اُس سے کہا کہ بیش بریں نیست کہ تم کافر ہو گئے ہو گے! تو بھائی ایمان اور کفر کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے ہماری تمہاری دوستی ہے اسلئے آؤ ہمارے ساتھ افطار میں تو شریک ہی ہو جاؤ اور دوسرا کام یہ کرو کہ کل سویرے ہی حضرت مولانا گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں جاؤ۔ بات سمجھ میں آگئی اور سمجھا ہوگا کہ یہ سچے دوست کہ میری مصیبت میں کام آیا کیونکہ میں تو اپنے ایمان کو جو ساری عمر کا ساتھی تھا اور جنت میں لیجانے والا رفیق تھا کھو چکا تھا ایسے وقت میں اس نے مجھے نہیں بھلایا چنانچہ اگلے دن صبح ہی اُن مولانا صاحبؒ کے یہاں گیا (یہ وہی مولانا صاحب تھے جنکو لوگوں نے تالی بجاکر بستی سے نکالا تھا، آج انکو اللہ تعالیٰ نے کیسی کرامت سے نوازا کہ کتنوں کو کفر سے نکال لیا) خانقاہ میں پہونچا۔ چنانچہ حضرتؒ کی نظر جیسے ہی اسپر پڑی اپنی جگہ سے

کو دکرا سکی جانب جھپٹے اور اسکے سینہ پر زور زور سے ہاتھ مار مار کر دھکے دینے لگے اور فرمانے لگے کہ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے ؟ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے ؟ یعنی اسکو کہنے اور سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ از خود اس سے دریافت کرنے لگے اب جو وہ اپنے اندر غور کرتا ہے تو شبہ کے ساتھ ساتھ اسکا جواب بھی موجود ہے اور ایسا قوی تصرف کہ جو شبہ کرے تڑ سے اسکا جواب موجود، چنانچہ اسلام کی جانب سے اسکا سینہ بالکل صاف ہو گیا اور اسکی حقانیت پر شرح صدر ہو گیا۔ پھر حضرت ہی کے ہاتھ پر اس نے توبہ کی اور بالکل صاف سینہ والا ہو گیا اور پھر تا حیات کبھی اسکے دل میں کسی مسئلہ کے متعلق وسوسہ تک نہیں پیدا ہوا۔ الحمد للہ علیٰ ذلک۔ سبحان اللہ کیسا عمدہ سینہ تھا اور کیسا نور تھا۔

یہ واقعہ میں نے اس پر سنایا کہ حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ آپ نے قسوۃ سے اور غفلت سے بھی پناہ مانگی ہے تو مراد اس غفلت سے یہی ہے کہ اس دنیا میں رہکر آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جائے، رسولؐ سے غافل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام سے غفلت ہو، آخرت سے غافل ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے، اسی کا نام دنیا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یعنی دنیا نام ہے خدا سے غفلت کا، اچھے کپڑے، سونا چاندی اور بال بچوں کا نام دنیا نہیں ہے مطلب یہ کہ آدمی کے پاس سب چیزیں ہوں لیکن قلب ان سے فارغ ہو دل ان سے اٹکا ہوا نہ ہو تو انکا ہونا کچھ مضر نہیں اور یہ شخص دنیا دار نہیں کہلائے گا۔ برخلاف اسکے کسی کے پاس ساز و سامان تو کچھ زیادہ نہیں ہے مگر جو کچھ بھی ہے قلب اس سے متعلق ہے تو یہ شخص غافل ہے اور دنیا دار ہے۔ اسی کو حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی

یعنی جب ہر گھڑی ایک ایک طرف تمہارا دل جاتا ہے تو تم تنہائی میں بیٹھکر بھی اپنے

دل میں کچھ صفائی نہیں پاؤ گے

دگر مال وجاہ است وفرع و تجارت   چو دل با خدا ہست خلوت نشینی

یعنی اور اگر مال و دولت تمھارے پاس ہے اور کھیتی اور تجارت ہے مگر دل خدا سے متعلق ہے تو تم ان تمام مشاغل میں گھرے ہونے کے باوجود خلوت نشین ہی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض مالداری کا نام دنیا نہیں ہے۔ اسی دنیا میں بڑے بڑے مالدار لوگ بزرگ ہوگئے ہیں۔ سلاطین صاحب نسبت ہوئے ہیں۔ صحابہؓ میں ایک جماعت ہی اغنیاء صحابہؓ کی تھی مگر وہ لوگ خدا سے غافل نہیں تھے۔ یہ غفلت تو قلب کی ایک صفت ہے اسکے لئے مال ہی کا ہونا ضروری نہیں، ہوسکتا ہے آدمی کے پاس مال بھی نہ ہو اور وہ غافل ہو۔ غفلت کا ہے سے خدا سے، خدا کی جنت سے، دوزخ سے، آخرت سے، خدا کی یاد سے، آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ سب چیزیں یاد ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یاد ہی رکھنے کے لئے اپنی دعا میں جنت کا سوال کیا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے جنت اور جو چیز اسکی طرف قریب کرنے والی ہو۔

میں کہتا ہوں خدا کے بندو کبھی تو خدا سے جنت کا سوال کیا کرو۔ نماز اور روزہ سب کرتے ہو یہ کیوں نہیں کرتے یہ مخ العبادۃ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال کرتے تھے اور دوزخ سے پناہ مانگتے تھے۔ فرماتے ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَھْلِ النَّارِ وَمِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالےٰ کی اہل دوزخ کے حال سے اور دوزخ سے اور اس چیز سے کہ قریب کرے اس سے، قول ہو یا عمل۔ حضرت علیؓ اٹھتے تھے اور دوزخ کو یاد کرکے بہت روتے تھے۔ یہ آپ کے اسلاف ہیں انکے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے؟ روتے ہو تو کبھی دوزخ کے خوف سے بھی روؤ۔ یہ رونا جو نہیں آتا تو اسکا سبب وہی غفلت ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے سب سے بڑی چیز اس

دنیا میں غفلت ہی ہے۔ دنیا لوگوں کے پاس ہوئی ہے مگر اسکی کوئی وقعت انکے دل میں نہیں ہوئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ کوئی مقدمہ فیصلہ کے لیئے آگیا مدعا علیہ نے خدا کی قسم کھالی امام صاحب کو اسکا بڑا افسوس ہوا کہ اللہ تعالے کے نام کو لوگ دنیاوی اغراض کیلئے استعمال کرنے لگے۔ اسکو روکا اور فرمایا تمھارا جو مطالبہ ہے وہ مجھ سے لے لو اور قسم مت کھاؤ۔ یہ کہکر ایک کثیر رقم اپنے پاس سے ادا کردی اور اسی وقت سے منصب قضاء سے توبہ کی کہ اسمیں یہ سب بھی کرنا ہوتا ہے۔ اللہ کا نام اس سے کہیں اعلیٰ و برتر ہے۔

آگے اپنی اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض ان معاصی سے بھی پناہ مانگتے ہیں جو غفلت کا نتیجہ اور ثمرہ ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کفر سے۔ فسق سے اور ضدا ضدی سے اور باطنی امراض میں سے ریا اور سمعہ سے اور جسمانی امراض میں سے بہرہ پن سے اور گونگے پن سے۔ اور جنون و جذام سے اور قرض کے بار سے اور فکر سے اور غم سے اور بخل سے اور کسی کا حق مار لینے سے اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے۔

دیکھیئے! پھر فرمایا کہ دنیا کے فتنہ سے اور دنیا کا فتنہ یہی ہے کہ اسکو آدمی سبب غفلت بنالے ورنہ تو اگر اسکو آخرت کا توشہ بنائے تو سبحان اللہ اسکا پوچھنا ہی کیا! وہ تو نعمت الدار کا مصداق ہے اور نعم المال الصالح للرجل الصالح کا مصداق ہے اور ایک اچھا دار اور مقام ہے توشۂ آخرت فراہم کرنے والوں کے لیئے اسلیئے کہ یہ دار العمل ہے اور آخرت تو دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے اسلیئے یہ مومن کے لیئے ایمان۔ عمل صالح اور معرفت اور نسبت حاصل کرنے کا محل ہے اور یہ سب چیزیں چونکہ مطلوب ہیں لہٰذا جو چیز انکا سبب بنے گی وہ بھی مطلوب ہوگی اسلیئے دنیا بھی مطلوب ہوئی۔ اللہ تعالے ارشاد فرماتے ہیں کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ حسن عمل میں

موت کا دخل تو یہ ہے کہ موت کے مشاہدہ سے انسان دنیا کو فانی اور بعث کے اعتقاد سے آخرت کے اعتقاد کو باقی جان کر وہاں کے ثواب حاصل کرنے اور وہاں کے عقاب سے بچنے کے لئے مستعد ہو سکتا ہے اور حیات کا دخل یہ ہے کہ اگر حیات نہ ہو تو عمل کس وقت کرے، پس حسن عمل کے لئے موت بمنزلہ شرط کے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے اور چونکہ موت عدم محض نہیں ہے اسلئے اس پر مخلوقیت کا حکم صحیح ہے۔

(بیان القرآن ص۲۵ ج۱۲)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ حیات یعنی انسان کی زندگی اسکے عمل کا ظرف ہے اسی طرح سے یہ دنیا بھی چونکہ عمل، طاعت اور تقویٰ و معرفت کا محل ہے اس لئے وہ بھی مقصود ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ عمل سے مراد (احسن عملا میں) وہ عمل ہے جو قلب و جوارح دونوں کو شامل ہو اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسن عملا کی تفسیر احسن عقلا و اورع عن محارم اللہ تعالیٰ و اسرع فی طاعۃ اللہ سے فرمائی ہے یعنی تاکہ دیکھے کہ تم میں سے کون اللہ تعالیٰ کے جناب سے صادر ہونے والے احکام کو سب سے زیادہ سمجھنے والا ہوتا ہے اور کون سب زیادہ اسکے خطاب کو اخذ کرنیوالا ہوتا ہے۔

بہر حال یہ دنیا چونکہ ایمان و طاعت اور محبت و معرفت کی جگہ ہے اسلئے بزرگوں نے طویل عمر کی تمنا کی ہے اور جن بزرگوں سے اسکے خلاف ثابت ہے وہ غلبۂ حال کی بات ہے۔ عارف جامی فرماتے ہیں ؎

بادو روزہ زندگی جامی نہ شد سیر غمت　　　وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتیم

یعنی دو روز کی زندگی میں جامی آپ کے غم سے آسودہ نہیں ہوا کیا خوب ہوتا اگر حیات دائمی اسے نصیب ہوتی۔

سبحان اللہ خوب کہا ہے شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں انکا یہی قول مقبول ہو گیا ہو اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی بھی مطلوب ہے اسلئے کہ عمر زیادہ ہوگی تو انسان طاعت زیادہ کریگا۔ معاصی سے بچے گا اور گذشتہ معاصی سے توبہ کریگا۔

غرض دنیا کی معرفت کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ یہ دنیا دار الفنا ہے اور باقی رہنے والی چیز آخرت ہے چنانچہ جس نے اسکا استحضار کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ مال بھی اچھی چیز ہے بشرطیکہ آدمی اُسے کفر اور معاصی کا ذریعہ نہ بنائے اور مال انسان میں کبر و طغیان نہ پیدا کرے کیونکہ اسمیں خاصہ ہے کہ وہ انسان کو کبر و کفر پر آمادہ کرتا ہے اور اسکے دماغ کو خراب کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام باوجودیکہ کیسے برگزیدہ لوگ ہوتے ہیں امت کے خیر خواہ اور نہایت رحیم وسیع الاخلاق لوگ ہوتے ہیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں کفار یہی کہکر انکے مقابلہ میں آئے ہیں کہ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا یعنی ہم ان سے مال میں بھی زیادہ ہیں اور تعداد میں بھی زیادہ ہیں اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے یوں دعا مانگی کہ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى دِيْنِيْ بِالدُّنْيَا وَعَلٰى آخِرَتِيْ بِالتَّقْوٰى یعنی اے اللہ تو اعانت فرما میری میرے دین پر دنیا کے ساتھ اور میرے آخرت پر تقویٰ کے ساتھ۔ یعنی جو جس درجہ کی چیز ہے مجھے توفیق عطا فرمائیے کہ میں انکو اسکے درجہ پر رکھوں اور وہ درجہ یہی ہے کہ دنیا کو دین کے تابع رکھوں اور اپنی آخرت کو تقویٰ کا کام کر کے درست رکھوں۔

دیکھئے اسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ دنیا کی معرفت اسطرح حاصل کرو کہ اسکو تابع بنالو دین کے۔ پس یہی اللہ اور رسولؐ کے نزدیک اسکی حقیقت ہے۔ دنیا کو آخرت کا معین ہونا چاہیے نہ یہ کہ اسکی وجہ سے آخرت ہی سے غفلت ہو جائے۔ اس بات کو سمجھ لیجیے گا تو انشاء اللہ تعالےٰ اسکے ضرر سے بچ جائیے گا۔ اور اگر ان سب باتوں کو نہیں سمجھو گے اور غفلت کرو گے تو آج ذرا سی کرو گے کل اور کرو گے اسی طرح سے ساری عمر کرتے رہو گے اور دنیا میں ایسا انہماک انسان کے لیے زہر ہے۔

ایک واقعہ حضرتؒ سے سنا فرماتے تھے ایک شخص کپڑے بیچا کرتا تھا چنانچہ مرتے وقت زبان سے یہی کہتا تھا کہ یہ کپڑا چار آنے گز ہے اور یہ آٹھ آنے گز ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ آدمی جس کام میں رہتا ہے اکثر موت کے وقت شیطان اسی کو سامنے لاتا ہے۔ بہرحال دنیا جو مذموم ہے تو اس وجہ سے کہ اکثر وہ سبب غفلت بنجایا کرتی ہے اور اگر انسان میں وہ غفلت

نہ پیدا کرے یا انسان اسمیں لگ کرکے اپنے اندر غفلت نہ پیدا ہونے دے، تو پھر وہ مذموم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ و رسول نے تمتعات دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع کا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نعمتوں کو استعمال کریں اور اللہ کا شکرادا کریں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلاً طَيِّبًا اے لوگو! جو چیز دنیا میں حلال اور طیب ہے اسے کھاؤ اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ یعنی اے ایمان والو ہمارے رزق میں سے طیبات کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ ایک اور مقام پر انبیاء علیہم السلام کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا یعنی اے رسولوں کی جماعت طیبات کو استعمال کرو اور صالح اعمال کرو۔

دیکھئے! ان سب نصوص سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے تمتع تنعم اور تلذذ شرعاً مطلوب ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ بندہ اسکے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اعمال صالحہ ادا کرے جس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ مطیع اور فرمانبردار بنکر ان نعمتوں کو استعمال کرے باغی اور طاغی بنکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی قوم نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ نعمتوں کو حرام کرلیا ہے تو اسپر اظہار ناراضگی فرمائی گئی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زینت کو جسے اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا اور پاک و حلال رزق کو کس نے حرام کیا؟ آپ فرما دیجئے کہ یہ زینت و طیبات دنیوی زندگی میں تو اصالۃً مومنین ہی کے لیے ہے (اور کفار کو جو ملتا ہے تو تبعاً) اور قیامت کے دن تو یہ سب چیزیں مومنین ہی کے لئے مخصوص ہونگی یعنی کفار کو مطلقاً نہ ملیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا مقصود ان چیزوں کا استعمال ہی کرانا ہے نہ کہ ترک کرانا۔ (ہاں پس حق تعالیٰ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مومنین ان طیبات کو دنیا میں مطیع اور خدا کے

احسانمند بندے بنکر شکریہ کے ساتھ استعمال کریں نہ کہ بغاوت کے ساتھ)

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کی ادعیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر موقعہ پر اس امر کو پیش نظر رکھا کہ مومن تمتعات دنیا میں پھنس کر خدا سے غافل نہ ہونے پائے چنانچہ اسباب غفلت میں سے ایک بڑا سبب کھانا تھا اس کے بارے میں آپ نے یہ کیا کہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کرکے اس کو شروع کرنے کو فرمایا اور آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ پڑھنے کو مسنون فرمایا۔ اس طرح پر اول و آخر خدا کا ذکر مسنون فرما کر آپ نے سبب غفلت کو سراپا ذکر بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ جب مومن ہاتھ دھوکر اور بسم اللہ پڑھ کر کھانے کو شروع کریگا اور اسکے آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پڑھیگا تو پھر وہ کھانا خدا کی مرضیات کے خلاف عمل کرنے کا باعث کیونکر ہو سکتا ہے۔ اب یہ سبب غفلت نہیں رہیگا بلکہ سبب معرفت بن جائے گا۔ اسی طرح سے کھانا کھانے کے بعد جو چیز اس کے لئے ضروری ہے یعنی قضاء حاجت کے لئے جانا اس موقعہ پر بھی آپ نے یہ طریقہ مسنون فرمایا کہ آدمی جب بیت الخلاء جائے تو پہلے بایاں پیر رکھے اور یہ دعا پڑھے :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ پھر نکلتے وقت داہنے پاؤں کو مقدم کرے اور یہ دعا پڑھے :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّیْ مَا يُؤْذِيْنِیْ وَاَبْقٰى عَلَیَّ مَا يَنْفَعُنِیْ۔

یعنی تمام تعریفیں اُس خدا کے لئے ہیں جس نے مجھ سے مضر چیز کو دفع فرمادیا اور جو چیز نفع بخش تھی اُسے باقی رکھا۔

دیکھیے ایسی چیز کو جس کا تعلق بظاہر دین و معرفت سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا مگر آپ نے اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل کی اور امت کو تعلیم فرمائی۔ اسی طرح سے ایک اور چیز بھی ہے جو کہ سراپا غفلت ہے یعنی سونا۔ اس میں بھی آپ کا

معمول یہ تھا کہ آپ سوتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے :-

بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ اَرْفَعُهُ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِي فَاغْفِرْ لَهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ ٥

اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ -

یعنی اے میرے رب! آپ ہی کے نام کے ساتھ رکھا میں نے اپنے پہلو کو اور آپ ہی کے سہارے اُٹھاؤنگا اسے اگر روک لیں آپ میری جان کو تو بخش دیجئے گا اسے۔ اور اگر پھر بھیجیں آپ اسے تو حفاظت فرمائیگا اس کی اس طرح جیسی حفاظت کرتے ہیں آپ اپنے نیک بندوں کی۔ یا اللہ بچائیے مجھے اپنے عذاب سے جس دن کہ اُٹھائیں آپ اپنے بندوں کو۔

اسی طرح سے جب سو کر اُٹھے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ دعا پڑھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانِيْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِيْ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ط

یعنی شکر اس اللہ کا جس نے ہمیں زندہ کیا بعد مار دینے کے۔ اور اسی کی طرف ہم سب کو اُٹھ کر رجوع ہونا ہے۔

دیکھا آپ نے سب سے زیادہ غفلت کے اوقات سونے ہی کے اوقات کو سمجھا جاتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ان اوقات کو بھی ضیاع سے بچا لیا عارف سلایا اور عارف ہی اُٹھایا پس اس کی وجہ سے درمیان کا سارا وقت بھی ذکر اور معرفت ہی میں شمار ہوا اور غفلت سے محفوظ رہا۔ یہ اعلیٰ درجہ کی عبودیت ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو سکھلائی۔ اِن چیزوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہوجاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوجاتی ہے۔ یعنی اولاً تو معرفت نعمت کی ہوتی ہے اور اس کے واسطے سے منعم کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان حوائج سے بشر کو جکڑ دیا تھا۔ یعنی کھانا۔ پینا سونا۔ پیشاب پاخانہ یہ سب امور بشر کے لئے لازم ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں اسکا بہت سا وقت گذر جاتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ انتہائی شفقت اور عنایت ہے کہ آپ نے انھیں ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ جس طرح سے کہ آدمی نماز و روزہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے اور اسکا

Scanned with CamScanner

قرب حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح سے آپ نے کھانے پینے وغیرہ کو بھی ذکر کا ذریعہ بنادیا اور جس طرح سے کھانا تازہ تازہ آتا ہے اسی طرح سے ہر ہر موقعہ پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرا کے آپ نے انسان کو تازہ تازہ معرفت عطا فرمائی۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند تا تو نانی بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل۔ ہوا۔ چاند، سورج اور آسمان یہ سب کے سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تم (اطمینان کے ساتھ) روٹی حاصل کرسکو اور غفلت کے ساتھ اس کو نہ کھاؤ۔ چنانچہ جب یہ ساری کی ساری کائنات ایک تمھاری راحت کے لئے سرگرداں ہے اور تابع ہے تو پھر یہ تو بالکل انصاف کے خلاف بات ہے کہ تم فرمانبردار نہ بنو۔

دیکھئے بزرگوں نے اور مشائخ نے کس کس طرح سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ کیا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے احکام بہت ہیں اور وہ سب انکی معرفت کرانے کے لئے مشروع کئے گئے ہیں لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بڑی چیز کو حاصل کرنا ہے تو پہلے چھوٹی چیزوں کو لو ہوتے ہوتے یہی چھوٹا عمل ایک دن بڑا عمل ہوجائیگا۔ علماء نے ان تمام سنتوں کو کتابوں میں مدون کردیا ہے۔ میں اس وقت اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت حاصل کرنے کا ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

مذکورہ بالا دعاؤں میں آپ نے دیکھا کہ کس طریقہ سے ہر ہر موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا سکھلایا ہے اسی کو میں دوام ذکر سمجھتا ہوں اور اسی کو مشائخ نسبت کہتے ہیں۔ اسی کے حاصل کرنے میں لوگوں نے سر اور جان کی بازی لگا دی ہے بڑے بڑے بادشاہوں کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل کی ہے اور اس کے آگے سلطنت تک کی پرواہ نہیں کی ہے۔

ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے۔ ایک صاحب نے جو خوش گلو تھے نہایت ہی خوش الحانی کیساتھ یہ شعر پڑھ دیا کہ ؎

میں جو اس پر مرٹا ناصح تو کیا بیجا کیا اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

ایک اہل دل بھی اس مجمع میں موجود تھے انکو تو یہ شعر سن کر حال طاری ہوگیا سمجھے ہونگے کہ یہ مضمون تو اللہ تعالیٰ پر مرمٹنے کا ہے خیال کیا ہوگا کہ دیکھو تو اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے کہ لوگ ہم کو پاگل سمجھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کے کیسے کیسے ولی ہوئے ہیں اور کیسے کیسے انبیاء گذرے ہیں اور سب کے قلوب اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور تھے اسی کو سوچ کر ان پر ایک کیف طاری ہوگیا کہ میں اس میدان میں تنہا نہیں ہوں بلکہ بڑے بڑے عقلاء زمانہ انبیاء جیسے یکتائے روزگار بھی اس میدان کے شہسوار ہوئے ہیں اسی کو اس شعر میں کہا ہے کہ ؎

میں جو اس پر مرمٹا ناصح تو کیا بیجا کیا اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

غرض اللہ تعالیٰ کے تعلقات کے سلسلہ میں بزرگوں کے بیشمار واقعات ہیں۔

حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ شاہی محل میں سو رہے تھے دروازے بند تھے کہ چھت کے اوپر دھم دھم کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم لوگ ہیں مسافر ہمارا اونٹ کھو گیا ہے اسی کی تلاش میں یہاں آگئے ہیں۔ یہ جواب سن کر حضرت کو بڑا طیش آیا خفا ہو کر کہا کہ ارے احمقو! اونٹ یہاں چھت پر کیسے آجائیگا ان لوگوں نے جواب دیا کہ اچھا تو اگر چھت پر اونٹ نہیں مل سکتا تو تخت پر خدا بھی نہیں مل سکتا۔ اس جواب کا سننا تھا کہ ایک تازیانہ لگا وہ سمجھ گئے کہ خدا کی طرف سے لطیفہ غیبی ہے جو میری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ پھر کیا تھا اللہ تعالیٰ کے جستجو کی لگن لگ گئی۔ تخت چھوڑ کر جنگل کا راستہ لیا۔

ایک واقعہ تو ان کے تخت چھوڑنے کا یہ لکھا ہے اور اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی تخت چھوڑنے کا بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ بادشاہ تھے اس لئے شکار کا بڑا شوق تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں کے ساتھ شکار کو گئے اور ایک ہرن کا تعاقب کیا۔ سب لوگ پیچھے رہ گئے۔ اور یہ اس کے پیچھے بھاگتے ہی چلے گئے۔ جب بہت دور چلے گئے تو ہرن ایک جگہ رک گیا اور ان کی طرف منہ کر کے یہ کہا کہ مَا لِهٰذَا خُلِقْتَ۔

یعنی آپ اس لئے نہیں پیدا کئے گئے کہ جانوروں کا شکار کریں بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے

خود شکار ہونے کے لئے پیدا کیا ہے یہ بات دل کو لگ گئی اور سب چیزیں چھوڑ چھاڑ کر جنگل کا راستہ لیا۔ یہاں جب تخت خالی ہوگیا تو لوگوں کو فکر ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ سب نے طے کیا کہ انھیں کو خوشامد کر کے لانا چاہئے۔ چنانچہ ارکان دولت تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ جنگل میں ایک دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اپنی گدڑی سی رہے ہیں۔ لوگوں نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور عرض کیا کہ حضرت کے بغیر سلطنت بالکل تباہ ہو رہی ہے اور اگر حضرت کو کوئی فکر دامنگیر ہو تو ہم سب لوگ اس کو دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

فرمایا کہ ہاں مجھے ایک فکر ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔

یعنی ایک فریق جنت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں جائیگا۔ لہذا مجھے یہ فکر دامنگیر ہے کہ میں کس فریق میں ہوں تم اگر اس کا اطمینان مجھے دلا دو تو میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ وہ لوگ انکو اطمینان کیا دلا سکتے تھے خود ہی فکر میں پڑ گئے۔ جب حضرت ابراہیم ابن ادھم نے انھیں محجوج کر دیا تو پھر یہ فرمایا کہ تم مجھے حکومت کی کیا لالچ دیتے ہو۔ سنو! اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی سوئی جس سے اپنی گدڑی سی رہے تھے دریا میں ڈالدی اور اس کے بعد ارکین سلطنت سے کہا کہ اپنے عملہ سے ہماری سوئی نکلوا دو۔ سب لوگوں نے اپنے کو اس سے قاصر ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا دیکھو اور یہ کہہ کر دریا کی مچھلیوں کو حکم دیا کہ مچھلیو! میری سوئی لاؤ۔ چنانچہ ساری مچھلیاں ایک ایک سونے کی سوئی لیکر پانی سے باہر نکل آئیں۔ آپ نے انھیں دیکھ کر یہ فرمایا کہ یہ نہیں لونگا میری والی سوئی لاؤ اتنے میں ایک مچھلی حضرت کی سوئی منہ میں لئے ہوئے سامنے آتی ہوئی نظر آئی۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ میری سوئی ہے اور اسکے بعد درباریوں سے کہا کہ دیکھا تم نے میری سلطنت۔ میں نے جب اس دنیوی سلطنت کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑھ کر مجھے سلطنت عطا فرمائی۔

چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ پھر اس کے بعد سے دونوں وقت حضرت کے پاس اللہ تعالےٰ

کے یہاں سے برابر خوان آنے لگا جس میں انواع اقسام کے ایسے ایسے کھانے ہوتے تھے کہ سارا جنگل مہک اُٹھتا تھا۔

سبحان اللہ کیا اکرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کا۔ اور کیسی قدردانی ہے اور جب وہ خدا کے یہاں سے آتا تھا تو کیسا کچھ آتا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تو عادت ہی یہ ہے کہ اپنے ماننے والوں کی قدر فرماتے ہیں اور اس کو اسکے کام سے زیادہ صلہ دیتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيَاةً طَيِّبَةً (جس شخص نے صالح عمل کیا خواہ مرد ہو یا عورت تو ہم اسکو خوشگوار زندگی مرحمت فرمائیں گے)

یعنی جو شخص عمل صالح کرتا ہے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو تو ہم اسکو حیات طیبہ نصیب فرماتے ہیں۔

چنانچہ اس آیت کو عمل کرنے والوں کے لئے سند بنایا ہے اور یہ ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے بندوں پر عمل کی مشقت کو بہت سہل فرما دیا اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مرد یا عورت کی تخصیص نہیں ہے۔ جو بھی عمل صالح کرے گا۔ حیات طیبہ سے نوازا جائیگا۔

ایک بزرگ حج کو گئے انھیں یہ دولت نصیب تھی کہ خواب میں روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوا کرتی تھی۔ مدینہ منورہ کے سفر میں راستہ میں کسی بدوی کے لڑکے کو ایک طمانچہ مار دیا۔ اُسی دن سے زیارت بند ہوگئی۔ غلطی ہوگئی تھی کہ اس لڑکے کو مار دیا۔ یہ سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی ہیں۔ ان کو کسی قسم کی ایذا پہونچانا آپ کے تعلق اور آپ سے محبت کے خلاف تھا۔ زیارت کے بند ہوجانے سے انکو بہت رنج ہوا۔ مدینہ شریف پہونچ کر جتنے بڑے بڑے مشائخ تھے سب سے ملاقات کی اور زیارت کھل جانے کی دعا کرائی مگر سب نے انکار کیا اور کہا کہ یہ کام ہمارے اختیار سے باہر ہے اور ایک عورت کے متعلق کہا کہ اگر وہ چاہے تو اس کام کو کر سکتی ہے۔

چنانچہ یہ بزرگ اس عورت کے پاس گئے اور اس سے اپنا واقعہ بیان کیا اس نے روضۂ انور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ شُف یعنی ادھر دیکھو۔ دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ یا تو خواب میں زیارت ہوا کرتی تھی یا اب بیداری میں ہو گئی۔

دیکھا آپ نے اس مرتبہ کی آپ کی عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں مرد ہونا اور عورت ہونا شرط نہیں ہے بلکہ جو بھی کام کریگا صلہ پائیگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُومِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

اور حیات طیبہ کے متعلق حضرت جعفر صادق سے مروی ہے کہ وہ معرفت باللہ اور صدق مقام مع اللہ اور صدق وقوف علی امر اللہ کا نام ہے۔

حضرت ابن عطا کہتے ہیں کہ حیات طیبہ عیش مع اللہ اور اعراض عما سوی اللہ کا نام ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو بہت کچھ عطا فرماتے ہیں اور سب سے بڑی چیز جو عطا فرماتے ہیں وہ اپنی ولایت اور اپنے سے نسبت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نہ آید آں دہد

یعنی آدھی جان اگر لیتے ہیں تو سو جان مرحمت فرماتے ہیں اور جو تمھارے وہم و گمان میں بھی نہ آوے وہ عطا فرماتے ہیں۔

تم سمجھتے ہو کہ ولایت یوں ہی خشک سی چیز ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ دیکھا نہیں کہ حضرت ابراہیم ابن ادھم نے اُسے سلطنت دیکر خریدا اور یہ ایسی دولت ہے کہ اسکے متعلق بعض بزرگوں کا مقولہ ہے کہ

لَوْ عَلِمَ الْمُلُوْكُ مَا نَحْنُ عَلَيْهِ لَقَاتَلُوْنَا عَلَيْهِ بِالسُّيُوْفِ۔

یعنی اگر یہ بادشاہ لوگ ہماری قلبی دولت سے واقف ہوتے تو اس کو حاصل کرنے کیلئے تلوار سے ہمارا مقابلہ کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ تلوار سے اگر چڑھائی بھی کرتے تب بھی وہ دولت نہیں ملتی۔ اس لئے

Scanned with CamScanner

کہ اس کے حصول کا ذریعہ خلوص ہے سیوف نہیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا عورت تھیں لیکن بڑے بڑے بزرگوں نے ان کو اپنا سردار مانا۔ غرض مومن مرد ہو یا عورت جو بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں فنا کریگا اللہ تعالیٰ اس کو حیات طیبہ بخشے گا یعنی اس دنیا میں اس کو زندہ دلی حاصل ہو جائے گی اور زندگی حقیقتاً اسی کا نام ہے۔

ایک شخص پڑھتے تھے ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ ان حضرات کے قلوب میں اپنی محبت کو ڈال کر اس کو زندگی بخش دیتے ہیں اور زندگی تو اسی کا نام ہی ہے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحبؒ مکان سے کچہری جارہے تھے میں بھی ساتھ تھا راستہ میں آہستہ آہستہ یہ گنگنا رہے تھے۔

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی
جان ٹھہری جانے والی جائے گی
پھول کیا ڈالوگے تربت پر مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

ایک شخص نے یہ سنا تو کہا کہ خواجہ صاحب آپ تو شاید خدا کو کبھی بھی نہ بھولتے ہوں گے یہ اس نے اس پر کہا کہ دیکھا کہ کچہری جارہے ہیں دنیاوی مشاغل سامنے ہیں مگر دلمیں خدا کی اور آخرت کی یاد بسی ہوئی ہے۔ یہی ہے حیات طیبہ یعنی معرفت باللہ اور صدق مقام مع اللہ۔ اور عیش مع اللہ ۔ چنانچہ جس شخص کو یہی ایک غم یعنی غم آخرت ہو جاتا ہے تو اور تمام ہم و غم اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک غم غم آخرت ایسا بڑا غم ہے جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا اور دوسرے ہموم وغموم مانند دیگر جادوگروں کی سپیلیوں کے ہیں۔ تو جس طرح سے کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدھا بنکر انکی رسیوں اور لاٹھیوں کے بنائے ہوئے سب سپیلیوں کو نگل لیا تھا اسی طرح سے یہ غم آخرت جب کسی مومن پر سوار ہو جاتا

ہوجاتا ہے تو اپنے مقابلہ میں کسی غم کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اور یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے)

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:-

من جعل الهموم هما واحداً هم المعاد كفاه الله سائر همومه ومن تشعبت به الهموم من احوال الدنيا لم يبال الله في اي اوديته هلك.

یعنی جس شخص نے اپنے تمام ہموم کو ایک ہم بنالیا اور وہ ہے فکر آخرت تو اللہ تعالیٰ اس کے دیگر تمام ہموم سے اس کی کفایت فرمائیں گے اور جس کی فکر دنیا کے حالات میں منتشر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ وہ دنیا کی وادیوں میں سے کس وادی میں ہلاک ہوگیا۔ (حاشیہ الموافقات ص۲۴۳ ج۱)

اللہ والوں کا سب سے بڑا سرمایہ اس دنیا میں فکر آخرت ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقعہ پر آخرت کو یاد رکھا۔ چنانچہ شروع میں میں نے جو استعاذہ سنایا تھا اسمیں بھی قبر کے عذاب سے قبر کے فتنے سے بھی آپ نے پناہ مانگی تھی۔ ایک اور دعا میں آپ یہ فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتِي فِي قَبْرِي. یعنی اے اللہ مبدل بانس کرنا میری وحشت کو میری قبر میں۔

دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت ہی کے تعلیم کے لئے دعا فرمارہے ہیں۔ وہاں کی باتیں ابھی یہاں نہیں سمجھ میں آرہی ہیں لیکن جب جاؤگے تو پتہ چلے گا۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ اسکا سامان پہلے سے کرو۔ قبر میں وحشت بھی ہوگی کسی کسی وقت جنت کی ہوا کا ایک جھونکا آجائیگا۔ پھر اس کے بعد اس کی راحت ولذت کی وجہ سے مومن کو دوسرے جھونکے کا انتظار رہیگا اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے وحشت محسوس کریگا۔ وہاں کی مونس بس خدا کی یاد اور اس کی نسبت ہوگی۔ خدا کے ذکر کا وہاں گو ثواب نہ ملے کہ وہ دارالعمل نہیں ہے دارالجزا ہے مگر اسکی وجہ سے وحشت ضرور دور ہوجائے گی۔

خلاصہ یہ کہ سب حراموں سے بڑھ کر جو چیز حرام ہے وہ غفلت ہے اور اس کے دور کرنے کا طریقہ اتباع سنت ہے اور اسی اتباع سنت کا ایک اعلیٰ فرد نفس کی اصلاح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اٰتِ نفسی تقوھا وزکھا انت خیر من زکھا انت ولیھا و مولاھا۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو اس جانب متوجہ فرمایا کہ اصلاح نفس کا ایک ذریعہ اور طریقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی ہے اگر ہم سے اور کچھ نہیں ہوتا تو یہی کرلیں کہ اللہ تعالیٰ سے نفس کی اصلاح کے لئے دعا ہی کر لیا کریں۔ اور اسمیں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق کے لئے سب سے بڑا مانع یہی نفس ہے اسی لئے جسے اتباع سنت کی فکر ہوجاتی ہے وہ اصلاح نفس ہی کے درپے ہوجاتا ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

میں نے آپ کو اس کے مارنے کا آسان طریقہ بتلا ہی دیا ہے کہ سنت کو پکڑ و ہر ہر موقعہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں انھیں یاد کرو۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی مسلمان بازار میں جائے اور یہ دعا پڑھے

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو حیٌّ لا یموت بیدہ الخیر وھو علی کل شیءٍ قدیر۔

تو اللہ تعالیٰ دس لاکھ نیکیاں لکھدیں گے اور دس لاکھ گناہ معاف فرمائیں گے اور دس لاکھ درجے بلند فرمادیں گے اور اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادیں گے۔

صحابہ کرام نے جب یہ ارشاد سنا کہ بازار میں اس دعا کے پڑھنے سے اتنا اتنا ثواب ملتا ہے تو بہت سے حضرات محض اس ثواب کو حاصل کرنے کے لئے بازار جاتے تھے۔ یعنی انھیں بازار میں کچھ کام نہ ہوتا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ بازار میں اس دعا کے پڑھنے پر اس ثواب

کو بتایا تھا اس لئے محض ثواب لینے کی خاطر بازار جاتے تھے اور اس دعا کو پڑھ کر ثواب حاصل کرتے تھے۔

یہ اس پر آپ کو سنا رہا ہوں کہ بزرگی کسی اور چیز کا نام نہیں ہے بلکہ بندگی ملا کرتی ہے صرف اتباع سنت سے اس لئے کہ بزرگی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور سچے تعلق ہو جانے کو اور نسبت صوفیہ علیہ کی علت تامہ کا جزو اخیر نسبت رسول ہی ہے یعنی جن چیزوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نسبت حاصل ہوتی ہے ان میں سے سب سے آخری چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔

اور اس نسبت کے حاصل ہونے کے لئے اتباع رسول لازم ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ انسان اتباع رسول کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت نہ حاصل ہو اور جس درجہ کی نسبت آپ سے ہوگی اسی قدر آپ کی اتباع کریگا اور جس قدر آپ کی اتباع کریگا اُسی قدر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کو نسبت حاصل ہوگی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل کرنے کا ذریعہ اور واسطہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت پیدا کرنا ہوا۔

اور ایک بات اور کہتا ہوں کہ اس میں تو شک نہیں کہ مقصود تو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ نسبت پیدا کرنا ہے باقی اسکا زینہ اور ذریعہ چونکہ نسبت مع الرسول ہے اس لئے پہلے اس کو حاصل کیا جائیگا چنانچہ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت یعنی نسبت کا طریق اتباع رسول ہے یعنی تکمیل نسبت کا ذریعہ اتباع سنت ہے۔ چنانچہ یہی بندے کے تعلق باللہ کی دلیل ہے۔ اور یہی اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی بندے سے محبت ہے

ایک بات اور سنئے وہ یہ کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک نسبت مع اللہ ایک نسبت بالرسول ان میں سے نسبت مع اللہ تو عروج ہے اور نسبت بالرسول یہ نزول ہے اور باتفاق مشائخ نزول عروج سے افضل ہوتا ہے بس کام صرف عروج ہی سے نہیں چلے گا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا دم بھرے اور بس۔ بلکہ اسے خود کو نزول میں بھی لانا ہوگا یعنی اتباع سنت کرنا ہوگا اور اسی کو

ذریعہ بنانا ہوگا عروج کا۔

ایک بات اسی سلسلہ میں اور کہتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کا ذریعہ اور واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی یہ کہ بدون آپ کی محبت اور آپ کا ادب کئے ہوئے خدا تعالیٰ تک رسائی ناممکن ہے۔ اسی طرح سے کہتا ہوں کہ رسولؐ تک پہنچنے کا بھی زینہ نائب رسول یعنی حضرات مشائخ ہیں اس لئے ان سے بھی محبت کرنی ہوگی اور ان کے ساتھ بھی سچی عقیدت رکھنی ہوگی ورنہ اگر اس میں کمی ہوگی اور ان حضرات کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی جائے گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی رسائی نہ ہوسکے گی اور جب رسولؐ تک رسائی نہ ہوگی تو خدا تک کیا ہوگی ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز برپئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کی راہ یہی ہے کہ ہر موقعہ پر خدا کی یاد کی جائے۔ یعنی کسی حال میں بھی مومن غافل نہ رہے۔ سوئے تو خدا کو یاد کرے اور اُٹھے تو خدا کا نام لے۔ کھانا کھائے تو اللہ کے نام سے شروع کرے اور جب کھانا ختم کر چکے تو خدا کی حمد کرے۔ حتیٰ کہ جب پاخانہ جائے تو خدا کو نہ بھولے اور اس سے باہر نکلے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مضر اجزا کو بسہولت بدن سے خارج کردیا اور اس کے مفید حصہ کو باقی رکھا اور جزو بدن بنایا۔ اس طرح آپ نے گویا ہمارے تمام اوقات غفلت کو اوقات ذکر بنادیا اور اس کے ذریعہ مومن سے اس کی جنت میں پیش آنے والی حسرت کا خاتمہ فرمادیا اس لئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہل جنت کو جنت میں کوئی حسرت نہ پیش آئے گی۔ بجز دنیا کی اس گھڑی کے ضیاع پر جس میں اس نے خدا کا ذکر نہ کیا ہوگا۔ پس آپ نے ان ادعیہ کو مسنون فرماکر اس کے سارے ہی وقت کا احاطہ فرمادیا کہ مسلمان اگر ہر ہر وقت کی جو مسنون دعا ہے اُس کے ہی پڑھنے کا اہتمام کرے تو پورا ذاکر۔ کامل صاحب نسبتہ اور حقیقی عارف باللہ ہو جائے۔ لیکن ہم جب اس کو کریں تب نا۔ آپ جب اس منزل میں قدم رکھے گا تو مشکلات پیش آئیں گی دعاؤں کو یاد کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں مجاہدہ کرنا ہوگا۔ جو آسان نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک صاحب تھے جنھوں نے ان دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کیا۔ لیکن خود کہتے تھے کہ میں کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ بھی دھوتا تھا اور آخر میں الحمد اللہ بھی پڑھتا تھا مگر شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جاتا تھا جب یہ خیال کرتا کہ یہ تو سنت پر ناتمام عمل ہوا اس کی وجہ سے ایک ضیق میں رہتا تھا۔ کہتے تھے کہ پھر میں نے نفس سے کہا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے تم کو اس سنت پر بھی عمل کرنا ہوگا اس طرح سے اس سے سختی سے مطالبہ کیا چنانچہ نفس کو یاد کرا کے رہا۔

اسی طرح سے کہتے تھے کہ پاخانہ سے نکلتے وقت تو دعا برابر پڑھتا تھا اور دایاں پاؤں پہلے نکالتا تھا اور جاتے وقت پہلے بایاں پیر بھی رکھتا تھا لیکن داخل ہونے کی دعا پڑھنی بھول جاتا تھا۔ اس کے لئے بھی نفس سے کہا کہ دیکھو تم صرف تین سنتوں پر عمل کرتے ہو چوتھی سنت کیوں ترک کردیتے ہو۔ دین میں یہ تقسیم کیسی کہ کچھ لیا اور کچھ چھوڑا اور پھر اہتمام کیا کہ وہ سنت بھی متروک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بہت کوششوں کے بعد کامیاب ہوگیا اور اب کھاتے وقت بسم اللہ بھی پڑھنے لگا اور بیت الخلاء جاتے وقت اللھم انی اعوذ بك من الخبث والخبائث بھی پڑھنے لگا۔ اس طرح سے اسوقت کی سب سنتوں پر عمل پورا ہوگیا۔

پس دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت پر عمل کرنے کے لئے طالبین نے کیسا کیسا مجاہدہ کیا ہے تب سنت پر عمل ہوسکا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا ہوئی ہے اور اس کو ذریعہ بنایا ہے اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل کرنے کا یہ وہ سلوک ہے جو سنت کے مطابق ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔

بزرگان دین کی یہی وہ سنت ہے جو کہ معتبرہ ہے اور مسلسل چلی آرہی ہے جس کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ۔

"نسبتہائے صوفیاء غنیمتے است کبریٰ"

یعنی حضرات صوفیاء کرام کے پاس جو نسبت کی دولت ہوتی ہے یہی تو

غنیمت کبریٰ ہے۔

اس کو کہہ رہا ہوں کہ نسبت تک رسائی کا ذریعہ یہی اتباع سنت ہے۔ کیونکہ نفس سے خلاصی کا ذریعہ سنت ہے اور عمل بالسُّنۃ ہی نسبت کا زینہ ہے پس نفس سے سفر کا پہلا قدم سنت ہے اور سنت کے بعد اگلا قدم نسبت ہے اسی کو جامی نے یوں کہہ دیجئے ؎

یعلم اللہ تا بجاناں دو قدم رہ بیش نیست — آں یکے بر نفس خود نہ واں دگر در کوئے دوست

(خدا جانتا ہے کہ محبوب حقیقی تک کی راہ کا فاصلہ دو قدم سے زیادہ نہیں ہے بس ایک قدم اپنے نفس پر رکھو اور دوسرا کوئے دوست میں رکھو)

اب سمجھ میں آتا ہو تو یہ راستہ اختیار کرو ورنہ اپنی سمجھ پر رُدُوا اور جو سمجھ میں آتا ہو وہ کرو۔

وما علینا الا البلاغ

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

(ضمیمۂ اولیٰ)

مضمون "نسبت" کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک طالب کا وہ سوال اور حضرت مصلح الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کا خلاصہ بھی نقل کر دیا جائے جس میں اُس نے نسبت کا مفہوم اور اس کے حصول کا طریق حضرت والاؒ سے دریافت کیا تھا اور حضرت اقدس نے حاضرین وقت کے سامنے اس پر مفصل گفتگو فرمائی۔ افسوس کہ جواب تفصیل سے تو ضبط نہ ہو سکا تاہم خلاصہ بھی جو محفوظ رہ گیا ہے کافی اطمینان بخش ہے۔

(نسبت کا مفہوم اور اس کے حصول کا طریق!)

بقلم یکے از خدام حضرت والاؒ

ایک صاحب نے حضرت والا مدظلہ العالی سے سوال کیا کہ حضرت یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں

صاحب "صاحب نسبت" ہیں تو اسکا کیا مطلب ہوتا ہے۔ نسبت کسے کہتے ہیں، اور وہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟

ارشاد فرمایا کہ نسبت کے معنی تعلق اور ربط کے ہیں اور یہ دو چیزوں کے درمیان پائی جاتی ہے ان میں سے ایک تو وہ ہوتی ہے جس کو (کسی سے) نسبت ہوتی ہے اور ایک وہ جس سے (کسی کو) نسبت ہوتی ہے۔

پس جس طرح سے دو مخلوق میں باہم نسبت ہوتی ہے۔ جیسے باپ بیٹے میں نسبت ہوتی ہے۔ استاد شاگرد میں نسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے خالق اور مخلوق کے درمیان بھی نسبت ہوا کرتی ہے۔

لہذا کسی شخص کے صاحب نسبت ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالے کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

اب اس بندہ کو بھی اللہ تعالی سے نسبت یعنی ایک تعلق اور ربط خاص حاصل ہو گیا ہے۔

باقی اللہ تعالی سے نسبت حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؛ اس باب میں لوگوں کا مذاق اور طریقہ مختلف رہا ہے۔

(۱) صحیح اور عند اللہ مقبول طریقہ اسکا یہی ہے کہ آدمی کتاب وسنت پر عمل کرکے اللہ تعالی کا قرب حاصل کرے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کتاب وسنت کو تو ترک کردے اور خدا کا راستہ اپنے خود ساختہ طریق سے طے کرے جیسا کہ حشویہ اور باطنیہ کا طریق تھا یا اہل الحاد اور جوگی بھی اسی طرح خدا تک پہونچنا چاہتے ہیں۔

ان میں سے پہلا طریقہ تو صحیح ہے اور دوسرا اضلال اور گمراہی ہے۔

لیکن یہاں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالی سے نسبت آدمی کو اللہ اللہ کرنے اور احکام

Scanned with CamScanner

شرعیہ کے بجالانے سے بھی حاصل ہو جائیگی مگر اسکا طریقہ عادیہ یہ ہے کہ آدمی اس کو کسی صاحب نسبت سے حاصل کرے یعنی کسی متبع سنت بزرگ کی صحبت کی برکت سے خواہ ان کے پند و نصیحت سے خواہ انکی توجہ اور القاء نسبت سے اس کو حاصل کرے کیونکہ سالک کے اندر بھی ان اُمور کی وجہ سے نسبت صحیحہ آجاتی ہے اور یہ طریقہ تحصیل نسبت کا وہی ہے جو مسلسل چلا آرہا ہے اور اس طریقہ سے جو نسبت حاصل ہوتی ہے وہ قوی اور پائیدار ہوتی ہے۔

چنانچہ اس نسبت کے حاصل کرنے میں آدمی مشائخ کا محتاج ہوتا ہے اور اس کو ان حضرات کے سامنے اپنی یہ احتیاج پیش بھی کرنی چاہئے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو اتباع سنت بھی کرنا ہوگا کیونکہ وہ بزرگ چونکہ متبع سنت ہیں اور خود انھوں نے اپنے اندر سنت کا نور حاصل کیا ہے اس لئے یہ حضرات سالک کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی نسبت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نسبت پیدا فرما دیتے ہیں اور پھر وہ سالک بقدر اس نسبت کی قوت کے اتباع سنت میں لگ جاتا ہے اور اس راستہ سے اللہ تعالیٰ کی اس نسبت کو جو شیخ کے توسط سے اس کو حاصل ہوئی ہے اور زیادہ قوی اور مستحکم بنا لیتا ہے۔

غرض مشائخ کے توسط سے اور اتباع سنت کی راہ سے جو نسبت انسان میں پیدا ہوتی ہے وہ محققین کے یہاں معتبر اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے اور ان کے علاوہ دوسرے طرق نہ معتبر ہیں نہ مقبول۔ (بقلم یکے از خدام)

(راقم عرض کرتا ہے کہ یہ ضمیمہ اولیٰ دراصل حضرت مصلح الامۃ کے امتحانات کے جوابات ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت اقدسؒ جب کسی مضمون کو اہم تصور فرماتے تھے تو مختلف اوقات میں اور متعدد بار اور تفنن عنوان کے ساتھ اسکو بیان فرماتے تھے اور پھر حاضرین سے دریافت فرماتے تھے کہ میں نے کیا بیان کیا اور تم نے کیا سمجھا؟ لوگ اپنے اپنے لفظوں میں اسکو لکھکر پیش کرتے جسکو صحیح ہونے کی صورت میں حضرت پسند فرماتے، یوں گویا وہ حضرت ہی کی بات ہو جاتی ع " زبان میری ہے بات انکی" کی رُو سے۔ چنانچہ نسبت کے مفہوم کی بھی تقریر دو حضرات نے کی تھی جو یہاں بہ عنوان " ضمیمہ اولیٰ " آپ کے سامنے ہے

ایک صاحب کی وضاحت گذر چکی دوسرے صاحب کی ملاحظہ فرمائیں) :-

(ایک دوسرے طالب کی وضاحت)

حضرت والا نے ایک روز نسبت کے متعلق ایک تقریر فرما کر فرمایا تھا کہ تم بھی لکھو کہ کیا سمجھے۔ اس پر لکھنے کی تو ہمت نہیں پڑتی مگر بطور امتثال حکم اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ لکھنے کی جرأت ہوئی۔

حضرت والا کی تحریر و تقریر سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ نسبت نام ہے دو چیزوں کے درمیان باہمی ارتباط اور تعلق کا جیسے باپ بیٹے۔ آقا غلام۔ شیخ و مرید کے درمیان باہمی ارتباط و تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح سے خالق اور مخلوق کے درمیان بھی ایک ربط و تعلق ہے اسی ربط و تعلق کا حصول ایک حد تک تو فرض ہے اور پھر اس کے بعد (زیادتی) فرض کفایہ ہے۔ جو کہ لامتناہی ہے اس کے حامل صوفیاء کرام کی جماعت ہے اور یہ حضرات اسی ربط و تعلق کو نسبت اور سکینہ۔ نور اور ملکہ یادداشت سے تعبیر فرماتے ہیں اور یہ (نسبت) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث ہے اور سینہ بسینہ چلی آرہی ہے اور یہ نسبت یا سکینہ کوئی قالی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حالی اور ذوقی اور وجدانی چیز ہے جیسے بھوک اور پیاس (وجدانیات میں سے) ہے۔ قلب میں ایک خاص کیفیت اور حالت ہوتی ہے جو "تاوقتیکہ خود حاصل نہ ہو جائے۔ اسکی حقیقت کو پہونچنا (اور اسکو سمجھنا مشکل ہے۔ اس کے حصول سے پہلے پہلے تو ہر جویاں اور طالب کا یہ حال رہتا ہے ع

یوسفِ گم گشتہ کا میرے پتہ چلتا نہیں

حضرات مشائخ نے اس کی ظاہری علامتوں پر مفصل کلام کر کے اسکو اقرب الی الفہم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کو جب چاہیں دیدیں۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشآء۔ مگر نسبت کے اکتساب کا جہاں تک تعلق ہے جو شخص بھی مجاہدہ اور ذکر یعنی اللہ اللہ

Scanned with CamScanner

کرے گا اس کو یہ نسبت حاصل ہو جائے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ یہ شخص شریعت کا اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی پابند ہے یا نہیں۔ اگر اس نے (یہ تعلق اور نسبت) سنت اور شریعت کی روشنی میں حاصل کی ہے تو وہ عنداللہ معتبر ہے ورنہ مشائخ حقہ کے نزدیک وہ غیر معتبر ہے جوکہ جوگ اور الحاد ہے۔ ضلالت اور گمراہی (فریب نفس اور تلبیس ابلیس ہے۔)

اس پر حضرت والاؒ نے ایک واقعہ بیان فرمایا تھا کہ حضرت جنید کے زمانہ میں کسی جماعت نے یہ کہا تھا کہ ہم لوگ تو اب پہونچ گئے ہیں (یعنی واصل الی اللہ ہو چکے ہیں) لہٰذا اب ہم کو شرعی احکام اور اعمال کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت جنیدؒ نے اُن کا یہ مقولہ سن کر فرمایا کہ ہاں یہ تو صحیح کہتے ہیں کہ وہ لوگ پہونچ گئے ہیں مگر کہاں؟ خدا تک نہیں بلکہ جہنم میں پہونچ گئے ہیں (یعنی واصل الی النار ہوگئے ہیں)

پھر حضرت والا نے اس پر زیادہ زور دیا تھا کہ ذکر و مجاہدہ سے جس طرح سے یہ نسبت حاصل ہوتی ہے ویسے ہی متبع سنت مشائخ کی توجہ اور ہمت سے بھی یہ نسبت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی یہ حضرات قلب سالک میں بھی نسبت القاء فرماتے ہیں اور وہ بھی معتبر ہوتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز جو سالہا سال کے مجاہدات و ریاضات کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ ان حضرات کی توجہ اور ہمت سے ایک آن میں حاصل ہو جاتی ہے اور سالک کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے۔ اسی طرح سے سالک کے قلب میں بھی وہی نور حاصل ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حصول نسبت کے لئے سبب قوی شیخ کامل کی توجہ اور اس کی ہمت بھی ہے اور شیخ کی توجہ کے حصول کا ذریعہ اس کا پاسِ ادب اور عظمت و احترام ہے۔

مشائخ کے یہاں آمد و رفت کی غرض و غایت اسی نسبت کی تحصیل ہونی چاہئے۔ مگر رونے کی بات ہے کہ آج عوام تو عوام خواص کی بھی اس کی طرف توجہ نہیں ہے۔ مشائخ کے پاس صرف آنے جانے ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے یا زیادہ سے زیادہ وظیفہ کو۔ اسی کو حضرت والا "بدن پر

گرنے سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یوں تو ظاہر ہے کہ جو شخص بھی ان حضرات کی صحبت اختیار کرے گا تو کچھ نہ کچھ نفع تو ضرور ہی اس کو حاصل ہوگا کیونکہ ؎

مستی کے لئے بوئے مے تند ہے کافی
میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

مگر جس منصب پر یہ حضرات فائز ہوتے ہیں اور جس دولت کے حامل ہوتے ہیں یعنی یہی نسبت اور سکینہ اس کو ان حضرات سے حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن آج حال یہ ہے کہ عام طور سے لوگ اپنی کم فہمی اور استعداد باطنی کے نہ ہونے کی وجہ سے اس دولت کے حاصل کرنے سے محروم ہی رہتے ہیں الا ماشاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر پر اپنا فضل فرمائے اور حضرت والا کی دولت ظاہری و باطنی سے مالا مال فرمائے۔ حضرت والا سے بھی یہی دعا کی التجا ہے۔

والسلام خادم کمترین

ضمیمۂ ثانیہ

(حضرت مصلح الامۃؒ کا ایک اور ملفوظ جو کسی اور موقعہ پر اسی موضوع پر ارشاد فرمایا) ناظرین کے افادہ کے لئے یہاں درج کیا جا رہا ہے

فرمایا کہ تصوف کی کتابوں میں ذکر قلبی کا عنوان بہت جگہ آتا ہے اسکا مفہوم اکابر کے نزدیک تو متعین ہے لیکن اصاغر اس سے ناواقف ہیں۔ میں نے اس کی کچھ وضاحت بمبئی میں اپنی ایک مجلس میں کی تھی۔ لوگ بہت خوش ہوئے اور بڑے بڑے لوگوں نے اس کو سراہا اور پسند کیا۔

میں نے وہاں جو بیان کیا تھا اسکا حاصل یہ تھا کہ ذکر قلبی نام ہے فکر کا اور فکر کا مفہوم ہر شخص جانتا ہی ہے۔ اس وقت آپ کے سامنے اس قول کا ماخذ بیان کرتا ہوں حضرت ابو بکر جصاص رازیؒ اپنی مشہور تصنیف احکام القرآن میں فاذکرونی اذکرکم کے تحت اقسام

ذکر شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

(فاذکرونی) قد تضمن الامر لیسائر وجوہ الذکر منھا سائر وجوہ طاعتہ وھو اعم الذکر ومنھا ذکرہ باللسان علی وجہ التعظیم والثناء علیہ والذکر علی وجہ الشکر والاعتراف بنعمہ ومنھا ذکرہ بدعاء الناس الیہ والتنبیہ علی دلائلہ وآیاتہ وقدرتہ وعظمتہ وھذا افضل الذکر وسائر وجوہ الذکر مبنیۃ علیہ وتابعۃ لہ وبہ تصحیح معناھا لان الیقین والطمانینۃ بہ تکون قال اللہ تعالیٰ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب یعنی واللہ اعلم ذکر القلب الذی ھو الفکر فی دلائل اللہ تعالیٰ وحججہ وآیاتہ وبیناتہ وکلما ازددت فیھا فکراً ازددت طمانینۃً وسکوناً وھذا ھو افضل الذکر لان سائر الاذکار انما یصح ویثبت حکمھا بثبوتہ۔ (احکام القرآن ص۹۳ ج ۱)

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فاذکرونی میں ذکر کا جو امر ہے وہ تمام طرق ذکر کو متضمن ہے چنانچہ منجملہ ان کے حق تعالیٰ کی جملہ طاعات ہیں اور یہ ذکر سب اذکار سے عام ہے۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کو زبان سے یاد کرنا بطور ثنا اور تعظیم کے یہ بھی ذکر ہے اور بطور شکر کے ذکر کرنا اور اسکی نعمتوں کا اعتراف کرنا یہ بھی ذکر ہے۔

نیز منجملہ ذکر ہی کے کسی شخص کا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینا اور اس کے وجوب وجود کے دلائل پر تنبیہ کرنا اور اس کی حکمتوں کو بیان کرنا بھی ہے۔ اسی طرح سے حق تعالیٰ کے دلائل اور ان کی آیات قدرت وعظمت میں تدبر کرنا یہ بھی ذکر ہے بلکہ افضل الذکر ہے اور دیگر وجوہ ذکر اسی پر مبنی اور اس کے تابع ہیں۔ چنانچہ اسی کے ذریعہ سے ان سب کے معانی کی صحت ہوتی ہے اس لئے کہ یقین اور طمانیت اسی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو یوں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں باقی معنی اس کے یہی معلوم ہوتے ہیں کہ ذکر قلب جس کا دوسرا نام اللہ کے دلائل اور اس کے حجج اور آیات اور اس کی بینات میں غور وفکر کرنا ہے اسی ذکر قلبی سے قلوب

کو اطمینان ہوتا ہے۔ تم ان سب میں جس قدر زیادہ اپنی فکر کو بڑھاؤ گے اسی قدر طمانینت اور سکون کو بھی بڑھتا ہوا پاؤ گے اور یہی افضل الذکر ہے اس لئے کہ اور دوسرے اذکار کی صحت اور اُن کے حکم کا ثبوت اسی سے ہوتا ہے۔

دیکھئے یہاں امام ابوبکر جصاص رازی نے افراد ذکر میں سے فکر فی دلائل اللہ وآیاتہ وقدرتہ وعظمتہ کو بھی شمار فرمایا ہے بلکہ اس کو افضل الذکر کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ دیگر سب انواع ذکر اسی پر مبنی ہیں اور اسی کے تابع ہیں بلکہ اسی سے ان کے معنی کی صحت ہوتی ہے اس لئے کہ یقین و طمانینت کا ذریعہ یہی ذکر ہے۔ چنانچہ آیت شریفہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب میں مراد یہی ذکر قلبی ہے جس کا دوسرا نام فکر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دلائل میں اور انکی آیات میں اور ان کے بینات میں فکر کرنا۔

میں کہتا ہوں کہ ذکر قلبی جس فکر کا نام ہے اس سے مراد فکر دائمی ہے جیسا کہ صوفیائے محققین کے یہاں معہود ہے چنانچہ یہ حضرات اس کو حضور اور ملکۂ یادداشت سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور لسان شرع میں اسی کو احسان کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے مکاتیب میں فرماتے ہیں کہ

اور جب مراقبہ کا کیف آجاتا ہے ذکر خفی یا جلی اس پر طبع نہیں جمتی۔ البتہ جب مراقبہ خوب قائم ہو جاتا ہے اُس وقت سب ذکر لسانی ہو یا قلبی جلی خفی مثل مراقبہ ایک درجہ سادی میں آجاتے ہیں اور وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جاننے اور شرم و حیا طاری ہو جائے اسکا نام حضور اور یادداشت ہے۔ اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے جب اس کا ملکہ خوب ہو جائے تو یہی امر ہے۔ کہ قابل اجازت و تلقین کے بناتی ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے۔

(مکاتیب رشیدیہ ص۹۵)

دیکھئے امام جصاص رازیؒ اور حضرت گنگوہیؒ دونوں ہی محققین ایک ہی بات فرماتے ہیں یعنی یہ کہ ذکر قلبی فکر کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندہ کو جو تعلق و نسبت ملکہ یادداشت اور نسبت احسان حاصل ہوتی ہے اسی کو ذکر قلبی کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

پس ذکر قلبی کا یہ مفہوم کہ وہ بھی ذکر لسانی کے مانند کسی قلبی تحریک کا نام ہوگا جیسا کہ اس کے ظاہر لفظ سے عام ذہنوں میں اس کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ ہر عضو کا وظیفہ اور ذکر اس کے شایان شان ہوا کرتا ہے لہذا ذکر لسانی تو تحریک لسان کا نام ضرور ہے لیکن ذکر قلبی میں حرکت وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں بلکہ سکون واطمینان کے ساتھ قلب جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور انکے دلائل قدرت میں فکر کرتا ہے اسی کا نام ذکر قلبی ہے۔

اور جیسا حضرت گنگوہی نے فرمایا ہے کہ

"وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالکِ معبود کے جانتے اور شرم وحیا طاری ہو جاوے اس کا نام حضور اور یادداشت ہے اور اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں"

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے بھی القول الجمیل میں تحریر فرمایا ہے شرائط شیخ کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

والشرط الثالث ان یکون زاهداً فی الدنیا راغباً فی الاخرۃ مواظباً علی الطاعۃ المؤکدۃ والاذکار الماثورۃ مواظباً علی تعلق القلب باللہ سبحانہ وکان "یادداشت لہ ملکۃ راسخۃ

(القول الجمیل ص۲)

ترجمہ:۔ تیسری شرط بیعت لینے والے کی یہ ہے کہ دنیا کا تارک ہو اور آخرت کا راغب ہو طاعات موکدہ اور اذکار منقولہ کا محافظ ہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کا دلی تعلق دائمی ہو اور یادداشت کی مشق اس کو کامل حاصل ہو۔

اسی طرح ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ:۔

طالب را از اں انتقال بتصور مفہوم ایں لفظ می گردد و آں تجلی حضرت حق است در نشاء علم کہ الطف واعلیٰ تجلیات واقرب آنہا است بحضرت ذات کہ چوں ایں یعنی مفہوم ایں لفظ کہ بسیط محض و مجرد بحت است در ذہن اور استقرارے می گیرد بحیثیتے کہ بصر بصیرت او دائم التوجہ بجانب ہما مفہوم باشد و تمام قوت

Scanned with CamScanner

دراکہ او مثل چشم مقصور النظر علیٰ ذالک المفہوم گردد و التفاتے بسوئے ماسویٰ آں از صمیم قلب نزند۔ اگر احیاناً خطرہ ماسویٰ در ذہن خطور می کند ہر آئینہ مثل امور اتفاقیہ باشد نہ از صمیم قلب و ایں مسمی بفکر است نزدیک قوم۔ (صراط مستقیم ص۹)

ترجمہ۔ پھر طالب نشۂ الفاظ سے یعنی ذکر لسانی سے لفظ اللہ کے مفہوم کے تصور کے جانب منتقل ہوتا ہے اور وہ حق تعالیٰ سبحانہ کی تجلی ہے۔ نشاء علم میں جوکہ سب تجلیات سے اعلیٰ و الطف ہے اور حضرت ذات سے سب سے زیادہ قریب جب یہ تجلی یعنی اس لفظ کا مفہوم جوکہ مجرد و بسیط محض ہے ذاکر کے ذہن میں جاں گزیں ہوجاتا ہے اور ایسا ہوجاتا ہے کہ سالک کی بصیرت کی نظر اس کی جانب مسلسل اُٹھتی رہتی ہے اور مانند موج کے اُٹھتی رہتی ہے اور اس کی تمام قوت مدرکہ (یعنی وہ قوتیں جن سے ادراک کیا جاتا ہے) اس کی آنکھ بن کر اسی مفہوم کی طرف اپنی نظر کو مقصور کرلیتی ہے اور وہ ذاکر اس مفہوم کے سوائے کسی غیر کی جانب اپنے صمیم قلب سے التفات روا نہیں رکھتا۔ اگر اتفاقاً کسی غیر اللہ کا خطرہ اس کے ذہن میں ہوا بھی تو بس ایسا جیسے کوئی امر اتفاقی ہو یعنی آیا اور چلا گیا۔ قلب کی گہرائیوں سے اسے ذرا لگاؤ نہیں ہوتا۔ بس اسی کیفیت کو۔ یعنی جو تعلق کہ لفظ اللہ کے مفہوم کو قلب کے ساتھ ہوجاتا ہے یہ حضرات فکر یعنی ذکر قلبی کہتے ہیں۔

اسی کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ یوں فرماتے تھے ؎

گئے دن باندھنے کے ٹکٹکی کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

بڑا ہی عمدہ شعر ہے اس میں اسی مضمون کیطرف اشارہ ہے۔ ٹکٹکی باندھنے سے بصر بصیرت کے دائم التموج ہونے اور قوت دراکہ کے مقصور النظر ہونے ہی کو مراد لیا ہے جس کا نام فکر ہے۔ اور دو دو پہر آنکھ بند ہونے سے وصول اور حضور تام کی جانب اشارہ ہے کہ اس میں سکون و طمانینت ہوا کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے مکتوب میں یادداشت اور ذکر قلبی کو جو مرادف

قرار دیا ہے تو اس لئے کہ جب کسی بندہ کا قلبی تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ دائمی ہو جاتا ہے تو اسی کا اثر اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایک ملکہ یادداشت حاصل ہو جاتا ہے اور یاد کے معنی ذکر ہی کے ہیں۔ پس اب یاد کا تعلق چونکہ قلب سے ہوتا ہے اس لئے اس کو ذکر قلبی بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس طور ذکر قلبی اور یادداشت گویا ایک ہی چیز کے دو نام ہوئے جس کو حضرات صوفیہ اصل کے لحاظ سے نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور اثر کے اعتبار سے۔ یہی یادداشت کہلاتی ہے یہی وہ نسبت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل چلی آرہی ہے اور یہی نسبت وہ ہے جو کہ تصوف کی روح اور حضرات صوفیہ کا گراں بہا سرمایہ ہے چنانچہ ان حضرات کی تمام تگ و دو اسی نسبت کی تحصیل کے لئے ہوا کرتی ہے۔ تصوف اس سے اگر خالی ہو کر پایا جائے تو وہ تصوف نہیں جوگ ہے۔ چونکہ جوگی بھی دنیا سے زاہد و مرتاض ہوتے ہیں اور نرا زہد کچھ مفید نہیں جب تک اس کے ساتھ اتباع سنت نہ ہو۔ یہی چیز تصوف کو جوگ سے ممتاز کرتی ہے لیکن افسوس کہ آج یہی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ اسلئے حقیقی تصوف بھی قریب قریب ختم ہی سا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ چونکہ اصل نہیں نقل ہے حقیقت نہیں رسم ہے اسلئے عام لوگوں کے نزدیک بھی منکر ہے اور ایک بڑی جماعت کو اس پر اعتراض ہے ورنہ اگر اس کی حقیقت کو دیکھا جائے تو سمجھ میں آئے کہ یہ وہ دولت ہے جس کے محتاج علماء تک ہوئے ہیں اور اپنی احتیاج کو محسوس کر کے یہ حضرات مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے اسکی تحصیل کی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے تو یہ فرمادیا ہے کہ

نسبت ہائے صوفیہ غنیمتے است کبریٰ

یعنی حضرات صوفیہ کی نسبت "ایک دولت بے بہا ہے"

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس دولت کا کوئی شمہ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ آمین

(نسبتِ صوفیہ قسط دوم ختم شد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ مضمون نسبتِ صوفیہ

(جمع کردہ از ملفوظاتِ حضرت والاؒ)

مقدمہ

(از جامی)

حضرت اقدس مرشدی مصلح الامۃؒ کی مشہور و معروف تالیف "تصوف اور نسبت صوفیہ" حصہ اول طبع ہوئی اور حضرات علماء کے مطالعہ سے بھی گذری تو سب ہی حضرات نے کیا عوام اور کیا خواص اسکو بیحد پسند کیا اور الحمدللہ لوگوں کو اس مختصر سے رسالہ سے طریق کا بہت ہی نفع پہونچا چنانچہ طالبین ہی کی رغبت کو دیکھکر حضرت والا نے اس کا حصہ دوم بھی تالیف فرمادیا تھا لیکن وہ صرف رسالہ ہی میں شایع ہو سکا تھا علحدہ کتابی شکل میں نہ چھپ سکا (ناظرین کرام مکمل نسبت صوفیہ کو انشاء اللہ تالیفات حصہ چہارم میں یکجا ملاحظہ فرماسکیں گے) لیکن جیسا کہ حضرت اقدس کا طریقہ تھا کہ جب کسی مضمون کیجانب آپ توجہ فرماتے تھے تو مسلسل اسی سلسلہ کی باتیں ہر مجلس اور ہر محفل میں ارشاد فرماتے رہتے تھے اور جب بھی جو باتیں قلب مبارک پر وارد ہوتی رہتی تھیں خدام میں سے جو بھی موجود ہوتا تھا اسکو بلاکر مضمون کی تقریر فرمادیتے اور وہ اسکو لکھ لیا کرتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ "نسبت صوفیہ" کے سلسلے میں بھی علاوہ مستقل کتاب کے وقتاً فوقتاً بعض "ضمائم" بھی رسالہ میں طبع ہوتے رہے ہیں پیش نظر مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے حضرت اقدس نے ارشاد فرمایا تھا اور اس کے ضبط تحریر میں کرلئے جانے کا حکم بھی فرمایا اور کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا جسکو راقم لکھتا جاتا تھا مگر خدا معلوم کس وجہ سے اچانک یہ سلسلہ موقوف ہوگیا اور مضمون تشنہ اور ناتمام ہی رہ گیا جس کا اب بیحد قلق اور افسوس ہے کیونکہ سہ

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
وہ چپ ہوگئے داستاں کہتے کہتے

اب مسودات کے ذخیرہ میں تتبع اور تلاش کے بعد خادم کو مضمون کا اتنا ہی حصہ مل سکا جسکو نسبت صوفیہ کا ضمیمہ تجویز کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ اسکو نافع اور مقبول بنائیں۔

یہ مضمون صاف تو حضرت والا کی حیات ہی میں کیا جا چکا تھا لیکن حضرت مصلح الامۃ کی نظر ثانی سے بلا شبہ یہ محروم رہا لہٰذا اس کے مطالعہ سے ناظرین کو اگر کچھ نفع پہونچ جائے اور بات صحیح طور پر ادا ہوگئی ہو تو اسکو حضرت مرشدی قدس سرہٗ کا فیض اور حق تعالیٰ کا فضل تصور کیا جائے اور اگر خدانخواستہ کچھ لغزش اور غلطی ہوگئی ہو تو اسکو راقم کی کم استعدادی اور بدفہمی کا نتیجہ قرار دے لیا جائے۔ اللہ تعالےٰ معاف فرمانے والے ہیں۔

حق تعالےٰ سے اپنے لئے صلاح و فلاح اور ناظرین کرام سے دعائے اصلاحِ حال و بال کا طالب ہوں۔ والسلام

راقم عبدالرحمٰن جامی

مقیم خانقاہ وصی اللّٰہی۔ ۲۳۔ بخشی بازار۔ الہ آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد کچھ عرصہ قبل میں نے تصوف پر کچھ بیان کیا تھا جس میں اہل حق صوفیہ کی نصرت کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ تصوف بدنام کہاں سے ہوا بعض احباب کو وہ مضمون بہت پسند آیا چنانچہ انھوں نے مجھے لکھا کہ تصوف کے اثبات پر اتنا واضح اور مدلل کلام ابتک نظر سے نہیں گذرا انکے اس تحریر فرمانے سے یہ اندازہ ہوا کہ طریق کے متعلق لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہے اسلئے جی چاہا کہ اس پر مزید کلام کروں اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ تصوف کے متعلق اس زمانہ میں جو افراط وتفریط پیدا ہو گئی ہے اسکو واضح طریقہ سے بیان کروں تاکہ اسکا حسن اور اعتدال ثابت ہو کر اسکی ضرورت اور نفع بھی لوگوں کے سامنے آجائے اور ناقصین و ناواقفین کے قول وفعل سے اس طریق کو جو نقصان پہونچا ہے اور جسکی وجہ سے منکرین کو اسکی مخالفت کا موقع ہاتھ آیا طالبین کو اس سے واقف کرا دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو ضرر سے بچا سکیں۔

عام طور پر جن حضرات کو صوفی سمجھا جاتا ہے یعنی جنکا شمار جماعت صوفیہ میں کیا جاتا ہے وہ تین طرح کے ہیں۔ ایک جماعت تو ان لوگوں کی ہے جو طریق میں کاملین کہلاتے ہیں جیسے حضرت جنید و حضرت شبلیؒ اور ان کے مانند اور دوسرے لوگ اور حقیقۃً یہی لوگ صوفی کہلانے کے مستحق ہیں اور انھیں کے طریقہ کا نام تصوف ہے اور دوسری جماعت ان لوگوں کی ہوئی ہے جن پر حال کا غلبہ رہا یا ابھی وہ طریق میں مبتدی سے تھے۔ اور تیسری جماعت ایسے لوگوں کی ہوئی ہے جو حقیقۃً صوفی تھے نہیں مگر انھوں نے اپنے کو اس جماعت میں داخل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تصوف میں یہ حضرات داخل ہی نہیں ہوئے تھے تو پھر ان کے کسی قول وفعل یا حال کا ذمہ دار تصوف کو کیوں قرار دیا جائے اسلئے کہ جب انھوں نے تصوف اختیار نہیں کیا تو پھر تصوف کو بھی ان پر اعتراض اور انکار رہا۔ اسی طرح سے مغلوب الحال اور مبتدی کے

افعال و اقوال کو بھی طریق کی جانب منسوب کرنا صحیح نہیں کیونکہ ان میں سے اول معذور ہے اور ثانی کے متعلق یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ غیر مکلف ہے چنانچہ ظاہر شریعت سے جماعت صوفیہ میں سے ہٹنے والے اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ورنہ تو صوفیائے محققین و کاملین شریعت سے سرمو تجاوز نہیں کرتے بلکہ اتباع ہی کی وجہ سے وہ کامل ہوتے ہیں۔ میں نے یہ مضمون جو بیان کیا ہے اسکی تائید علامہ شعرانیؒ کے اس کلام سے ہوتی ہے۔

وجمیع من شطح عن ظاهر الشريعة انما هو دخيل فيهم او غلب عليه حال او كان مبتديا في الطريق۔ واما الكاملون كالجنيد واضرابه فطريقهم محررة على الادب تحرير الذهب اذ هم حماة الدين۔

جو شخص بھی ظاہر شریعت سے تجاوز کرتا ہے یا تو وہ ان میں خواہ مخواہ داخل ہوگیا ہے اور یا اس پر کوئی حال غالب ہوگیا ہے اور یا وہ طریق میں مبتدی ہے باقی جو کامل ہیں جیسے حضرت جنیدؒ اور انکے امثال انکا طریق سراسر ادب پر ہموار ہوتا ہے کیونکہ یہ حضرات حامیان دین ہیں۔

(التنبیہ الطربی ص۱۵)

دیکھئے اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صوفیہ سب کے سب ایک ڈھنگ کے نہیں ہوئے ہیں بہت سے ان میں کامل ہوئے ہیں اور بہت سے دخیل ہوئے ہیں اور ایک بڑی تعداد ایسوں کی بھی ہوئی ہے جو نہ تو دخیل تھے اور نہ کامل ہی ہوئے ہیں اب آپ خود غور فرمائیے کہ جو جماعت اتنے مختلف بلکہ متضاد افراد پر مشتمل ہو تو پھر ان سب پر ایک حکم کیونکر لگایا جا سکتا ہے غلطی یہیں سے ہوئی کہ جن کی نظر کاملین پر پڑی انھوں نے سب کو کامل ہی سمجھ لیا اور سب کی تائید کرنے لگے اور جن حضرات کے پیش نظر ناقصین یا وہ لوگ جو دخیل تھے ان کے خلاف شرع کارنامے آئے تو انھوں نے ساری جماعت ہی کے خلاف فتویٰ لگا کر سبھی کو مجروح اور ساقط الاعتبار بنا دیا۔

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں آپ نے معلوم کیا کہ یہ دونوں طریقے صحیح نہ تھے بلکہ حق تفصیل ہے یعنی کاملین اہل حق ہیں اور انکا پیش فرمودہ تصوف معتبر ہے اور دوسرے لوگوں کا یہ حکم نہیں بلکہ جو باتیں انکی شریعت کے مطابق ہیں وہ حق اور صواب ہیں اور جو شریعت

کے مزاحم ہیں وہ ناقابل اتباع ہیں بلکہ ناقابل اعتبار۔

میں نے کچھ دنوں قبل جو رسالہ تحریر کیا تھا اسکا نام "تصوف اور نسبت صوفیہ" تھا جس کے مطالعہ سے یہ امر ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ تصوف بہر حال بدعت نہیں ہے۔ اسی درمیان میں بعض محققین کی مزید عبارتیں نظر سے گذریں جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ایک بالکل صحیح چیز ہے کتاب وسنت کے مطابق ہے اور اسی سے مستنبط ہے چنانچہ معنی اور مصداق کے اعتبار سے یہ دین وشریعت کی روح ہے کسی طرح اسکو بدعت نہیں کہا جا سکتا صاحب اعتصام لکھتے ہیں کہ:۔

تصوف متقدمین کے نزدیک دو معنی پر بولا جاتا تھا:۔

(۱) تخلق بکل خلق سنی اور تجرد عن کل خلق دنی یعنی تمام اخلاق حسنہ کے ساتھ متصف ہونا اور جملہ رذائل اخلاق سے اپنے کو پاک کرنا۔

(۲) الفناء عن نفسہ والبقاء لربہ یعنی اپنے نفس کو فنا کرنا اور بقاء باللہ حاصل کرنا۔

میں کہتا ہوں کہ آپ ان دونوں معنوں میں سے کس کو بدعت کہئے گا خُلق سنی کا اختیار کرنا بدعت ہے کہ خُلق دنی (برے اخلاق) سے تجرد بدعت ہے درآنحالیکہ کتاب وسنت (اعلیٰ اخلاق) انکی ترغیبات وترہیبات سے پُر ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ وَإِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (بلا شبہ آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں) وقال تعالیٰ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (تحقیق فلاح پائی اسنے جس نے نفس کا تزکیہ کرلیا اور خائب وخاسر ہوا وہ جس نے اسے (فجور) میں دبا دیا) وقال تعالیٰ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (جس شخص نے خوف کیا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے) وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں پیدا ہی کیا گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں)

اسی طرح سے اپنے نفس کو مٹانا اور تخلق باخلاق اللہ اختیار کرنا یا اللہ تعالیٰ کی صفات میں معرفت واعتبار کے ساتھ نظر کرنا انمیں سے کیا چیز بدعت

ہے؟ ظاہر ہے یہ سب چیزیں عین دین اور عین منشا رشارع ہیں لہٰذا اسے کیسے بدعت کہہ سکتے ہیں؟

اور اگر آپ یہ کہیں کہ لفظ تصوف بدعت ہے کیونکہ یہ کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں یہ لفظ بولا نہیں جاتا تھا تو میں کہونگا کہ اگر یہ بدعت ہے تو پھر علم کلام علم عقائد کے جو الفاظ آپ بولتے ہیں انکے متعلق آپ کیا کہیں گے کیونکہ عقائد وکلام تو خیر منصوص ہے لیکن ایک فن کو جو علم عقائد اور علم کلام کے ساتھ تعبیر کیا جانے لگا یہ پہلے اصطلاح کہاں تھی اور انھیں آپ کبھی بدعت نہیں کہتے بلکہ یہ علماء کے السنہ پر جاری وساری ہیں اور امت میں رائج ہیں اور خلفاً عن سلف کسی نے اسے بدعت نہیں کہا ہے ظاہر ہے کہ آپ جواب میں یہی کہیں گے کہ ان لفظوں سے اگرچہ انکا ذکر خیر القرون میں نہیں آیا لیکن مفہوم ومصداق کے اعتبار سے تو یہ کتاب وسنت کے ابحاث پر مشتمل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی گفتگو عقائد کے قبیل سے ہے اور اس گفتگو سے کتاب وسنت پُر ہے اور یہی سب بحثیں علم عقائد اور علم کلام میں کی جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بس اسی طرح تصوف کو سمجھ لیجئے کہ جب اسکا مصداق "تخلق بخلق سنی اور تجرد عن خلق دنی" یا "فنار عن نفسہ وبقار بربہٖ" کا ذکر کتاب وسنت میں موجود ہے تو اب محض اس وجہ سے کہ لفظ تصوف آپ کو کتاب وسنت میں نہیں ملتا آپ کا اس سے انکار کرنا انصاف سے کس قدر بعید ہے؟

بات یہ ہے کہ اصل مقصود معنی ومصداق ہوا کرتے ہیں اگر محض الفاظ پر نظر کو محصور رکھئے گا تو نزاع کا باب وسیع ہو جائے گا۔ حکایت مشہور ہے کہ تین شخص سفر میں جارہے تھے ایک عربی تھا دوسرا ترکی تھا تیسرا ایرانی، راستہ میں قیام کیا اور یہ طے پایا کہ باہم چندہ کر کے مشترکہ کوئی چیز منگائی جائے اور سب لوگ کھائیں۔ ایرانی نے کہا کہ طبیعت انگور کھانے کو چاہتی ہے۔ عربی نے کہا کہ نہیں بھائی عنب منگایا جائے اور ترکی نے کہا میری رائے ہے کہ استافیل منگایا جائے۔ دیکھئے تینوں شخص بات ایک ہی کہہ رہے تھے لیکن ایک دوسرے کی ناواقفیت کی وجہ سے ہر ایک نے یہ سمجھا کہ میرے ساتھی

کی رائے میری رائے کے خلاف ہے چنانچہ ہر شخص نے اپنی ہی رائے پر اصرار کیا اور بات یہانتک بڑھی کہ قریب تھا کہ نزاع شروع ہو جائے استنے میں ایک ایسا شخص آگیا جو تینوں زبانوں سے واقف تھا اس نے کہا کہ لائیے مجھے آپ سب لوگ پیسے دیجئے میں ابھی بازار سے لاتا ہوں چنانچہ بازار جاکر انگور خرید لایا اور ان سب کے درمیان رکھدیا سب کے سب بہت خوش ہوئے اور ہر ایک نے کہا کہ ہم تو یہی چاہتے تھے۔ علماء اس قصہ کو نزاع لفظی کی مثال میں بیان فرماتے ہیں یعنی صورتاً نزاع حقیقتاً کچھ نہیں پس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے ایک چیز نزاعی نہیں ہوتی لیکن الفاظ کا بگڑ اسکو نزاعی بنا دیتا ہے۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

اختلاف خلق از نام اوفتاد چوں بمعنیٰ رفت آرام اوفتاد

یعنی مخلوقات کے تمام جھگڑے اور اختلافات محض ظاہر کے اعتبار سے ہیں اگر ان سب کو معنیٰ اور اصل کی جانب راجع کر دیا جائے تو آرام مل جائے یعنی سارا اختلاف ختم ہو جائے میں سمجھتا ہوں کہ تصوف کے بارے میں جو لوگوں کو بعض غلط فہمیاں ہوئیں تو اس کا بھی منشا یہی ہوا کہ اسکی حقیقت پیش نظر نہ ہوسکی یا اسکے دقائق پیش نظر نہ ہوسکے۔ یہی اسکے انکار کا سبب بنا اور اسمیں شک نہیں کہ تصوف میں حقائق کے ساتھ ساتھ دقائق بھی ہیں صاحب اعتصام نے بھی جہاں تصوف کی بحث کی ہے اسکا عنوان یہ قائم کیا ہے کہ "الکلام فی دقائق التصوف"، اسی طرح سے شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "علم تصوف کمال دقیق است ہر کہ او را بخوبی می داند صدرا وغیرہ پیش او ہیچ نیست (بیاض ق ۲۳)

یعنی علم تصوف نہایت دقیق فن ہے جو شخص اس میں ماہر ہو جاتا ہے تو صدرا وغیرہ کی اسکے سامنے کچھ حقیقت نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شے فی نفسہ صحیح ہو لیکن اپنی دقت کی وجہ سے وہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے اور سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے لوگ اسکے منکر ہو جائیں۔

۔ میں نے یہ جو کہا کہ اصل مقصود الفاظ سے معنیٰ اور مصداق اور عنوان سے معنون ہوا کرتا ہے خود وہ الفاظ اور عنوان مقصود نہیں ہوتا تو آپ کے سامنے اسکی مثال بیان کرتا ہوں

گلستاں میں ہے کہ :-

"عبدالقادر جیلانی را دیدند رحمۃ اللہ علیہ در حرم کعبہ روے برحصار نہادہ بود ومیگفت اے خداوند بہ بخشائے واگر مستوجب عقوبتم مرا روز قیامت نابینا برانگیز تا در روے نیکاں شرمسار نباشم"

یعنی حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے دیکھا کہ حرم شریف کی کنکریوں پر پیشانی رکھے ہوئے یہ کہتے تھے کہ خداوندا مجھے بخش دیجئے اور اگر میں سزا ہی کا مستحق ہوں تو روز قیامت مجھے نابینا اٹھائیے تاکہ نیکوں کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔

اسی طرح سے ایک موقع پر شیخ سعدی علیہ الرحمہ اللہ تعالیٰ سے یوں مناجات فرماتے ہیں کہ ؎

رسم است کہ مالکان تحریر ... آزاد کنند بندۂ پیر
اے بار خدائے عالم آرائے ... بر سعدی پیر خود بہ بخشائے

یعنی قاعدہ ہے کہ غلاموں کے مالک اپنے غلام کے بوڑھا ہو جانے پر اسکو آزاد کر دیتے ہیں لہٰذا اے خدائے بزرگ و برتر جو کہ اس عالم کا سنوارنے والا ہے تو بھی اپنے اس بوڑھے سعدی کو بخش دے۔

اسی طرح سے امام اعظم رحمۃ اللہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مسجد میں عشار کی نماز ادا کی اور امام نے سورہ زلزلت پڑھی، نماز ختم ہونے پر اور سب تو اپنے اپنے گھر چلے گئے لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ رات بھر وہیں کھڑے رہے اور اپنی داڑھی پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہی عرض کرتے رہے کہ لے اللہ تو ذرہ برابر خیر کا بدلہ خیر سے دیگا اور ذرہ برابر شر کا بدلہ شر سے دیگا اپنے اس عبد نعمان پر رحم فرما اور اسکو دوزخ کی آگ سے نجات دیدے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حرم کعبہ میں جو کچھ فرما رہے تھے یا شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جن لفظوں میں دعار کی ہے اور مغفرت طلب کی ہے اسی طرح امام صاحب نے طلب مغفرت کا جو عنوان اور طریقہ اختیار فرمایا بعینہ ان لفظوں میں اور اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے بلکہ

شیخ سعدی نے تو زبان ہی دوسری اختیار کی یعنی فارسی میں کہا، بایں ہمہ آپ ان سکو بدعت نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ ان سب الفاظ اور عنوان کے ذریعہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے آگے آہ وزاری اور ابتہال فرما رہے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اَسْئَلُکَ مسئلۃ المسکین و ابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل یعنی اے اللہ میں سوال کرتا ہوں سوال کرنا بیکس کا سا اور گڑگڑاتا ہوں گڑگڑانا گنہگار ذلیل کا سا پس ان سب حضرات کی دعاؤں میں بھی معناً ابتہال موجود ہے لیکن نہ تو سب کے الفاظ ہی عربی میں ہیں اور نہ ان حضرات نے لفظ ابتہال ہی استعمال کیا ہے لیکن یہ سب حضرات ابتہال کی سنت کو ادا کرنے والے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں جو امور وارد ہیں وہاں مقصود انکا مصداق اور معنون ہے الفاظ اور عنوان مقصود نہیں چنانچہ لفظ تصوف کو بھی اسی قبیل سے سمجھ لیجئے کہ معنون اس کا کتاب وسنت میں موجود ہے اگرچہ لفظ تصوف قرآن وحدیث میں نہ آیا ہو۔ اب محض اس اتنے کی وجہ سے یہ چیز بدعت تو نہ ہو جائیگی۔ باقی ان حضرات نے اپنے طریق کے لئے اس لفظ کو کیوں اختیار کیا اسکی وجہ ہم نے اپنے سابق مضمون "تصوف" میں مفصل بیان کی ہے۔

یہاں ایک اور بات سمجھ لیجئے کہ صاحب اعتصام تصوف کے جو دو معنی بیان فرما رہے ہیں یعنی تخلق و تجرد اور فنا وبقا تو یہ دونوں چیزیں اتصاف کے قبیل سے ہیں یعنی صفات ہیں کہ جن سے انسان متصف ہوتا ہے یعنی یہ عملی چیزیں ہیں پس تصوف اصل میں تو اتصاف ہی کا نام ہے مگر کسی چیز کے ساتھ اتصاف کیلئے چونکہ پہلے اسکا علم ہونا ضروری ہے اسلئے علم تصوف نے کچھ دنوں بعد ایک نہایت مرتب اور مہذب شکل اختیار کر لی اور چونکہ یہ خالص دینی چیز تھی اسلئے علماء ظاہر ابتداءً اس سے گھبرائے کہ دین میں یہ نئی چیز کیا ؛ چنانچہ کبار علماء کے مقولے کتابوں میں درج ہیں کہ انھیں ابتداء میں مشائخ کے طریق کا انکار رہا ہے یہاں تک کہ انھوں نے ازراہ تعجب لوگوں سے یہ پوچھا ہے کہ فلاں شیخ کے گرد لوگ کیوں جمع ہوتے ہیں اور وہ ان سے کیا باتیں کرتے ہیں ؟ چنانچہ شیخ عبادہ جو ایک زبردست مالکی عالم گذرے ہیں وہ اپنے زمانہ کے شیخ مدین رحمۃ اللہ علیہ پر انکار کرتے تھے کہ الیش ھذہ الطریق التی

Scanned with CamScanner

بزعم ھولاء نحن لا نعرف الا الشرع یعنی یہ مشائخ اپنے کو جس طریق پر کہتے ہیں یہ کیا چیز ہے؟ ہم تو سوائے شریعت کے اور کچھ جانتے نہیں۔ چنانچہ انھیں شیخ عبادہ کے بعض شاگرد جب شیخ مدین کی مجلس میں پہونچے اور انکی صحبت اختیار کی تو انکے درس میں شریک ہونا چھوڑ دیا اس پر شیخ عبادہ کو اور برہمی ہوئی اور انکا صوفیا پر انکار اور زیادہ بڑھ گیا یہانتک کہ شیخ مدین کے یہاں سال میں ایک مرتبہ دعوت ہوتی تھی اس میں انھوں نے شیخ عبادہ کو بھی مدعو کیا اور اپنے مریدین سے کہدیا کہ شیخ آویں تو نہ کوئی گردن اٹھا کے انھیں دیکھے اور نہ انکی تعظیم کیلئے کھڑا ہو اور نہ انکے لئے مجلس میں آ گئے بیٹھنے کیلئے جگہ خالی کرے چنانچہ شیخ عبادہ آئے اور حلقہ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اس انتظار میں کہ کوئی پوچھے تو بیٹھیں مگر نہ تو شیخ نے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ کسی اور شخص نے یہاں تک کہ اسی طرح ٹہلتے رہے اور چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا کتاب میں لکھا ہے کہ حتیٰ کاد یتمیز من الغیظ ساعۃ طویلۃ یعنی اتنی دیر گذر گئی اور اتنا غصہ آیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ بس ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جائیں گے اتنے میں شیخ مدین نے سر اٹھایا دیکھا تو شیخ عبادہ کھڑے ہوئے ہیں لوگوں سے کہ بھائی شیخ عبادہ کے لئے جگہ دو اور ان کو اپنے پاس بلا کر قریب بیٹھا لیا اور اس کے بعد شیخ عبادہ سے فرمایا ایک سوال سامنے آگیا ہے انھوں نے کہا فرمائیے پوچھا کہ مشرکین سے اگر کسی خوف کا اندیشہ نہ ہو تو کیا ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونا آپ کے نزدیک جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا نہیں۔ پھر شیخ مدین نے ان سے کہا آپ کو قسم دیکر پوچھتا ہوں سچ بتائیے آپ جب تشریف لائے اور آپ کے آنے پر کوئی شخص کھڑا نہیں ہوا تو اس سے آپ پر کچھ تکدر ہوا تھا یا نہیں؟ انھوں نے اقرار کیا کہ بیشک ہوا تھا۔ پھر اسکے بعد شیخ مدین نے ان سے دوسرا سوال کیا کہ اچھا یہ بتائیے کہ آپ سے کوئی انسان یہ کہے کہ میں تم سے راضی نہ ہونگا مگر یہ کہ تم میری ایسی ہی تعظیم کرو جیسی تعظیم اپنے رب کی کرتے ہو تو آپ اس سے کیا فرمائیں گے؟ انھوں نے کہا کہ میں اس سے کہونگا کہ تم نے کفر کی بات کہی (یعنی یہ تو کھلا ہوا شرک ہے) اس کے بعد باہم کچھ مختصر سی باتیں ہوئیں کہ اتنے میں شیخ عبادہ برسر مجمع کھڑے ہو گئے اور فرمایا لوگو! گواہ رہو کہ میں اسوقت شیخ مدین کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہوں کہ آج میرا اسلام میں داخلہ کا پہلا دن ہے

چنانچہ پھر اسکے بعد سے شیخ عبادہ شیخ مدین کی خدمت میں رہ پڑے یہاں تک کہ انھیں کے یہاں وفات پائی اور تربۃ الفقراء میں دفن ہوئے۔

(طبقات الکبری ص ۹۴)

اسی طرح سے حافظ ابن حجر کا واقعہ علامہ شعرانی نے الیواقیت میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے ابن فارض کے بعض ابیات تائیہ کی شرح لکھی اور انھیں شیخ مدین کی خدمت میں برائے تقریظ پیش کیا انھوں نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھ دیا کہ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

سارت مُشرقةً وسرت مغربا شتان بين مشرق ومغرب

(یعنی (میری محبوبہ) مشرق کو چلی گئی اور میں نے مغرب کی راہ لی، ظاہر ہے کہ مشرق و مغرب میں بون بعید ہے)

مطلب یہ تھا کہ آپ نے اس کوچہ میں تو کبھی قدم رکھا نہیں ہے بلکہ آپ تو علوم ظاہری کے پڑھنے پڑھانے میں رہے ہیں باطن سے متعلق امور کو آپ کیا جانیں؟ غرض یہ بات لکھکر حافظ ابن حجر کے پاس انکی تحریر واپس کر دی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر کو تنبہ ہوا کہ واقعی میں اتنی بڑی دولت سے غافل ہوں۔ اہل طریق کا اذعان کیا اور انھیں شیخ مدین کے یہاں رہ پڑے اور زندگی ختم کر دی۔

(الیواقیت ص۱۵ ج ۱)

یہ واقعات میں نے اس پر بیان کئے کہ ہر زمانہ میں علماء ظاہر کو ابتداءً طریق سے انکار اور مشائخ سے وحشت رہی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی عنایت ان کے شامل حال ہوئی اور جہل و عناد کا پردہ قلب سے ہٹا تو پھر ان حضرات کی اور فن کی حقیقت منکشف ہوئی۔ چنانچہ جب علماء نے کسی شیخ کو مانا ہے تو بہت ہی زیادہ مانا ہے۔ علماء طریق نے اس قسم کے واقعات کو جمع کر دیا ہے جن سے اہل ظاہر کا ابتداءً مشائخ پر انکار اور انتہاءً ان سے اعتذار کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایسے بھی واقعات بیان فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء محققین اور مشائخ کاملین

کا اتباع سنت میں بھی قدم راسخ تھا چنانچہ یہ حضرات اس باب میں بھی علمائے ظاہر سے کچھ پیچھے نہ تھے بلکہ ان کے خلوص ہی کی برکت تھی کہ انکا صرف ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا کرنے میں وہ تاثیر رکھتا تھا کہ علمائے ظاہر بڑی بڑی تقاریر سے بھی اس جیسے اثر کے پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ اور یہ اس لئے کہ علمائے ظاہر کی رسائی تو صرف حدیث ہی تک ہوتی تھی اور ان حضرات کی رسائی صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو جاتی تھی۔ وہ حضرات تو صرف قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامل ہوتے ہیں اور ان حضرات کو حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حصہ ملا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے عمل میں ایک روح اور قول میں جان ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکے اسی روح اور اثر کا بیان شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بہت ہی خوب فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"اولیاء اللہ کا کلام نامرد کو مرد اور مرد کو شیر مرد بنا دیتا ہے"

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تاثیر کلام کو نہایت اچھے عنوان سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

گفتِ انساں پارۂ انساں بود پارۂ از ناں یقیں ہم ناں بود

(یعنی انسان کا کلام مثل جزو انسان کے ہے تابع ہوتے ہیں۔ پس جیسا متکلم ہوگا ویسا ہی اس کا کلام بھی ہوگا۔ جس طرح سے کہ روٹی کا ٹکڑا روٹی ہوتا ہے)

چنانچہ جب یہ حضرات کامل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے انکی نسبت صحیح ہوتی ہے تو پھر انکے قلبی حال کا اثر انکے کلام میں بھی آجاتا ہے۔

یہ کہہ رہا تھا کہ ہر زمانہ میں اہل طریق میں سے کاملین اور قابل اتباع وہی حضرات سمجھے گئے ہیں جنکا قدم عمل بالشریعت اور اتباع سنت میں راسخ تھا۔ اسوقت میں آپکے سامنے اس امر کے اثبات کیلئے دو واقعات بیان کرتا ہوں جنھیں میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں اور اسوقت پھر بیان کرتا ہوں' ان سے ان حضرات کا شریعت محمدیہ

Scanned with CamScanner

کے ساتھ شغف اور تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے مکتوبات میں ہے کہ شیخ الاسلام شیخ فتح اودھی تین روز متواتر سماع میں مشغول رہے اور پانچوں وقت نمازیں ادا کرتے رہے۔ تین دن کے بعد جب سکون ہوا تو احباب نے عرض کیا کہ تین دن گذر گئے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ ان ایام میں میں نے نماز ادا کی ہے؟ عرض کیا جی ہاں حضرت نے سب نمازیں ادا فرمائی ہیں۔ اس کے بعد شیخ محمد عیسیٰ جو حضرت کے خلیفہ تھے ان کے پاس یہ مسئلہ دریافت کرنے کیلئے بھیجا کہ ان ایام میں مجھے ہوش نہیں تھا تو میں نے جو نمازیں پڑھی ہیں وہ صحیح بھی ہوئی ہیں یا نہیں؟ شیخ محمد عیسیٰ نے جواب میں لکھا کہ حقیقت میں نماز تو وہی ہوئی جو حضرت مخدوم نے (اس حالت میں کہ قلب ماسوی اللہ کے تعلق کو چھوڑ چکا تھا) ادا فرمائی لیکن شریعت کی رعایت کیوجہ سے دوبارہ پڑھ لیں۔ سبحان اللہ حضرت کا یہ حال اور ان کا یہ فتویٰ عدیم المثال ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت جب ہوش نہیں تھا تو نمازیں وقت اور تعداد رکعت وغیرہ کا اہتمام کیسے فرماتے تھے؟ حضرت رح نے فرمایا کہ انکو اِدہر کا ہوش نہیں تھا لیکن اُدہر کا پورا ہوش تھا۔

میں کہتا ہوں کہ واقعی عجیب حال ہے بیہوش ہیں لوگ سمجھ رہے ہیں کہ انکو ہوش نہیں ہے لیکن وضو نماز اور رکعتوں کی تعداد وغیر سب چیزیں صحیح طور پر ادا ہو رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ ان حضرات کے کمال تعلق مع اللہ اور اہتمام بالاوامر کی بین دلیل ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ان حضرات کی کرامت بھی ہے اور استقامت بھی۔ دوسرا واقعہ سنیئے۔

سیر الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ شرف الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے لب کے بال بہت بڑھ گئے تھے مگر کسیکی ہمت نہوتی تھی کہ انکو کاٹ دے قاضی ضیاء الدین سنامی قدس سرہٗ چونکہ شریعت کا جوش دلمیں رکھتے تھے ایکدن

انھوں نے ایک ہاتھ میں قینچی لی اور دوسرے سے انکی ریش مبارک پکڑ کر انکے لب کے بال کاٹ دیئے اس واقعہ کے بعد حضرت ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دیتے تھے اور یہی فرماتے تھے کہ یہ ایک بار شریعت محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے (اسلئے قابل قدر ہوگئی ہے) سبحان اللہ سنت اور شریعت کی محبت ملاحظہ فرمائیے کہ اصل چیز تو الگ رہی جس چیز کو سنت اور شریعت سے ذرا بھی نسبت ہو جاتی تھی اسکا بھی یہ حضرات اس درجہ احترام فرماتے تھے اور بالکل اسکا مصداق تھے کہ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ انھوں نے تیرے جمال کا مشاہدہ کیا ہے اور اپنے پیروں پر فدا ہوتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہونچے ہیں اور اپنے ہاتھ پر ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ اس نے تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچ لیا ہے۔

چونکہ شریعت میں دو گواہ ہوتے ہیں اسلئے انھیں دو واقعات پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ بزرگوں کے اس قسم کے واقعات سے دفاتر بھرے ہوئے ہیں اور شریعت کا ادب ان حضرات کے قلوب میں اسدرجہ راسخ تھا کہ اسکی مخالفت تو کیا کرتے کبھی کوئی موقع آگیا ہے اور گنجائش بھی ہوئی تب بھی اسکی مزاحمت تک گوارا نہ کی

ایک بزرگ کتا پالے ہوئے تھے ایک عالم انکے یہاں تشریف لے گئے انھوں نے اسپر نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت حدیث شریف میں کتا پالنے کی ممانعت آئی ہے۔ یہ آیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے حالانکہ حدیث شریعت میں استثنا بھی آیا ہے یعنی حراست (حفاظت ۱۲) کے لئے اور شکار کے لئے کتا پالنا جائز ہے وہ بزرگ اتنا تو جانتے ہی تھے مگر انھوں نے ان عالم کی زبان سے یہ حدیث سنکر ذرا بھی مزاحمت نہیں کی بلکہ اس کتے کو مخاطب کرکے کہا کہ بھیّا! یہاں سے چلے جاؤ مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ نبی ؐ صاحب نے کتا پالنے کو منع فرمایا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کتا اٹھا اور ایک طرف کو چل دیا

پھر اسکے بعد کسی نے اسکو وہاں دیکھا نہیں معلوم نہیں کسی اور شہر چلا گیا یا کہیں ڈوب مرا۔ بہرحال ان بزرگ کا یہ عمل یعنی شریعت کی اتباع اور سنت سے عدم مزاحمت اور انکی صحبت کی وجہ سے کتے پر یہ اثر قابل عبرت ہے۔

غرض یہ حضرات اپنی ایک روشن تاریخ رکھتے ہیں اور چونکہ یہ ایک فعّال جماعت تھی اسلئے کسی کی مجال نہ تھی کہ انکو کچھ کہہ سکے۔ لیکن اب جو صوفیہ کے متعلق لب کشائی کی جرأت ہو جاتی ہے یا اس سے بھی آگے بڑھکر تصوف ہی کا جو انکار ہو رہا ہے تو یہ بات نہیں کہ جماعت کوئی بری جماعت ہے یا تصوف کوئی بری چیز ہے، بلکہ ہوا یہ کہ جو لوگ اس جماعت میں داخل ہو گئے بہت سے ان میں ایسے بھی تھے جو اسمیں داخل ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ جس جگہ اور جس جماعت میں نااہل پہونچ جائیں گے تو وہ جگہ فاسد اور وہ جماعت بدنام ہو ہی جائیگی۔ اب اسکی وجہ سے اصل شئے کو تو برا نہیں کہہ سکتے اور نہ اسکا انکار ہی کر سکتے ہیں ورنہ تو تعلیم و تعلم وعظ و تبلیغ حتیٰ کہ ایمان و اسلام ان میں سے کونسی چیز آج خیر القرون کے مانند موجود ہے حالانکہ انکا کوئی بھی منکر نہیں بلکہ یہاں نقص کی نسبت لوگوں ہی کی جانب کیجاتی ہے۔

میں یہاں ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ ان حضرات کی حقانیت کی ایک روشن دلیل یہ بھی ہے کہ جس طرح کہ انھوں نے علمائے ظاہر کو انکی خشکی پر تنبیہ فرمائی ہے اور اس سے نکلنے کی ترغیب دی ہے اسی طرح سے اپنے ہم مشرب یعنی جماعت صوفیاء میں جو غیر مخلص داخل ہو گئے ہیں انکی بھی کچھ کم خبر نہیں لی ہے ایسا ایسا کہا ہے کہ کیا کوئی دوسرا کہے گا۔ مثال کے طور پر ہم یہاں سید احمد کبیر رفاعی قدس اللہ سرہٗ جو اپنے زمانہ کے شیخ کامل اور زبردست مصلح تھے انکا کلام پیش کرتے ہیں۔ علماء کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

"تجھکو تیرے دعویٰ علم نے تباہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اے اللہ میں ایسے علم سے جو نفع نہ دے آپکی پناہ

مانگتا ہوں (اب بتلا جس علم سے حضورؐ نے پناہ مانگی ہے اس پر تیرا ناز کہانتک زیبا ہے) اسے محبوب تو ہمارے دروازوں پر پہرہ دے کیونکہ تیرا جو وقت اور لمحہ ہمارے دروازوں پر گذرے گا وہ تیرے لئے ایک اعلیٰ درجہ اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کا وقت ہوگا کیونکہ ہمارا رجوع اللہ کی طرف صحیح ہو چکا ہے (اسلئے جو ہمارے پاس آتا ہے اسکو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کی توفیق ہوجاتی ہے)

(فائدہ) دیکھئے فرما رہے ہیں کہ اسے محبوب تو ہمارے دروازوں کا پہرہ دے اور آگے اسکی وجہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ اسلئے کہ ہمارا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہو چکا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جسکا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہو چکا ہے یعنی صدق پیدا ہو چکا ہے تو اسکو حق ہے کہ دوسروں کا رجوع صحیح کرانے کیلئے انکو اپنی طرف دعوت دے اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا رجوع تو صحیح ہو چکا ہے لہٰذا میرے واسطے سے انکا رجوع بھی صحیح ہو جائے گا لیکن جسکا اپنا رجوع ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہ ہوا ہو اور جس کے اندر ابھی خود ہی صدق نہ پیدا ہوا ہو اسکے لئے اسطرح کی باتیں کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ رہزنی ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ یعنی ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری جانب رجوع کر چکے ہیں۔ (سیدنا رفاعیؒ نے اپنے قول کی کہ ہمارے دروازوں کا پہرہ دے یہ دلیل بیان فرمائی)

(البنیان المشید ص۵۵)

اسی طرح سے ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

بزرگو! ذکر اللہ کی پابندی کرو کیونکہ ذکر وصال حق کا مقناطیس ہے قرب کا ذریعہ ہے۔

(فائدہ) یہ جو فرمایا کہ وصال حق کا مقناطیس ہے یہ اصل وضع کے اعتبار سے ہے اور اسکے لئے شرط یہ ہے کہ انسان میں صدق اور طلب ہو اسکے ساتھ جب ذکر کیا جائے گا تو بلا شبہ وہ وصال حق کا مقناطیس ہی ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی اور چیز کی آمیزش ہو جائیگی تو پھر وہ ذکر وصال حق کا ذریعہ تو کیا ہوگا پاگل ہو جانے اور دماغ ہی خراب ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے واقعات میں اسکا مشاہدہ کیا ہے کہ ذکر بالجہر یا کثرت ذکر کیوجہ سے لوگ پاگل تک ہو گئے ہیں اور جنگل کا راستہ لیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں:۔

"جو اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے اور جو اللہ سے مانوس ہوا وہ اللہ تک پہونچ گیا (مگر یاد رکھو کہ) ذکر اللہ صحبت مشائخ کی برکت سے دل میں جمتا ہے (کیونکہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے (تو ایسے لوگوں سے تعلق پیدا کرو جن کے دل میں خدا کی یاد جم چکی ہے تم کو بھی یہ دولت نصیب ہوگی ورنہ غافلوں کی صحبت میں رہکر یا تنہا خلوت میں رہکر یہ دولت حاصل نہ ہوگی) ہم سے صحبت پیدا کرو (کیونکہ) ہماری صحبت آزمایا ہوا تریاق ہے (اور) ہم سے دور رہنا زہر قاتل ہے۔

(فائدہ) میں کہتا ہوں کہ مشائخ کی صحبت کو تریاق اسلئے فرمایا کہ حُبّ دنیا حُبّ جاہ اور محبتِ مال ایک قسم کا زہر ہے اور تریاق زہر مار کو کہتے ہیں پس جس طرح سے تریاق کا استعمال زہر کے اثر اور اسکے ضرر کو ختم کر دیتا ہے اسی طرح اہل اللہ کی صحبت بھی انسان سے حب مال و حب جاہ کے ضرر کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ یہ لوگ خود اپنے دل سے اسکی محبت ختم کر چکے ہوتے ہیں اسلئے جو انکی صحبت میں رہتا ہے اس سے بھی یہ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ صحبت کا اثر لازمی ہے۔ اور میں یہاں ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح سے بزرگوں کی صحبت اپنی شرائط معتبرہ یعنی صدق و طلب کے ساتھ تریاق ہے اسی طرح سے بزرگوں کا پانا اور انکی خدمت میں پہونچکر بھی اخلاص

نہ حاصل کرنا اور اپنے اندر صدق وطلب نہ پیدا کرنا یہ بھی اس جاننے والے کے لئے عذاب ہے۔ سیدنا رفاعیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہم سے دور رہنا زہر قاتل ہے لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ صرف دور ہی رہنا نہیں بلکہ قریب بھی رہنا مگر شرائط صحبت نہ اختیار کرنا اور صدق وطلب اپنے اندر نہ پیدا کرنا یہ بھی سم قاتل ہے۔ چنانچہ منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں آتے اور واللہ باللہ تاللہ کہتے تھے لیکن اخلاص نہیں حاصل کیا اس لئے اسی میں ختم ہی ہو گئے۔ آگے فرماتے ہیں کہ :-

"اے ہم سے محجوب رہنے والے تیرا یہ خیال ہے کہ عالم بنجانے کے بعد تجھے ہماری ضرورت نہیں (بتلا) اس علم سے کیا فائدہ جس پر عمل نہیں اور اس عمل سے کیا فائدہ جس میں اخلاص نہیں (اور اخلاص کا حاصل کرلینا آسان نہیں وہ لفظوں کے یاد کرلینے سے حاصل نہیں ہوتا) اخلاص ایک خطرناک راستہ کے (پار اس) کنارے پر ہے (اب بتلا) تجھے عمل کیلئے کون اٹھائے گا۔ ریا کے زہر کا کون علاج کرے گا جو تیرے اندر بھرا ہوا ہے اور اخلاص حاصل ہوجانے کے بعد تجھے بے خوف و خطر راستہ کون دکھائے گا (کیا یہ درسی کتابیں اور کتابوں کے پڑھانے والے بتلائیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں) جاننے والوں سے پوچھو اگر تم خود نہیں جانتے فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ خدائے علیم وخبیر نے ہمکو یہی طریقہ بتلایا ہے (کہ جس بات کا تم کو علم نہ ہو جاننے والوں سے معلوم کرو) ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ :-

"عزیز من! مجھ سے دل کا علم یعنی روحانی علم تو لے لے۔ مجھ سے شوق کا علم لے لے (یہ سب کچھ تو لے سکتا ہے مگر) اے محجوب (یعنی اے محروم) تو مجھ سے کہاں سے لے سکتا ہے۔ مجھے تو تجھ سے پہلے ہی حقیقت کا کشف ہو چکا ہے (یعنی میں جانتا ہوں کہ تجھکو ان علوم

سے میرے الفاظ کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ تجھے مجھ سے مناسبت ہی نہیں تو میرا دل میرا ذوق تجھکو نہیں مل سکتا اور جب تک تو میرے دل کو میرے ذوق کو نہ لیگا کام نہیں چلے گا) عزیز من اگر تو میری نصیحت کان لگا کر دل سے سنتا تو میرا اتباع کرتا (جب تو اتباع نہیں کرتا تو یہ اسکی دلیل ہے کہ تیرا دل میری باتوں کو قبول نہیں کرتا)"

(البنیان المشید ص۴۹)

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:-

"بزرگو! تمھارے اندر بعضے فقہا اور علما بھی ہیں۔ تم وعظ کی مجلسیں بھی منعقد کرتے ہو درس بھی دیتے ہو احکام شرعیہ بھی بیان کرتے ہو (مفتی بنکر) لوگوں کو احکام بھی بتلاتے ہو خبردار چھلنی کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ عمدہ آٹا تو نکال دیتی ہے اور بھوسی اپنے پاس رہنے دیتی ہے اسی طرح (تمھارا یہ حال نہ ہونا چاہیے کہ تم اپنے منہ سے تو حکمت کی باتیں نکالتے رہو اور دلوں میں کھوٹ رہ جائے کہ اسوقت تم سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر (عمل کرنے کا) مطالبہ کیا جائیگا اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ یعنی کیا دوسروں کو تو نیکی کی تاکید کرتے ہو اور اپنے آپ کو نیکی سے بھلائے دیتے ہو۔

(البنیان المشید ص۸۹)

یہ سارا خطاب علمار کو تھا اسی طرح سے اپنے زمانے کے صوفیوں کو بھی ان کے رسوم پر سخت تنبیہ فرماتے ہیں چنانچہ ان پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

پہلے صوفی بن جا تاکہ ہم بھی تجھے صوفی کہیں۔ میرے پیارے تیرا یہ گمان ہے کہ یہ طریقت تیرے باپ کی میراث ہے، تیرے دادا سے سلسلہ بسلسلہ چلی آرہی ہے، تیرے پاس بکر وعمر کے نام سے آجائیگی تیرے شجرہ نسب میں داخل ہو جائیگی، تیرے خرقہ کے گریبان پر تیرے

کلاہ پر منقش ہو جائے گی۔ تو نے سرمایۂ طریقت کو سمجھ لیا ہے کہ اونچی لباس ہو ایک کلاہ ہو، ایک لاٹھی ہو، ایک گدڑی، ایک بڑا سا عمامہ ہو، بزرگوں جیسی شان و صورت ہو۔ نہیں خدا کی قسم اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تیرے دل کو دیکھتا ہے۔ تیرے دل میں خدا کے اسرار اور اسکے قرب کی برکت کیونکر ڈالی جائے کہ وہ تو کلاہ و خرقہ و تسبیح اور عصا اور ٹاٹ کے حجابوں میں گرفتار ہو کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو رہا ہے یہ عقل کس کام کی جو نور معرفت سے کوری ہو۔ یہ سر کس کام کا جو جوہر عقل سے خالی ہو۔ اے مسکین تو نے اس جماعت کے جیسے کام تو کئے نہیں اور ان کا لباس پہن لیا۔

عزیز من! اگر تو اپنے دل کو مار کر خوف کا لباس پہن لیتا اور ظاہر کو لباس ادب سے آراستہ کرتا اور نفس کو ذلت کا لباس پہناتا اور انانیت (تکبر) کو فنا کا لباس پہناتا اور زبان کو ذکر کے لباس سے آراستہ کرتا اور ان سب حجابوں سے (جن میں تو پھنسا ہوا ہے) چھوٹ جاتا اسکے بعد اگر یہ لباس پہنتا تو تیرے لئے بہت بہتر ہوتا (اور) بہت بہتر ہوتا مگر تجھ سے یہ بات کیونکر کہی جائے (یہ تیری سمجھ میں نہ آئیگی) تو نے تو سمجھ لیا ہے کہ میری کلاہ اس جماعت جیسی کلاہ ہے۔ میرا لباس انکے لباس جیسا ہے سب کی صورتیں ملی جلی ہیں (مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے) حالانکہ دل مختلف ہیں (اور سب سے زیادہ ضرورت دل ہی کے ملنے کی ہے) اگر تجھکو اپنی حقیقت معلوم ہوتی تو ماں، باپ، دادا، چچا اور لمبا کرتا اور کلاہ و تخت و زینہ سب سے الگ ہو جاتا اور خدا کی قسم (خدا کو ڈھونڈھنے کیلئے) ہمارے پاس آتا اور پھر اچھی طرح ادب حاصل کرکے یہ لباس پہنتا۔ اور میرا گمان تو یہ ہے کہ حسن ادب (حاصل ہو جانے) کے بعد تو اپنے نفس کو اس لباس اور تمام فضولیات سے جو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہیں خود ہی الگ

کرے گا۔

اے مسکین! تو (اسوقت) اپنے وہم پر چل رہا ہے۔ اپنے خیال پر راستہ طے کر رہا ہے۔ اپنے جھوٹ اور عجب وغرور کے ساتھ چل رہا ہے انانیت (اور تکبر) کی ناپاکی لادے ہوئے ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے (تکبر کے ساتھ ایک قدم بھی طے نہیں ہو سکتا) تواضع کا علم سیکھ، عبرت کا سبق پڑھ، مسکنت اور انکسار کا علم حاصل کر۔

(البنیان المشید ص۴۳)

اسی طرح سے دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

عزیز من! ان مسکین صوفیوں سے جو حجاب میں پڑے ہوئے ہیں پوچھو کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے شہروں میں کوئی ایسا عالم موجود رہے جو بدعتیوں کے شبہات کا روشن دلیلوں سے جواب دیتا رہے (اگر نہیں چاہتے تو یہ تمھاری جہالت اور حماقت ہے اور اگر چاہتے ہو تو علماء کی ضرورت کو تم نے تسلیم کر لیا پھر ان پر اعتراض اور انکار کیوں کرتے ہو)۔

عزیز من! اسی طرح ان غریب علماء سے بھی جو حجاب میں پڑے ہوئے ہیں پوچھو کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے شہروں میں کوئی ایسا شخص رہے جو زبردست کرامتوں سے منکروں اور گمراہوں اسلام کے مخالفوں معاندوں کو دبا دے (اور مغلوب کر دے) جنکو دیکھکر مخالفین اسلام خود ہی بول اٹھیں کہ واقعی اسلام سچا مذہب ہے بحث وتکرار کی نوبت ہی نہ آوے۔ کیا تمھارا دل یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی زبان کا سلسلہ بند ہو جائے۔ تمھارے نفس یہ خواہش کرتے ہیں کہ معجزات نبویہ کی سلطنت خالی رہے (اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو اپنے ایمان کی خیر مناؤ) اگر نہیں تو بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی ترجمان کون ہے اور حضور ص کے معجزات کا نمونہ کس کے پاس ہے؟ تمھارے یا

صوفیہ کے ؟ اگر یہ لوگ نہ رہے تو حضورؐ کے روحانی اور باطنی کمالات کا
نمونہ دنیا کو کون دکھلائے گا آیت یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ
آمَنُوا مَعَہٗ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ (جس دن
کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو ان کے ساتھ ایمان والے ہیں انکو رسوا نہ کریگا
ان کا نور آگے آگے اور دائیں جانب چلتا ہوگا)۔ گواہی دے رہی
ہے کہ نبوت احمدیہ کی یہ باطنی زبان اور سلطنت محمدیہ ہمیشہ باقی
رہیگی (اور آیت) نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ
(ہم تمھارے اولیار ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) ان حقائق
کے دوام (بقا) کو ثابت کر رہی ہے تم (اس تفریق سے کہ صوفی علمار پر
اعتراض کرتے اور علمار صوفیہ پر) اپنی بربادی کے لئے کنواں کھود رہے ہو۔

اے خواص ! اے عوام ! اے وہ حضرات جو دونوں قسم کی
شان رکھتے ہو تم سب ایک ہی جماعت ہو اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے یعنی اسلام (کسی نے کیا خوب کہا ہے

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی اسکا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں)

اسی طرح سے ایک اور مقام پر دونوں جماعتوں کو انکے مقصود کی جانب متوجہ فرماتے
ہیں اور انکے حقیقی نقص پر جو دونوں جماعتوں میں مشترک ہے تنبیہ فرماتے ہوئے کہتے
ہیں :-

بزرگو ! صوفیہ کے طریق کا منتہیٰ وہی ہے جو فقہا کے طریق کا منتہیٰ ہے اور فقہا،

Scanned with CamScanner

کے طریق کا منتہیٰ وہی ہے جو صوفیہ کے طریق کا منتہیٰ ہے۔ جن گھاٹیوں میں پھنس کر فقہاء مقصود کی طلب سے رہ جاتے ہیں انھیں گھاٹیوں میں صوفیہ بھی اپنے سلوک میں مبتلا ہوتے ہیں (دونوں کو مقصود سے روکنے والی ایک ہی چیز ہے یعنی غرض نفسانی اور محبت دنیا اور حب جاہ۔ اور دونوں کو مقصود تک پہونچانے والی بھی ایک ہی چیز ہے یعنی اخلاص اور ماسوائے حق سے رُخ پھیر لینا) طریقت عین شریعت ہے اور شریعت عین طریقت ہے۔ دونوں میں صرف لفظی فرق ہے اصل اور مقصود اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے (اور نزاع لفظی کو ہم مثال سے سمجھا چکے ہیں) میرے نزدیک جو صوفی فقیہ یعنی عالم کی حالت پر انکار کرے یقیناً مبتلائے قہر ہے اور جو فقیہ، صوفی کی حالت پر انکار کرے وہ بھی راندۂ درگاہ ہے۔ ہاں اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کر رہا ہو شریعت کے موافق نہ چلتا ہو تو پھر ایک دوسرے کو برا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں۔ پس یہاں صوفی کامل اور فقیہ عارف مراد ہے (یعنی ان دونوں کا منتہی ایک ہے اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے پر انکار نہیں کر سکتے۔ اور اگر کریں گے تو یقیناً وہ تصوف اور علم شریعت سے ناواقف ہونے کی بنیاد پر کریں گے۔

(البنیان المشید ص۱۸۵)

میں کہتا ہوں دیکھئے سیدنا رفاعیؒ حقیقی صوفی پر انکار کرنے سے منع فرما رہے ہیں، اور آج یہ حال ہے کہ اصل تصوف ہی کا انکار کیا جا رہا ہے یہ بھلا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ باقی سیدنا رفاعی نے اپنی ان عبارات میں جو ذرا تیز تیز کہا تو اسکا منشاء یہ ہے کہ اپنے پاس آنے والوں کو حقیقت کیطرف رجوع کراتے ہیں کہ انکی طرف رجوع کرنے سے دنیاوی اغراض مدنظر نہ ہونا چاہیئے مثلاً مال جاہ

کیونکہ وضع ان حضرات کی دنیا میں مخلوق خدا کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے ہے اگر یہ لوگوں کو حاصل نہو تو یہ قلب موضوع ہے اور خلاف منشاء الٰہی ہے۔ اور (اسی لئے) اس جماعت کا اصل دین الٰہی کا حاکی ترجمان ۱۲ ہونا ضروری ہے ورنہ پھر فساد ہی فساد ہے۔

حضرت رفاعیؒ نہایت ہی متواضع بزرگ گذرے ہیں سخت کلامی اور درشت گوئی انکی عادت نہیں تھی لیکن یہ حضرات جب سمجھ لیتے تھے کہ بدون لہجہ کچھ سخت اختیار کیے ہوئے مخاطب پر اثر نہیں پڑے گا اسوقت اپنی طبیعت کے بالکل خلاف محض اسکی مصلحت سے کچھ تیز بھی کہدیتے تھے

میں کہتا ہوں یہ حضرات اس باب میں بھی تبع سنت ہوئے ہیں اسلئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اذا ظہرت الفتن او قال البدع وسُبَّت اصحابی فلیظہر العالم علمہ فمن لم یفعل ذالک فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین ولا یقبل اللہ صرفاً ولا عدلاً یعنی جب فتن کا یا یہ فرمایا کہ بدع کا شیوع ہو جاوے اور میرے صحابہ کو گالیاں دی جائیں تو چاہیئے کہ عالم اپنے علم کو ظاہر کرے پس جو شخص ایسا نہ کریگا اس پر اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے اور اللہ تعالیٰ نہ تو فرض قبول فرمائیں گے اور نہ نفل۔

دیکھئے اس حدیث سے جس طرح یہ معلوم ہوا کہ عالم دین کیلئے ضروری ہے کہ وقت پڑ جانے پر اپنے علم کو ظاہر کرے کیونکہ اگر وہ ایسے وقت میں بھی اپنے علم کو ظاہر نہ کرے گا تو ضلالت پھیل جائیگی اور گمراہی عام ہو جاوے گی۔ اسیطرح سے طریق کا بھی حکم معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو طریق کی گمراہیوں اور بدعتوں نیز اسکے واجبات کو اور اس طور و طریقہ کو جس پر انھوں نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے صاف صاف بیان فرماتے رہیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو اپنے پاس آنے جانے والوں کو زجر و توبیخ بھی کریں اور یہ بیان ایسے وقت کیلئے ضروری ہے بلکہ حق مقام کو ادا کرنا ہے اور ان حضرات کی سب سے بڑھکر عبادت ہے۔ چنانچہ منہج العُمّال میں شیخ کی شرائط میں لکھا ہے کہ:۔

انہ یعاقب المرید علی کل ھفوۃ تصدر منہ ولا سبیل الی الصفح
عنہ فی زلۃ البتۃ فان فعل لم یوف حق المقام الذی ھو فیہ وھو
امام غاش برعیتہ غیر قائم بحرمۃ ربہ

(بیاض حضرت والا ص ۳۰)

یعنی شیخ کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مرید کی ہر اس لغزش پر نکیر کرے اور اسے سزا دے جو اس سے صادر ہوتی ہو کیونکہ یہاں کسی غلطی کے معاف کرنے اور اس کے درگذر کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر کسی شیخ نے معاف کر دیا تو جس منصب و مقام پر فائز ہے اسکا پورا حق ادا نہیں کیا، چنانچہ اسکو اپنی رعیت کے ساتھ دھوکے کا معاملہ کرنے والا امام کہا جاوے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے رب کی حرمت کے ساتھ قائم ہونے والا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ چونکہ یہ حضرات امام ناصح اور اپنے رب کے ساتھ احترام کیساتھ پیش آئے ہوئے ہیں اس لئے حق مقام ادا فرماتے ہیں یعنی مریدین کی دیکھ بھال اور انکے اعمال و احوال پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ کی طرف سے انھیں یہ منصب ملا ہوتا ہے اسلئے جہاں ضرورت سمجھتے ہیں تو یہ حضرات کچھ تیز بھی کہہ دیتے ہیں اور اسکا انکو حق ہے۔ اور حق تعالیٰ کی طرف سے اسپر اجر و ثواب کی امید بھی رکھتے ہیں اور یہ جو میں نے کہا کہ اسکا انکو حق ہے تو اسکی ایک دلیل تو وہی ہے جو میں نے منہج التمحال سے بیان کی ہے کہ اسکو مشیخت کے شرائط میں سے شمار کیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات الٰہیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

والخلافۃ ظاھرۃ و باطنۃ فالخلافۃ الظاھرۃ اقامۃ الجھاد
والقضاء والحدود و الجبایہ و العشور و الخراج
وقسمتھا علی مستحقیھا وقد حمل اعبائھا العادلون من ملوک الاسلام
والخلافۃ الباطنۃ تعلیم الکتاب والحکمۃ و تزکیتھم بنور

الباطن بقوارع الوعظ و جواذب الصحبۃ ۔

(تفہیمات الٰہیہ)

یعنی خلافت کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری ایک باطنی، خلافت ظاہری تو یہی ہے مثلاً جہاد کرنا، مقدمات کے فیصلے کرنا، حدود و قصاص کا جاری کرنا، عشور و خراج کی وصولیابی اور انکو مستحقین پر تقسیم کرنا۔ چنانچہ اس بار کو اپنے کاندھوں پر سلاطین اسلام میں سے ان حضرات نے اٹھایا جو اہل عدل تھے ـــــــ اور خلافت باطنی نام ہے کتاب اللہ کی تعلیم کا اور حکمت سکھانے کا لوگوں کا تزکیہ کرنے کا نور باطن کیساتھ ایسے مواعظ کے ذریعے سے جو کانوں کو کھڑکھڑا دینے والے ہوں اور ایسی صحبتوں کے ذریعہ سے جو اپنے اندر جذب مقناطیسی رکھتی ہوں۔

دیکھئے شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ خلافت ظاہری کی مانند ایک خلافت باطنی بھی ہوتی ہے جس کے خلیفہ اور امام یہی حضرات مشائخ ہوتے ہیں۔ پس جیسے سلطان اور خلیفہ کو اصلاح ظاہر کے سلسلہ میں کبھی سیاست بھی کرنی پڑتی ہے اسی طرح سے ان حضرات کو بھی اہل نفس کو انکی رسوم و بدعات سے نکالنے کیلئے کبھی کبھی کچھ سختی اور سیاست کرنی پڑتی ہے جو انکی امامت اور خلافت میں قادح نہیں ہے۔ اسی منصب پر اپنے زمانہ میں حضرت رفاعیؒ بھی فائز تھے اور اسی مقام سے سیدنا عبدالقادر جیلانی کلام فرماتے تھے اور اب اس آخری دور میں یہی منصب اللہ تعالیٰ نے حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمایا تھا (ناقل عرض کرتا ہے کہ فی زماننا الحمدللہ اس مرتبہ پر ہمارے حضرت عـــه والا دامت برکاتہم فائز ہیں)۔

(حاشیہ عـــه) چنانچہ حضرت والا مدظلہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ زمانۂ حال کے ایک دوسرے شیخ کے مرید حضرت کے لوگوں سے کہتے تھے کہ بھائی حضرت کی جلالت شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہاں کوئی عالم یا بزرگ نہیں آتا مگر یہ کہ آنے کے ساتھ ہی اسکو اسکی فکر پڑجاتی ہے کہ پہلے جاکر حضرت سے ملاقات کراؤں۔ نیز حضرت والا کے فیض و برکات کا پتہ لوگوں کے (بقیہ اگلے صفحہ)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تصوف کوئی بری چیز نہیں ہے باقی لوگوں کو جو اس پر اعتراض اور انکار ہوا تو اس وجہ سے کہ اہل تصوف اپنے اسلاف کے طریقہ پر نہیں رہ سکے، مشائخ کے یہاں صرف چند اشغال اور وظائف باقی رہ گئے جس کو انھوں نے تصوف کے نام سے پیش کیا اور لوگوں نے بھی اسی کو تصوف جانا باقی مشائخ کی اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق سے متعلق جو تعلیمات تھیں انکو یکسر ترک کر دیا گیا جسکی وجہ سے تصوف جسد بے روح

رجوعات سے اور ان میں دینی تبدیلی پیدا ہو جانے سے چلتا ہے۔ اور شان تعلیم و تربیت کا علم حضرت والا کے ارشادات وملفوظات وتالیفات سے بخوبی ہو سکتا ہے اور جنکو حضرت کی ایک مجلس بھی میسر ہو گئی ہے ان سے اسکی برکت کا حال معلوم کیجئے۔

ایک صاحب نے حضرت والا کی تعلیم وتربیت کا کچھ خلاصہ اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اسکو ہم یہاں نقل کر دیں امید کہ ناظرین کیلئے موجب بصیرت ہوگا۔ وھو ھذا۔

"امت کی اصلاح کا کام بڑا مشکل ہے اسکے لئے اللہ تعالیٰ ہی اپنے جس بندہ کو منتخب فرما لیتے ہیں وہی یہ کام کر سکتا ہے اور جنکو اس منصب پر فائز فرمایا جاتا ہے اسکو اس کام کے سلسلے میں جن جن امور اور علوم کی حاجت پڑا کرتی ہے ان سب سے وہ نوازا جاتا ہے مثلاً کتاب وسنت کا علم امت کے حال پر شفقت و رحمت اور بصیرت وغیرہ یہ تمام چیزیں اسکو ملا کرتی ہیں، نیز اسکو کام کرنیکا طریقہ اور سلیقہ بھی دوسروں سے اچھا آتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے نفوس کو اور نفوس کے کیود کو بخوبی جانتا ہے جسکی وجہ سے اپنے کام میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کامیابی اور اسکے طریقۂ کار اور اسکی صفات کو دیکھکر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ذات اصلاح امت کیلئے مامور من اللہ ہے۔ اور یوں بھی اس کے اخلاص کی برکت سے اہل سعادت پہچان ہی لیتے ہیں ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

چونکہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو اس منصب پر فائز فرمایا ہے اسلئے حضرت والا کا طریقۂ کار اصلاحات وہدایات سبھی خاص شان رکھتی ہیں اور ان میں ہر ایک باب اصلاح میں اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور جسطرح سے کہ طبیب حاذق بہت طول طویل نسخہ نہیں لکھتا بلکہ چٹکلوں سے بڑے بڑے امراض کا

ہوکر رہ گیا اور یہ چونکہ ایک عملی چیز تھی اس لئے لوگوں سے جب عمل ختم ہوا تو آہستہ آہستہ علم بھی رخصت ہوگیا اور اسکی جگہ جہالت اور ضلالت نے لے لی تو اس نوع کا بگاڑ کچھ تصوف ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر فن کا یہی حال ہے کہ جب لوگ حقیقت کو چھوڑ دیں گے اور رسوم پر عکوف کریں گے تو ظاہر ہے وہ فن ختم ہی ہوجائے گا کیونکہ کوئی بھی فن ہو وہ زندہ رہتا ہے اہل فن کے باقی رہنے سے (جمع رہیں گے) اور جب اس فن کے بتانے اور سمجھانے والے

علاج کردیتا ہے۔ اسی طرح سے حضرت والا نے بھی دین کے اتنے بڑے وسیع علم کو چند لفظوں میں سمجھادیا اور اس بحر ناپیداکنار کو چند قدموں میں طے کرادیا۔ چنانچہ مجالس میں تلاوت قرآن کی اہمیت اور طریقہ اور اسکے آداب تلقین فرماکر مخلوق کو گویا خالق سے جوڑ دیا اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ نسبت پیدا کرنے کا طریقہ بتلادیا کہ طالبین خدا اسکو اختیار کریں اور اپنی اپنی نسبت استوار کریں۔

(۲) اوراد مسنونہ کو کچھ اس انوکھے انداز میں پیش فرمایا کہ ان کے سننے کے بعد اب معلوم ہوا کہ جن چیزوں کو ہم ابتک صرف اعتقادی سمجھتے تھے وہ محض علمی نہیں بلکہ عملی ہیں اور ربط بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے ارتباط باللہ کا ذریعہ ہیں۔ اسی مضمون کو حضرت والا نے اپنے مخصوص عنوان "بشریت کی راہ سے ترقی" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس طور پر دین کا ایک بڑا باب کھولدیا اور ہماری غفلت سے ان سنتوں کے ضیاع کا جو اندیشہ تھا اسکا سدباب فرمادیا۔

(۳) پھر تلاوت قرآن ہو یا اوراد مسنونہ ان پر عمل کرنے میں جو چیز حائل بنتی تھی یعنی ہمارا نفس حضرت والا نے اپنے موثر انداز سے اسکے مارنے کی ترغیب فرمائی اور کتاب وسنت سے یہ ثابت فرمایا کہ اسکا مارنا فرض ہے۔

(۴) اور اسکے مارنے کا طریقہ بھی بیان فرمادیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور جس طرح سے نفس کا مارنا فرض ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی محبت بھی فرض ہے۔

(۵) عام طور سے چونکہ انسان کو اپنے نفس سے محبت ہوتی ہے خواہ وہ عالم ہو یا عامی اسی وجہ سے اسکو اللہ تعالیٰ کا قرب میسر نہیں ہوتا لہٰذا نفس کی محبت کو قلب سے کھرچنے کے لئے اور اللہ تعالےٰ کی محبت کو قلب میں پیوست کرنے کیلئے کبھی کبھی یہ حضرات زجر و توبیخ بھی فرمادیتے ہیں جسمیں خاص

اور اسکو رسوم و بدعات سے صاف کرنے والے باقی نہ رہیں گے تو اس فن کو ختم ہی سمجھئے جیسا کہ اس زمانے میں بلکہ اب سے بہت پہلے تصوف کا حال ہو چکا ہے ورنہ تو جس زمانے میں تصوف کے کچھ اہل فن موجود تھے اور اس کے اصول کی پوری پوری رعایت کیجاتی تھی تو اہل تصوف کا ایک دبدبہ اور شوکت قلوب پر قائم تھی اور اہل ظاہر ان اہل باطن سے گفتگو کرتے گھبراتے تھے کیونکہ سمجھتے تھے کہ حقیقی دین کے حامل یہی لوگ ہیں

میں نے آپ کے سامنے منہج العمال سے شیخ کی ایک شرط نقل کی تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی کتاب " القول الجمیل" سے شیخ کی جملہ شرائط جو اہل فن کے نزدیک معتبر ہیں نقل کر دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ کس قدر مرتب اور مہذب فن ہے ایسا نہیں ہے کہ " یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا" چنانچہ اس میں بیعت لینے والے کیلئے بہت سی شرطیں ہیں یہ نہیں کہ جسکا جی چاہے وہ پیر بن جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک سوال قائم کیا ہے کہ بعلک تقول اخبرنی ما شرط من یاخذ البیعۃ یعنی بیعت لینے والے (پیرومرشد) کیلئے کیا کیا شرائط ہیں بیان فرمایئے۔ پھر آگے اسکا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شرط ممن

اس مرید ہی کی مصلحت ہوتی ہے اور یہ حضرات جو کچھ کرتے ہیں وہ کسی بد خلقی کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ غیرۃً للحق اور شفقۃً علی الخلق کرتے ہیں اسلئے جو طالب کہ صادق ہوتا ہے وہ اللہ کے لئے اسکو گوارا کرتا ہے جس طرح کہ یہ حضرات اللہ ہی کے لئے اسکو کہتے سنتے ہیں اس بات کو ذہن نشین فرما کر حضرت والا نے راستہ کو آسان اور مجاہدہ کو سہل فرما دیا۔

یہ چند امور ہیں جنکو حضرت والا کی تعلیمات کا اور ان چند دنوں کے ارشادات کا خلاصہ اور نچوڑ سمجھا ہوں۔ حضرت والا سے اسکی تصویب چاہتا ہوں اور اگر صحیح سمجھا ہوں تو اس علم پر عمل اور عمل میں اخلاص کی دعا چاہتا ہوں"۔ (انتہیٰ حاشیہ)

یاخذ البیعۃ امورٌ احدھا علم الکتاب والسنۃ ومااریدالمرتبۃ القصوی بل یکفی من علم الکتاب ان یکون قد ضبط تفسیر المدارک او الجلالین وغیرھا وحقّقہٗ علی عالم وعرف معانیہ وتفسیر الغریب واسباب النزول والاعراب والقصص ومایتصل بذلک یعنی شیخ میں یہ چند امور شرط ہیں اول یہ کہ کتاب و سنت کا علم رکھتا ہو اور اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں میں منتہی ہو بلکہ قرآن کا اتنا علم ہونا کافی ہے کہ تفسیر مدارک یا جلالین یا انھیں کے مثل کوئی تفسیر محفوظ کر چکا ہو اور کسی عالم سے اسکو محقق کر چکا ہو یعنی اسکے معانی اور لغات مشکلہ کے تراجم، شان نزول اور اعراب قرآنی اور قصص وغیرہ کو سمجھ چکا ہو۔ ومن السنۃ ان یکون قد ضبط وحقق مثل کتاب المصابیح وعرف معانیہ وشرح غریبہ واعراب مشکلہ وتاویل معضلہ اور علم حدیث میں اتنا علم کافی ہے کہ مثلاً کتاب مصابیح یا مشارق الانوار کو ضبط و محقق کر چکا ہو یعنی اسکا ترجمہ جانتا ہو اور اسکے لغات مشکلہ کی شرح اور انکا اعراب اور معضل کی تاویل فقہاء کے مذہب کے مطابق جانتا ہو ولا یکلف بحفظ القرآن ولا التفحص عن حال الاسانید لاتری ان التابعین واتباعھم کانوا یاخذون بالمنقطع والمرسل انما المقصود حصول الظن ببلوغ الخبر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی بیعت لینے والا علم قرآن کے سلسلے میں اسکا مکلف نہیں کہ اختلاف قرأت کا بھی حافظ ہو اور نہ علم حدیث کے سلسلے میں اسکا مکلف ہے کہ اسانید کی تفتیش کی ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ تابعین اور تبع تابعین کا عمل یہ تھا کہ وہ حدیث منقطع اور مرسل کو بھی لے لیتے تھے اس لئے کہ مقصود صرف اتنا تھا کہ اس امر کا ظن حاصل ہو جائے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ بسلسلہ پہونچ گئی ہے اور یہ درجہ تفحص رواۃ پر منحصر نہیں ہے۔ ولا بعلم الاصول والکلام وجزئیات الفقہ والفتاوی یعنی بیعت لینے والا اصول فقہ یا اصول حدیث اور علم کلام اور فقہ و فتاوی کے جزئیات کے جاننے اور یاد رکھنے کا بھی مکلف نہیں وانما شرطنا العلم لان الغرض من البیعۃ امرہ بالمعروف ونہیہ عن المنکر وارشادہ الی تحصیل السکینۃ الباطنۃ وازالۃ الرذائل واکتساب الحمائد ثم امتثال المسترشد بہ

فی کل ذالک فمن لم یکن عالما کیف یتصور منه هذا اور ہم نے شیخ کے لئے عالم ہونے کی شرط اسلئے لگائی کہ بیعت سے مقصود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا ہے۔ نیز مرید کی رہنمائی سکینۂ باطنی حاصل کرنے کی جانب اور اسکو رذائل سے بچانا اور فضائل کے اکتساب پر آمادہ کرنا ہے جس کے بعد مرید کے ذمہ یہ ہے کہ ان تمام امور میں اسکا اتباع کرے۔ پس جو شخص کہ ان سب امور سے خود ہی واقف نہ ہوگا وہ دوسرے کی کیا رہنمائی کریگا۔

وقد اتفق کلمۃ المشائخ علی ان لایتکلم علی الناس الامن کتب الحدیث وقرأ القرآن اللهم الا ان یکون رجل صحب العلماء الاتقیاء دهراً طویلا و تادب علیهم وکان متفحصاً عن الحلال والحرام ووقافا عند کتاب الله وسنة رسوله فعسی ان یکفیه ذالک والله اعلم مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت (یعنی اصلاح و تربیت) نکرے مگر وہی جس نے احادیث یاد کی ہوا ور قرآن کا علم حاصل کیا ہو مگر یہ کہ کوئی ایسا شخص ہو جس نے متقی علماء کی بہت مدت تک صحبت اٹھائی ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو اور حرام و حلال کا تفحص (جستجو) کیا ہو اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹھہر جانے والا ہو یعنی اپنے افعال اقوال و احوال کو کتاب و سنت کے موافق کرلیا ہو تو امید ہے کہ اسقدر معلومات بھی اسکو کفایت کرجائے جبکہ وہ کامل عالم نہ ہو۔

والشرط الثانی العدالة والتقوی ویجب ان یکون مجتنبا عن الکبائر غیر مصر علی الصغائر یعنی بیعت لینے والے کیلئے دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں عدالت و تقوی ہو لہٰذا ضروری ہے کہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو (فائدہ) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مرشد کے کیلئے تقوی اس لئے مشروط ہوا کہ بیعت سے مقصود باطن کی صفائی ہے اور انسان مجبور ہے اپنے بنی نوع کے افعال کی اقتدار کرنے پر اور صفائی باطن میں فقط قول بدون عمل کے کفایت نہیں کرتا، تو جو مرشد کہ اعمال خیر سے متصف نہیں فقط زبانی

تقریروں پر کفایت کرتا ہو وہ شخص برہم زنِ حکمت بعیت ہے ۔ اسکے بعد شرط ثالث کو بیان فرمایا ہے جسکو ہم پہلے مفصلاً بیان کرچکے ہیں ۔

والشرط الرابع ان یکون آمراً بالمعروف ناهیا عن المنکر مستبدا برائه لا امعة لیس له رای ولا امرؤ ذا مروة وعقل تام یعتمد علیه فی کل مایأمر به وینهی عنه قال الله تعالیٰ ممن ترضون من الشهداء فما ظنك لصاحب البیعة یعنی چوتھی شرط یہ ہے کہ بعیت لینے والا معروف کا امر کرنے والا ہو۔ خلاف شرع امور سے روکنے والا ہو اور اپنی رائے پر مستقل ہو، مرد ہر جائی نہ ہو کہ اسکے لئے نہ کوئی رائے ہو اور نہ امر مروت والا ہو اور عقل کامل رکھتا ہو کہ اعتماد کیا جائے اس کے اوامر و نواہی پر۔ دیکھو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گواہی ان لوگوں کی مقبول ہے جنکو تم پسند کرتے ہو یعنی بوجہ عدالت و تقویٰ کے، تو کیا تمھارا گمان ہے صاحب بعیت کے متعلق کہ اسکو کیسا ہونا چاہیئے ؟

والشرط الخامس ان یکون صحب المشائخ وتادب بهم دهرا طویلا واخذ منهم النور الباطنة والسکینة وهذا لان سنة الله جرت بان الرجل لا یصلح الا اذا رأی المفلحین کما ان الرجل لا یتعلم الا بصحبة العلماء وعلی هذا القیاس غیر ذالك من صناعات اور پانچویں شرط یہ ہے کہ بعیت لینے والا مرشدان کامل کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے زمانۂ دراز تک ادب سیکھا ہو اور ان سے نور باطن اور سکینت حاصل کئے ہو اور یہ یعنی صحبت کاملین اسواسطے مشروط ہوئی کہ عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ مراد ملتی نہیں جب تک کہ مراد پانے والوں کو نہ دیکھے جیسے انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے اور اسی پیشیوں کو قیاس کرلو مثلاً آہنگری کہ بدون صحبت آہنگر کے یا نجاری کہ بدون صحبت نجار کے نہیں آتی ۔

(فائدہ) مولانا نے ارشاد فرمایا کہ جریان سنت اللہ کا بھید یہ ہے کہ انسان اس نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ اپنے کمالات کو حاصل نہیں کرسکتا بدون اپنی ابناء جنس کی معاونت اور مشارکت کے بخلاف اور حیوانات کے کہ انکے کمالات پیدائشی ہیں، اور کسبی نہایت کمتر ہیں

Scanned with CamScanner

چنانچہ تیرنا حیوانات کا پیدائشی کمال ہے اور انسان کو بغیر سیکھے نہیں آتا۔

ولایشترط فی ذالک ظهور الکرامات والخوارق ولاترک الاکتساب لان الاول ثمرة المجاهدات لاشرط الکمال والثانی مخالف للشرع ولا تغتر بما فعله المغلوبون فی احوالهم ۔ انما المامور القناعة بالقلیل والورع من المشبهات ۔ یعنی شیخ ہونے کے لئے یہ شرط نہیں کہ اس سے کرامات و خوارق کا بھی ظہور ہوا ورنہ یہ شرط ہے کہ وہ ترک کسب کردے اسلئے کہ کرامات و خوارق وغیرہ مجاہدات وریاضات کا ثمرہ ہیں نہ کہ شرط کمال ۔ اور کسب کا ترک کرنا شرع کے خلاف ہے اور درویش مغلوب الحال جو باتیں کرتے ہیں ان سے دھوکے میں نہ پڑنا یعنی وہ جو ترک کسب کرتے ہیں اسکو سند نہ بنانا کیونکہ منقول یہی ہے کہ انسان تھوڑے پر قناعت کرے اور مشتبہات سے پرہیز کرے یعنی مال مشتبہ اور پیشہ مکروہ نہ اختیار کرے باقی نفس مال کمانا اور پیشہ اختیار کرنے کی شرعاً اجازت ہے ۔

(فائدہ) مولانا نے ارشاد فرمایا کہ اسی طرح سے یہ بھی شیخ کیلئے شرط نہیں ہے کہ وہ کمال ترہب اختیار کرے یعنی عبادات شاقہ کو اپنے اوپر لازم کرلے مثلاً صوم دہر اور ساری رات جاگنے کو اختیار کرے اور عورتوں سے جدائی اختیار کرے اور لذیذ کھانے کھانا چھوڑ دے اور جنگل اور پہاڑوں میں رہنا شروع کردے مگر ہمارے زمانے کے عوام اسکو شرط کمال جانتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں بزرگی کیلئے تو شرط کیا ہوتیں جائز بھی نہیں اسلئے کہ تشدد فی الدین اور تشدید علی النفس میں داخل ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنی جانوں پر سختی نکرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے گا ۔ اور ارشاد فرمایا ہے لا رہبانیۃ فی الاسلام اسلام میں رہبانیۃ جائز نہیں (اور رہبانیۃ کے معنی وہی ہیں جو اوپر گذرے) ۔

شیخ کے لیئے کیا امور مشروط ہیں اور کیا نہیں انکا بیان ختم ہوا ۔

نوٹ : (افسوس کہ یہ مضمون اتنا ہی مرتب ہوسکا اور کسی عارض کی بنا پر اسکی تکمیل نہ ہوسکی)

Scanned with CamScanner

(تصوف کا ایک اہم مضمون)

فرمایا کہ ــــ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی ارشاد فرماتے ہیں :۔
"کشف و خرق عادات و تصرف در عالم کون و فساد از ریاضت دست میدہد ولہذا حکماء اشراقیین و جوگیان ہند بداں متمتع می شدند و ایں کمالات از نظر اعتبار اہل اللہ ساقط است بجوز و مویز نمی خرند دفع رذائل و قتل شیطان و وسواس بے طور سنت ممکن نیست۔
پندار سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز در پے مصطفیٰ"
قاضی صاحبؒ نے اس عبارت میں اہل اللہ و غیر اہل اللہ کے تصوف و سلوک میں فرق بیان فرمایا ہے اور وہ تمام اغلاط جو سلوک میں پیش آتے ہیں انکا قلع قمع فرمادیا ہے کیونکہ اثناء سلوک میں جو اغلاط سالک کو پیش آتے ہیں اور جنکی وجہ سے سلوک تمام نہیں ہوتا وہ یہی سب چیزیں ہیں جو اشراقیہ اور جوگیوں میں ہوتی ہیں یہ لوگ ان کمالات کو مقصود سمجھتے ہیں اور اہل اللہ انکو کچھ نہیں سمجھتے حتی کہ ایک اخروٹ اور ایک دانہ کشمش کی تو کچھ وقعت بھی ہوتی ہے لیکن تصرفات کی انکی نظر میں اتنی قدر بھی نہیں اور یہ اسلئے کہ انکی نظر اعتبار میں کچھ اور ہی چیزیں ہوتی ہیں اور وہ توحید اور ذات و صفات کی سیر اور قرب و قبول عند اللہ ہیں چنانچہ جن لوگوں کا مقصود یہ نہیں ہے انکو قاضی صاحبؒ نے اہل اللہ کے زمرہ ہی سے ساقط کردیا ہے ــ اور قاضی صاحبؒ نے یہ جو فرمایا کہ یہ کمالات نظر اعتبار اہل اللہ سے ساقط ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کے تمام اعمال کا مبنیٰ للہیت ہوتی ہے نفسانیت کو بالکل دخل نہیں ہوتا بلکہ اہل اللہ کے کمالات قرب و قبول عند اللہ کا ثمرہ ہوتے ہیں اور ملکوتی ہوتے ہیں۔ باقی جوگیوں کو جو یہ کمالات حاصل ہوتے ہیں تو اسمیں انکی نفسانیت کو دخل ہوتا ہی کیونکہ یہ لوگ جو ریاضات و مجاہدات کرتے ہیں ان سے مقصود انھیں تصرفات وغیرہ کی تحصیل ہوتی ہے پس انکے کمالات انکی ریاضات و مجاہدات کا ثمرہ ہوتے ہیں اور کمالات ناسوتی ہیں ــ بلاشبہ قاضی صاحبؒ کا یہ مضمون حق و باطل کا معیار ہی یعنی تصوف اور جوگ میں فارق ہے ــ قاضی صاحبؒ نے یہ جو فرمایا کہ "ایں کمالات از نظر اعتبار اہل اللہ ساقط است بجوز و مویز نمی خرند" مجھکو تو انکا یہ فرمانا بہت ہی لطف دے گیا اسی مضمون کو حضرت شیخ سعدیؒ نے اس شعر میں ادا فرمایا ہے سبحان اللہ تصوف کا حق ادا کردیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

ندارند چشم از خلائق پسند کہ ایشان پسندیدۂ حق بسند

قال اللہ تعالیٰ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

چونکہ آیت بالا میں مومنین کے لئے اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر زبردست ترغیب ہے

بناءً علیہ ـــــــــ رسالۂ نافعہ

یعنی

افاضات ممبئی کا ایک اہم اور زرّین حصّہ

منجملہ ارشادات

مُصلح الامّۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ناظرین رسالہ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ اس رسالے میں سارے ہی مضامین حضرت والا مدظلہ ہی کے ہوتے ہیں تاہم سہولت کی غرض سے ہر مضمون اور ہر سلسلۂ ملفوظ کو کسی خاص اسم سے موسوم کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس سے قبل علیگڈھ کے زمانۂ قیام کے ملفوظات **مجالس علیگڈھ** کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ امسال پھر حضرت والا نے بمبئی کا سفر فرمایا اور پانچ ماہ قیام رہا (۱۱ اپریل ۶۶ء کو الٰہ آباد سے روانگی ہوئی اور ۱۰ ستمبر ۶۶ء کو وہاں سے واپسی ہوئی) اس دفعہ قیام سلیمان بلڈنگ آگرہ روڈ کرلا میں رہا۔

شروع شروع چند ہفتے تک تو بوجہ ضعف و نقاہت کے حضرت والا نے بنفس نفیس خود کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ اسکے بعد ۹ مئی ۶۶ء سے مجلس میں خود بھی ارشاد فرمانا شروع کر دیا اسوقت "افاضات بمبئی" کے عنوان سے اسی سفر کے ملفوظات پیش کئے جا رہے ہیں جنمیں تاریخی تسلسل کے بجائے مضامین کے تسلسل کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے چنانچہ سب سے پہلے وہ ارشادات پیش کئے جا رہے ہیں جنمیں حضرت والا نے "اتباع سنت" پر گفتگو فرمائی ہے اور اگرچہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے تاہم ابتک جسقدر جمع ہو گیا ہے ناظرین اس سے استفادہ کریں۔

اصل میں ایک عرصہ سے یعنی "تلاوت قرآن" کی اشاعت کے بعد ہی سے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ قرآن شریف کے متعلق تو الحمدللہ بہت کچھ مضمون جمع ہو گیا ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ "سنت" پر بھی کچھ لکھدوں اور کبھی کبھی زمانۂ علالت میں بھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ "بس یہی ایک تمنا ہے کہ سنت کے اوپر بھی کچھ لکھدوں تم لوگ دعا کرو کہ مجھے صحت ہو جائے اور یہ کام بھی کر لوں" بلکہ درمیان میں جب کچھ صحت ہوئی تو مناجات مقبول لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں پر کچھ گفتگو بھی فرمائی لیکن بمبئی پہونچکر جب طبیعت اور ذرا سنبھلی اور باقاعدہ مجلسیں ہونے لگیں تو وہاں پھر یہ سلسلہ شروع فرما دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ مجلسیں منضبط ہو کر حضرت والا کی نظر سے بھی گزر گئیں۔

اسوقت آپکے سامنے افاضات بمبئی کی انھیں مجالس سے ابتدا کیجاتی ہے اور اس حصہ کا نام وصیۃ السنۃ رکھا جاتا ہے اسکے بعد دیگر سب مجالس (بمبئی) انشاء اللہ اسی (افاضات بمبئی کے) عنوان کے تحت پیش کیجائیں گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

(جامع: جامی عفی عنہ)

(مجلس اول)

فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند دعائیں لکھی تھیں اب پھر ان کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں ایک صاحب نے جو میرے ہی آدمی تھے حافظ بھی تھے۔ کہا کہ بہت عمدہ دعائیں ہیں بڑا ہی لطف آیا مگر یہ بھی کہتے تھے کہ میں نے کوشش کی ان دعاؤں کے یاد کرنے کی مگر یاد نہیں ہوئیں۔ یہ لوگ قرآن یاد کر لیتے ہیں۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ یہ قرآن شریف کے بارہ میں ہے اور وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ وارد ہے اس لئے یہ ساری امت پر آسان ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو یاد کرنا اور آپ کی سنت کو سینہ میں محفوظ کرنا یہ خاص لوگوں کا کام ہے اور ان لوگوں کے لئے یہ سہل ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ ورنہ یہ آسان کام نہیں ہے جس پر اللہ تعالیٰ سہل کر دیگا اس پر سہل ہو جائیگا اسکو ان چیزوں سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہو جائے گی اس مناسبت سے یہ چیزیں یاد ہو سکتی ہیں۔ اس وقت میں پہلے آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک استعاذہ نقل کرتا ہوں ممکن ہے کہ آپ اسے سن کر شرما جائیں اور آپ کو ہنسی بھی آجائے لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا ہے تو پھر وہ تو تشریع ہو گئی۔ آپ کو اسے سمجھنا ہوگا اور عالم کو اس کا بیان کرنا ضروری ہے حضرت مولانا رح بھی اسی مضمون سے متعلق ایک شعر پڑھا کرتے تھے لوگ شرم کے مارے نظریں نیچی کر لیتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ وہ مضمون حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں خواہ بشکل سوال ہوں یا استعاذہ آپ کی عبدیت کے شیون کا پتہ دیتی ہیں یعنی جس وقت آپ پر جس شان اور جس حال کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت اسی قسم

کی دعائیں آپ اللہ تعالیٰ سے مانگتے چنانچہ ایک خاص شان میں آپ اللہ تعالیٰ سے اس طرح سے تعوذ فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ سُوْءِ الْعُمُرِ وَفِتْنَۃِ الصَّدْرِ (یعنی اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں بری عمر سے اور دل کے فتنہ سے)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ دل کا بھی ایک فتنہ ہوتا ہے اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانہ میں دل کسی کا خراب ہی نہیں ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے قلب کے فتنہ سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں وَاعوذ بعزتک لا الٰہ الا انت ان تضلنی۔ (یعنی پناہ مانگتا ہوں بوسیلہ تیری عزت کے نہیں ہے کوئی معبود سوائے تیرے اس بات سے کہ گمراہ کرے تو مجھے)

سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ایسی ہیں کہ انسان اگر انھیں یاد کرے اور صرف انھیں ہی مانگا کرے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو جائے۔ آگے فرماتے ہیں:-

وَمِنْ جُھْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْکِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَۃِ الْاَعْدَاءِ (یعنی میں پناہ مانگتا ہوں بلا کی مشقت سے اور بدبختی کے پالینے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے طعنہ سے) وَمِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَشَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ وَمِنْ شَرِّ مَا عَلِمْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْلَمْ (یعنی اور پناہ چاہتا ہوں تیری اس کام کی برائی سے جو میں نے نہیں کیا اور اس چیز کی برائی سے جو مجھے معلوم ہے اور اس چیز کی برائی سے جو مجھے معلوم نہیں)

وَمِنْ زَوَالِ نِعْمَتِکَ وَتَحَوُّلِ عَافِیَتِکَ وَفُجَاءَۃِ نِقْمَتِکَ وَجَمِیْعِ سَخَطِکَ یعنی پناہ چاہتا ہوں تیری نعمت کے جاتے رہنے سے اور تیرے امن کے پلٹ جانے سے اور تیرے عذاب کے ناگہاں آجانے سے اور تیرے تمام غصوں سے)

دیکھئے جن چیزوں سے انسان کو بہت تکلیف پہونچتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں سے پناہ مانگنا ہمیں سکھلا دیا۔ کسی شخص کو کوئی نعمت ملی ہوئی ہو اور وہ اس سے چلی جائے اس سے اسے کس قدر تکلیف ہوتی ہے اسی طرح سے اگر امن اٹھ جائے۔ کسی کی جان مال عزت و آبرو محفوظ نہ رہے تو ظاہر ہے کہ یہ بھی کس قدر تکلیف کی چیز ہے۔ اسی طرح کوئی آفت ناگہانی درپیش ہو جائے تو انسان کے لئے بڑی سخت چیز ہو جاتی ہے اسلئے کہ نہ وہ اسکو دفع کر سکتا ہے اور نہ برداشت کے لئے پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ یوں تو تکلیف و پریشانی ہر مصیبت میں انسان کو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک جو مصیبت پڑ جائے تو وہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتی ہے جس طرح کہ اچانک کوئی خوشی پیش آجائے اور کوئی

Scanned with CamScanner

نعمت ملجائے تو وہ زیادتی مسرت کا سبب بنتی ہے اور اسے نعمت غیر مترقبہ کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زیادتی خوشی کے لئے یہ ضرب المثل ہوگیا ہے اب سکے بعد وہی الفاظ ہیں اور وہی دعا ہے جس کے متعلق میں نے شروع میں کہا تھا کہ آپ کو سن کر تعجب بھی ہوگا اور حیا بھی آئیگی۔ ارشاد فرماتے ہیں وَمِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ وَمِنْ شَرِّ لِسَانِیْ وَمِنْ شَرِّ قَلْبِیْ وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ۔ (یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں بوسیلہ تیری عزت کے نہیں ہے کوئی معبود سوا تیرے پناہ اپنی شنوائی کی برائی سے اور اپنی بینائی کی بھی برائی سے اور اپنی زبان کی برائی سے، اور اپنے دل کی برائی سے اور اپنی منی کی برائی سے)

یہ ہیں آپ کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں پڑھ رہا ہوں ان میں آپ نے ہماری تمام ضروریات کا احاطہ فرمالیا ہے لیکن آپ کا یہ حال ہے کہ آپ اگر اسکو دن بھر پڑھیں تب بھی یاد نہ ہو اسلئے کہ ان چیزوں سے مناسبت باقی نہیں ہے اور اکبر یا اقبال کا شعر سنو گے تو اسکو یاد کرلو گے اسی بات کو سمجھانا چاہتا ہوں مگر اس پر نہیں آتے اسی کو وہ صاحب کہتے تھے کہ یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ تھک کر چھوڑ دیا۔ دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمع کے شر سے پناہ مانگی ہے۔ کیونکہ آدمی بہت سی ایسی چیزیں سن لیتا ہے جسکو نہیں سننا چاہیئے یہی شنوائی کا شر ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔ اسی طرح آپ نے بصر کے شر سے بھی پناہ مانگی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کسی ایسی چیز کو دیکھے جسکی جانب نظر کرنا جائز نہیں ہے اسیطرح سے آپ نے لسان کے شر سے پناہ مانگی ہے اور لسان کا شر یہ ہے کہ آدمی غیبت کذب نمیمہ وغیرہ میں مبتلا ہو جائے۔ اسی طرح سے آپ نے قلب کے شر سے پناہ مانگی ہے اس سے مراد جملہ رذائل قلبیہ ہیں اور یہ سب امت کے لئے تعلیم ہے۔ ورنہ تو حضور معصوم تھے۔ آگے فرماتے ہیں وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ (یعنی اے اللہ میں اپنی منی کی برائی سے بھی پناہ مانگتا ہوں) اسی کے متعلق میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ضروری چیز کو ڈھکا چھپا نہیں رکھا ورنہ تو اس سے پہلے ومن شر قلبی فرما چکے تھے اور ایک دوسرے مقام پر من شر نفسی بھی فرمایا ہے: اس عموم کے اندر یہ خاص چیز بھی داخل تھی لیکن آپ نے اس ضمنی ذکر کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اسکی تخصیص فرمادی اسلئے کہ جسقدر گناہ دنیا میں ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ گناہ اسی کے سبب سے ہوتے ہیں تو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کی اصلاح کے لئے

تشریف لائے تھے تو اتنی اہم چیز کو کیسے چھوڑ دیتے۔

اب آپ کو اسکے سننے میں بھی شرم آتی ہے اور اسی شرم کی وجہ سے لوگ اسکو بیان بھی نہیں کرتے۔ میں نے تو کسی عالم اور بزرگ کو اسے بیان کرتے سنا نہیں۔ مگر جو مصلحین ہوئے ہیں انھوں نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں لکھا ہے کہ میرے والد بزرگوار نے مجھے یہ نصیحت بلکہ وصیت کی تھی کہ بیٹے شہوت سے پرہیز کرنا، شہوت ایک آگ ہے۔ اسکی وجہ سے دوزخ کی آگ کو اپنے اوپر تیز نہ کرنا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں فرماتے ہیں ؎

پدر چوں دور عمرش منقضی گشت — مرا ایں یک نصیحت کرد و بگذشت

والد مرحوم نے جب ان کی عمر ختم ہونے کو آئی — تو مجھے یہ ایک نصیحت فرمائی اور اس دار فانی سے رحلت فرماگئے

کہ شہوت آتش است از وے بہ پرہیز — بہ خود بر آتش دوزخ مکن تیز

کہ بیٹا! دیکھنا شہوت ایک آگ ہے اس سے پرہیز کرنا اور اس میں پڑکے دوزخ کی آگ کو اپنے اوپر تیز نہ کرنا

درآں آتش نداری طاقت سوز — بصبر آبے بریں آتش زن امروز

اسلئے کہ وہ آگ بڑی سخت ہے اسکی سہار مشکل ہے لہذا آج ہی صبر کرکے اس پر پانی ڈالدو

اسی طرح سے حضرت مولانا تھانویؒ بھی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

احفظ منیّک ان تصبّ فانہ — ماء الحیٰوۃ یصبّ فی الارحام

(یعنی اپنی منی کی حفاظت کرو اسے ضائع نہ ہونے دو اسلئے کہ وہ انسانی جوہر اور مادۂ تولید ہے یعنی اس سے انسان کی زندگی قائم ہے اور وہ رحم میں ڈالی جاتی ہے۔)

حضرتؒ اسکو اکثر پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ مصلح تھے جانتے تھے کہ لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کی ضرورت ہے اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت یہ کیا لفظ زبان پر لا رہے ہیں اسکا تذکرہ نہ کرنا چاہیئے خود چاہے کام سب کریں مگر کسی سے سننا عیب سمجھتے تھے اور حضرت اسلئے بیان فرماتے تھے کہ حدیث کا مضمون ہے یہ سب تقویٰ کی باتیں ہیں اگر یہ حضرات بھی نہ بیان کریں تو کون بیان کرے ظاہر ہے کہ والدین تو بیان کرینگے نہیں اب اگر علماء اور مشائخ بھی اسے نہ بیان کریں تو لوگوں کو اس کی طرف توجہ کیسے ہو اسی کے شر سے بچنے کا نام عفت ہے اور اسی کو پارسائی اور پاکدامنی کہا جاتا ہے چنانچہ ایک دوسری دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سوال

کیا ہے فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی (یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے ہدایت اور پرہیزگاری اور پارسائی اور سیر چشمی) یعنی جس طرح پہلی حدیث میں منی کے شر سے تعوذ فرمایا تھا اسی طرح سے اس حدیث میں اس کے شر سے محفوظ رہنے کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے یعنی عفت اس کا سوال فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ چیز کس قدر اہم ہے کہ مختلف عنوان اختیار فرماتے ہیں اور مطلوب ایک ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ ان دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ منی اور شہوت کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے یعنی انسان جب ان کا غلط استعمال کرنے تو یہ اس کے لئے مہلک ہے باقی شہوت فی نفسہ مذموم نہیں ہے بلکہ بہت سے کمالات کے تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس مضمون کو مولانا روم نے مثنوی میں نہایت عمدہ ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است

کہ از و حمام تقوی روشن است

(یعنی دنیوی شہوت کی مثال انگیٹھی (اور اس کے اپلے وغیرہ) کی سی ہے کہ فی نفسہ نہایت مبتذل اور گندی چیز ہے لیکن تقوی کا حمام اسی سے روشن ہے) چنانچہ جو شخص اپنے نفس اور اسکی شہوت پر قابو پائے ہوتا ہے اسی کو متقی کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فرشتوں کو اور دیوار کو کوئی متقی نہیں کہتا۔ اس دنیا میں انسان اپنے اسی نفس کو متقی بنانے کا مکلف کیا گیا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اسکو بھی طلب فرمایا ہے۔

ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا

(یعنی اے اللہ میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرمائیے اور آپ ہی اس کا تزکیہ فرما دیجئے (اس لئے کہ) آپ سب تزکیہ کرنے والوں سے بہتر تزکیہ فرمانے والے ہیں آپ ہی نفس کے مالک اور اس کے متولی ہیں آپ کو اس پر پوری قدرت اور کامل اختیار حاصل ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو معصوم ہیں لیکن نفس کی چیرہ دستیوں سے خوب واقف ہیں اور یہ کہ انسان پر یہ کس طرح سے غالب رہتا ہے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل

Scanned with CamScanner

فرمائیں اس لئے اپنے مجاہدے اور اپنے عمل سے صرف نظر کر کے اللہ تعالیٰ ہی سے اسکے بارے میں بھی اعانت طلب کرتے ہیں اور اعانت طلب کرنا سکھاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ بھی ارشاد فرما چکے تھے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے نفس کو اس کا فجور بھی الہام فرمایا اور اس کا تقویٰ بھی الہام فرمایا) اور جب اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (یعنی یقیناً مراد کو پہونچا جس نے اسکو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اسکو فجور میں دبا دیا۔ یعنی فجور سے مغلوب کر دیا۔

تو اس اعلان کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو طالب فلاح کی صف میں لا کھڑا کیا اور قرآن شریف پر عمل آپ کا خلق تھا اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا مانگی کہ نفس کو اس کا تقویٰ آپ ہی عطا فرمایئے اور آپ ہی اس کا تزکیہ فرمایئے اسلئے کہ جب فجور آپ الہام فرمائیں تو کس کی مجال کہ اسکو اس سے نکال سکے بدون آپ کی توفیق کے اور پھر یہ کہ خالق کے تزکیہ میں اور مخلوق کے تزکیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے اسلئے کہ جب اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا فرمائیں گے تو پھر نفس کیسے تقویٰ نہ حاصل کریگا۔ یہ اعلیٰ درجہ کی عبدیت ہے اور انبیاء علیہم السلام کا غایت کمال ہے کہ وہ اپنے لئے کسی کمال کو ذاتی نہیں سمجھتے۔ کمالات سے متصف ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے بڑا کمال نبوت ہی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ عصمت بھی ہے لیکن یہ حضرات اسکو بھی خدائی عطیہ سمجھتے ہیں۔ دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تعالیٰ ان کا قول نقل فرماتے ہیں کہ ملک مصر کے ساتھ اپنی رہائی سے قبل جو مکالمہ فرمایا اس کی وجہ یہ بیان فرمائی۔

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام جو میں نے کیا محض اسوجہ سے تاکہ عزیز (مصر) کو یہ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اسکی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور (یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی تبری بالکل برحق تھی لیکن اس موقع پر اپنی اصل اور حقیقت یاد آگئی چنانچہ فوراً گفتگو کا انداز بدل کر فرمایا کہ میں نے دست اندازی تو نہیں کی مگر وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ط یعنی میری غرض تو بس یہی تھی اور باقی میں اپنے

نفس کو بالذات بری اور پاک نہیں بتاتا کیونکہ نفس تو ہر ایک کا بری ہی بات بتلاتا ہے۔ بجز اس نفس کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس میں امر بالسوء کا مادہ نہ رکھے جیسا کہ انبیاء کے نفوس ہو جاتے ہیں مطمئنہ جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ میری نزاہت و عصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں کہ تخلف محال ہو بلکہ رحمت و عنایت الٰہیہ کا اثر ہے اس لئے وہ امر بالسوء کا حکم نہیں کرتا۔ ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا (ہوتا) بلاشبہ [بلائی ۱۲] میرا رب بڑی مغفرت والا ہے۔ بڑی رحمت والا ہے۔

یعنی اوپر جو نفس کی قسمیں معلوم ہوئیں آمارہ اور مطمئنہ سو امارہ اگر توبہ کرے تو اسکی مغفرت فرمائی جاتی ہے اور مرتبہ توبہ میں وہ لوامہ کہلاتا ہے اور جو مطمئنہ ہے وہ کمال اس کا لازم ذات نہیں بلکہ عنایت و مغفرت کا اثر ہے۔ پس امارہ کے لوامہ ہونے پر عفو کا ظہور ہوتا ہے اور مطمئنہ میں رحیم کا۔

(بیان القرآن ص۸۵ ج ۵)

دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے کسقدر تواضع اور عاجزی کے کلمات اپنے متعلق استعمال کئے یہ سب نزول اور عبدیت کے مقام میں فرما رہے ہیں ورنہ تو ظاہر ہے کہ ان حضرات کے نفوس مطمئنہ ہوتے ہیں اور نہ صرف مطمئنہ بلکہ اطمینان کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں لیکن بات وہی ہے کہ کسی کمال کو اپنا ذاتی وصف نہیں سمجھتے اسلئے اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے ہیں اسی مقام میں ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نفس مطمئنہ کا سوال فرمایا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ (یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے ایسا نفس جو تجھ پر ایمان رکھے اور جو تیرے ملنے کا یقین رکھے اور تیرے حکم پر راضی رہے اور تیرے عطیہ پر قناعت رکھے۔

اب لوگ قرآن شریف تو پڑھ لیتے ہیں اور اس کا ترجمہ بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کو مطمئنہ بنانے کا جو سہل اور آسان طریقہ تعلیم فرمایا ہے اس پر نہیں آتے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کیا جائے۔ جب تک کہ ان سے مانگو گے نہیں، ملے گا نہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ جو بات اب اتنے دنوں کے بعد معلوم ہوئی اگر پہلے سے معلوم ہو جاتی تو اتنا مجاہدہ

نہ کرتے اور اس میں شک نہیں کہ مجاہدہ سے کام نہیں چلتا اس لئے کہ آپ اگر تقویٰ حاصل کرنے کے مجاہدہ کرینگے تو آپ کا نفس بھی آپ کو تقویٰ سے ہٹانے کے لئے مجاہدہ کرے گا اور پھر آپ کے لئے دشواری ہو جائیگی اسلئے کہتا ہوں کہ کام جو چلتا ہے تو محض فضل سے، باقی یہ ضرور ہے کہ طالب خدا کے لئے راہ طلب میں مجاہدہ ناگزیر ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ تو ملتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہدایت فرمانے ہی سے لیکن خود وہ ہدایت مرتب ہوتی ہے ہمارے مجاہدہ پر ایک دفعہ اپنے ایک وعظ میں حضرتؒ نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ لوگوں نے اسکو بہت پسند کیا وہ مثال یہ بیان فرمائی کہ دیکھو باپ بازار سے کوئی چیز لاتا ہے اور اپنے چھوٹے بچے کو دور سے دکھاتا ہے۔ بچہ چیز لینے کے لئے دوڑ کر باپ کے پاس پہونچتا ہے اور لینے کے لئے لپکتا ہے وہ اپنے ہاتھ کو اونچا کر لیتا ہے بچہ اُچکتا ہے کودتا ہے تاکہ اس کو لے لے مگر باپ ہاتھ اور اونچا کر لیتا ہے۔ بالآخر جب وہ خود لینے سے قاصر رہ جاتا ہے تو ماں کی طرف حسرت سے دیکھتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو ہی باپ کے ہاتھ سے لیکر مجھے دیدے۔ ماں یہ کرتی ہے کہ باپ ہی کی جانب اشارہ کر دیتی ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے ہی لئے لائے ہیں تم کو ہی دینگے بس اسی طرح اور اچھلو کودو۔ تمہارا کودنا اچھلنا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بچہ جب کود اچھل کر تھک جاتا ہے تو باپ کو رحم آجاتا ہے اور وہ چیز بچے کو دیدیتا ہے۔ بس یہی حال اور یہی مثال طریق میں مجاہدے کی ہے کہ اس کی وجہ سے وصول نہیں ہوتا بلکہ انسان کامیاب تو ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے محض فضل وکرم سے باقی مجاہدہ اسکے لئے شرط عادی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کا کودنا اچھلنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اب اس نے سپر ڈالدی اور اپنے کو عاجز وقاصر اور مجھ کو قادر سمجھ لیا تو پھر فضل فرمادیتے ہیں۔

سبحان اللہ بڑے ہی غضب کی مثال ہے۔ اس سے لوگوں پر بڑا اثر ہوا چنانچہ سب سے زیادہ معرفت اس چیز کی انبیاء علیہم السلام کو ہوتی ہے اسلئے وہ کسی کمال کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے اور میں نے جو یہ کہا کہ مجاہدہ وصول کے لئے سبب عادی ہے اس کی علت نہیں اس لئے کہ کبھی انسان بدون مجاہدہ کے بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

کہ جہاز میں لوگ ان کو چپت مارتے تھے اور انھوں نے دعا کردی سب کے سب صاحب نسبت ہو گئے لیکن یہاں بھی ان لوگوں کو مجاہدہ اگرچہ نہیں کرنا پڑا مگر وصول کے لئے سبب یہاں بھی تھا اور وہ تھا ان بزرگ کی دعا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے آدمی مجاہدہ سے پہونچتا ہے اور وصول کا ایک سبب و ذریعہ مجاہدہ ہے اسی طرح سے اس کا ایک دوسرا سبب دعا بھی ہے۔ خواہ آپ خود کریں یا کوئی دوسرا آپ کے لئے کردے۔ اسکو آپ کیوں بھولے ہوئے ہیں۔ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست سنت ہے اسکو اختیار کرو۔ اور اسکو لوگوں سے بیان کرو۔ جب کام کا طریقہ ہی نہ سکھلاؤ گے تو کام کیسے ہوگا۔

مشائخ کا یہی تو کام ہے کہ وہ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچادیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام ہے کہ خدا تک پہونچادیں۔ اور رسول تک پہونچانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعاؤں تک پہونچادیں اور اسکی معرفت کرادیں پھر وہ دعائیں (سوال اور استعاذہ) خدا تک پہونچا دینگی۔ آج اگر علماء یہ راستہ اختیار کریں تو لوگوں کے لئے آسانی بھی ہو اور بہت جلد عوام کے اندر بھی صلاح و تقویٰ پیدا ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ ان کا حال ہم لوگوں سے اچھا ہو جائے مگر جب عالم بتلائے گا نہیں تو عامی اور جاہل کیسے سیکھ لے گا۔ اور عالم اس لئے نہیں بتاتے کہ انھوں نے کتابیں تو بیشک پڑھی ہیں مگر یاد ہونے اور عمل کرنے کے باب میں یہ اور وہ دونوں برابر ہیں۔ پھر بقول قائل ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

عوام تو خیر عوام ہی ہیں۔ آج عالم کا یہ حال ہے کہ اس کو قرآن و حدیث سے زیادہ مناسبت دوسری چیزوں سے ہے۔ ایک دن میرے ہاتھ میں اکبر حسین جج کا دیوان تھا ایک مولوی صاحب ملنے آئے میرے ہاتھ میں اسکو دیکھ کر فرمانے لگے کہ اچھا فلاں کتاب ہے۔ فلاں مولوی صاحب بھی اپنی مجلس میں اسی کو سامنے رکھتے تھے اور لوگوں کو سُنا سُنا کر اسی سے پند و نصیحت فرماتے تھے میں نے جب یہ سنا تو آپ سے کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا گذر گئی۔ میں نے ان سے تو کچھ کہا نہیں اپنے دل میں کہا انا للہ پند و نصیحت کے لئے کتاب و سنت ہے کہ اقبال اور اکبر کا کلام ہے ان مولانا صاحب کو اگر حضرتؒ کی کتابوں کے سنانے میں معاصرت مانع تھی تو کوئی تفسیر

Scanned with CamScanner

کی کتاب یا حدیث کی کتاب لے لیتے اور مسلمانوں کو اس میں سے سنا دیتے۔ کتاب وسنت پر تو ایمان ہے اور کسی کے کلام پر ایمان نہیں ہے۔ میں ان کی برائی نہیں کرتا ہوں ان کا کلام بہت اچھا ہوتا ہے اور اصلاحی باتیں ہوتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے علماء بھی اس پر اتر آئے ہیں تو پھر اب قرآن وحدیث کی اشاعت کی توقع کس سے کی جاوے۔ اور جب علماء کی مجلس میں گرمی شعر وشاعری سے آئے گی تو قرآن وحدیث کا محل کون سی مجالس ہوں گی۔ یہ خیال آکر رنج ہوا اور میں نے وہ کتاب الماری میں رکھوا دی اور اس کے بعد قرآن وحدیث ہی کا وعظ کہنے لگا۔ آدمی قرآن وحدیث بیان کرے اور ضمناً بطور تائید کے کسی کا کلام بھی پیش کردے تو خیر اس میں تو کچھ مضائقہ نہیں ہے مگر یہ کہ ان ہی کو اصل بنا لیا جاوے اور ان کو کتاب وسنت کا مقام دے دیا جاوے یہ بات تو اللہ ورسول کو کبھی پسند نہیں ہوگی اور بلا شبہ یہ کتاب وسنت کے حق میں تقصیر ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو جتنا مزا میر کے اور اقبال کے اشعار میں آتا ہے اتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں نہیں آتا۔ میں اس وقت آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اور آپ کے تعوذات ہی کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ دین ودنیا کی کوئی ضروری چیز ایسی نہیں ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے نہ مانگی ہو یا مضر چیزوں سے پناہ نہ مانگی ہو اور آپ تو معصوم تھے اللہ تعالیٰ کے محبوب تھے اس لئے زیادہ تر مقصد ان دعاؤں اور استعاذوں سے امت کو تعلیم کرنا ہے۔ اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ تو امت کا اس قدر لحاظ فرمائیں اور امت کو آپ کی ان دعاؤں کی جانب التفات تک نہ ہوسکے۔ سنئے۔

سب سے بڑی دعا جو آپ نے اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

وَاَسْئَلُكَ نَعِيْمًا لَّا يَنْفَدُ وَقُرَّةَ عَيْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَاَسْئَلُكَ الرِّضَاءَ بِالْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَائِكَ۔ یعنی اے اللہ میں سوال کرتا ہوں اور طلب کرتا ہوں تجھ سے ایسی نعمت کہ ختم نہ ہو اور آنکھوں کی ایسی ٹھنڈک

کہ جو جاتی نہ رہے اور مانگتا ہوں تجھ سے رضا مندی تیرے حکم پر اور خوش عیشی موت کے بعد اور مزا تیرے دیدار کا اور تڑپ تیرے وصال کی۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے فلاح دارین طلب فرما رہے ہیں۔ نعمت کا سوال فرماتے ہیں کہ ایسی نعمت عطا فرمائیے کہ جو کبھی ختم نہ ہو یہ اس لئے کہ جس طرح سے نعمت کا نہ ہونا انسان کے لئے باعث تکلیف ہوتا ہے اسی طرح سے نعمت کا باقی نہ رہنا اور درمیان میں سلب ہو جانا۔ یہ بھی سبب کلفت ہوتا ہے۔ نیز اس میں آپ نے موت کے بعد خوش عیشی کی دعا فرمائی ہے جس سے مراد جنت کا عیش ہے لیکن اس پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت طلب فرمائی اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق اور تڑپ طلب فرمائی یہ اس لئے کہ آخرت میں سب سے بڑی نعمت جو مومن کو حاصل ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہی ہے۔

یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی دعا تھی اور سب سے بڑھ کر استعاذہ یعنی جس چیز سے آپ نے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی ہے وہ یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ تَصُدَّ عَنِّیْ وَجْهَكَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ۔ یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری اس سے کہ تو منھ پھیر لے مجھ سے قیامت کے دن۔

آپ نے یہ استعاذہ اسلئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ادنی سی بے التفاتی دوزخ کے عذاب سے بڑھ کر ہو گی۔ دیکھئے جس طرح سے سب سے بڑی نعمت آخرت میں اللہ تعالیٰ کے وجہ کی جانب نظر کرنے کی لذت ہو گی اسی طرح سے سب سے بڑی نقمت اللہ تعالیٰ کی بے التفاتی ہو گی۔ (چہرہ)

چنانچہ کافر کو دوزخ کا تو جو عذاب ہو گا اس سے اسکو جیسی کچھ تکلیف ہو گی وہ تو ظاہر ہے لیکن اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بے رخی کی ضیق ہو گی۔ ایسی ضیق کہ اگر وہاں موت ہوتی تو مر جاتا، غرض وہ پہلا عنوان سوال تھا اور یہ پناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چیز کو مختلف عنوان سے اللہ تعالیٰ سے طلب فرماتے ہیں جس وقت جو حال طاری ہوا اور جو شان غالب ہوئی اسی کے مناسب دعا فرمائی۔ یہ میں آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے اعلیٰ درجہ کی جو دعا ہے اسکو بتلا رہا ہوں اور آپ نے نعیماً لا ینفد کا جو

سوال فرمایا ہے یہ جسمانی نعمت ہے اور لذۃ النظر کا جو سوال فرمایا یہ روحانی نعمت ہے انبیاء علیہم السلام کا وصول چونکہ کامل ہوتا ہے اسلئے اس میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ اسئلک نعیما الخ یہ آپ عروج تام میں فرما رہے ہیں۔ اسی طرح سے اسئلک الشوق الی لقائک یہ بھی انتہائی عروج ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے مناجات کا کیسا کچھ شوق ہوگا۔ ہم آپ تو اسکو سمجھ بھی نہیں سکتے لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شوق ہے تو آپ کو بھی ہونا چاہیئے۔ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت دنیا ہی میں آجاتی ہے۔ یہ سب تو عروج کی دعائیں ہیں۔ اب نزول کی سنیئے فرماتے ہیں۔

اللھم قنی شر نفسی یعنی اے اللہ مجھ کو میرے نفس کے شر سے محفوظ رکھئے اللھم ات نفسی تقوٰھا اے اللہ مجھے میرے نفس کا تقویٰ عطا فرما۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نفس کا تقویٰ ہوتا ہے اسی طرح اس کا شر بھی ہوتا ہے۔ اسی پر نظر کر کے یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں۔ اسی طرح سے آپ نے سمع کے شر سے بصر کے شر سے لسان کے شر سے قلب کے شر سے اور منی کے شر سے پناہ مانگی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ اسی طرح سے آپ نے ظالم ہونے سے اور مظلوم ہونے سے بھی پناہ مانگی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمِنَ الْفَاقَۃِ وَمِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ وَمِنَ الْھَدْمِ وَمِنَ التَّرَدِّیْ وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَاَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَمِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِیْ سَبِیْلِکَ مُدْبِرًا وَاَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغًا یعنی پناہ مانگتا ہوں آپ کی فاقہ سے اور اس سے کہ میں ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں اور کسی چیز کے اپنے اوپر گر جانے سے اور کسی چیز پر سے گر پڑنے سے اور ڈوب جانے سے اور جل جانے سے اور اس سے کہ گڑبڑ میں ڈال دیں مجھے شیطان موت کے وقت اور اس سے کہ مروں میں جہاد سے بھاگ کر اور اس سے کہ مروں میں زہریلے جانور کے کاٹنے سے

اور سنیئے ایک مقام پر آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ یَّدْعُوَ عَلَیَّ رَحِمٌ قَطَعْتُھَا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ وَمِنْ شَرِّ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ وَمِنْ شَرِّ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی اَرْبَعٍ۔ یعنی پناہ چاہتا ہوں تیری کہ بد دعا دے مجھے کوئی رشتہ دار جس سے میں نے قطع رحم کیا ہو۔ یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں اس حیوان کی برائی سے جو کہ پیٹ کے بل

چلتا ہے (جیسے سانپ) اور اس حیوان کی برائی سے جو دو پیر سے چلتا ہے (یعنی انسان) اور اس حیوان کی برائی سے جو چار پیروں سے چلتا ہے (جیسے تمام درندے) اور سنئے فرماتے ہیں۔

اللھم انی اعوذ بک من امرأۃ تشیبنی قبل المشیب واعوذ بک من ولد یکون علی وبالا واعوذ بک من مال یکون علی عذابا اللھم انی اعوذ بک من الشک فی الحق بعد الیقین واعوذ بک من الشیطان الرجیم واعوذ بک من شر یوم الدین۔

یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے کہ مجھے بوڑھا کر دے بڑھاپے سے پہلے اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال اور پناہ چاہتا ہوں ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری شک لانے سے ہر بات میں بعد یقین کے اور پناہ چاہتا ہوں تیری شیطان مردود سے اور پناہ چاہتا ہوں تیری روز جزا کی سختی سے۔

دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بداخلاق عورتوں سے پناہ مانگی ہے اور ناخلف اولاد سے پناہ مانگی ہے۔ مال ہونے کے عذاب سے پناہ مانگی ہے اور شیطان سے پناہ مانگی ہے۔

آپ غور کیجئے گا تو آج دنیا میں انسان کو انھیں چیزوں کی طرف سے پریشان پائیے گا اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں ہیں پناہ مانگنے کی۔ لیکن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سے پناہ مانگ کر ہمیں نہ بتا دیتے تو امت ان کی طرف سے پریشان بھی رہتی اور پناہ بھی نہ مانگتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت قائم فرما دی تاکہ لوگ بھی آپ کی اقتدا کریں کیونکہ بڑے جب عمل کرتے ہیں تب ہی چھوٹے بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ جو چیز پیر نہیں کرتا تو مرید بھی اسکو نہیں کرتا۔ اور جس طرح سے آپ نے بڑی بڑی چیزوں کی دعا کی ہے توحید کی کی ہے۔ جنت کی کی ہے، عافیت کی کی ہے دوزخ سے نجات کی کی ہے اسی طرح سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی طلب فرما کر بتا دیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِنِعْمَتِکَ السَّابِقَۃِ عَلَیَّ وَبَلَائِکَ الْحَسَنِ الَّذِیْ ابْتَلَیْتَنِیْ بِہٖ وَفَضْلِکَ الَّذِیْ فَضَّلْتَ عَلَیَّ اَنْ تُدْخِلَنِی الْجَنَّۃَ بِمَنِّکَ وَفَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے بوجہ تیرے سابق انعام کے جو مجھ پر ہے اور بوسیلہ اس اچھے امتحان کے جس سے امتحان کیا ہو تو نے میرا اور بوسیلہ تیرے اس فضل

کے جو تونے میرا ہو مجھ پر یہ کہ داخل کر مجھے جنت میں اپنے احسان اور فضل اور رحمت سے
اسی طرح ایک جگہ فرماتے ہیں اَسْئَلُكَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَبِكُلِّ حَقٍّ هُوَلَكَ وَبِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ اَنْ تُقِيْلَنِيْ وَاَنْ تُجِيْرَنِيْ مِنَ النَّارِ بِقُدْرَتِكَ سوال کرتا ہوں میں تجھ سے بحق تیرے اس نور ذات کے کہ اس سے روشن ہیں سب آسمان اور زمین اور صدقہ ہر اس حق کا جو تیرا ہے اور بذریعہ اس حق کے جو مانگنے والوں کا تجھ پر ہے یہ کہ درگذر کرے تو مجھ سے اور پناہ دے مجھے دوزخ سے اپنی قدرت سے۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَاَهْلِيْ وَمَالِيْ۔ اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے معافی اور امن اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں اپنے اہل میں اور اپنے مال میں۔

اسی طرح سے ایک جگہ فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلَاحًا وَاَوْسَطَهُ فَلَاحًا وَاٰخِرَهُ نَجَاحًا۔ اَسْئَلُكَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔ یعنی یا اللہ کردے اس دن کے اول حصہ کو بہتری اور اس کے اوسط حصہ کو فلاح اور اسکے آخری حصہ کو کامیابی۔ میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی دنیا کی اور آخرت کی۔ اے سب سے بڑے مہربان۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ مِنْ كُلِّ بَلِيَّةٍ۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ مِنْ جَمِيْعِ الْبَلَاءِ۔ چنانچہ ایک طویل استعاذہ میں امور آخرت سے پناہ مانگنے کے بعد امور دنیا کو ایک ایک کر کے شمار کرایا۔ فرماتے ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَأْثَمِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَشَرِّ فِتْنَةِ الْغِنَا وَشَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنَ الْقَسْوَةِ وَالْغَفْلَةِ وَالْعَيْلَةِ وَالذِّلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ وَالْكُفْرِ وَالْفُسُوْقِ وَالشِّقَاقِ وَالسُّمْعَةِ وَالرِّيَاءِ یعنی اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی سے اور بزدلی سے بہت بڑھاپے سے! قرض سے گناہ سے۔ دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے قبر کے فتنہ سے اور

قبر کے عذاب سے اور مالداری کے برُے فتنہ سے اور زندگی اور موت کے فتنہ سے اور سخت دلی سے اور غفلت سے اور تنگدستی سے اور ذلت سے اور خواری سے اور کفر سے اور فسق سے اور ضد اور ضدا ضدی سے اور سنانے سے اور دکھانے سے۔

دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری کوئی دینی یا دنیوی ضرورت کی چیز نہیں چھوڑی جسے آپ نے نہ بیان فرمایا ہو اسی طرح سے کوئی مضر چیز دین یا دنیا کے اعتبار سے نہیں چھوڑی جس سے پناہ نہ مانگی ہو۔ آپ نے بھی کبھی اس منزل کی سیر کی ہے؟ آپ جو اشعار پڑھتے ہیں اور ان پر وجد کرتے ہیں۔ یہ کوئی پہونچنا نہیں ہے۔ حدیث شریف کو میں بیان کر رہا ہوں اس کے ذریعہ سے آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جاتا ہے۔ اور ہم جو یہ دعائیں پڑھ رہے ہیں آپ کو اس میں مزا نہ آتا ہوگا۔ لیکن ہم کو تو مزا آتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ان سب چیزوں میں مبتلا ہیں اور خوب خوب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ان دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے پناہ نہیں مانگتے حالانکہ یہی کام کرنے کا ہے جب آدمی کرتا ہے تب ہی کچھ کھلتا ہے اگر ہم بزرگوں کے تصرفات کے واقعات آپ کے سامنے بیان کریں تو آپ کو خوب لطف اور مزا آئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعائیں آپ میں کچھ حرکت نہیں پیدا کرتیں۔ بات یہ ہے کہ اولیاء جو کچھ کرتے ہیں وہ عروج کے مقام سے کرتے ہیں اور انبیاء جو یہ سب دعائیں مانگ رہے ہیں یہ نزول اور عبدیت کے مقام میں مانگ رہے ہیں اور نزول صوفیا کے نزدیک عروج سے افضل ہے جن اولیاء نے اس مقام کو پایا ہے ان کا بڑا درجہ ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ زبان سے جو یہ فلاح دارین کہا کرتے ہیں در اصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

اسی کو کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

پے نہ بردے ہیچ کس در منزل حق الیقیں — تا نہ بودے ذات پاکت اندریں رہ مقتدی

یعنی کوئی شخص حق الیقین کی منزل تک پہونچنے کے لئے راستہ طے نہیں کر سکتا جب تک کہ آپ کی ذات والا صفات اس راہ میں اس کے لئے پیشوا نہ ہو۔

چنانچہ سب سے زیادہ صحابہ کو سنتوں کا اور دعاؤں کا اہتمام تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے کسی سنت کو چھوڑتے نہ تھے۔ ایک صحابی کسی جگہ کے گورنر مقرر ہوئے اتنے بڑے عہدہ پر ہونے کے باوجود یہ کرتے تھے کہ اگر کوئی لقمہ گر جاتا تھا تو اسکو اٹھا کر صاف کر کے کھا لیتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ عجمی لوگ ہیں اس فعل کو برا جانتے ہیں اور اس کو حقیر سمجھیں گے۔ لہذا آپ ایسا نہ کیجئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ برا مانیں یا بھلا مانیں ہم اپنے نبیؐ کی سنت کو نہیں ترک کریں گے ان حضرات کی اتباع کی یہ برکت ہوئی کہ دین کی ایک ایک چیز محفوظ ہو گئی۔ ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال چلکر دکھا دیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے چلا کرتے تھے انھوں نے تھوڑی دور چلکر دکھایا لوگ اسے دیکھ کر بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش ہوا تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ بس تم لوگ اتنے ہی میں بیہوش ہو گئے یہ صحابہ ہی کا ظرف تھا کہ حضور کو برابر دیکھتے تھے اور پھر بھی ہوش میں رہتے تھے۔ صحابہ کے متعلق ایک عالم نے خوب بات کہی۔ یہ کہا کہ اگر تم لوگ صحابہ کو دیکھتے تو مجنوں کہتے اور اگر وہ لوگ تمہیں دیکھتے تو کافر سمجھتے۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب دعائیں جو آپ کو سنا رہا ہوں اسی لئے تاکہ آپ اسکو سمجھیں اور اس کا اثر لیں کہ اتنا زبردست ذخیرہ جو دین میں ہے وہ یونہی بیکار نہیں ہے اگر ان دعاؤں سے مقاصد حاصل ہی نہ ہوا کرتے تو یہ بالکل زائد اور عبث چیز ہوتی۔ حالانکہ اللہ و رسول اس سے منزہ ہیں نقص ہمارے ہی اندر ہے کہ ہم ان کو اول تو پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو مثل وظیفہ کے سرسری اور رسمی طور پر دل شریک نہیں ہوتا اور نہ عقیدت شامل ہوتی ہے اس لئے نفع سے بھی ہم محروم ہیں ورنہ تو ایک بزرگ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ جب بیمار ہوتے تھے تو علاج نہیں کراتے تھے بلکہ وضو کا بچا ہوا پانی پی لیتے تھے اس سے ان کو شفا ہو جاتی تھی۔ اصل چیز عقیدت ہے اسی لئے میں درمیان درمیان میں آپ کو متوجہ کرتا رہتا ہوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ میرا کلام نہیں ہے اور نہ میرے باپ یا استاد کا کلام ہے۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو سب مسلمانوں کا ایمان ہے اسلئے جو دعائیں آپ نے اللہ تعالیٰ سے کی ہیں اور جو استعاذے فرمائے ہیں ہم اس سے کیسے مستغنی ہو جائیں گے؟

ہر زمانے میں اللہ والوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات طلب کی ہیں اور ان سے ایسی ایسی مناجات کی ہے کہ جس سے ان کے خوف اور شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری عاجزی پسند ہے۔ چنانچہ ان کے کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طلب میں اپنے کو جلا کر رکھدیا ہے۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اور اپنے نفس کی معرفت ان حضرات کو ہوتی ہے۔ مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں کہ ؎

در جگر افتادہ ہستم صد شرر　　در مناجاتم ببیں خون جگر

یعنی میرے جگر میں سینکڑوں چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ میرے خون جگر کو اگر دیکھنا ہو تو میری مناجات میں دیکھو۔

مولانا یہ اپنے متعلق فرمارہے ہیں اسی پر انبیاء علیہم السلام کو قیاس کر لیجئے کہ ان کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ آگے مولانا اس کا کچھ نقشہ کھینچتے ہیں فرماتے ہیں کہ ؎

ایں چنیں اندوہ کافر را مباد　　دامن رحمت گرفتم داد داد

ایسا غم خدا نہ کرے کسی کافر کو بھی ہو۔ میں نے تیرے رحم کا دامن پکڑ لیا ہے فضل فرمائیے میں فضل کا طالب ہوں

کاش کہ مادر نزادے مر مرا　　یا مرا شیرے بخوردے در چرا

اے کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا　　یا کوئی شیر مجھے جنگل میں کھالیتا

اے خدا آنکن کہ از تو می سزد　　کہ زہر سوراخ مارم می گزد

اے اللہ تو میرے ساتھ وہ معاملہ کر جو تجھے زیب دیتا ہے۔ اسلئے کہ (نفس کے) سانپ نے مجھے ہر سوراخ سے ڈس لیا ہے۔

دیکھا آپ نے یہ مناجات ہے آپ کے اولیاء اللہ کی جنھوں نے اس میں اقتدا کی ہے انبیاء علیہم السلام کی۔ اب جو حضرات اللہ تعالیٰ کے ایسے مقرب ہیں ان کے تو یہ حالات ہیں اور آپ چہ غم ہیں ع "جنکے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"!

بات یہ ہے کہ یہ حضرات اہل معرفت ہیں اور آپ کا گذر اس کوچہ میں نہیں ہوا ہے انسان کو جب کسی کی معرفت ہوتی ہے تو اس کی عظمت بھی قلب میں ہوتی ہے۔ اور اس کا خوف اور اسکی ناراضی کا غم بھی ہر وقت مسلط رہتا ہے اور اپنی نا اہلی اور بے کمالی ہر وقت سامنے رہتی ہے۔

ایاز محمود کا غلام تھا بادشاہ اسکو بہت چاہتا تھا۔ ابتداءً جب وہ بادشاہ کے یہاں آیا

تو اس کے کپڑے نہایت معمولی تھے۔ بادشاہ نے اسکی لیاقت کا اندازہ لگا کر اسکو اپنا مصاحب خاص بنالیا۔ چنانچہ دربار میں اس کے لئے خاص جگہ مقرر کردی اور شاہی جوڑا اسے عطا فرمایا جسے پہن کر وہ دربار میں بیٹھتا۔ مگر اس کا یہ معمول تھا کہ اپنے پرانے کپڑے اتار کر ایک کونے میں رکھ دیتے تھے روزانہ ان کے پاس جاتا تھا اور ان کی طرف اشارہ کرکے اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہتا تھا کہ ایاز قدر خود بشناس یعنی ایاز اپنے مرتبہ کو نہ بھولنا۔ تم مستحق تو انھیں بوسیدہ کپڑوں کے ہو لیکن یہ شاہی کرم ہے کہ جو اس خلعت سے نوازا ہے چنانچہ اس کے اس ادب اور قدردانی کا یہ صلہ ملا کہ بادشاہ نے اسے بڑھاتے بڑھاتے وزراء سے بھی اس کا مرتبہ بڑھا دیا۔ یہ قصہ میں نے اس پر سنایا کہ جو اپنی حیثیت کو نہیں بھولتا وہ اس دنیا میں بھی ترقی کرجاتا ہے۔ اور یہی معاملہ وہاں کا بھی ہے۔ انبیاء اور اولیاء نے اس راز کو سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مراتب عالیہ پائے اور جس نے اس کے خلاف راستہ اختیار کیا یعنی عطیہ شاہی کی ناقدری کی بے ادبی کی وہ یہاں بھی خسران میں پڑا اور وہاں بھی۔ ایک بادشاہ نے ایک دفعہ اپنے مصاحبین کو خلعت تقسیم کیا لیکن سب لوگ ابھی ہاتھوں میں لئے کھڑے ہی تھے کہ ایک درباری کو چھینک آگئی اس نے یہ کیا کہ اسی خلعت سے ناک صاف کرلی۔ بادشاہ نے اسے دیکھ لیا اسے نہایت ناگوار معلوم ہوا اس نے خلعت واپس لے لی کہ جو شاہی عطیہ کی ناقدری کرے تو وہ اس لائق نہیں کہ اسکو انعام دیا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ تمام کافروں کا یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ رہا ہے کہ جس برتن میں کھایا ہے اسی میں چھید کیا ہے یعنی جس خالق نے انھیں پیدا کیا اسی کے ساتھ بے ادبی سے پیش آئے چنانچہ اسی کی شکایت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمائی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ۔ کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اسکو ایک نطفہ سے پیدا کیا بالآخر وہ ہمیں سے جھگڑتا ہے وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ہمارے لئے مثال بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ان کی عظیم قدرت اسی وقت پیش نظر ہوگی جب انسان اپنی حقیقت کو یاد رکھے گا۔ کافر نے اسی کو بھلا دیا اور انبیاء علیہم السلام نے اسی کو یاد رکھا اور دوسروں کو یاد کرایا یہ نعمت کا شکر ہے۔ چنانچہ جو جتنا شکر کرے گا اتنی ہی نعمت بڑھیگی

Scanned with CamScanner

انبیاء اور اولیاء اپنے وجود پر اور ایمان پر شکر کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعائیں میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں یہ بہت کم ہیں ان دعاؤں کے مقابلہ میں جن کا ذکر احادیث میں آتا ہے آپ نے مفصل ہر ہر چیز کو اس لئے بیان فرمادیا تاکہ وہ آپکے لئے سنت ہو جائے اور آپ بھی اسی طرح دعا مانگیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان دعاؤں کو ارشاد فرمانا تشریع ہے اور تشریع سوائے نبی کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ آپ کسی بزرگ کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھیں گے تو ٹھیک ہے اگر حدود شرع کے اندر ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن وہ تشریع نہیں ہوسکتی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعاؤں کو بتایا ہے ہمارے لئے ان پر عمل کرنا سنت ہوگا۔ میں یہ سب بیان کر رہا ہوں لیکن یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اولیاء کے تصرفات اور کرامات کے ذکر میں جتنا مزا آپ کو آتا ہے نبی کی دعاؤں میں اتنا نہیں آتا۔ ان میں مزا کیوں نہیں آتا ان کے اندر جو جامعیت ہے فلاح دارین کی اور جو عبدیت ہے اسکو کوئی ولی کیسے پہونچ سکتا ہے اولیاء تو زیادہ تر عروج میں ہوتے ہیں اور یہ سب باتیں نزول کی ہیں۔

ایک بزرگ گذرے ہیں خواجہ باقی باللہؒ۔ ایک دن حضرت کے یہاں کچھ مہمان آگئے، مکان کے نیچے ایک باورچی رہتا تھا۔ اس نے اتنے مہمانوں کا کھانا پکا کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ چونکہ خدمت موقع کی تھی اس لئے حضرت بہت خوش ہوئے اور جوش میں آکر فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس نے کہا جو مانگونگا ملیگا۔ حضرت نے سمجھا کہ دنیا مانگے گا۔ زیادہ سے زیادہ بادشاہت مانگے گا فرمایا ہاں مانگ کیا مانگتا ہے وہ اس پایہ کے بزرگ تھے۔ باورچی نے مکرر پوچھا کہ جو مانگونگا ملیگا۔ فرمایا ہاں۔ اس نے تیسری بار پوچھا کہ جو مانگونگا ملیگا۔ فرمایا کہ ہاں۔ کہا مجھے اپنا جیسا بنا دیجئے۔ فرمایا ارے یہ نہ مانگ! اس نے کہا کہ نہیں آپ تو وعدہ فرما چکے ہیں، حضرت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور حجرہ میں لے گئے اور اسکو توجہ اتحادی دی، چنانچہ جب حجرے سے باہر نکلے ہیں تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ حضرت کون ہیں اور نانبائی کون ہے، مگر وہ زندہ نہ رہ سکا۔ تین دن کے بعد مرگیا۔ ظاہر ہے کہ جس دولت کو حضرت نے ایک مدت میں بتدریج حاصل کیا تھا وہ درجہ اور وہ ضبط اسے چند منٹ میں کیسے حاصل ہوجاتا اور وہ اس کا تحمل کیسے کرسکتا تھا، تو آپ کے اولیاء یہ کرسکتے ہیں لیکن انبیاء کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کھلاتے پلاتے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں، مگر یہ شریعت جو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے یہاں سے لائے ہیں آج ہمارے لئے آپ کو اسی کا سمجھانا مشکل ہو گیا ہے ہم سمجھانا چاہیں تو نہ سمجھا سکیں!

اور سنئے! ایک بزرگ تھے رسول نما، ان کو رسول نما اس لئے کہا جاتا تھا کہ انھیں یہ مرتبہ حاصل تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیتے تھے، لیکن اس کے لئے وہ ایک ہزار روپیہ لیا کرتے تھے ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ تمام دنیا کو زیارت کرا دیتے ہو ہمیں نہیں کرا دیتے! انھوں نے کہا کہ ضرور! جب چاہو! مگر جو شرط سب کے لئے ہے وہ تمہارے لئے بھی ہے۔ ایک ہزار روپیہ لاؤ! انھوں نے کہا کہ میرے پاس روپیہ کہاں؟ کہا کہ جب روپیہ نہیں تو پھر زیارت بھی نہ ہوگی، مگر پھر کہا کہ اچھا ایک تدبیر ہے وہ یہ کہ تم جاؤ اور نہا دھو کر کپڑے بدل کر، کنگھی، چوٹی، سرمہ، مسی، تیل پھلیل کر کے تب آؤ وہ سمجھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا معاملہ ہے شاید اسی کے لئے اس اہتمام کو فرمایا ہوگا۔ گئیں اور نہا دھو کر، بن سنور کر آگئیں! انھوں نے یہ کیا کہ ان کے بھائی کو بلا لائے اور کہا کہ ذرا اپنی بہن کو تو دیکھو انھیں بڑھاپے میں کیا یہ شوق ہوا کہ دلہن بنی بیٹھی ہیں! بھائی کو دیکھ کر اور یہ سن کر ان کو بڑی غیرت آئی اور کہنے لگیں کہ آپ نے کیا میرا فضیحتا کرانے کے لئے یہ سب کیا تھا؟ یہ کہہ کر رونے لگیں اور اسی حالت میں غنودگی آگئی، سو گئیں، حضرت نے توجہ کر دی اور زیارت ہو گئی۔ جب سو کر اٹھیں تو بڑی خوش تھیں! کہنے لگیں جائیے آپ نے نہیں کرائی نہ سہی مجھے تو زیارت ہو گئی! انھوں نے فرمایا کہ وہ میں نے ہی توجہ دی تھی! تو چونکہ وہ کامل تھے روپیہ کا بدل فوراً تجویز کر لیا کہ جس قدر تصفیہ قلب کا ایک ہزار روپیہ خرچ کر کے ہوتا انھوں نے اس طریقہ سے کر دیا۔

یہ واقعہ اس پر سنا رہا ہوں کہ آپ کے اولیاء یہ کر سکتے ہیں! لیکن اس کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کی زیارت ہو گئی۔

اور ایک ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی زیارت، حضور کی شریعت کی زیارت حضور کی ذات کی معرفت، یہ چیز کوئی متبع سنت بزرگ ہی کر سکتا ہے اور اس معنی کر ہر بزرگ رسول نما ہے۔

اس لئے اگر کسی شیخ نے لوگوں کو رسول ہی تک نہیں پہنچایا تو وہ شیخ ہی کیا ہے؟ حقیقتاً شیخ وہی ہے جو حضور تک پہنچا دے، اور حضور کا یہ کام ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں،

اور حضور تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ حضور کی سنت تک پہنچا دیں! اور خدا تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت تک پہنچا دیں جو خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے!

اب انبیاء کی شریعت کو ایسے طریقہ پر ہم آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتے کہ آپ اس کے عاشق ہو جائیں! اور وہ آپ کو محبوب ہو جائے ورنہ تو آدمی کو جب کسی چیز کی معرفت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ میرے لئے سراپا رحمت ہے تب تو وہ اس کا عاشق ہی ہو جاتا ہے ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو اختؔر
اِدھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے یہ دم بدم عنایت

کسی نے خوب ہی دعا کی ہے ؎

این دو دولت از خدا داریم ہر دم آرزو
خانۂ خالی ز غیر و صحبتِ جانانہ

(ترجمہ)

اللہ تعالیٰ سے بس انھیں دو دولتوں کی آرزو ہے اور ہر وقت اسی کے حصول کی تمنا ہے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسا قلب عطا فرما دیں جس میں غیر کا گذر نہ ہو، اور دوسرے محبوب حقیقی کی صحبت ہو۔

Scanned with CamScanner

(مجلس دوم)
(بسلسلۂ وصیۃ السنۃ)

فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں جو آپ کو سنائی ہیں وہ مناجات مقبول میں حضرت مولانا رح نے جمع فرمادی ہیں، یہ بھی ان علماء کا احسان ہے کہ ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو جمع فرمادیا۔ ورنہ لوگوں کی اس زمانہ میں یہ ہمت نہ تھی کہ احادیث سے انھیں یاد کرتے، میں نے آپ سے بیان کیا تھا کہ میرے ایک دوست تھے حافظ قرآن، دعاؤں کا ایک مختصر سا مجموعہ جسے میں نے منتخب کیا تھا اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئے لیکن کہا کہ یاد نہیں ہوتیں۔ یہ تو آج ہماری مناسبت کا حال ہے۔ بہر حال علماء نے اپنا کام کردیا ہے اب آپ یاد کریں یا نہ کریں۔

حضرت مولانا نے مناجات مقبول میں ایک تتمہ بھی قائم فرمایا ہے جس میں صبح وشام اور خاص خاص اوقات واحوال کی دعائیں جمع فرمادی ہیں۔ اب ان چیزوں کو تو یاد کرتے نہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ نور دیدو، یہ کیا ہے؟ نور ہی حاصل کرنے کا طریقہ تو بتلا رہا ہوں، سنو اور عمل کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (یعنی شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام کے ساتھ کہ جس کے نام کے ساتھ نہیں نقصان پہنچا سکتی ہے کوئی چیز نہ زمین میں اور نہ آسمان میں وہ سنتا ہے اور جانتا ہے!

اس دعا کو روزآنہ صبح وشام تین مرتبہ پڑھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ سے انشاء اللہ ہر چیز کے ضرر سے محفوظ رہیئے گا، کیسی عمدہ دعا ہے، اب آپ کیسا سُن رہے ہیں؟ لیکن پڑھئے گا نہیں! بس بدن پر گرنا چاہیئے گا۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ میرا تجربہ ہے کہ جس دن بسم اللہ الذی الخ نہیں پڑھتا اس دن کوئی نہ کوئی آفت ضرور پیش آجاتی ہے۔ کہیں کوئی کیڑا ہی کاٹ لیتا ہے، وہی صاحب ایک

بات اور کہتے تھے اور بہت اچھی معلوم ہوتی تھی، کہتے تھے کہ میرا کھانا دونوں وقت ایک جگہ سے آتا ہے، لیکن میں اس پر بھروسہ نہیں کرتا ہوں، صبح آتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید شام کو بند کر دیں اور شام کو آتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب شاید صبح کو نہ آئے، اس پر اگلے وقت کا کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ مگر کبھی کھانا بند نہیں ہوا برابر آتا رہا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی کا نام توکل ہے اسی کو اللہ پر نظر کرنا کہتے ہیں اور اسی کو افتقار الی اللہ کہا جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ؕ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تو پھر یہ حضرات جتنے بھی کمالات ہیں سب میں اپنے کو حقیر ہی جانتے ہیں عبدیت کی نہایت عمدہ تفسیر ہے سراپا افتقار ہو جانا، حقیقی عبدیت افتقار سے ہوتی ہے۔ اور یہ (افتقار) حقیقی عبدیت کا جزو عمدہ ہے اور دوسرا جزو حسن قدوہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔
(اقتدار)

اب لوگ اپنے کو فقیر جو لکھتے ہیں، تو یہ محض رسمی ہے، فقر ایک بہت بڑا مقام ہے، یعنی آدمی معطی اور فیاض اللہ تعالیٰ کو سمجھے اور اپنے کو ان کے سامنے عاجز، محتاج اور سائل قرار دے، یہ بہت اچھا حال ہے، بلکہ کمال عبدیت ہے، انبیاء علیہم السلام اسی کے ساتھ متصف ہوتے ہیں، اسوقت اسی کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام میں سب سے بڑھے ہوئے تھے، اور کیسا کچھ آپ کا افتقار تھا۔ اس کا کسی قدر اندازہ آپ کی دعاؤں اور تعوذات ہی سے ہوتا ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ (ترجمہ) پناہ چاہتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی، تمام مخلوق کی برائی سے۔

آپ نے بہت سے وظیفے پڑھے ہوں گے لیکن اسکو کبھی نہ پڑھا ہوگا۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اے اللہ جتنی آپ کی مخلوقات ہیں سب کے شر سے آپکی پناہ پکڑتا ہوں، ما خلق کا عنوان اس لئے اختیار فرمایا ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ سب آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، لہذا آپ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکیں۔

بہت دنوں سے چاہتا تھا کہ سنت کے اس مضمون کو ایک خاص شان سے بیان

کروں لیکن کوئی نہ کوئی عذر لاحق ہو جاتا تھا، اس وقت پھر ارادہ کیا ہے کہ اسے بیان کردوں لیکن یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر ہم لوگ آپ کو اپنا کوئی وظیفہ بتا دیتے تو آپ اسے پیر کا وظیفہ سمجھ کر گرہ باندھ لیتے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح و شام کا جو وظیفہ فرما رہے ہیں اس کی جانب توجہ نہیں کرتے۔ آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کسی بزرگ کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ وظیفہ کی طرف التفات نہ کرنا یہ کیسا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ بِکَ اَصْبَحْنَا وَبِکَ اَمْسَیْنَا وَبِکَ نَحْیٰ وَبِکَ نَمُوْتُ وَاِلَیْکَ النُّشُوْرُ ۝ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ اے اللہ آپ ہی کی قدرت سے صبح کی ہیں نے اور آپ ہی کی قدرت سے شام کی ہیں نے۔ اور آپ ہی کی قدرت سے زندہ ہیں ہم اور آپ ہی کی قدرت سے مرتے ہیں ہم اور آپ ہی کی طرف اٹھنا ہے۔ کوئی معبود نہیں سوا اللہ کے۔ وہ اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا ملک ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ وہ خود زندہ ہے۔ مرتا نہیں۔ وہ سب چیز پر قادر ہے۔

دیکھا آپ نے افتقار الی اللہ کی شان! اب اس دعا کو صبح پڑھ لیجئے تو شام تک محفوظ اور شام کو پڑھ لیجئے تو صبح تک مامون!

اور سنئیے آگے فرماتے ہیں:۔ رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ اَصْبَحْنَا عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ وَکَلِمَۃِ الْاِخْلَاصِ وَعَلٰی دِیْنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمَ وَعَلٰی مِلَّۃِ اَبِیْنَا اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ راضی ہیں ہم اللہ سے باعتبار رب ہونیکے اور اسلام سے باعتبار دین ہونے کے اور محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم سے باعتبار نبی ہونیکے صبح کی ہم نے دین اسلام اور کلمہ اخلاص پر اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر اور اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر جو خاص مطیع تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے آگے فرماتے ہیں!

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ؕ (اے اللہ تو ہی میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا کیا میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ پر ہوں جہانتک طاقت رکھتا ہوں! اقرار کرتا ہوں تیری نعمت کا جو مجھ پر ہیں اور اقرار کرتا ہوں اپنے گناہ کا۔ پس بخشدے مجھے کیونکہ گناہوں کو نہیں بخش سکتا ہے کوئی سوائے تیرے، پناہ پکڑتا ہوں میں تیری اپنے اعمال کی برائی سے۔ کافی ہے مجھ کو اللہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اسکے میں نے اس پر بھروسہ کیا اور وہ رب ہے عرش عظیم کا!

سبحان اللہ اس دعا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے۔ ہر موقع پر خدا کی یاد اور ہر حاجت میں اسی کی جانب احتیاج۔

شیخ ابوسعیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ابوالفضل محمد بن حسن جو اپنے وقت کے شیخ تھے ان سے سنا کہ الماضی لایذکر یعنی ماضی کا ذکر نہیں کیا جاتا (یعنی قابل ذکر نہیں) والمستقبل لا ینتظر اور آئندہ کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے وما فی الوقت یعتبر یعنی بس حال کا اعتبار کرنا چاہیئے اور اسکو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ آگے فرماتے ہیں ھذا صفۃ العبودیۃ یعنی بندہ جس بندگی اور فرمانبرداری کا مامور ہے وہ یہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یعنی

ع　"ماضی و مستقبلت پردۂ خدا ست"

یعنی ماضی و مستقبل حجاب ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ حقیقۃ العبودیۃ شان الافتقار الی اللہ تعالٰے وھذا من اصل العبودیۃ وحسن القدوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو الذی لیس فیہ للنفس نصیب ولا راحۃ یعنی عبودیت کی حقیقت (دو چیزیں ہیں) ایک شان افتقار الی اللہ تعالی (یعنی ہر وقت قلباً اپنے آپ کو اللہ کا محتاج جاننا اور دل سے یہ سمجھنا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے خدا کی طرف سے ہے) اور یہی اصل بندگی ہے۔ اور دوسری

چیز ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن قدوہ (یعنی تمام امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی اقتدا کہ جس میں سالک کے پیش نظر محض آپ کی فرمانبرداری ہو جس کی علامت یہ ہے) کہ اس میں نفس کیلئے نہ کوئی حظ ہو نہ راحت ہو!

چنانچہ یہ بالکل ظاہر ہے اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ایک دعا بھی اگر آپ دل سے پڑھ لیں تو اللہ تعالیٰ سے نسبت جڑ جائے۔ اس کی مثال سنئے۔ فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ۔ اے اللہ آپ میرے پالنے والے ہیں۔ آپ ہی نے مجھے پیدا کیا ہے کوئی معبود نہیں ہے سوا آپ کے۔!

دوسری دعا سنئے۔ فرماتے ہیں:-

اَللّٰهُمَّ اَنَا عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ اَتَقَلَّبُ فِیْ قَبْضَتِكَ وَاُصَدِّقُ بِلِقَائِكَ وَاُوْمِنُ بِوَعْدِكَ اَمَرْتَنِیْ فَاَبَیْتُ وَنَهَیْتَنِیْ فَاَتَیْتُ هٰذَا مَكَانُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ + یعنی اے اللہ میں تیرا غلام ہوں۔ تیرے غلام کا بیٹا ہوں۔ تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ سچ جانتا ہوں تیرے ملنے کو۔ یقین رکھتا ہوں تیرے وعدہ پر۔ مجھ کو تو نے حکم دیا تو میں نے تیری نافرمانی کی اور تو نے منع کیا تو میں نے وہی کام کیا۔ یہ جگہ ہے پناہ لینے والے کی دوزخ سے بذریعہ تیرے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے تیرے۔ پاک ہے تو۔ میں نے ظلم کیا اپنی جان پر۔ آپ مجھے بخشدیجئے۔ بیشک تیرے سوا اور کوئی گناہ کو نہیں بخش سکتا۔!

دیکھئے جو آپ کا روزمرہ کا کام ہے کہ ادھر جاتے ہیں ادھر جاتے ہیں وہ انبیاء کا وظیفہ ہے یعنی اس میں بھی وہ حق تعالیٰ سے مدد چاہتے رہتے ہیں کہ کہیں کسی زحمت میں نہ پڑ جائیں کس قدر عبدیت اور کس قدر افتقار ہے۔ آپ سے کہتا ہوں کہ میرے لوگ جب کہیں جاتے ہیں تو اطمینان نہیں ہوتا جب تک کہ واپس نہیں آجاتے۔ اسلئے کہ کسی وقت کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کیا ہو جائے؛ چنانچہ موٹر۔ ریل اور ہوائی جہاز کے حادثات آپ سنتے ہی رہتے ہیں اسلئے انبیاء علیہم السلام یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے سارے تقلبات یعنی کہیں آنا جانا

سب آپ ہی کے قبضہ میں ہے اور آپ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ ہی ہمارے محافظ ہوجائیے۔

انبیاء علیہم السلام کا تو یہ حال ہے اور آپ کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ اپنے جملہ امور کو خدا کے حوالہ کر دینا چاہیئے!

اور میں تو کہتا ہوں کہ آج کل اللہ تعالیٰ کی جانب افتقار اور اظہار احتیاج کے اسباب جس قدر زیادہ ہوگئے ہیں اتنی ہی غفلت زیادہ ہوگئی ہے۔ چنانچہ اسی غفلت کا ایک فرد یہ بھی ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعائیں آپ کو سنا رہا ہوں، اور آپ کو نیند آرہی ہے۔ دل نہیں لگ رہا ہے تو نہ لگے۔ میرا وقت تو بیکار جائے گا نہیں۔ اسلئے کہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھ رہا ہوں مجھے تو اس کا ثواب ملے گا ہی۔ البتہ اپنا وقت آپ نے ضائع کیا اس کو آپ جانئے! لیکن یہ سمجھ رکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس طرح سے دعا فرمائیں۔ اور آپ ان کی جانب التفات نہ کریں تو اس سے بڑھ کر اور کیا گمراہی ہوگی۔ آپ کا راستہ یہیں سے بند ہے۔ سنتے ہیں آپ! کبھی راستہ بند بھی ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ تھے پانی پت میں۔ ایک صاحب (جو بعد میں خود بہت بڑے متبع سنت بزرگ ہوئے) ان کی خدمت میں گئے اور ان کے مرید ہوگئے۔ اور زمانہ کے دستور کے مطابق انھوں نے ان کو طاقیہ (ٹوپی) دی۔ انھوں نے لے لی، لیکن اس کے بعد انھیں کسی بات سے شبہ ہوا کہ شاید یہ کامل طور پر متبع سنت نہیں ہیں اسلئے ان کا طاقیہ واپس کر دیا، انھوں نے لے لیا۔ یہ صاحب واپس ہوئے چلتے چلتے تھک گئے مگر راستہ طے نہیں ہوا خیال کیا کہ درخت پر چڑھ کر دیکھیں کوئی شخص نظر آئے تو راستہ پوچھیں چنانچہ ایک درخت پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ دو آدمی سیدھے ان کی طرف آرہے ہیں۔ جب وہ قریب آئے تو پوچھا کہ راستہ کدھر ہے؟ انھوں نے کہا کہ راستہ تو آپ شیخ کے مکان ہی پر چھوڑ آئے ہیں۔ انھوں نے کہا ایسا ہی ہے؟ کہا کہ ہاں! درخت سے اتر کر شیخ کے مکان کی طرف چل دیئے تو راستہ طے ہونے لگا۔ جب مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ شیخ مکان کے دروازے پر اس طرح سے طاقیہ لئے کھڑے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت طاقیہ دیدیجئے۔ فرمایا لو۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ راستہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر ہے اور آپ کے ساتھ عقیدت اور آپ کی سنت پر عمل کرنے میں اسکو چھوڑ دو گے تو پھر راستہ کہاں ملے گا ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اور اس میں شک نہیں کہ شیخ تو وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرادے کیونکہ بغیر آپ کے واسطہ کے نہ آخرت کا کام انجام پائیگا اور نہ دنیا کا۔ ہمارے شیخ المشائخ قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ در راہ محمد رہ نہ یافت
تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

(ترجمہ) جس شخص نے آنحضرتؐ کی راہ (شریعت وسنت) نہ پائی وہ قیامت تک (خدا کی حضوری) کی گرد بھی نہ پاسکیگا

لہٰذا اسکو دیکھنا ہوگا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کو پکڑا ہے یا نہیں! انتہا ہوگئی کہ آپ نے علاوہ عروج کے حالت نزول میں بھی دعائیں مانگی ہیں جس میں ہماری تمام ضروریات کا ذکر ہے بلکہ اگر ہم اپنی ضروریات کو شمار کرتے تو شاید نہ کر سکتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک کر کے ہماری جملہ حاجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی ہے۔

یہ فرماتے ہیں:۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الصَّمَمِ وَالْبَكَمِ وَالْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَسَيِّئِي الْاَسْقَامِ وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَمِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْبُخْلِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ وَمِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَمِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَّفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا يُسْتَجَابُ لَهَا ٥ اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں تیری! بہرے ہونے سے اور گونگے ہونے سے اور جنون سے اور جذام سے اور بری بیماریوں سے اور بار قرضہ سے اور فکر سے اور غم سے اور بخل سے اور لوگوں کے دبا لینے سے اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے اور اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو مقبول نہ ہو۔

دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ بلاؤں اور تمام بیماریوں سے پناہ مانگی

ہے اور خاص خاص بیماریوں کو ذکر فرمایا ہے۔ بہرے ہونے سے پناہ مانگی ہے۔ گونگے ہونے سے پناہ مانگی ہے جنون اور جذام سے پناہ مانگی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی نفع ہوتا ہے۔ لیکن آپ بوعلی سینا کی، طبیبوں کی اور ڈاکٹروں کی تو خوشامد کرینگے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو یہ عافیت تقسیم فرما رہے ہیں اسکی آپ کو خبر نہیں اور نہ طبیب لوگ آپ کو یہ بتائیں گے! خود ہی خیال فرمایئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیگا تو پھر مجال ہے کہ کوئی بیماری اور موذی چیز اس کے پاس آسکے۔ اور اگر آئے گی تو اسے تابع ہونا پڑیگا یعنی مومن پر وہ غالب نہ ہوگی۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاقہ سے پناہ مانگی ہے اور رزق کا سوال کیا ہے اسلئے کہ اس دنیا میں آدمی کو رزق کی بھی ضرورت ہے لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم روزی کے لئے بھی پیر کے پاس جائیں گے اور ان سے سوال کرینگے لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں سوال کرینگے۔ پیر سے خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ناخوش (معاذ اللہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں:۔

اَسْئَلُكَ رِزْقًا طَيِّبًا وَّعِلْمًا نَّافِعًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا۔ یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے رزق پاکیزہ اور علم کارآمد اور عمل مقبول۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جو تشریف لائے ہیں تو دونوں جہان کی فلاح سکھلانے کے لئے۔ اب جس شعبہ میں آپ ان سے الگ ہوں گے اسی شعبہ میں گمراہی آجائے گی۔ یہ ہے حقیقی افتقار الی اللہ کہ بندہ اللہ ہی سے روزی کا سوال کرے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کیا ہے اسی طرح رزق کا بھی سوال کیا ہے۔

حضرت مولانا رحمہ نے ایک مرتبہ کسی صاحب کو کچھ دیا۔ فرمایا کہ ارے بھائی گھٹ جائیگا تو مانگ لیں گے۔ انھیں کے قبضہ میں تو سب کچھ ہے وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ٥ اس آیت کے متعلق علماء لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں قیام فرمایا تو منافقین نے یہ کہا کہ ان پر خرچ نہ کرو اس کی وجہ سے یہ لوگ پریشان ہو کر خود ہی مدینہ چھوڑ دیں گے۔ اللہ

Scanned with CamScanner

تعالیٰ کو ان کا یہ ذلت آمیز جملہ نہایت ناگوار ہوا اور انتہائی غصہ میں فرمایا کہ کیا یہ منافق لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی ان کے ہاتھ میں ہے؟ سن لو کہ اللہ ہی کے لئے آسمان اور زمین کے جملہ خزائن ہیں لیکن منافقین اسکو نہیں سمجھتے اور مارے تکبر کے ایسا کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم لوگ جب مدینہ میں داخل ہونگے تو ہم میں کا عزیز، ذلیل کو نکال دے گا۔ اپنے آپ کو عزیز سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو ذلیل۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اس میں یہ جو فرمایا کہ عزت بھی مؤمنین کے لئے ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اس کی جانب سے بھی اطمینان دلادیا۔

دنیا میں رزق اور عزت یہی دو تو مسئلہ ہے۔ اللہ ورسول نے ان دونوں کی جانب سے بھی صالحین کو مطمئن فرمادیا۔ اس طرح سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ سکھلایا کہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ سے آخرت میں جنت کا سوال کیا جاتا ہے اسی طرح سے اس سے اس دنیا میں بھی صحت اور عافیت، راحت اور عزت اور رزق ووسعت بھی طلب کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان سب کے خزانے بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔!

دیکھا آپ نے ان حضرات کا افتقار!۔

انبیاء علیہم السلام کو اس میں جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا تو مشکل ہے بس اس کا کچھ سراغ ان حضرات کی دعاؤں ہی سے ہوتا ہے، اب جس کو دعوات اور آپکی عبدیت اور افتقار نیز آپ کے اسوۂ حسنہ سے حصہ ملا ہے تو سبحان اللہ کیا کہنا! یہ بڑی توفیق ہے۔ اسکے برابر وہ لوگ نہیں ہیں جو ایسے نہیں۔ اور جو لوگ بزرگوں کے پاس رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ان کو کچھ حصہ نہیں ملا تو بڑے افسوس اور محرومی کی بات ہے۔ اسی پر کہتا ہوں کہ ؎

کعبہ بھی گئے پر نہ گیا عشق بتوں کا
زمزم بھی پیا پر نہ بجھی آگ جگر کی

باقی محض رسمی طور پر کچھ کلمات زبان پر جاری ہو جانے کو حصہ پانا نہیں کہا جائے گا

Scanned with CamScanner

بلکہ حصہ پانا یہ ہے کہ سنت کا یہ نور اسکے گوشت اور پوست میں بسا جائے اور ہر وقت اس کی برکات سے اس کو حصہ ملتا رہے اور ان دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اسکو ایک خاص حصہ حاصل ہو جائے۔

ایک بادشاہ بیمار ہوا۔ ایک بزرگ کو بلایا۔ ان سے درخواست کی کہ دعا کیجئے اس مرض سے اچھا ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ قیدیوں سے جیل خانہ بھرا ہوا ہے بہت سے ان میں بے قصور بھی ہیں اس ظلم کے ساتھ کس طرح دعا کروں۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ قیدی چھوڑ دیئے جائیں۔ ان بزرگ نے اسی وقت دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا "یا اللہ جس طرح تونے اسکو اسکی معصیت کی شامت چکھائی ہے اسی طرح سے اسکو اس کی طاعت کا بدلہ بھی چکھا دیجئے" چنانچہ وہ اسی وقت اچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔!

تو یہ بھی ہوتا ہے۔ اور جس طرح سے آپ لوگ حکیم ڈاکٹر کے بہت معتقد ہیں تو سمجھ لیجئے کہ ایک اور چیز بھی ہے ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

یعنی تم نے حکمت یونانیاں تو بہت پڑھی اب ذرا حکمت ایمانیاں کی طرف آؤ اور اسکو بھی تو پڑھو۔ اور اب تو حکیمی بھی ختم ہے۔ ڈاکٹری ہی رہ گئی ہے۔

اور سنئے۔ جونپور میں ایک بزرگ تھے۔ ایک شخص پانی پھنکوانے کے لئے بوتل لے گیا انھوں نے دور ہی سے کہا وہیں رکھو۔ ہم پھونک دیتے ہیں قریب لانے کی ضرورت نہیں ہے اس نے کہا کہ دور سے کیسے پھونکیں گے اس میں کیسے اثر ہو گا۔ انھوں نے کہا کہ اثر دیکھنا چاہتے ہو۔ اچھا تو دیکھو! یہ کہہ کر وہیں سے پھونکا تو برتن تڑ سے ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔ یہ بھی تو ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان لانا چاہیئے! اور یہ بھی سن لیجئے کہ معرفت ناتمام رہتی ہے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ درمیان میں نہیں ہو جاتا اور آپ کی یہ دعائیں پیش نظر نہ ہونگی تو آپ کی بعض شیون کی معرفت نہ ہو سکے گی۔

آپ کی سمجھ میں یہ تو آجاتا ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر کے پاس چلیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دعاؤں کے پاس بھی چلنا چاہیئے!

ایک حکیم صاحب نے بہت عمدہ بات کہی۔ میں بیمار تھا لوگ دعا بھی کر رہے تھے اور دوا بھی جاری تھی اس پر انھوں نے کہا کہ دوا کی وہاں تک رسائی نہیں ہے جہاں تک دُعا کی ہے۔ دعا کی رسائی عرش تک ہے ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

(ترجمہ) مظلوم کی آہ سے ڈرتے رہو کیونکہ اسکے دعا کرنیکے وقت دربار خداوندی سے قبولیت خود اسکے استقبال کیلئے آتی ہے

میں نے یہ سن کر کہا کہ ہاں بھائی صحیح کہتے ہو۔ میرا بھی یہی اعتقاد ہے۔ دعا ہی تو مومن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ یعنی اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کر لوں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اور یہ دعا سب چیزوں کے لئے ہے۔ جس طرح آخرت کے لئے اور بڑی بڑی چیزوں کے لئے ہے اسی طرح دنیا کے لئے اور معمولی حوائج کے لئے بھی ہے۔ فرماتے ہیں:-
اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا (یعنی اے اللہ کارآمد رکھ ہماری شنوائیاں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت جبتک ہمیں زندہ رکھے۔ اور رکھنا اسکی خیر کو باقی ہمارے بعد) ۔ مگر عامۃ الناس کو اس راہ پر لگانا بڑا مشکل ہے۔

ایک بزرگ تھے حج کو جارہے تھے ایک دفعہ مدینہ منورہ کے راستہ میں ایک بدو کے لڑکے کو مار دیا وہ بزرگ حضوری تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوا کرتی تھی۔ بند ہوگئی اب تو یہ بہت پریشان ہوئے۔ لڑکے کو ہر چند روپیہ پیسہ دیا مگر زیارت نہیں کھلی۔ مدینہ شریف حاضر ہو کر وہاں تمام مشائخ کی خوشامد کی مگر سب نے جواب دیا کہ ہمارے اختیار سے بالاتر یہ چیز ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ جس کے قبضہ میں ہے اس کا پتہ بتلا سکتے ہیں۔ وہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے روضہ کے پاس ایک عورت کھڑی ہے۔ وہ چاہے تو البتہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ اس نے جالی مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ (کشف) دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں۔ بس پھر اسکے بعد سے برابر زیارت ہونے لگی۔

اب یہ سب باتیں اور بزرگوں کے حالات آپ کو کیسے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر انکا صرف سننا آسان ہے۔ عمل کو کہوں تو بھاگ جاؤ گے۔ سنو! میں کہتا ہوں کہ یہ جو دعائیں میں آپ کو سنا رہا ہوں تو یہ بھی گویا آپ سے (کشف) کہہ رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اگر کرنی ہے اور صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی تو آپ کی دعاؤں کو لو۔ اس سے کیوں منہ پھیرے ہوئے ہو۔ اس کی جانب توجہ کیوں نہیں کرتے۔ باقی یہ سمجھ لو کہ دروازہ بند ہے۔ قفل پڑا ہوا ہے اسکو کھلوانے کی ضرورت ہے!

سنو! روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حجرۂ شریف کے اندر جانے کیلئے ایک دروازہ ہے مگر اس پر قفل پڑا رہتا ہے۔ وہ جگہ دعا قبول ہونے کی ہے لوگ وہاں جاتے ہیں دعا کرتے ہیں ایک مرتبہ شریف مکہ آیا۔ اس کے لئے دروازہ کھلا کرتا تھا لوگوں نے حسب دستور کھولنا چاہا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے تمام اصحاب صفہ کو بلوایا اور کہا کہ آپ لوگ اس کو کسی طرح کھول دیجئے۔ سب کے سب عاجز رہے اس نے دریافت کیا کہ کوئی اور تو نہیں رہ گیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ایک صاحب اصحاب صفہ میں سے ہیں! ان کو بلایا گیا۔ آئے کنجی دی گئی کہ دروازہ کھول دیجئے انھوں نے کھولا تو دروازہ تو کھل گیا مگر یہ بزرگ بیہوش ہو کر گر گئے۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہو گیا تھا؟ کہا کہ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا ہے دیکھتا کیا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت غصہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہاری خاطر سے دروازہ تو کھول دیا ہے۔ مگر خبردار فلاں سے ناراض ہوں یہ شخص اندر گھسنے نہ پائے۔

اس پر میں کہتا ہوں کہ اسی طرح سے کوئی چاہے کہ خود ہی سے کامیابی حاصل کرلے ناممکن ہے۔ قفل بند ہے بغیر اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قفل کھولیں۔ خدا تک

رسائی مشکل ہے۔ اور وہ قفل یہی آپ کی سنتیں ہیں انھیں پر عمل کرنے سے قفل کھلتا ہے۔
اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

ایک صوفی صاحب ایک جگہ مسجد میں بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے ؎

محمد پہ دل کو فدا کر چکے ہیں
جو فرض خدا تھا ادا کر چکے ہیں

میں نے سنا تو ان کی بڑی قدر ہوئی کہ دیکھو تو یہ خدا کا فرض ادا کر چکے ہیں! بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دل فدا کرنا خدائی فرض ہے۔ لیکن یہ فرض جانتے ہیں کس طرح سے ادا ہوتا ہے؟ اتباع سے!

جو آپ پر دل فدا کر چکا ہوگا وہ ہر چیز میں آپ کا طریقہ تلاش کرے گا۔ عبادت میں ریاضت میں۔ ظاہر میں۔ باطن میں۔ دعا میں۔ استعاذہ میں اور ان سب میں آپ کا پس رو اور تابع ہوگا۔!

(مجلس سوم)

(بسلسلۂ وصیۃ السنۃ)

فرمایا کہ دعاؤں کا سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے۔ یہ بھی ایک دریائے ناپید اکنار ہے میں بیچارہ اس کو کیا بیان کرسکتا ہوں تاہم بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے اسکو پیش کرتا ہوں۔ باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معرفت اللہ تعالیٰ سے حاصل تھی اس کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا اور تمام ادعیہ آپ کی اسی معرفت سے ناشی ہیں۔ آپ نے عروجی چیزیں بھی بیان فرمائی ہیں اور نزولی بھی بیان فرمائی ہیں۔ لوگ عروجی کو تو بیان کرتے ہیں مگر نزولی کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ شان عبدیت اسی میں زیادہ ہے اور ہم لوگوں کے مفید مطلب بھی یہی چیزیں ہیں۔ ہم اگر عروجی باتیں آپ سے بیان کریں تو آپ کو وجد تو آجائے گا لیکن کچھ زیادہ مفید آپ کے لئے نہ ہوگا۔ اسلئے کہ آپ کے مرتبہ سے بلند باتیں ہوں گی۔ اس کے لئے خاص استعداد کی ضرورت ہے۔

میں نے الہ آباد میں اپنے زمانۂ علالت میں ایک دن ایک صاحب کے سامنے ایک صاحب کا واقعہ نقل کردیا تھا کہ کسی صاحب نے ان کے سامنے ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھ دیا ؎

میں جو اس پر مرمٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

جس کو سنکر انھوں نے بڑی زور کی چیخ ماری، ایک حال طاری ہوگیا۔ یہ ان صاحب کو میں نے سنایا تو اس شعر کو وہ بھی سنکر وجد کرنے لگے اور کہتے تھے کہ سارے دن ایک کیف سا طاری رہا اور بڑی ہی لذت آئی۔

وہی صاحب کہتے تھے کہ وطن گیا ہوا تھا۔ ایک دن بازار سے گھر کو آرہا تھا یہی شعر پھر

ذہن میں آگیا اور ایسا محو ہوا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا۔ دوسروں سے پوچھنا پڑا کہ بھائی میرے گھر کو کون سا راستہ گیا ہے ؟ لوگ ہنستے تھے کہ بچپن سے یہیں رہنا سہنا، آنا جانا ہے۔ یہ آج کیا باتیں کر رہے ہیں کہ گھر کا راستہ دریافت کر رہے ہیں۔

اور سنیئے ! ایک بزرگ ہیں خواجہ باقی باللہ ؒ ایک دن کہیں چلے جا رہے تھے کہ ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اس نے کان میں کہدیا کہ ؎

درکنز و ھدایہ نتوان یافت خدا را
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

یعنی کنز و ہدایہ میں تمہیں خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی تلاش ہے تو دل کا پارہ پڑھو۔ کہ اس پارہ میں اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب نہیں ہے۔

یہ سننا تھا کہ بس دل پر ایک چوٹ سی لگی اور خدا کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے اور پھر جس مقام تک پہونچے۔ اور جس پائے کے بزرگ ہوئے معلوم ہے۔

تو یہ سب عروج کی باتیں ہیں اور اولیاء اللہ زیادہ تر اسی حال میں ہوئے ہیں مگر حضرات انبیاء نزول میں ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پورے عاشق اور مخلوق کے سامنے پورے باہوش یہی وجہ ہے کہ عروج والا پہچانا جاتا ہے کہ اس کی باتیں اوروں سے مختلف ہوتی ہیں اور نزول والے کو لوگ پہچانتے نہیں ! آپ ہی کے درمیان میں ہوگا مگر ایسا گھلا ملا ہوگا کہ آپ اس کو بزرگ جانیں گے ہی نہیں، اور پہچانیں گے ہی نہیں، حضرت مولانا ؒ کے متعلق ایک حکیم صاحب صاحب نے کہا کہ حضرت بڑے گہرے ہیں۔ حضرت ؒ کو یہ بات پہنچی تو فرمایا کہ میں تو گہرا نہیں ہوں حکیم صاحب سے کسی نے حضرت ؒ کی اس بات کو نقل کر دیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ میرا مطلب یہ تھا کہ حضرت ایسے کامل شخص ہیں کہ بظاہر مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے قلب ایک آن کے لئے غافل نہیں ہے اور اس طرح سے رہتے ہیں کہ کوئی اسکو سمجھ بھی نہیں سکتا میری یہ مراد تھی گہرا ہونے سے اسکو لوگوں نے سمجھا نہیں اور حضرت سے نقل کر دیا۔ (یعنی انھوں نے یہ جملہ حضرت کی مدح میں استعمال کیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید حضرت پر اعتراض کر رہے ہیں) بہر حال اہل نزول کو لوگ پہچانتے نہیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مقام نزول میں جو تعلیمات فرمائی ہیں اس سے مقصد یہی ہے کہ انسانوں کو بشریت ہی کے راستہ سے وصول کرادیں اور خدا تک پہنچادیں۔ یعنی بشر اسی بشریت کے ساتھ ساتھ ولی ہو جائے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی رح بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ جلالی تھے ان کے متعلق مولانا محمد علی صاحب مونگیری رح نے بہت عمدہ بات بیان فرمائی۔ وہ یہ کہ فرمایا کہ "حضرت کو جو غصہ ہے تو یہ نہیں کہ ولایت کے بعد غصہ پیدا ہو گیا ہے تاکہ کسی کو یہ وسوسہ ہو کہ ولایت کے ساتھ یہ غصہ کیسا؟ بلکہ اسی بشریت میں ولایت آگئی ہے۔ اسی حالت میں ولایت مل گئی ہے۔ یعنی غصہ کا مزاج میں ہونا یہ بشریت ہے جیسے اور صفات بشریت ہیں تو اسی بشریت میں حضرت کو ولایت ملی ہے۔

بڑی عمدہ بات فرمائی۔ حضرت مولانا اسکو بہت بیان فرماتے تھے۔ بڑا ہی لطف آتا تھا۔

ایک صحابی رض فرماتے تھے:۔ انی احتسب نومتی کما احتسب قومتی۔ یعنی میں اپنے سونے میں بھی اسی طرح ثواب سمجھتا ہوں جیساکہ اپنی نمازیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اسلئے تھا کہ انھوں نے اپنی نوم کو بھی خدا کے لئے کردیا تھا۔ لہٰذا جب ان کو نوم میں ثواب ملتا تھا تو کھانے میں کیوں نہ ملے گا؟ کیونکہ نوم کے بمقابلہ کھانے میں غفلت کم ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بسم اللہ کہہ کر شروع کیا جاتا ہے اور الحمدللہ پڑھ کر ختم کیا جاتا ہے۔ تو اس میں اگر کسی کو ثواب ملے تو کیا تعجب ہے۔!

سنو! اللہ تعالیٰ کی جتنی نعمتیں اس دنیا میں ہیں ان میں سب سے بڑھکر کھانا پینا ہے روپیہ پیسہ اپنے بدن پر اور اپنی ذات پر کم ہی صرف ہوتا ہے دوسروں کی تنخواہ وغیرہ میں زیادہ حصہ صرف ہوجاتا ہے۔ باقی کھانے کا ایک لقمہ اور پانی کا ایک گھونٹ جس قدر مفید ہے ہزاروں ہزار روپیہ اسکی برابری نہیں کرسکتا۔ اور کوئی دوسری چیز اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ پس انبیاء علیہم السلام بھی اسکو استعمال کرتے ہیں اور اولیاء بھی کھاتے پیتے ہیں۔ مگر تقویٰ علی الطاعۃ کی نیت کرکے اسکو دین اور طاعت بنالیتے ہیں۔ چنانچہ کھانے کی یہی جہت

مومن کے پیش نظر ہوتی ہے۔ جیساکہ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

یعنی کھانا تو صرف اس لئے ہے کہ آدمی کی جان باقی رہے اور اس سے قوت ہو تاکہ اللہ اللہ کرے، لیکن تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ دنیاوی زندگی ہی کھانے کے لئے دی گئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یہ حضرات اسلئے کھاتے ہیں تاکہ قوت آئے اور آدمی ذکر اللہ کر سکے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ کھانا پانی استعمال کرنے کے بعد ہی وہ فوراً کام میں آجاتا ہے اور بدل ما یتحلل ہو جاتا ہے۔ لہذا ضروری ہے!

اسلئے رب سے زیادہ شکر اسی کا واجب ہے۔ پس روپیہ پیسہ بھی نعمت ہے مگر اس میں انہماک مضر ہے ٹھیک نہیں! جو لوگ بہت زیادہ مالدار ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کا معدہ خراب ہی ہوتا ہے۔ حضرتؒ سے سنا کہ ایک امیر شخص اپنے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا باہر کی سیر کر رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک دیہاتی آیا اس نے دو ٹکڑ (موٹی روٹی) نکالے اور خوب انکو لطف لیکر کھایا اور پانی پیا۔ اور لیٹا سو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس رئیس نے تمنا کی کہ کاش میری یہ سب ریاست اسکو ملجاوے اور اسکی صحت مجھے دیدی جائے تو میں اس تبادلہ پر راضی ہوں۔

دیکھا آپ نے عافیت کی قدر؟

اور سنئے! ایک بزرگ جا رہے تھے شہر کا دروازہ بند تھا معلوم ہوا کہ شاہی باز اُڑ گیا ہے اسکی تلاش ہے اسلئے ہر طرف کے پھاٹک بند کر دیئے گئے ہیں، ان بزرگ کو یہ خیال ہوا کہ اے اللہ تعالیٰ تیری عجیب شان ہے جسکے ساتھ جو معاملہ چاہے کرے، حکومت تو نے ایسے احمق کو دی ہے کہ جسکو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ باز کے بھاگنے اور دروازہ کے بند کرانے میں کیا تعلق ہے؟ اور ایک ہم ہیں مفلوک الحال کہ جوتا بھی پیر میں ٹھیک سے نہیں ہے! الہام ہوا کہ تو پھر تبادلہ کر لو۔ کہو تو تمہاری عقل و معرفت اسکو دیدیں اور اسکی حکومت و سلطنت تمکو دیدیں۔ ڈر گئے! فوراً سجدہ میں جاکر دعا کی کہ بے ادبی ہو گئی معاف کر دیجئے مجھے آپکی عطا فرمائی ہوئی نعمتِ عقل اور دولتِ معرفت کافی ہے۔ مجھے سلطنت نہ چاہیئے!

Scanned with CamScanner

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی یہی طعام ہے اسلئے عارفین نے انبیاء علیہم السلام سے سیکھ کر۔ اسی کو اپنے لئے معرفت کا ذریعہ بنایا۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ ہم کھلا پلا کر لوگوں کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ تو اس درجہ کے تھے نہیں، غلط کہتے تھے! البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیب دیتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے بندوں کو خدا تک کھلا پلا کر پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ انبیاء تو بڑے لوگ ہیں اولیاء نے اسی کو ذریعۂ قرب بنایا ہے۔ یہی ہے بشریت کی راہ سے پہنچنا۔

حضرت مولانا رح فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھے کچھ ہدیہ وغیرہ دیتا ہے تو اسکی وجہ سے ایک نیا اور خاص تعلق اللہ تعالےٰ سے قلب کر لیتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا دیتا ہے تو اسکی وجہ سے ایک دوسرا نیا اور جدید تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے یہ تعلق بڑھتا جاتا ہے!

میں کہتا ہوں کہ وہ تعلق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور ان کا فضل خاص ہر دفعہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حضرات جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس بندہ کو میری طرف متوجہ کیا ہے اور انھیں کی نظر رحمت ہو گئی ہے۔ جو یہ نعمتیں ملی ہیں ورنہ میں تو اس قابل نہ تھا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

حضرت رح اس قسم کی معرفت کی باتیں بہت بیان فرماتے تھے۔ لوگوں نے حضرت کو پہچانا نہیں مرنے کے بعد پتہ چلے گا کہ یہ اللہ والے تھے۔ اگر ان کے آگے جھکے ہوتے تو کچھ مل ہی جاتا۔

دیکھئے جو چیزیں ہمارے لئے غفلت اور حجاب کی ہیں۔ اسے یہ حضرات خدا تعالیٰ سے نئے تعلق کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اب حضرت ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرماتے تھے یہ تو معلوم نہیں۔ کہ اسے قیامت کیلئے اٹھا رکھتے تھے یا یہاں ہی کچھ دعا وغیرہ اس کے لئے کر دیتے تھے۔ بہرحال محسن کی قدر فرماتے تھے۔ یہ اس پر کہہ رہا ہوں کہ یہ کھانا ایسی چیز ہے کہ یہ بھی خدا تک انسان کو پہنچا دیتا ہے جبکہ غفلت کے ساتھ نہ ہو۔ یا بعد میں غفلت نہ پیدا کرے اور اگر غفلت کے ساتھ ہو تو دنیا ہے اور حجاب ہے۔ چنانچہ جس طرح سے دنیا کا ہونا کبھی انسان کو غافل بنا دیتا ہے۔ اسی طرح سے فقر یعنی دنیا کا نہ ہونا بھی ایمان کے لئے خطرہ ہی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

Scanned with CamScanner

نے فقر سے پناہ مانگی ہے۔ کاد الفقر ان یکون کفراً

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ "مومن قوی، مومن ضعیف سے بہتر ہے یوں بھی میں خیر ہے"، یہ اس لئے کہ قوی شخص جو کام کر سکتا ہے ضعیف اسکو نہیں کر سکتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ معرکہ میں جو مورچہ اہم اور مشکل ہوتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں نظر آتے تھے۔ اور آپ کے ساتھ حضرت صدیق رضؓ اور حضرت فاروق رضؓ بھی رہتے تھے۔ اور آپ کی پناہ لیکر لڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری اور جسمانی قوت بھی بہت زیادہ عطا فرمائی تھی۔

یہ بتا رہا ہوں کہ جس طرح نماز میں۔ تلاوت میں قرب ہوتا ہے اسی طرح اللہ والوں کو کھانے میں بھی قرب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کھانا نعمت ہے اور اس سے منعم کی معرفت ہوتی ہے باقی یہ کہ ان صحابی رضؓ نے نوم کا تو ذکر کیا مگر کھانے کا ذکر نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ "میں کھانے میں بھی وہی ثواب سمجھتا ہوں جیسا کہ نماز میں"؛ اسلئے کہ صحابی تھے۔ سمجھتے تھے کہ امت اسکو سن پائیگی تو خوب کھائے گی اور غافل رہے گی۔ حضرت رحؒ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحؒ حضرت کا نام لیکر فرماتے تھے کہ میاں فلاں! پانی تو ٹھنڈا ہی پیا کرو۔ ہر بُن موسے الحمد للہ نکلے گا۔

میں کہتا ہوں کہ جب پانی پینے میں ہر بن موسے الحمد للہ نکلے گا، تو کیا کھانے میں نہ نکلے گا؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟ مگر زہد کی وجہ سے یہ حضرات کھانے کا ذکر نہیں فرماتے کہ امت اسی طرف چل پڑے گی۔ حضرت حاجی صاحب رحؒ فرماتے تھے کہ ان درویشوں کو کیا ہو گیا ہے کہ شوربہ میں پانی ملا لیتے ہیں، نہ شوربا ہی رہا نہ پانی ہی رہا۔ ارے ہر ایک کو الگ رکھو۔ شوربہ میں الگ تجلی دیکھو اور پانی میں الگ دیکھو۔

آپ نے کھانے کا ذکر سنا اگر آدمی اس میں حد پر رہے یعنی اس میں متبع سنت رہے تو بڑا کام بن جائے یعنی ہاتھ دھو کر بسم اللہ کہہ کر کھائے، بعد میں الحمد للہ کہے۔ اس طور پر کھانا بھی گویا ذکر ہی ہو جائے گا۔ اسی طرح سے حضرت رحؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں جو سر پر تیل لگواتا ہوں تو اس نیت سے کہ دماغ سرکاری مشین ہے اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ اس طرح تیل لگانا بھی عبادت ہے۔

Scanned with CamScanner

کھانا نفس کے حقوق میں سے ہے حظوظ میں سے نہیں ہے اور اگر اس کے بعض افراد ابتداً حظوظ میں سے ہوئے بھی تو اپنے اثر اور نتیجہ کی وجہ سے وہ بھی حقوق بنجاتے ہیں۔

کھانے کے متعلق بھی علماء نے تفصیل بیان فرمادی ہے جس سے اس کا حکم شرعی معلوم ہوتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح مالا بدّ منہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

خوردن بقدریکہ قوام زندگی است فرض است " یعنی اتنا کھانا کہ جسکی وجہ سے زندگی قائم رہے فرض ہے اور " بقدریکہ بدان نماز ایستادہ تواں خواند و قوت بہ روزہ حاصل شود مستحب ست " یعنی اور اتنا کھانا کہ اسکی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے اور روزہ رکھنے کی قوت حاصل ہوجائے، مستحب ہے۔ " اما نصف شکم مسنون " اور آدھا پیٹ کھانا سنت ہے۔ " وتا پری شکم مباح است " اور بھر پیٹ کھانا مباح ہے " اور اگر بہ نیت قوت بر جہاد و تحصیل علوم دین بخورد مستحب باشد " یعنی اور اگر اس نیت سے کھانا کھائے کہ جہاد کی قوت حاصل ہو اور علوم دین کی تحصیل آسان ہو، تو مستحب ہے۔ " و زیادہ از پری شکم حرام ست۔ مگر بقصد روزہ فردا یا بہ لحاظ مہمان یعنی پیٹ بھر سے زیادہ کھانا حرام ہے بجز دو حالتوں کے۔ ایک تو یہ کہ کل کے دن روزہ رکھنے کا خیال ہے (اس لئے سحری میں کچھ زیادہ کھالیا) یا مہمان کا ساتھ دینے کیلئے (پیٹ بھر جانے کے بعد بھی شریک رہا) تو یہ جائز اور مباح ہے۔ اور مباح بقصد طاعت، عبادت ہے۔

میں یہاں ایک دوسری چیز اور کہتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سے طعام کو معرفت کا ذریعہ بنایا ہے اسی طرح سے اسکا جو نتیجہ ہے یعنی پاخانہ اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہیں، وہ یہ کہ آپ جاتے وقت پہلے بایاں قدم بیت الخلاء میں رکھتے تھے اور یہ دعا پڑھتے تھے :-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِکَ مِنَ الۡخُبُثِ وَالۡخَبَائِثِ۔ یعنی اے اللہ میں خبیث جن مردوں اور خبیث عورتوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔

لوگ تو اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جنوں کے مذکر اور مؤنث سے پناہ مانگتے ہیں جو ایسے مقام پر رہتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ خود پاخانہ بھی تو خبیث چیز ہے کیونکہ یہ اگر اندر رک جاتا ہے تو بہت فساد پیدا کرتا ہے اور بڑے مضرات کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری دعا میں

جسے آپ پاخانہ سے باہر نکلتے وقت پڑھا کرتے تھے. فرماتے ہیں:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ . یعنی شکر ہے اس خدا کا کہ جس نے اس چیز کو خارج فرمادیا جو مجھکو ایذا دیتی اور اس چیز کو جو مفید اور نافع تھی باقی رکھا۔

دیکھئے دعا میں دونوں جانبوں کی کیسی رعایت فرمائی اور ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کیونکہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اگر کل کا کل خارج ہوجائے تو پھر زندگی کیونکر باقی رہے گی اور اگر کچھ بھی نہ خارج ہو تو ایک مستقل مصیبت ہے. اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا۔ کہ اس نے اس کھانے کا مفید حصہ باقی رکھا جس سے خون بنا اور قوت حاصل ہوئی۔ اور مضر حصہ خارج کرکے سکون بخشا، پس جس طرح سے تمام چیزوں سے عافیت طلب فرمائی ہے. اسی طرح سے اس میں بھی عافیت کی دعا کی ہے۔

پانی پت میں ایک بزرگ تھے فرمایا کرتے تھے! جانتے ہو ایمان کی سلامتی اور خاتمہ بالخیر کیا ہے؟ پھر خود ہی فرماتے کہ ایمان کی سلامتی ہے پیٹ بھر کھانا اور خاتمہ بالخیر یہ ہے کہ کھل کر پاخانہ عنوان تو ان کا ظرافت کا تھا مگر بات بالکل صحیح فرمائی۔

اب آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب دعائیں بیان کر رہا ہوں مگر یہ سب آپ کو یاد نہ ہونگی۔ کیونکہ یاد ہونے کے لئے پہلے مناسبت ہونا ضروری ہے. مناسبت پیدا کیجئے گا تب یہ سب یاد ہوں گی۔

کھانا کھانے کے بعد آپؐ نے یہ دعا مانگی:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

یعنی شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے کھانا کھلایا. پانی پلایا اور مسلمان بنایا۔

یہ عروج ہے۔ اور پاخانہ کے بعد جو دعا مانگی ہے وہ نزول ہے۔

اس وقت تو آپ بہت غور سے سن رہے ہیں لیکن وقت پر سب بھول جائیے گا. کھانے کے بعد والی شاید یاد رہ جائے تو رہ جائے. لیکن پاخانہ سے آنے کے بعد کی دعا کا یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔

جب تک کہ نیت نہ درست کیجئے گا۔ کام نہ چلے گا۔ —— اور وہ نیت عبدیت

کا ارادہ ــــ ہے ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس میں کامل تھے۔ اس لئے وہ ہر وقت آپ کے پیش نظر رہتی تھی اور ہم لوگ ناقص ہیں۔ اس لئے غافل ہی ہیں۔ کسی وقت یاد آگیا کرلیا۔ نہ یاد آیا چھوڑ دیا۔

(مجلس چہارم)
(بسلسلہ وصیۃ السنہ)

فرمایا کہ کئی دنوں سے سنت کے متعلق بیان کررہا ہوں اسے بیان کرتا رہوں گا۔ اسوقت ایک اور بات پہلے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ عام طور سے میرا طریقہ کہیں آنے جانے کا نہیں ہے لیکن یہاں بمبئی جو آیا، یا علیگڈھ کا سفر پیش آیا تو خاص حالات کی بنا پر۔ پھر بھی میں جب کہیں آتا جاتا ہوں تو احباب سے اسکے متعلق اچھی طرح سے مشورہ کرلیتا ہوں چنانچہ جب بصیرت کے ساتھ سفر کی ضرورت سمجھ لیتا ہوں تب ہی کہیں کا ارادہ کرتا ہوں۔ پہلی بار جو بمبئی آنا ہوا تو یہ مولوی صاحب جو بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے بھی مشورہ کیا کہ وہاں تو علما آتے ہی جاتے ہیں، میری وہاں کیا ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے نہایت عمدہ بات کہی، کہا کہ جانے کی ضرورت اس لئے ہے کہ اور حضرات کے ذریعہ وہاں زمین ہموار ہوچکی ہے اب اس میں تخم پاشی کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمین کا ہموار کرنا ہے اور ایک اس میں تخم پاشی کرنا ہے۔ یہ دو کام ہیں۔ بعض زمین ہموار کرنے والے تخم پاشی نہیں کرسکتے، اس فرق سے میں خوش ہوا۔ مگر اس تخم پاشی کا میں اہل ہوں یا نہیں یہ الگ بات ہے۔ ان مولوی صاحب نے بات نہایت عمدہ کہی کہ ایک ہوتا ہے زمین ہموار کرنا اور ایک ہوتا ہے تخم پاشی کرنا یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

اسی طرح جب علیگڈھ کے لوگوں نے مجھے بلایا تو میں نے وہیں کے ایک صاحب سے جو مجھ سے تعلق رکھتے ہیں یہی سوال کیا تھا۔ انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ اس کا عنوان اگرچہ مختلف تھا مگر حاصل ایک ہی تھا۔ انھوں نے یہ کہا کہ لکڑیاں جمع ہیں اور خشک بھی ہیں بس ان میں آگ لگانے کی دیر ہے۔

پھر میں نے اسی اتنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق پہلے ایک صاحب

کو بھیجا جنھوں نے وہاں جاکر ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقات کی اور سب کے اندر طلب اور غایت شوق پایا۔ انھوں نے واپس آکر کہا کہ لوگ طالب ہیں حضرت کو تشریف لیجانا چاہیئے۔ اور دوسری جگہ بھی لوگوں کے حالات اچھی طرح معلوم کئے تب وہاں گیا۔ اسوقت میں نے یہ اس پر سنایا کہ کاشتکار کھیتوں میں تخم پاشی کرتا ہی ہے اس سے پہلے زمین ہموار کرتا ہے۔ مشائخ کی مثال تخم پاشی کرنے کی شاید ہو گی۔ میں نے اس کے متعلق چند حضرات سے دریافت کیا کہ آپ حضرات تبلائیے تخم پاشی سے کیا مراد ہے؟ لوگوں نے مختلف باتیں کہیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ایمان کی تخم ریزی مراد ہے۔ میں نے اس جواب کو پسند کیا۔ اسلئے کہ انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں تشریف لائے ہیں تو آخر کس چیز کے لئے؟ ابتداءً امر میں ایمان ہی کا بیج قلب میں بوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے صحابہؓ کو سب سے بڑی دولت جو ملی وہ دولت ایمان ہی تھی۔ آپ کی صحبت نے ان حضرات کے ایمان کو ایسا قوی کر دیا تھا کہ ایک موقع آگیا تو لوگوں نے دریا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ ایک مولوی صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ کس طرح مسلمانوں پر اثر ڈالیں۔ مگر پھر خود ہی کہنے لگے کہ مسلمان ضعیف الایمان ہو گئے ہیں۔ ایمان مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے صحیح فرمایا۔ جنت کا یقین۔ دوزخ کا یقین۔ ثواب کا یقین۔ عذاب کا یقین۔ یہ سب ایمانیات میں سے ہیں۔ چنانچہ ترغیب وترہیب ایمان ہی کے قوی کرنے کے لئے ہیں۔ بزرگوں کے یہاں جاکر ایمان ہی قوی کیا جاتا ہے۔

ایک عورت کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ دوسری قسم کی تھی لیکن ایک بزرگ کا وعظ سنا۔ خوف آخرت دل میں سما گیا تائب ہو کر مسلمانوں کے ساتھ ان کے اصحاب میں داخل ہو گئی اور مجاہدین کے گھوڑوں کے لئے دانہ دلنے کی خدمت اسکے سپرد ہوئی۔ اس حالت میں اس سے کسی نے پوچھا کہ بی بی پہلی حالت میں جب فیس اتنی تھی اس وقت تم اچھی تھیں یا اسوقت جبکہ چکّی پیس رہی ہو۔ اس نے کہا کہ اسوقت تو ہم اپنے خدا کو ناراض کئے ہوئے تھے کیا اچھے ہوتے؟ اور اب تو الحمد للہ ہمارے ایمان کا یہ حال ہے کہ اگر اسکو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو اٹھا نہ سکے۔

دیکھا آپ نے! یہ ابھی تھوڑے دن پہلے کا واقعہ ہے۔ عورتوں کا ایمان ایسا ہو جاتا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ ضعیف الایمان اور ضعیف الیقین ہو گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

پہلے زمانہ کا ایک قصہ اور سنیئے :۔

شیخ سعدیؒ سفر کر رہے تھے۔ کشتی میں سوار تھے۔ رفیق کے پاس پیسے نہیں تھے اسلئے کشتی والوں نے سوار نہیں کیا۔ سعدیؒ کو ان کی جدائی کا بڑا قلق تھا لیکن دیکھا کہ وہ پانی پر چل رہے ہیں اور ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔ شیخ سعدی کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے تعجب کی نظر سے دیکھا انھیں یہی شبہہ تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیداری کا عالم ہے؟ ساتھی نے جب ان کو متحیر دیکھا تو کہا کہ

عجب ماندی ای یار فرخندہ رای تراکشتی آورد و مارا خدای

مرا اہل صورت بدیں سنگرند کہ ابدال در آب و آتش روند

یعنی سعدی تعجب کیوں کرتے ہو اور اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ تم کو کشتی لئے جا رہی ہے اور مجھے خدا لئے جا رہا ہے۔ مجھکو اہل ظاہر اسلئے نہیں پہچانتے کہ ابدال لوگ آگ اور پانی پر چلا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کو ان کے ایمان اور یقین کی برکت سے کیسا کیسا نوازا ہے سبحان اللہ!

اور سنئے ایمان کی برکت!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضؓ ہیں حضرت سفینہؓ ایک سفر میں جارہے تھے راستہ میں ایک جنگل سے گذر ہوا ایک شیر مل گیا۔ اسے دیکھ کر انھوں نے کہا کہ میں ہوں سفینہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام! یہ سنتے ہی شیر دُم ہلانے لگا اور ان کے آگے آگے ہو گیا۔ یہانتک کہ ان کو راستہ پر پہنچا دیا اور واپس چلا گیا۔

دیکھتے ہیں آپ! کبھی آپ کا ایسا بھی وقت تھا۔ سب ترقی ایمان سے ہوتی ہے۔ ایمان ایک بیج ہے جو قلب مومن میں ہوتا ہے اور اعمال صالحہ کے ذریعہ نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں کلمہ طیبہ کی مثال درخت ہی کے ساتھ بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا۔ یعنی مثال کلمہ طیبہ کی مانند اس درخت کے ہے کہ جو ثابت ہو مفسرین فرماتے ہیں یعنی قائم اور برقرار ہو قلب مومن میں۔ اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال ایک درخت سے دی اور اس کی جو صفات بیان کی ہیں وہ

دنیا کے درختوں پر صادق نہیں آتیں۔ پس مراد اس سے جنت کے درخت ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے اُكُلُهَا دَائِمٌ یعنی اس کے پھل دائمی ہیں۔ عام مفسرین نے پھل کے دائمی ہونے کا یہ مطلب لکھا ہے کہ توڑ لینے پر پھر پیدا ہو جائے گا۔ لَا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ مگر مشائخ رح فرماتے ہیں کہ وہاں سے جدا ہی نہ ہوگا۔ توڑنے والا تو سمجھے گا کہ میں نے اسکو توڑ لیا۔ لیکن وہ پھل اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ اسلئے کہ وہاں ہر چیز کو دوام ہے فنا نہیں! غرض وہاں مومن کو جو چیز بھی ملے گی رضا، قرب، نعم یہ سب ایمان کی فرع ہیں۔ جیسا ایمان ہوگا۔ ویسی ہی چیزیں ملیں گی۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ایمان کا بھی سوال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِیْ۔ اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے ایمان کہ پیوست ہو جائے میرے دل میں۔

اس لئے مومن کا ایمان ہر وقت اسکے قلب میں کام کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ سونے میں۔ جاگنے میں۔ ہر حالت میں قلب اپنا کام کرتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یباشر قلبی ایسا ایمان عطا فرما جو میرے قلب سے مباشرت کرے

اسی ایمان کا وہ ثمرہ تھا جسے وہ صحابیؓ یوں فرماتے تھے کہ میں اپنے نومہ میں بھی ویسا ہی ثواب سمجھتا ہوں جیسا کہ قومہ میں۔ اس لئے کہ مومن ایمان پر سوتا ہے اور اٹھ کر پھر تجدید ایمان کر لیتا ہے تو اول و آخر ایمان ہونیکی وجہ سے درمیان کا اس کا وہ سونا بھی کل کا کل عبادت بنجاتا ہے۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اپنی ایک دعا میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰی وَبِكَ نَمُوْتُ: اے اللہ آپ ہی کی قدرت سے صبح کی ہم نے اور آپ ہی کی قدرت سے شام کی ہم نے اور آپ کی قدرت سے زندہ ہیں ہم اور آپ ہی کی قدرت سے مرتے ہیں ہم۔

اس دعا کے پڑھ لینے کی وجہ سے جو زمانہ کہ غفلت کا تھا وہ بھی ذکر کا ہو گیا۔ مومن اللہ تعالیٰ سے نسبت پیدا کر لیتا ہے اور اپنی تمام چیزیں درست کر لیتا ہے۔ پس تمام امور اس کے حق میں طاعت بنجاتے ہیں۔ بزرگوں کے یہاں جا کر اور ان کی صحبت میں رہ کر یہی چیز حاصل کی جاتی ہے۔

ایک شخص نے حضرت رح کو اپنا حال لکھا۔ کچھ شکایت کی تھی کہ میرا حال اب پہلے جیسا نہیں رہا اور

اتنے دنوں رہا مگر مجھے کچھ حاصل نہ ہوا اور جو حاصل بھی ہوا تھا وہ باقی نہیں رہا۔ حضرتؒ نے الوسے فرمایا کہ حاصل ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے اور آپ نے کسی کو کسی سے حاصل ہوتے دیکھا ہے؟ انھوں نے عرض کیا۔ جی ہاں مجھ ہی کو ملا تھا اور آپ ہی سے ملا تھا۔ فرمایا کہ بھائی میں نے معلوم نہیں کیا کیا تھا؟ اس وقت میرا ابتدائی زمانہ تھا آپ بھی مبتدی تھے میں بھی مبتدی تھا۔ اب الحمد للہ ثابت اور راسخ ہے۔ ان صاحب نے یہ گفتگو مجھ سے نقل کی تو میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے اندر بھی ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز شیخ میں ثابت ہوگی تو مرید میں بھی ضرور ثابت ہوگی۔

حضرتؒ یہ فرما رہے ہیں کہ الحمد للہ اب ثابت ہے۔

تو دیکھا آپ نے کتنی کتنی مدتوں کے بعد جاکر تب رسوخ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایمان کا پودا قلب مومن میں بڑے بڑے مجاہدوں کے بعد جاگزیں ہوتا ہے۔ لیکن جب جڑ پکڑ لیتا ہے تو پھر اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۔ کا بھی مصداق ہو جاتا ہے۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ سب چیزیں آنی جانی ہیں بجز ایمان کے یہی قبر میں بھی ساتھ دے گا۔ یہی پل صراط پر بھی لے چلے گا، اسی کی وجہ سے مومن کرامتوں سے نوازا جاتا ہے۔

ایک بزرگ نے کچھ لوگوں سے کہا کہ تمہارے پیر کا لوٹا سمندر میں جہاز سے گر گیا تھا میں نے اٹھا کر دیدیا۔ لوگوں نے اس بات کو یاد کر لیا اور جب وہ بزرگ حج سے واپس آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا انھوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ ہاں بیشک لوٹا گر گیا تھا لیکن اسی وقت پانی میں سے ایک ہاتھ نکلا! جس نے ہمیں لوٹا پکڑا دیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون صاحب تھے۔

ان کی یہ کرامت ان کے ایمان کی وجہ سے تھی! مفتی صاحب نے تخم پاشی کی شرح ایمان کے ساتھ جو کی ہے۔ اس سے میں بہت خوش ہوا کہ میرے دل کی بات کہدی۔ اب چاہے انھیں کی برکت سے میرے دل میں آیا ہو۔ یا میری وجہ سے ان کے قلب میں آیا ہو۔ بہر حال انھوں نے یہ صحیح کہا۔

جس طرح سے ہو سکے ایمان کو کامل کرنا چاہیئے خواہ اس کے لئے ذکر اللہ کرو، خواہ درود شریف پڑھو! خواہ تلاوت کرو۔ ایمان ہی کے بقدر مومن میں پلصراط پر چلنے کی قوت ہوگی کوئی تو بجلی کی طرح گذر جائے گا کوئی اس سے کم رفتار سے، کوئی اس سے کم۔ اسلئے میں کہتا ہوں

Scanned with CamScanner

کہ جب ایمان ہی اصل ہے تو آدمی اصل ہی کو کیوں نہ پکڑے۔ بزرگوں کے یہاں لوگ جاتے ہیں تو اگر اور کچھ نہیں پتہ تا تو ان سے ایمان ہی کی دعا کیوں نہیں کراتے۔ ان کے یہاں جا کر ایمان ہی حاصل کرلو۔ بزرگوں کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ ان کے تعلق کی وجہ سے لوگوں کا ایمان درست ہو گیا ہے۔ ان سے تھوڑا سا تعلق بھی تحفظ ایمان کا ذریعہ بن گیا ہے۔ امام رازی رح ایک مشہور عالم گذرے ہیں ان کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں گئے چند دنوں کے بعد ان بزرگ سے کہا کہ میرے سینے سے کوئی چیز سُرسُر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا مبارک ہو۔ یہ تمہارا منطق اور فلسفہ ہے جو نکل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت میں نے اسکو بڑی محنت سے حاصل کیا ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے آئے پھر اپنے علمی مشاغل میں لگ گئے۔ بالآخر ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو وہ بزرگ زندہ تھے۔ شیطان نے ان کو پریشان کرنا شروع کیا۔ کہا کہ دنیا سے کیا لیکر جا رہے ہو انھوں نے جواب دیا کہ توحید لیکر جا رہا ہوں اس نے کہا کہ توحید کے دلائل پیش کرو۔ انھوں نے دلائل بیان کرنا شروع کئے۔ عالم تھے فلسفی تھے ساری عمر یہی کام کیا تھا لیکن جو دلیل بیان کرتے شیطان اسکو توڑ دیتا۔ جب تمام دلائل بیان کر چکے اور اس نے سب کو توڑ دیا تو امام عاجز ہو گئے! قریب تھا کہ شیطان ان کو لے لیتا۔ کہ ادھر ان بزرگ کو منکشف ہوا کہ امام رازی کا انتقال ہو رہا ہے اور ابلیس انھیں تنگ کر رہا ہے وضو کر رہے تھے خادم کے ہاتھ سے لوٹا چھین کر بڑی زور سے دیوار پر پھینک کر مارا اور کہا۔ "کہتا کیوں نہیں کہ خدا کو بلا دلیل مانا"

اللہ تعالیٰ نے شیخ کی آواز امام کے کانوں تک پہونچا دی۔ چنانچہ انھوں نے کہدیا کہ خدا کو بلا دلیل مانا۔ اس کا جواب تو شیطان کے پاس تھا نہیں۔ مایوس ہو کر واپس ہو گیا اور امام کی روح پرواز کر گئی۔ دنیا سے ایمان لیکر گئے، حسن خاتمہ نصیب ہو گیا۔

یہ اتنا بڑا نفع بزرگوں سے تعلق ہی کی وجہ سے انہیں پہنچا۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ ایمان درست کرو اور اگر سمجھ میں آتا ہے تو کچھ کام کر لو۔

دیکھئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر آسانی کے ساتھ ہم کو خدا تک پہنچا دیا۔ یعنی خود بھی یہ دعا فرمائی ہے اور امت کو بھی سکھلائی ہے کہ وہ یوں کہا کریں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ كُلَّ مُهِمٍّ

مِنْ حَيْثُ شِئْتَ وَمِنْ اَيْنَ شِئْتَ حَسْبِيَ اللهُ لِدِيْنِيْ حَسْبِيَ اللهُ لِدُنْيَايَ. حَسْبِيَ اللهُ لِمَا اَهَمَّنِيْ حَسْبِيَ اللهُ لِمَنْ بَغٰى عَلَيَّ حَسْبِيَ اللهُ لِمَنْ حَسَدَنِيْ حَسْبِيَ اللهُ لِمَنْ كَادَنِيْ بِسُوْءٍ حَسْبِيَ اللهُ عِنْدَ الْمَوْتِ حَسْبِيَ اللهُ عِنْدَ الْمَسْأَلَةِ فِي الْقَبْرِ حَسْبِيَ اللهُ عِنْدَ الْمِيْزَانِ حَسْبِيَ اللهُ عِنْدَ الصِّرَاطِ حَسْبِيَ اللهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝

یعنی اے اللہ پروردگار ساتوں آسمانوں کے پروردگار عرش عظیم کے۔ یا اللہ کافی ہوجا تو ہر مہم میں جس طرح سے چاہے تو اور جس جگہ چاہے تو۔ کافی ہے مجھ کو اللہ میرے دین کے لئے۔ کافی ہے مجھ کو اللہ میری دنیا کیلئے۔ کافی ہے اللہ مجھ کو میری کل فکروں کے لئے۔ کافی ہے مجھ کو اللہ اس شخص کے لئے جو مجھ پر زیادتی کرے۔ کافی ہے مجھ کو اللہ اس کے لئے جو مجھ پر حسد کرے۔ کافی ہے مجھ کو اللہ اس شخص کے لئے جو فریب دے مجھے برائی کے ساتھ۔ کافی ہے مجھ کو اللہ موت کے وقت کافی ہے مجھ کو اللہ قبر میں سوال کے وقت۔ کافی ہے مجھ کو اللہ میزان کے پاس۔ کافی ہے مجھ کو اللہ پلصراط کے پاس۔ کافی ہے مجھ کو اللہ۔ نہیں ہے کوئی معبود سوا اسکے۔ اسی پر بھروسہ کیا میں نے اور وہی رب ہے عرش عظیم کا۔

دیکھئے اسی ایک دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کو خدا تک پہنچا دیا۔ یعنی اس کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ وہ دل سے سمجھے اور زبان سے کہے کہ اللہ تعالیٰ میری دینی اور دنیاوی ہر ہم وغم میں کافی ہیں۔ دشمن کے لئے کافی ہیں۔ حاسد کے لئے کافی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کی کفایت فرمالیں تو پھر اسکو حاسد اور دشمن کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح جب مومن نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمیں کافی ہیں۔ اور اُسنے اپنا وظیفہ ہی یہ بنالیا۔ کہ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔

اور ہر موقع پر اس نے اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا کارساز سمجھا تو پھر کہیں بھی اس کی گاڑی رُکنے والی نہیں۔ ایسا شخص قبر کی منزل میں بھی کامیاب۔ میزان میں بھی کامیاب اور صراط پر بھی کامیاب ہوگا۔!

حضرت رح سے سنا کہ نکیرین نے قبر میں ایک بزرگ سے سوال کیا کہ من ربك انھوں نے

جواب دیا کہ آپ لوگ ہزاروں ہزار میل دور آسمان سے اتر کر آئے ہیں اور رب کو نہیں بھولے ہیں اور ہم دو ہاتھ زمین کے نیچے آکر رب کو بھول جائیں گے. کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست

گویم آنکس کہ ربودے دل دیوانہ ما!

یعنی اگر نکیرین آکر مجھ سے قبر میں سوال کرینگے کہ بتا تیرا رب کون ہے تو میں کہوں گا کہ میرا رب وہی ہے جس نے میرے دیوانے دل کو میرے پہلو سے اچک لیا ہے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ سے فرمایا کہ کیا حال ہوگا جب نکیرین قبر میں سوال کریں گے؟ یہ سنکر حضرت عمر رضؓ بولے یا رسول اللہ یہ فرمایئے کہ اس وقت ہمارے اندر عقل بھی موجود ہوگی یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں عقل ہوگی! عرض کیا کہ بس پھر کچھ ڈر نہیں، جواب دے لیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

مطلب یہ تھا کہ اس دنیا میں جس طرح ہم نے خدا کو عقل سے پہچانا ہے اور اسکی معرفت حاصل کی ہے اور اس پر ایمان لائے ہیں تو اگر یہ عقل وہاں بھی موجود ہوئی تو اسی سے وہاں بھی جواب دے لیں گے. البتہ اگر خدا نخواستہ عقل ہی نہ رہ جائے تب تو مشکل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اصل چیز ایمان ہے اور بلاشبہ یہی تخم ہے اور مسلمانوں کے قلوب میں اسی کو پیدا کرنا تخم پاشی ہے. یہی وہ چیز ہے جو ہر جگہ کام آنے والی ہے. زندگی میں یہ کام آئے، قبر میں یہ معین ہو! آخرت میں یہ مددگار رہے، اسی دعا کو دل سے پڑھ لیجئے. دیکھئے کتنا سکون اور اطمینان ہو جاتا ہے. اہل معرفت نے اسی لئے اللہ تعالیٰ کا عشق اور حب مولیٰ کا غم اختیار کیا ہے اور اس غم سے انھیں کبھی سیری نہیں ہوئی. چنانچہ حضرت جامیؒ بہت بڑے شخص گذرے ہیں ان کا یہ معمول تھا کہ حج کے لئے جاتے تھے اور جب واپس ہونے لگتے تو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کی اجازت چاہتے تو قبر مبارک سے یہ آواز آتی تھی کہ ؎

بہ سفر رفتنت مبارک باد

بہ سلامت روی و باز آئی

یعنی تمہارا سفر میں جانا مبارک ہو. سلامتی کے ساتھ جاؤ اور پھر آؤ!

جب آخری بار حج کو گئے اور حسب دستور اجازت چاہی تو جواب ملا ؎

بہ سفر رفتنت مبارک باد

بہ سلامت روی نہ باز آئی

یعنی سلامتی کے ساتھ جاؤ مگر اب نہ آسکو گے۔

چنانچہ اسی سال وصال ہوگیا اور پھر حاضری کی نوبت نہ آئی یہی حضرت جامیؒ ہیں کہ جب ان کا خدا سے ملنے کا وقت قریب ہوا تو یہ کہتے تھے ؎

با دو روزہ زندگی جامی نہ شد سیر غمت

وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتیم

یعنی اپنی اس دو روز کی زندگی میں جامی آپ کے غم عشق سے سیر نہیں ہوا کیا خوب ہوتا کہ عمر جاودانی اسے حاصل ہوتی۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے عشق کے ساتھ عمر جاودانی ہوسکتی ہے

اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما!

یعنی وہ شخص کبھی نہیں مرتا جسکا دل عشق سے زندہ ہوا۔ اہل زمانہ کے قلوب پر ہمارا دوام نقش ہے۔

آپ سے کہتا ہوں کہ وہی طریقہ اختیار کیجئے جو آپ کے اولیاء کاملین نے کیا۔ یہ سب کیا کہ دوسروں پر فتوے لگا رہے ہیں! اپنے اوپر فتویٰ لگائیے۔ دوسروں کو تو فاسق اور کیا کیا کہتے ہو۔ اپنے گریبان میں بھی تو منہ ڈال کر دیکھو۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آنکھ بند ہے۔ ورنہ تو اگر باطنی آنکھ کھلی ہوتی تو وہی کہتے۔ جیسا کہ اکبر حسین جج نے کہا ہے ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی

اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

یہ سب کیا کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قلب جو عطا فرمایا ہے تو عیوب اور رذائل سے بگڑنے

کے لئے نہیں بلکہ تخم عشق بونے کے لئے کسی نے خوب کہا ہے ؎

دل دیا ہے اس نے تخم عشق بونے کے لئے
آنکھ دی ہے اس نے ساری عمر رونے کے لئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْیَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَکُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَّالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ٥

یعنی یا اللہ نصیب کر مجھے آنکھیں برسنے والی کو سیراب کریں دل کو بہتے ہوئے آنسوؤں سے تیرے خوف سے قبل اس وقت کے کہ ہو جائیں آنسو خون اور ڈاڑھیں انگارے!

دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ سے سوال فرما رہے ہیں کہ ایسی آنکھیں نصیب فرما کہ جو آنسو برسانے والی ہوں اور اس سے قلب کو سیراب کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ قلب بمنزلہ کھیت اور زمین کے ہے اور اس میں جو بیج ڈالا گیا ہے یعنی تخم ایمان یا تخم عشق۔ اس سینچائی سے اسی میں ترقی مقصود ہے۔ مبارک ہیں وہ آنکھیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا ان کے خوف سے روئیں! حدیث شریف میں آتا ہے کہ حشر کے دن بہت سے لوگ عرش کے سایہ میں ہونگے ان میں وہ جوان بھی ہوگا جس نے اپنی جوانی خدا کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے تقویٰ میں گذاری ہو اس کو ندا دی جائے گی کہ تم نے اپنی جوانی میرے لئے ختم کردی تھی اس لئے آج اسکے صلہ میں تمہیں عرش کے سایہ میں جگہ دی جاتی ہے۔

اب کیا یہ سارے مضامین اثر لینے والے نہیں ہیں؟ کیا ہماری آبرو لیتے ہو۔ کہ ہم یونہی ٹخ ٹخ کرتے رہیں اور آپ لوگ کچھ نہ سیکھیں۔ اس سے لوگ کیا سمجھیں گے اور کیا رائے قائم کرینگے۔ یہ خیال کریں گے کہ جس طرح سے اور سب لوگ یہاں آتے ہیں اسی طرح سے یہ بھی یہاں آئے ہیں۔ ہماری آبرو اس سے ہے کہ تخم عشق بوئیے۔ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ ایمان کا نشو و نما کیجئے۔ عشق کہیں چھپتا ہے! عاشق اور محب کو لوگ ہزار میں پہچان لیں۔ اس کا انداز ہی اور کچھ ہوتا ہے اور اس کے عمل میں اثر ہوتا ہے۔ میں یہاں دیکھتا رہتا ہوں کہ آپ لوگ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں گذرنے والے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ عبادت کا یہ طریقہ بہت

عمدہ ہے۔ اور آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہونگے کہ بڑے اچھے لوگ ہیں اپنے مالک کی عبادت کر رہے ہیں!

اللہ تعالیٰ کی محبت سب انسانوں کے دلوں میں ہے لہذا ان کی عبادت قلوب کو جذب کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ مال و دولت ہی جاذب نظر ہے۔ بلکہ دینداری بھی اپنے اندر ایک جذب رکھتی ہے۔

ایک بادشاہ نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی لڑکی کی شادی کسی دیندار ہی سے کریگا۔ خواہ وہ امیر نہ ہو۔ چنانچہ کہیں ایک دفعہ جا رہا تھا ایک مسجد میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ نماز نہایت خشوع خضوع کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ کھڑا ہو گیا اور اس کی نماز کو دیکھنے لگا۔ جس طرح سے یہاں لوگ راستہ چلتے چلتے آپ کی نماز کو دیکھنے لگتے ہیں۔ بالآخر یہ فیصلہ دل میں کر لیا کہ بس اسی کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کروں گا۔ جب اس نوجوان نے اپنی نماز ختم کر لی تو بادشاہ اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اگر شاہ شجاع کرمانی اپنی لڑکی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دے تو تم منظور کر دگے؟ اس نوجوان نے کہا کہ میاں چپ بھی رہو کیسی باتیں کرتے ہو؟ پٹوانے کا ارادہ ہے کیا؟ بادشاہ نے کہا نہیں۔ میں ہی شاہ شجاع ہوں اور میں اپنی لڑکی کو تمہارے نکاح میں دینا چاہتا ہوں۔ تمہاری نماز مجھے پسند آگئی ہے بس یہی اس کا مہر ہے۔ تمہیں اور کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر نکاح کر دیا۔

اب اس لڑکی کا حال سنئے!

شاہی محل سے رخصت ہو کر جب اس غریب نوجوان کے یہاں آئی تو گھر میں دیکھا کہ ایک ٹکڑا روٹی کا طاق میں رکھا ہوا ہے۔ لڑکی الٹے پاؤں باہر آگئی اور کہا کہ میرے والد نے تو میرا نکاح ایک صالح نوجوان سے کیا تھا تم تو وہ نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ گھر میں یہ روٹی کیسی رکھی ہوئی ہے۔ اس لڑکے نے کہا نہیں۔ میں ہی تمہارا شوہر ہوں۔ شاہ شجاع نے میرے ہی ساتھ تمہارا نکاح کیا ہے! باقی یہ روٹی جو تم دیکھتی ہو تو بات یہ ہے کہ آج میرا روزہ تھا۔ میں نے افطار کیلئے رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے کہا کہ اسی سے تو مجھے شبہ ہوا کہ تم وہ نہیں ہو۔ کیونکہ میرے والد نے بہت تعریف کر کے میرا نکاح تمہارے ساتھ کیا ہے۔ اور میں یہ دیکھتی ہوں کہ تم میں خدا پر توکل نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

دوسرے وقت کے لئے کھانا اٹھا کر رکھتے ہو مجھے یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی۔ تاہم اب جبکہ تمہارے ساتھ میرا نکاح ہو ہی گیا ہے تو گذر کرنا ہی ہے۔ مگر روٹی کے اس ٹکڑے کو باہر کردو (یعنی صدقہ کردو) تب میں گھر میں قدم رکھوں گی۔ دیکھا آپ نے ع

"وزیرے چنیں شہر یارے چناں"

کبھی آپ کی بادشاہزادیاں بھی ایسی ہوتی تھیں اور آپ کے نوجوانوں کی نماز امیروں کے لئے جاذب نظر ہوتی تھی۔ یہ اس پر سنا رہا ہوں کہ دیکھ رہا ہوں کہ جو چیزیں کرنے کی ہیں ان سے تو بہت دور ہو گئے ہو اور دوسری دوسری باتوں میں انہماک ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ شریعت کو پکڑو۔ نماز درست کرو۔ آدمی کی نیت اگر خراب بھی ہوتی ہے تو پھر ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔ اب تک نہیں کیا تو اب سے کرو۔

ایک شخص نے ایک جگہ مسجد میں اس نیت سے اعتکاف کیا اور خوب عبادت کی تاکہ لوگ دیندار سمجھیں اور کسی امیر گھرانے سے پیغام آئے مگر کسی نے پوچھا تک نہیں۔ بہت دن تک اسی طرح معتکف رہا اور خوب عبادت کرتا رہا۔ ایک دن یہ خیال ہوا کہ دنیا کے لئے اتنی محنت کر رہے ہو اور دنیا والے رُخ نہیں کرتے تو پھر کیوں نہ اللہ ہی کے لئے کرو۔ نیت کا بدلنا تھا کہ پیغامات آنا شروع ہو گئے لیکن نیت درست کر لینے کے بعد اب تو اس کا مقصود خدا ہو چکا تھا۔ دنیا دل سے نکل چکی تھی اس لئے اس نے لوگوں سے کہا کہ صاف صاف کہتا ہوں کہ میں ابتداءً اسی لئے بیٹھا تھا اس وقت تو تم لوگوں نے پوچھا تک نہیں۔ اب مجھے خدا مل گیا ہے لہذا تمہارے رشتہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ اسی نوع کا ایک اور واقعہ سنئے:۔

ایک آدمی نے بیت المقدس میں عبادت شروع کی تاکہ وہاں کی تولیت اسکو مل جائے لیکن کسی نے توجہ نہیں کی۔ اسکے بعد انھوں نے اپنی نیت بدلدی اور خدا کے لئے عبادت کرنے لگے۔ اس کے بعد ہی لوگوں نے کہا کہ بیت المقدس کی تولیت قبول فرمائیے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے اسی نیت سے عبادت شروع کی تھی۔ لیکن اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (یعنی ابتداءً مجھ میں خلوص نہیں تھا اور دنیا ہی مجھے مقصود تھی لیکن اب خدا نے مجھ پر اپنا فضل فرما دیا ہے اسلئے اب تولیت مجھے درکار ہی نہیں ہے)

غرض ایسے بہت سے لوگ ہوئے ہیں کہ ابتدا میں ان کی نیت اچھی نہیں تھی لیکن بعد میں اچھی ہوگئی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھیں اور اللہ تعالیٰ توجہ نہ فرمائیں۔ وعدے اللہ کے سچے ہیں۔ لیکن کامیابی جب ہوگی جب کام طریقہ سے کروگے اور طریقہ یہی ہے کہ سب سے پہلے ایمان درست کرو۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اس راستہ میں ایمان چلتا ہے یعنی آدمی جو بھی ترقی کرتا ہے وہ ایمان کی وجہ سے کرتا ہے اور ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے اور آخرت کے حساب وکتاب پر ایمان لانا ہے۔ آپ اس چیز کو خشک کیوں سمجھ رہے ہیں۔ اولیاء اللہ کے کلمات بتارہے ہیں کہ یہ تر ہے۔ انھیں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا واقعہ ہے کہ سماع سنتے تھے۔ محاسب نے منع فرمایا، ترک کردیا کچھ لوگوں نے طعن کیا۔ کسی نے اسکی اطلاع حضرتؒ کو دیدی کہ لوگ ایسا ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی ہم مسلمان ہمارے باپ مسلمان شریعت کا ایک حکم سنا اسکو مان لیا اس میں طعن کی کیا بات ہے حضرت شیخ قدس سرہٗ خود بڑے زبردست عالم متبع سنت بزرگ اور شیخ کامل گذرے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔ مکتوبات میں لکھتے ہیں ؎

ہر کہ در راہِ محمد رہ نیافت
تا ابد گردِ ازیں در گہ نیافت

یعنی جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ نہیں اختیار کیا یعنی خدا تک پہنچنے کے لئے آپؐ کے طریقوں اور آپؐ کی سنتوں کو ذریعہ نہیں بنایا تو وہ کبھی بھی اس درگاہ تک نہیں پہنچا اور پہنچنا تو بجائے خود رہا۔ اس درگاہ کی گرد راہ کو بھی اس نے نہیں پایا۔ نہایت عمدہ شعر ہے۔ اسی لئے آپؐ کے سامنے سنت کا مضمون چھیڑا ہے تاکہ آپ کو راستہ مل جائے۔ کیونکہ یہی راہ ہے ؎

میندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز برپئے مصطفےٰ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

(مجلس پنجم)
(بسلسلۂ وصیۃ السنۃ)

سنت کا مضمون کئی دن سے بیان کر رہا ہوں اس سلسلے میں آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ کا بھی تھوڑا سا بیان کر چکا ہوں جنکی دو حیثیتیں ہیں. بعض چیزیں انسان کو مقصود ہوتی ہیں جن کا وہ طالب ہوتا ہے ان کے طلب کرنے کو دعا کہتے ہیں اور بعض چیزیں مضر ہوتی ہیں انسان ان سے پناہ مانگتا ہے اسے استعاذہ کہتے ہیں. آدمی اپنی ہر چیز طلب کرنے میں اور ہر چیز سے بچنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے یہ افتقار ہے اور اسی کا نام عبدیت ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں اور استعاذے ثابت ہیں یہ سب تشریع ہے یعنی نماز روزے کی طرح احکام تشریعیہ ہیں اور آپ کے کمال عبدیت کی دلیل ہیں۔

اور آپ کی بعثت چونکہ دونوں جہان کی صلاح کیلئے ہوئی ہے اسلئے جو چیزیں بھی انسان کے فلاح دارین کے لئے مضر تھیں آپ نے اس سے پناہ مانگی ہے اور جو چیزیں کہ فلاح کے لئے درکار تھیں آپنے اس کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کی ہے چنانچہ آپنے ایک استعاذہ میں آپ فرماتے ہیں کہ:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اِمْرَأَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ وَلَدٍ يَّكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالًا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ مَّالٍ يَّكُوْنُ عَلَیَّ عَذَابًا۔ یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے جو مجھے بوڑھا کر دے بڑھاپے سے پہلے اور پناہ چاہتا ہوں ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب دنیا میں یا آخرت میں۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت سے پناہ مانگی ہے جو اپنے کج خلقی کی وجہ سے گھر کو دوزخ بنا دے اور شوہر کو اس طرح فکر میں ڈال دے کہ بڑھاپے سے قبل وہ بوڑھا ہو جائے۔ آپ کے اس دعا کی تلقین سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ

کسقدر احاطہ تھا آپ کو امت کے احوال کا اسی طرح آپ کی بے انتہا شفقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دعا کو سکھلا کر امت کو کتنی بڑی ضیق سے نجات حاصل کرنے کی سبیل بتلائی۔ آپ تو امت کی اصلاح کے لئے اسقدر فکر مند ہوں اور امت کو آپ کی تعلیمات کی جانب ذرا توجہ نہ ہو خود آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ کیسی بات ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے حکم دو قسم کے ہیں۔ بعض تشریعی احکام یہی نماز روزہ اور مختلف حالات سے متعلق دعا اور استعاذہ۔ ان سب کو کروگے تو اجر پاؤگے اور دعا قبول ہوگئی تو دنیا میں بھی کامیاب رہو گے اور نہ کروگے تو یہاں بھی پریشان رہوگے اور اسی پر آخرت کو قیاس کرو لیکن اللہ تعالیٰ کے جو احکام کہ تکوینی ہیں ان پر تو خواہی نخواہی عمل کرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً بیمار کرنا چاہیں گے تو بیمار ہونا پڑے گا۔ مصیبت پڑی تو سہنا پڑے گا۔ اس میں آپ کو کوئی اختیار نہ ہوگا۔ جیسا احکام تشریعیہ میں اختیار رہتا ہے۔ احکام تکوینیہ میں اختیار باقی نہیں رہتا ہے مگر دعائیں جو اسکے لئے یا استعاذہ جو اس کے لئے وارد ہے وہ احکام تشریعیہ کے قبیل سے ہیں اس میں اختیار رہتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کیسی کیسی دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں لیکن آپ کو ان کی جانب ذرا توجہ نہیں ہوتی۔ ایک دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اِنَّا نَسْأَلُكَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَمُنْجِيَاتِ اَمْرِكَ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ وَّالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ۔ یعنی ہم مانگتے ہیں تجھ سے تیری مغفرت کے اسباب اور نجات دینے والے کام کی اور بچا رہنا ہر گناہ سے اور لوٹ ہر نیکی کی اور کامیابی بہشت کی اور نجات دوزخ کی۔

ایک دعا میں آپ یہ فرماتے ہیں:۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ خُلُقِيْ وَطَيِّبْ لِيْ كَسْبِيْ وَقَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَلَا تُذْهِبْ طَلَبِيْ اِلٰى شَيْئٍ صَرَفْتَهٗ عَنِّيْ۔ یعنی اے اللہ بخش دے میرے گناہ اور وسیع کر دے میرا خلق اور حلال کر دے میرا کسب اور قناعت دے مجھے اس چیز پر جو تو نے مجھے دی اور نہ لے جا طلب میری کسی ایسی چیز کی طرف جسکو تو نے مجھ سے ہٹا لیا ہے۔

یہ دعا آپ کی جامع دعا ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے اس میں آپ نے دینی اور

دنیوی تمام حاجات کا احاطہ فرما دیا ہے مگر کوئی دعا چاہے کیسی ہی مفید اور مختصر کیوں نہ ہو آپ کو اس سے کیا لینا، نہ تو آپ اس کی ضرورت ہی سمجھتے ہیں اور نہ آپ کو ان کے یاد کرنے کی فرصت ہے البتہ کسی شاعر کا کوئی شعر آپ کو مل جائے تو اسے آپ ضرور یاد کر لیں گے اور میں یہ کہتا ہوں کہ دین اور دنیا دونوں کی فلاح کا دروازہ بند ہے ان کے کھلوانے کا ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور استعاذوں کو اختیار کرو اسی سے دارین کی فلاح حاصل ہوگی ورنہ معاملہ مشکل ہے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسباب شر سے کس کس طرح پناہ مانگ رہے ہیں فرماتے ہیں :۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ حَالِ اَھْلِ النَّارِ وَمِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ وَمِنْ شَرِّ مَا اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ وَشَرِّ مَا بَعْدَہٗ وَمِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَشَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ وَاَنْ نَّقْتَرِفَ عَلٰی اَنْفُسِنَا سُوْءً اَوْ نَجُرَّہٗ اِلٰی مُسْلِمٍ اَوْ اَکْتَسِبَ خَطِیْئَۃً اَوْ ذَنْبًا لَا تَغْفِرُہٗ وَمِنْ ضِیْقِ الْمَقَامِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ +

یعنی پناہ پکڑتا ہوں میں اللہ کی اہل دوزخ کے حال سے اور دوزخ سے اور اس چیز سے جو قریب کرنے والی ہو دوزخ کے قول ہو یا عمل اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے قبضے میں ہے اور پناہ چاہتا ہوں میں تیری اس چیز کی برائی سے جو آج کے دن میں ہے اور اس چیز کی برائی سے جو اس کے بعد ہے اور اپنے نفس کی برائی سے اور شیطان کی برائی سے اور اس کے شرک سے اور اس سے کہ حاصل کریں اپنی جان پر کسی برائی کو یا اسکو کسی مسلمان کی طرف پہنچائیں یا کروں میں کوئی ایسی خطا اور گناہ جسے تو نہ بخشے اور مقام کی تنگی سے قیامت میں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود معصوم تھے لیکن آپ اللہ تعالیٰ سے ان سب چیزوں سے پناہ مانگ رہے ہیں اور آپ اپنے کو دیکھ لیجئے کہ آپ کے اوقات کیسے گذر رہے ہیں۔ ایک ایک بات کو مکرر سہ کرر فرماتے ہیں اور اجمالی طور پر کہنے کے بعد پھر اسے مفصل بھی فرماتے ہیں۔ دیکھئے نار سے پناہ مانگنے کے بعد کیسا عنوان اختیار فرمایا ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ دوزخیوں کے حال سے پناہ چاہتا ہوں اتنا بھی کافی تھا۔ لیکن آگے فرماتے ہیں کہ اور خود دوزخ سے بھی پناہ چاہتا ہوں اور ایسے اقوال و اعمال سے پناہ چاہتا ہوں جو دوزخ سے قریب کرنے والے ہوں۔ اسی طرح یہ فرمایا کہ جن کی

پیشانی تیرے قبضے میں ہے ان کے شر سے پناہ مانگتا ہوں نہایت عام عنوان تھا۔ لیکن آگے پھر چند خاص امور کو ذکر فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں جو چیزیں ہونے والی ہیں ان کے شر سے پناہ چاہتا ہوں اس طرح سے آج کے بعد جو امور در پیش ہوں ان کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ اسی طرح سے فرماتے ہیں۔ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ یعنی اپنے نفس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ اب جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں تو یہ دعا سنت ہو گئی کسی کی مجال ہے کہ اپنے نفس کے شر سے پناہ نہ مانگے۔ اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً لوگوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ نفس کا بھی ایک شر ہوتا ہے اس سے آدمی کو بچنا چاہیئے۔ اسکے متعلق یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :۔

وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ یعنی میں اپنے نفس کو بالذات بری نہیں کرتا اسلئے کہ نفس تو برائیوں کا حکم کیا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس کے شر سے بچنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے اسکے لئے اللہ تعالیٰ ہی سے زیادہ پناہ مانگنے کی ضرورت ہے۔

آگے فرماتے ہیں :۔

وَشَرِّ الشَّیْطَانِ وَشِرْکِہٖ۔ یعنی پناہ پکڑتا ہوں اللہ کی شیطان اور اس کے شرک کے شر سے۔ یعنی جس طرح یہ نفس انسان کا داخلی دشمن ہے اسی طرح شیطان اس کا خارجی دشمن ہے جب ان دونوں دشمنوں سے انسان خدا کی حفاظت اور پناہ میں آگیا پھر کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مضمون کو ایک دوسرے عنوان سے ادا فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

اَللّٰھُمَّ کَمَا حُلْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ قَلْبِیْ فَحُلْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ الشَّیْطَانِ وَعَمَلِہٖ

یعنی اے اللہ جس طرح حائل ہیں آپ مجھ میں اور میرے دل میں اسی طرح سے حائل ہو جائیے مجھ میں اور شیطان اور اس کے کام میں۔ یعنی آپ جب میرے اور شیطان اور اس کے کام کے درمیان میں حائل ہو جائیں گے تو پھر اس کا کوئی داؤ مجھ پر نہ چل سکے گا؛

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کے نفس کی معرفت کرائی شیطان کی معرفت کرائی اور حیلولۃ کی معرفت کرائی۔ نیز اس دعا میں یہ فرمایا ہے کہ اس گناہ سے پناہ مانگتا ہوں جسے آپ معاف نہ کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک

گناہ وہ ہوتا ہے کہ جسکے بعد انسان کو ندامت ہو توبہ کی توفیق ہو، اور وہ معاف ہو جائے گناہ تو یہ بھی ہے لیکن انجام کے اعتبار سے اسکے حق میں سبب خیر ہو گیا۔ لیکن ایک گناہ وہ ہوتا ہے کہ جسکے کرنے کے بعد اس کی معافی نہ ہو ظاہر ہے کہ ایسے معاصی آدمی کے حق میں مہلک ہی ہیں اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی پناہ مانگی ہے!

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کو نہ لیجئے گا تو دین کا ایک بڑا حصہ آپ سے فوت ہو جائیگا اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی ان دعاؤں میں انسانی تمام ضروریات اور مضرات دینی اور دنیاوی ظاہری اور باطنی، حالی اور مآلی سب کو جمع فرما دیا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ہی ہے کیونکہ جن جن باریک گوشوں تک آپ کی نظر پہونچی ہے اولیاء اور عقلاء بھی اس کے بیان سے قاصر تھے، تا بدیگراں چہ رسد،

مثال کے طور پر دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غایت عبدیت میں اور عالم نزول میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمارہے ہیں کہ:۔

اللّٰھُمَّ حَصِّنْ فَرْجِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ۔ یعنی اے اللہ تو میری شرمگاہ کی حفاظت فرما اور میرا معاملہ مجھ پر آسان فرما، جس طرح سے آپ نے مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ فرمایا، یا جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے آپ نے اپنی ایک دعا میں وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ یعنی میں اپنے منی کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ اسی کو یہاں دوسرے عنوان سے یہ فرمایا کہ میری شرمگاہ کی حفاظت فرما۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ لوگ اسے سنکر شرما جاتے ہیں تو پھر اسے بیان کیا کرینگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اخلاق کی اصلاح کے لئے تشریف ہی لائے تھے اسلئے بدخلقی کا جو سب سے بڑا سرچشمہ اور منبع تھا امت کو اس کے شر سے متنبہ کرنا ضروری تھا اور آپ بھلا کیوں نہ فرماتے جبکہ اللہ تعالیٰ نے وارثین فردوس اور مومنین مفلحین، متقین کے اوصاف میں اسکو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ٥ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ٥ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ٥ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ٥ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ

مَلُوْمِیْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

یعنی بالتحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی (حرام شہوت رانی) سے حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ (حد شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (بس) ایسے ہی لوگ وارث ہونیوالے ہیں جو فردوس کے وارث ہونگے (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دیکھئے اس میں حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ فلاح پانے والے مومنین وہ ہیں جنکی یہ یہ صفات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھنے والے ہیں تو جب اللہ تعالیٰ نے اس وصف کی مدح فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے یہ دعا فرمائی کہ اَللّٰهُمَّ حَصِّنْ فَرْجِیْ یعنی میری شرمگاہ کو محفوظ کر دیجئے وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ یعنی میرے کام کو آسان فرما دیجئے۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ آپنے کسی عالم اور بزرگ کو اس پر کلام کرتے نہ سنا ہوگا اسلئے کہ یہ ایک عملی اور اصلاحی چیز ہے تقریر کے مد کی چیز ہی نہیں ہے۔ آپ سے کہتا ہوں کہ صرف تقریر سے کب تک کام چلائیگا کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی تقریر ہی سے کام چل جائیگا؟ وہاں پرسش ہو جائیگی کہ کتنا عمل کیا اور کتنوں سے عمل کرایا کتنا سیکھا اور کتنوں کو سکھایا اسکی بحث بھی اہم بحث ہے عفت اسی پر موقوف ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ تَمَامَ الْوُضُوْءِ وَتَمَامَ الصَّلٰوةِ وَتَمَامَ رِضْوَانِكَ +

یعنی اے اللہ تجھ سے کمال وضو کا سوال کرتا ہوں اور کمال صلوٰۃ کا سوال کرتا ہوں اور آپ کی کامل رضا کا سوال کرتا ہوں۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب طور پر وضو کا نماز کا اور پھر رضا کا سوال کیا ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مومن کا اصل مقصود ہے جسکی جگہ آخرت میں جنت ہے اور جنت کی کنجی نماز ہے۔ اسلئے نماز کے کمال کو طلب فرمایا اور نماز کی مفتاح وضو ہے اسلئے اس کے کمال کو بھی طلب فرمایا۔ یعنی مومن کو جب کمال وضو میسر ہو جائیگا تو اسکی وجہ سے کمال صلوٰۃ نصیب ہوگا اور اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی۔

اسی کے متعلق کہہ رہا ہوں کہ اس دار دنیا میں یہی چیز تو حاصل کرنے کی ہے جو کہ حاصل ہوگی اتباع سنت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلو گے تب ہی پہونچ سکو گے ورنہ کوئی جنت میں بدون اس دروازے کے داخل ہونا بھی چاہے گا تو دھکا دیدیا جائے گا۔

مولانا روم ؒ نے مثنوی میں کسی کا کشف لکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فلسفی کے متعلق فرمایا بغیر میرے واسطے کے جنت میں داخل ہونا چاہتا تھا میں نے دھکا دیدیا تو جہنم میں جا گرا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ کِتَابِیْ بِیَمِیْنِیْ یعنی اے اللہ میرا اعمال نامہ میرے داہنے ہاتھ میں دیجئے۔ کیونکہ قیامت میں مومن کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا اور کافر کا بائیں ہاتھ میں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ اب آپ کو تمنا تو اسکی ہوگی کہ مجھ کو میرا اعمالنامہ میرے داہنے ہاتھ میں ملے۔ لیکن آپ نے اس کی دعا کبھی نہ کی ہوگی

اور سنئے ارشاد فرماتے ہیں

اَللّٰھُمَّ غَشِّنِیْ بِرَحْمَتِکَ وَجَنِّبْنِیْ عَذَابَکَ یعنی یا اللہ ڈھانپ لے مجھے اپنی رحمت میں اور بچا نا مجھے اپنے عذاب سے اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ قَدَمَیَّ یَوْمَ تَزِلُّ فِیْہِ الْاَقْدَامُ یعنی اے اللہ ثابت قدم رکھنا میرے قدم کو جسدن کہ ڈگے بہت سے قدم۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:- اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَصْلِحْھُمْ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِھِمْ وَاَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَاجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَالْحِکْمَۃَ وَثَبِّتْھُمْ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِکَ وَاَوْزِعْھُمْ اَنْ یَّشْکُرُوْا نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ وَاَنْ یُّوْفُوْا بِعَھْدِکَ الَّذِیْ عَاھَدْتَّھُمْ عَلَیْہِ وَانْصُرْھُمْ عَلٰی عَدُوِّکَ وَعَدُوِّھِمْ اِلٰہَ الْحَقِّ سُبْحَانَکَ لَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ - اِغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ عَمَلِیْ اِنَّکَ تَغْفِرُ الذُّنُوْبَ لِمَنْ تَشَآءُ وَاَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ یعنی اے اللہ بخش مجھے اور تمام مومنین اور مومنات اور مسلمین اور مسلمات کو اور درست کر دے انھیں اور صلح فرما دے ان کے آپس میں اور الفت دے ان کے دلوں میں اور کر دے ان کے دلوں میں ایمان اور حکمت اور ثابت رکھ انھیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر اور نصیب کر انھیں یہ کہ شکر کریں تیری اس نعمت کا جو تو نے ان کو دی ہے اور یہ کہ پورا کریں تیرا وہ وعدہ جو تو نے ان سے کیا ہے اور غالب کر ان کو اپنے اور ان کے دشمن پر اے معبود برحق پاک ہے تو تیرے سوا کوئی معبود نہیں بخش دے میرے گناہ اور درست کر دے میرے عمل کیونکہ تو بخش دیتا ہے گناہ جس کے چاہتا ہے اور تو ہی غفور رحیم ہے۔

دیکھا آپ نے یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں۔ انہیں سے بعض کو تو آپ نے ایک دفعہ بھی نہ کیا ہوگا اور جن دعاؤں کو مانگا بھی ہوگا تو محض زبان سے اور سرسری طور پر۔ اہل اللہ اس کو اور طریقے سے مانگتے ہیں حقیقی وظیفہ یہی ہے اس کو کیجئے اور اس کا نفع دیکھئے۔ اللہ تعالٰی نے جو دعائیں سکھائی ہیں یہ اللہ تعالٰی کی طرف جذب ہے اسے اختیار کرو تو جذب حاصل ہو جائے، ایمان تازہ ہو جائے کیونکہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اور آپ کی دعاؤں کو نہ لوگے ایمان کامل نہ ہوگا۔

میں عالموں سے کہتا ہوں کہ جب قوم کو دین سکھانے کے لئے ممبر پر آپ کھڑے ہوئے ہیں تو یہ سب چیزیں سکھلائے تاکہ مسلمانوں کو فائدہ ہو لیکن سکھانا آسان تھوڑے ہی ہے۔ آدمی جب پہلے خود سیکھے ہوتا ہے تب ہی دوسروں کو سکھا سکتا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی تا راہ بیں نباشی کے راہبر شوی

در مکتبِ حقائق پیش ادیب عشق ہاں اے پسر بکوش تا روزے پدر شوی

(ترجمہ) اے نادان کوشش کر تاکہ تو دانا اور راہ سے باخبر ہو جائے اس لئے کہ جب تک تو خود راستہ نہ دیکھے ہوگا دوسرے کی رہبری کیا کرے گا۔ مکتب حقائق میں ادیب عشق کے سامنے اے لڑکے کوشش کر تاکہ ایک دن تو باپ ہو جائے۔

میں اتنے دنوں سے بمبئی میں ہوں اگر یہ لوگ سیکھیں تو ہر طرف نور ہی نور ہو جائے ایک طرف تو دعائیں خود نہایت عمدہ اور دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی محبت اور شفقت کے ساتھ انھیں سکھایا ہے جس طرح کہ باپ اپنی اولاد کو سکھاتا ہے۔

(مجلس ششم)

بسلسلہ وصیۃ السنۃ

فرمایا کہ دعا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں۔ مثنوی میں مولانا رومؒ نے ایک جوان کا قصہ لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ عجیب قصہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ ؎

ایں دعا بشنو زبندہ کاے خدا ثروتے بے رنج روزی کن مرا

یعنی ایک بندۂ خدا کی یہ دعا سنو کہ اسنے یہ دعا کی کہ اے اللہ مجھے ثروت (مال) عطا ہو بدون رنج و مشقت کے۔ مگر یہ سب باتیں آپ کی سمجھ میں نہ آئیں گی اس لئے کہ راستہ چھوڑ چکے ہیں۔ کامیابی آپ کے نزدیک جلسہ میں ہے اور مجمع کا نام ہے اس لئے کہ جہاں تھا وہاں سنتا تھا کہ کہتے تھے کہ " زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہو کر جلسہ کو کامیاب بنائیں اور ثواب دارین حاصل کریں" اس سے معلوم ہوا کہ جلسہ کی کامیابی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسمیں شریک ہوں۔ باقی آخرت کا ثواب تو خیر سمجھ میں آتا تھا مگر اس دار کا نہیں سمجھا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ شاید یہی مٹھائی وغیرہ جو تقسیم کرتے ہیں اسی کو اس دار کا

Scanned with CamScanner

ثواب سمجھتے ہوں گے ـــــ آگے اس جوان کی دعا نقل فرماتے ہیں کہ ؎

چوں مرا توآفریدی کاہلی ۔ زخم خوارے سست جلبے تنبلے
کاہلم چوں آفریدی اے ملی ۔ روزیم دہ ہم زراہ کاہلے

یعنی جب تو نے مجھے کاہل پیدا کیا اس حال میں کہ میں سست ہوں، کاہل ہوں اور زخمی دل ہوں تو پھر اے غنی! جب تو نے مجھے کاہل پیدا کیا ہے تو مجھے روزی بھی کاہلی ہی کی راہ سے عطا فرما۔ مناجات مقبول کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ جوان کی دعا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں تھا کہ بہت دنوں اسی طرح دعا کرنے کے بعد ایک گائے اس کے مکان میں آگئی (اس نے یہ سمجھ کر کہ میری دعا قبول ہوئی ہے اسکو استعمال کیا) لیکن تھی وہ دوسرے کی۔ اس کو علم ہوا تو اس نے داؤد علیہ السلام کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ وہ نوجوان یہی دعا کرتا تھا ؎

کاہلم من سایۂ خسپم در وجود ۔ خفتم اندر سایۂ احسان وجود
کاہلان وسایہ خسپاں را مگر ۔ روزی بنہادۂ نوع دگر

اے خدا میں اس عالم وجود میں سایہ میں پلا ہوا ہوں اور کاہل ہوں ہمیشہ تیرے ظل احسان میں سویا کیا ہوں اور کاہلوں اور سایہ میں سونے والوں کو تو دوسرے ہی طریقہ سے روزی دیتا ہے۔ لہذا مجھے بھی اسی طرح سے روزی عطا فرما۔

دیکھا آپ نے روزی کا طریقہ صرف تعب و مشقت ہی نہیں ہے بلکہ کسی کسی کو بدون تعب کے بھی روزی ملا کرتی ہے۔ جیسا کہ آگے فرماتے ہیں ؎

ہر کرا پاہست جوید روزیئے ۔ ہر کرا پانیست کن ذل سوزیئے
رزق را میراں بسوئے این حزیں ۔ ابر را باراں بسوئے ہر زمیں
چوں زمیں را پانہ باشد جود تو ۔ ابر را راند بسوئے او دو تو

فرماتے ہیں کہ جس کے پیر ہے وہ تو اپنی روزی چل کر حاصل کر لیتا ہے اور جس کے پاؤں نہیں ہوتے اسکی دلسوزی آپ فرماتے ہیں پس مجھ حزیں و غمگیں کی جانب میرا رزق چلایئے تو ہی ہر زمین کی جانب بارش کو بھیجتا ہے جب زمین کے پیر نہیں ہیں تو تو ابر کو اس کی جانب دوڑاتا ہے اور وہاں جا کر وہ برستا ہے جس طرح سے کہ ؎

Scanned with CamScanner

طفل را چوں پا نباشد مادرش　　آید و ریزد وظیفہ بر سرش
روزیئے خواہم بنا گہ بے تعب　　کہ ندارم من زکوشش جز طلب

چھوٹے بچے میں اپنے پیر سے چلنے کی طاقت نہیں ہوتی تو اسکی ماں آتی ہے اور اسکا مقرر وظیفہ (دودھ) پلا جاتی ہے۔ اسی طرح سے اے خدا میں بھی ایسی روزی تجھ سے چاہتا ہوں جسمیں تعب نہ ہو اس لئے کہ میرے پاس سوائے طلب کے اور تجھ سے مانگنے کے اور دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہی دعا ایک زمانہ تک وہ کرتا رہا چنانچہ اللہ تعالیٰ پر اسکو اس درجہ یقین تھا کہ وہ جانور اس کے گھر اندر خود بخود آگیا تو اس نے یہ سمجھا کہ میری دعا قبول ہوئی اور اسکے ساتھ وہ معاملہ کیا جو شئی مملوکہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا مالک نے نبی وقت کی خدمت میں مقدمہ پیش کیا حضرت نے غلام (جوان) سے بینہ طلب فرمایا۔ بالآخر قواعد شرعیہ کی رُو سے اس پر ملکیت غیر میں تصرف کا فیصلہ فرمادیا یہ سن کر وہ جوان بڑی زور سے رویا ایسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھی اُس کے رونے سے متاثر ہوگئے اور وجداناً آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ یہ فیصلہ صحیح نہیں ہوا اس لئے اعلان فرمادیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ آج نہیں اب کل دوں گا۔ لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہوگئے۔ بعضوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی اعتراض کیا کہ دیکھئے صاحب نہایت صاف فیصلہ تھا اسکو بھی ملتوی فرمادیا۔ یہ ایسا تھا جیسے آپ لوگ ہم لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں سمجھتے بوجھتے کچھ نہیں مگر اعتراض کرنے کو تیار۔ خدائے تعالیٰ کے کارخانۂ قدرت میں دم مارنے کی مجال نہیں۔ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ داؤد علیہ السلام نے شب کو خواب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ لڑکا بظاہر حق پر معلوم ہوتا ہے مگر دلائل ظاہری سے اس کے خلاف کا پتہ چلتا ہے۔ سمجھا دیجئے یہ کیا راز ہے؟ وحی آئی کہ یہ جوان حق پر ہے اور یہ مدّعی اس کے باپ کا غلام تھا اور اسکی سب چیزیں جنمیں گائے بھی داخل ہے جو اس کے باپ کی میراث ہوکر اسی کی مملوک ہیں۔ اس غلام نے ایک سفر میں تنہا پاکر اس کے باپ (یعنی اپنے آقا) کو فلاں جنگل میں مار کر فلاں درخت کے نیچے دفن کر دیا ہے اور اسکے بعد اس کی جملہ

اشیاء کا مالک بن بیٹھا ہے یہ جوان اس وقت بچہ تھا اسکو کچھ خبر نہیں۔ صبح کو داؤد علیہ السلام نے سب اہل بستی کو جمع کرکے پورا واقعہ سنایا اور اسی جگہ جاکر اس کے باپ کی لاش کو برآمد کیا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور اپنی سُوظنی پر سب بہت نادم ہوئے۔ یہ معاملہ تھا چونکہ یہ جوان نیک تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے قلب میں یہ دعا ڈال دی جس کی وجہ سے بلا محنت اور مشقت کے گھر بیٹھے امیر وکبیر ہوگیا اگر اللہ تعالیٰ یہ انتظام نہ فرماتے تو مال کے برآمدگی کی کوئی سبیل نہ تھی ــــ یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اگر مال اور دنیا ہی مطلوب ہے تو اسی کو اللہ تعالیٰ سے مانگیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک کو محنت اور مشقت کے بعد ہی دیں روزی مشقت سے بھی ملتی ہے اور آرام سے بھی بعضوں کو مل جاتی ہے اور جس طرح سے اور اسباب تحصیل رزق کے ہیں اسی طرح سے اسکا ایک سبب دعا بھی ہے ــــ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے سوال فرماتے ہیں کہ :۔ اَسْئَلُكَ رِزْقًا طَيِّبًا یعنی اے اللہ میں تجھ سے پاکیزہ رزق کا سوال کرتا ہوں۔ مولانا رومؒ اسی کو سمجھاتے ہوں گے کہ دعا کو کم نہ سمجھو یہ بھی ایک سبب ہے منجملہ اور اسباب کے اور بڑا سبب ہے۔ مولانا کا یہی قاعدہ ہے کہ سلوک اور طریقت کی باتوں کو قصص اور حکایات کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔ جوان کا قصہ بیان فرماکر بتایا کہ دعا بھی کوئی چیز ہے۔ باقی جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان اور یقین ہوگا وہی اسکو ذریعہ اور سبب سمجھے گا دوسرے کو اس جانب التفات تک نہ ہوگا ــ

ایک لڑکا ایک شاعر کے پاس جایا کرتا تھا وہ اس کو اشعار لکھوا کر کہتا تھا کہ دیکھو یہ شعر پانچسو روپیہ کا ہے اور یہ ہزار کا ہے۔ لڑکے نے کاپی پر لکھ لیا ایک دفعہ اسکی ماں نے کہا کہ جاؤ بازار سے ترکاری لاؤ۔ گئے دو چار آنے کی ترکاری لی اور سو روپیہ والا شعر ایک پرچہ پر لکھ کر ترکاری والے کو دیا اسنے کہا میاں یہ کیا مذاق کرتے ہو دام لاؤ۔ خیر اس کو دے دلاکر اس وقت تو بات ختم کی مگر بڑا قلق ہوا کہ یہ استاذ نے کیا غلط بیانی کی۔ اس دوکاندار نے تو

مٹکے کو بھی نہیں پوچھا اور انھوں نے کہا تھا کہ سو روپیہ کا شعر ہے۔ افسوس کے ساتھ گھر آئے اور اگلے روز جاکر استاد سے جاکر یہ واقعہ بیان کیا انھوں نے کہا کہ تم اُسے وہاں کہاں لیگئے۔ وہ اسکی منڈی نہیں ہے۔ اسکو بادشاہ کے یہاں لیجاؤ چنانچہ اگلے دن وہ بادشاہ کی خدمت میں گیا اور وہ شعر پیش کیا بادشاہ بہت ہی خوش ہوا اور انعام و اکرام، جوڑا گھوڑا سے اسکو نوازا۔

حضرتؒ نے اس قصہ کو اپنے وعظ میں بیان فرمایا ہے اور اس پر بنایا ہے کہ جس طرح شعر کی قدر دانی کی جگہ نقال کی دوکان نہ تھی بلکہ بادشاہی دربار تھا۔ اسی طرح آپ جو اعمال حسنہ کر رہے ہیں تو یہ نہ سمجھئے کہ ہم کو اس کا کوئی صلہ نہیں مل رہا ہے۔ دنیا اسکی منڈی نہیں ہے بلکہ اس کا بازار آخرت ہو انشاء اللہ یہ سکے وہاں چلیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس طرح سے آپ جو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں تو یہ نہ سمجھئے کہ یہ سوال بیکار جا رہا ہے دل سے طلب کیجئے اور شرائط طلب کے ساتھ سوال کیجئے تو دیر یا سویر دعا ضرور قبول ہوگی اللہ تعالیٰ کریم ہیں انھوں نے دعا کرنے کا حکم فرمایا ہے پھر قبول نہ فرمائیں گے؟ ع

در کریم سے سائل کو کیا نہیں ملتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے رزق طیب کا سوال فرماتے تھے علم نافع کا سوال فرماتے تھے اور عمل مقبول کا سوال فرماتے تھے۔ پس جس طرح اور امور کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں اسی طرح رزق کی بھی ہو جائے گی دعا کا چرچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خوب ہی خوب تھا چنانچہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرتے تھے تو آپ کھانا کھانے کے بعد ان کو جو دعا دیتے تھے بس وہی ان کا مطلوب ہوتا تھا صحابہ خوش ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کیا مل گئی کہ بس سب کچھ مل گیا۔ اس قدر آپ کی دعا پسند ہوتی تھی کہ صحابہ اسپر قربان ہی تو ہو جاتے تھے۔ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانتے ہو کیا ہے؟ یہی اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا۔ جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے قرب کا، جنت کا، وہاں کے دوام کا سوال فرمایا

ہے اسی طرح سے آپ نے روزی کا بھی سوال کیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں صحابہ کا یہ حال تھا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جاتا تو اس کا بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے تھے۔ نمک گھٹ جاتا تو اسکو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اسلئے یہ حضرات نمک اور جوتے کا تسمہ حاصل کرنے میں بھی اپنے کو مستقل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خدا کا محتاج جانتے تھے اور خواہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی ہر ایک کا سوال کرتے تھے بس یہی سوال اور اللہ تعالیٰ کی جانب افتقار و احتیاج ان کا سب سے بڑا عمل تھا۔

ایک مولوی صاحب جوکہ حضرت مولاناؒ کے شاگرد تھے لکھنؤ پہونچے وہاں ایک انگریز افسر سے ملے اور کہا کہ کیا مولویوں کے لئے آپ کے یہاں جگہ نہیں ہے؟ اس نے کہا مولانا! آپ کے لئے بہت جگہیں ہیں لیکن ہماری ملازمت آپ کو کچھ زیب نہیں دیتی۔ آپ جیسے لوگوں کے لئے تو بس یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد میں رہیں یا مدرسہ میں تعلیم دیں اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں اس کے بعد اُسنے اپنے خانساماں سے اشارہ کیا کہ مولانا کی خدمت میں پچاس روپیہ نذرانہ پیش کرو۔ اور خانساماں کے ہاتھ سے لیکر خود اپنے ہاتھ سے نہایت ادب سے پیش کیا۔ مولانا نے نہیں لیا کہا کہ ابھی تو آپ نے فرمایا ہے کہ بس مسجد اور مدرسہ کی نوکری ہمارے لئے ہے تو اب تو ہم مسجد ہی میں جاکر بیٹھیں گے اور خدا جو دے گا اس پر صابر و شاکر رہیں گے اس لئے اس سے معاف رکھئے۔ ان عالم صاحب نے اپنے اس استغناء سے مسلمانوں کی عزت رکھ لی ۔ سبحان اللہ لیکن حضرت مولاناؒ فرماتے تھے کہ میں ہوتا تو لے لیتا اور یہ سمجھتا کہ نوکری منظور ہوگئی ہے اور یہ پیشگی اسی کی پہلی قسط ہے ایک کافر بدون طلب کے دے رہا ہے اور اس طرح ادب و احترام کے ساتھ دے رہا ہے اور جملہ شرائط ہدیہ محفوظ ہیں پھر اس کے منجانب اللہ ہونے میں کیا کلام ہے؟؟

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

وہ مولوی صاحب ناقص تھے اس لئے بات کو سمجھ نہ سکے اسکو واپس نہ کرنا

چاہیئے تھا عارف ہوتے تو سمجھ میں آجاتا کہ یہ خدائی انتظام ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اللہ پہ نظر رکھنا توکل ہے باقی ان ہی سے سوال کرنا یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔ جس طرح اور اسباب کا اختیار کرنا خلاف توکل نہیں ہے اسی طرح سے دعا کرنا اور سوال کرنا بھی توکل کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ توکل کے معنیٰ ہیں اسباب سے نظر اٹھ جانے کے نہ یہ کہ اسباب ہی نہ اختیار کرنے کے۔ لہذا اسباب تو اختیار کیا جائے گا مگر نظر مسبب الاسباب یعنی حق تعالیٰ پر رکھنی ہوگی۔ بسا اوقات صحیح بات نہ جاننے کی وجہ سے انسان بڑی گڑبڑی کر لیتا ہے۔

ایک بزرگ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ جو کا آٹا جو استعمال ہو رہا ہے وہ چھانا نہ جائے اسلئے کہ صحابہ رضؓ کا معمول آٹا چھاننے کا نہ تھا بس منہ سے پھونک دیتے تھے جو بھوسی اُڑجاتی اُڑجاتی اور جو رہ جاتی رہ جاتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس سے سب گھر والوں کے پیٹ میں درد پیدا ہوگیا ایک طرف سے سب بیمار ہوگئے مصیبت ہوگئی۔ ان بزرگ کو تنبیہ ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بے ادبی ہوگئی معاف فرمائی جائے۔ حضرات صحابہ دوسرے ہی لوگ تھے انکی ریس ہم کو نہیں کرنی چاہیئے۔ بڑی جرأت اور جسارت کی بات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں اور گھر میں کہلا بھیجا کہ کہدو کہ آٹا چھان کر روٹی پکائی جائے۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا رزق اور ذریعۂ رزق الگ الگ رکھا ہے۔ لباس مختلف بنائے ہیں حضرت رحؒ فرمایا کرتے تھے لوگ موٹا کپڑا پہنتے ہیں میں اگر انھیں پہن لوں تو چبھے چنانچہ جس کیلئے جو راہ مقرر کردی وہی اسکے لئے مناسب ہے یہی خدائی تقسیم ہے ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

اب یہ جو کہہ رہا ہوں کہ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے سوال ہے یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ہوگا۔ صحابہ کرام اپنی تجارتوں اور کھیتیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کرتے تھے۔

حضرت عمر رضؓ کا اعلان تھا کہ جو شخص فقہ نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار میں نہ بیٹھے۔ چنانچہ جب اذان ہوتی تو تڑاتڑ تڑاتڑ دکانوں کے دروازے اس طرح سے بند ہوتے کہ ایک شور مچ جاتا تھا۔ سبحان اللہ ایسے تاجر تھے اور ایسی تجارت تھی رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ کے پورے مصداق تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا وصف قرآن شریف میں یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو خدا کی یاد سے مشغول نہیں کرتی۔

Scanned with CamScanner

ایک شخص اپنے یہاں کا حال بیان کرتے تھے کہ ایک صاحب گھی تولنے جا رہے تھے ترازو ابھی اٹھائی ہی تھی کہ اذان ہو گئی بس ترازو رکھ دیا اور کہا کہ سرکاری پکار ہو گئی اب نماز کے بعد لوگوں نے کہا بھی کہ اس کو تول دیجئے کہا نہیں بس۔ اب نماز کے بعد۔ اس قدر اہتمام تھا نماز کا اور تجارت بھی کرتے تھے کبھی آپ کے تاجر ایسے بھی ہوتے تھے حضرت ؒ سے سنا فرماتے تھے کہ ایک انگریز کسی بزرگ کے یہاں گیا اثناء گفتگو میں اس نے یہ دریافت کیا کہ حضرت آپ کھاتے کہاں سے ہیں ؟ یعنی ذریعۂ معاش آپ کا کیا ہے ؟ انھوں نے فرمایا کہ اس کا جواب کل دونگا چنانچہ وہ پھر آیا اور پانچسو روپیہ ہدیہ میں پیش کیا اور اپنے سوال کے جواب کا منتظر رہا ان بزرگ نے دیکھا کہ یہ سمجھا نہیں۔ تو فرمایا کہ جواب تو اپنے سوال کا آپ نے خود ہی دے لیا بس اسی طرح سے کھاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے دل میں ڈال دیتے ہیں وہ دے جاتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والے ہیں اور اس کے طریقے عجیب و غریب ہیں۔ لوگوں نے پتھر کو توڑا دیکھا کہ اس کے اندر ایک چیونٹی بیٹھی ہے اور اسکے منہ میں دانہ موجود ہے اور بظاہر پتھر میں کسی طرف کوئی سوراخ وغیرہ بھی نہ تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت ہے اسی طرح سے وہ اپنے بندوں کو روزی دیتا ہے۔ روزی کا معاملہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے متعلق ہے اس میں عقل و ہنر کو دخل نہیں ہے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گر روزی بہ دانش در فزودے ز ناداں تنگ تر روزی نہ بودے
بناداں آنچناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند

یعنی روزی اگر عقل سے ملا کرتی تو نادان اور بے عقل سے زیادہ پریشان حال اس بارہ میں کوئی دوسرا نہ ہوتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نادان کو ایسے طریقوں سے روزی پہونچاتا ہے کہ دانا اور عقلمند اسے دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے۔

اس پر ایک اور واقعہ سنئے ! اس کو پہلے بھی سنا چکا ہوں ایک بزرگ نے ایک صاحب کو کام کرنے کے لئے دہلی بھیجا جب متعین ہو گئے تو گئے۔ یہ حضرات اسے تھوڑا ہی دیکھتے تھے کہ کہاں رہیں گے ؟ کیا کھائیں گے۔ جب شیخ نے فرما دیا کہ فلاں جگہ جاؤ بس چلے گئے۔ چنانچہ جا کر جامع مسجد میں ٹھہرے کئی وقت فاقہ ہوا کسی نے پوچھا تک نہیں مگر ہٹے نہیں ڈٹے رہے۔ بالآخر ایک دن ایک شخص گرم گرم بریانی قاب میں لایا اور خدمت میں پیش کیا

اسی وقت کے بھوکے تھے وہیں کھڑے ہی کھڑے شکم سیر ہو کر کھایا کچھ بریانی بچ رہی خیال کیا کہ اس کو شام کے لئے اٹھا کر رکھ دیں مگر قاب ٹیکنا ہی چاہتے تھے کہ پھر یہ سوچا کہ اجی جس خدا نے اس وقت دیا ہے وہ شام کو بھی دیگا اس کو کسی فقیر کو کھلا دیں یہ سوچکر سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے کہ ایک مجذوب مل گیا ان کو دیکھ کر کہا کہ خوب سمجھا بے سالے خوب سمجھا ٹھہر چکی تھی کہ اگر یہ قاب ٹیک دے تو بھوکا مار دیا جائے چنانچہ پھر شام کو اسی طرح کھانا آگیا (اب کیا تھا اب تو امتحان میں پاس ہی ہو گئے تھے) تازہ بتازہ نوع بنوع دونوں وقت کھانا آتا رہا۔

رزق کا معاملہ بھی عجیب ہے جو اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیتا ہے وہ مزے میں ہے اور جو لوگ اس کو اپنے قوت بازو کا ثمرہ سمجھتے ہیں وہ پریشان رہتے ہیں۔

ایک بزرگ تھے ان کا کوئی معاملہ خدا سے تھا وہ یہ کہ عہد کیا تھا کہ کسی کی جانب ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ ایک دفعہ ایک باغ میں سیر کر رہے تھے ایک پھل کی جانب بلا اختیار ہاتھ بڑھا دیا۔ اتنے میں پولیس کی دوڑ آگئی اس باغ میں ڈاکو بھی ٹھہرے ہوئے تھے اس شبہ میں ان بزرگ کو بھی پکڑے گئے اور کوتوال نے ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیدیا چنانچہ ایک ہاتھ کاٹ بھی دیا گیا۔ دوسرا کاٹنے جارہے تھے کہ سامنے سے ایک شخص گھوڑے پر سوار چیختا ہوا آتا نظر آیا کہ ہائیں ہائیں ان کا ہاتھ نہ کاٹو یہ چور نہیں ہیں یہ تو فلاں بزرگ ہیں۔ وہ بزرگ مشہور تھے کوتوال بھی انکا نام سُنے ہوئے تھا۔ جب یہ معلوم ہوا تو قدموں پر گر گیا کہ حضرت بڑی غلطی اور گستاخی ہو گئی معاف فرما دیجئے۔ فرمایا کہ بھائی تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے مجرم میں ہی ہوں میں نے اپنے خدا کے عہد کے خلاف کام کیا ہے اس کی سزا میں اگر میرا سارا بدن بوٹی بوٹی کر کے رکھ دیا جاتا تو میں اس کا مستحق تھا یہ تو کچھ نہیں ہوا۔

پھر اس کے بعد سے ان بزرگ کے ایک ہاتھ میں پٹی بندھی رہتی تھی اور کوئی شخص ہمت نہ کرتا کہ پوچھتا حضرت یہ کیا ہوا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ہمت کر کے دریافت کیا تو فرمایا کچھ نہیں یَدٌ جَنَتْ فَقُطِعَتْ یہ ایک ہاتھ تھا جس نے کہ جنایت کی اسکی پاداش میں کاٹ دیا گیا۔

یہ بزرگ کچھ ٹوکری وغیرہ بھی بناتے تھے اور بازار میں فروخت کر کے اسی سے اپنا کام چلاتے تھے۔ چنانچہ اُن کی کرامت سے تنہائی میں ان کا وہ ہاتھ بھی درست ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا سب کام ٹھیک سے کر لیتے تھے اور لوگوں کے سامنے ایک ہی رہتا تھا

Scanned with CamScanner

ایک دن ایک شخص بغیر اطلاع و اجازت کے ان کے مکان کے اندر گھس گیا جہاں وہ تنہائی میں کام کرتے تھے دیکھا تو دونوں ہاتھ صحیح و سالم ہیں اس نے باہر آکر شور مچادیا کہ لوگو! ان کی کرامت سنو! تنہائی میں ان کے دونوں ہاتھ درست ہوجاتے ہیں اس کو دیکھ کر ان بزرگ کو رنج ہوا کہ خواہ مخواہ میرا راز اس نے افشا کردیا اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع ہوئے کہ یا اللہ اس میں کیا راز ہے جب میرا ہاتھ کٹا تو میں نے خیال کیا کہ لوگ مجھے اب چور سمجھ کر چھوڑ دیں گے مجھے مخلوق سے فرصت ملے گی آپ کی یاد کا موقع زیادہ ملے گا اور آپ نے مجھے کرامت سے نوازا تو میرا اس سے کچھ نقصان بھی نہ تھا لیکن اس شخص نے راز کو ظاہر کرکے مخلوق کو اور زیادہ متوجہ کردیا الہام ہوا کہ تم کو لوگ چور سمجھنے لگے تھے یہ مجھے پسند نہ ہوا۔ تم نے ہمارا قصور کیا تھا ہم نے سزا دیدی ہم جانیں تم جانو مگر یہ مخلوق تم کو جب برا سمجھنے لگی تو ہم نے اپنا آدمی (فرشتہ) بھیج کر تمہاری کرامت کی تشہیر کرادی تاکہ میرے دوست کو دوسرا کوئی برا نہ سمجھے۔ سبحان اللہ ایسی بندہ نوازی ہے ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھکو انشا ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے یہ دم بدم عنایت

یہی کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ ایسا اور ان کی رزاقیت ایسی ہے پھر لوگ اگر ان سے ہی سوال کریں تو کیا ساری دنیا کو روزی ملیگی اور یہی شخص محروم اور بھوکا رہے گا ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ ان سے نسبت اور تعلق پیدا کرو پھر ان کا معاملہ دیکھو اب مخلوق پر نظر رہتی ہے اور چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو متوکلین علی اللہ کے ساتھ ہوتا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے کچھ اپنے حالات بیان کررہے تھے حضرت سنتے رہے اسی سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ حضرت فلاں شخص نے کہا تھا کہ تم کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ لے چلیں گے حضرت حاجی صاحبؒ نے ڈانٹ کر اٹھادیا کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں مت کرو (مطلب حضرتؒ کا یہ تھا کہ خدا جو چاہتا ہے ہوتا ہے اس پر نظر رکھنی چاہئے اور اسی سے اپنی ہر حاجت کہنی چاہیئے نہ زید، عمرو سے نہ کہنا چاہیئے اور نہ ان پر اتکال کرنا چاہیئے غیر اللہ پر توکل ہی شرک ہے)

میں نے آپ کے سامنے مثنوی سے جوان والا قصہ جانتے ہیں کیوں بیان کیا۔ جنت کے لئے پڑھا ہے یعنی جنت حاصل کرنے کے لئے۔ ہم اگر کوشش نہیں کرسکتے تعب نہیں برداشت کرسکتے مجاہدہ نہیں کرسکتے تو کم از کم دعا ہی کریں۔ یعنی جس طرح اس جوان نے کہا تھا کہ ؎

Scanned with CamScanner

روزی خواہم بناگہ بے تعب کہ ندارم من زکوشش جز طلب

اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ؎

جنتے خواہم بناگہ بے تعب کہ ندارم من زکوشش جز طلب

آخر جنت بھی تو ایک رزق ہی ہے پس جس طرح سے اللہ تعالیٰ سے دنیوی رزق کا سوال کرتے ہیں جنت کا بھی کرتے ہیں، کیونکہ کہہ چکا ہوں کہ جنت تو محض فضل سے ملے گی۔ اور مومن کا سوال اور پھر جنت کا سوال اور مالک جنت سے اور اپنے خالق سے بڑا سوال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سوال کیا فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَاقَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْعَمَلٍ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ جنت کے وارث ہونے کی دعا فرمائی۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ اس سے بڑھکر آپ اور آسان چیز کیا چاہتے ہیں۔ صرف زبان سے کہنا کیا مشکل ہے جتنا زیادہ سوال اللہ تعالیٰ سے کروگے اسی قدر نسبت قوی ہوگی اور اتنا ہی ایمان اور یقین بڑھے گا۔ ملتے مانگتے خود سوال سے اور مسئول عنہ سے ایک نسبت ہوجائے گی۔ مگر کیجئے تب اس کا فائدہ دیکھئے۔ اور اس کی فکر نہ کیجئے کہ قلب شامل نہیں ہے ابتدا میں نہ ہوگا جانے دیجئے آگے چل کر وہ بھی شریک ہوجائے گا یہاں تک کہ ابھی تو زبان پر پہلے آتا ہے پھر قلب تک پہونچتا ہے۔ بعد میں پہلے قلب میں آوے گا اور وہاں سے زبان پر آوے گا اور قلب میں ایک تقاضا پیدا ہوگا کہ اس کو زبان سے بھی کہا جائے اور جب تک زبان سے آکر کہہ نہ لیگا تسلی نہ ہوگی

اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرنے کو جو میں کہہ رہا ہوں یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِی الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ یعنی دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر تو ہلکے پھلکے ہیں میزان میں وزنی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ہی محبوب ہیں۔ وہ کیا ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

اسی طرح سے یہ دعا کرنا بھی ہے کہ دیکھنے اور لفظوں میں تو نہایت آسان ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا وزن بہت ہے۔ کاش آپ اس کو سمجھتے۔

Scanned with CamScanner

(مجلس ہفتم)

بسلسلہ وصیۃ السنۃ

فرمایا کہ میں کل جو مضمون بیان کر رہا تھا اللہ تعالیٰ سے جنت کے سوال کے متعلق اسی کو آج پھر بیان کروں گا۔ ایک بات یاد آگئی اس کو بھی سُن لیجئے میں ایک مرتبہ مسوری گیا ہوا تھا میرے ایک ساتھی شاہ صاحب اور خواجہ صاحب بھی ہمراہ تھے میرے پیر میں کچھ تکلیف تھی جس کی وجہ سے چلنے میں اور پہاڑ پر چڑھنے میں مجھے تکلف ہو رہا تھا اور راستہ بھی ایسا تھا کہ اگر ذرا قدم پھسلے تو آدمی نیچے دور جا گرے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اپنے دل میں کہا کہ جب ساتھ پکڑا ہے تو جہاں تم لیجاؤ گے چلیں گے۔ خواجہ صاحب جوان آدمی تھے سب سے آگے آگے رہتے تھے شاہ صاحب سب میں بوڑھے تھے سب سے پیچھے رہ جاتے تھے۔ ہموار زمین ملتی تو بڑھکر پھر ساتھ پکڑ لیتے خواجہ صاحب کے تیز چلنے پر خفا ہوتے اور کہتے کہ خواجہ صاحب تم دوست نہیں ہو دشمن ہو آگے بڑھ جاتے ہو ہماری رعایت نہیں کرتے اس طرح سے سیر کرنے سے کیا فائدہ دلچسپی ختم ہو جاتی ہے جب اس طرح سے شاہ صاحب خوب خفا ہوئے تو خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ ایک شعر پڑھ دیا ؎

یہ رونا کج ادائی کا یہ شکوہ بے وفائی کا سزا ہے دل لگانے کی مزا ہے آشنائی کا

شاہ صاحب صاحب حال بزرگ تھے اسے سُن کر اس زور سے چیخے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ پر سے ہی گر جائیں گے کہنے لگے کہ اچھا اب کچھ شکایت نہیں ہے جو چاہو کرو سب گوارا ہے جس طرح سے چاہو چلو اب ہم کچھ نہ کہیں گے۔

انھیں شاہ صاحب کا واقعہ ہے کہ کسی نے ان کے سامنے خوش الحانی کے ساتھ ایک مرتبہ یہ شعر پڑھ دیا تھا ؎

میں بھی اس پر مرتا ناصح تو کیا بیجا کیا اک مجھے سودا اٹھا دنیا بھر تو سودائی تھی

یہ سُن کر شاہ صاحب بڑی زور سے چیخے معلوم ہوتا تھا کہ چھت ہی گر جائیگی اور وہاں سے اٹھ کر

یہ جادہ جا اپنے حجرہ میں چلے گئے۔
یہاں بھی ایک صاحب اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ وطن میں گھر سے باہر بستی میں گیا تھا کہ یہی شعر یاد آگیا اس کے ساتھ مترنم ہوا جس کی وجہ سے ایسی محویت ہوئی کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا میں کہتا ہوں کہ یہاں گھر سے مراد دار دنیا ہے اس کو بھول جانا ہی اچھا ہے ورنہ تو ہمارا گھر جنت ہے جس کی طرف سے آج ہم غافل ہیں چنانچہ جو اصلی چیز ہے اسکی جانب لوگ آتے ہی نہیں اور دوسری دوسری غیر ضروری چیزوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ دو آدمی بھی کام کے نہیں نکلتے ہیں ورنہ اگر دو چار آدمی بھی بات کو سمجھ لیں تو کام چل پڑے۔

اب سنئے! جنت کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ جنت کے بہت سے موجب اور بہت سے اسباب ہیں جن میں قول بھی ہے عمل بھی ہے۔ اسی طرح دوزخ میں لیجانے والے بھی بہت سے قول ہیں اور بہت سے عمل ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کو بہت آسان کر دیا ہے وہ یہ کہ جنت کا سوال کر کے امت کو یہ تعلیم دی کہ دیکھو اس کے حاصل کرنے کا سب سے سہل اور آسان طریقہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا ہے کیونکہ جب ایک چیز کا بندہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے گا تو کبھی نہ کبھی تو اس کی دعا قبول ہو ہی جائے گی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چوں نشینی بر سر کوئے کسے   عاقبت بینی تو ہم روئے کسے
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے   عاقبت زاں در برون آید سرے

یعنی جب تم کسی کے دروازے کے سامنے بیٹھو گے تو ایک نہ ایک دن کسی کی صورت دیکھ ہی لوگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم کسی کے دروازے کو کھٹکھٹاؤ گے تو بالآخر کوئی نہ کوئی شخص باہر آویگا ——— میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بار بار جنت کا سوال کرنا اور زبان ہی سے یہ کہنا کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ یہی دروازہ کھٹکھٹانا ہے ایک نہ ایک دن اسکی اجابت ہو ہی جائے گی کیونکہ سوال ایسی ذات سے ہے جس کی جنت ہے اور سوال جنت کا ہے جو مؤمنین ہی کے لئے بنائی گئی ہے پھر اللہ تعالیٰ کریم ہیں اور کریم اپنے در سے سائل کو محروم نہیں لوٹاتا جب بندہ اپنے اعمال سے صرف نظر کر کے محض اللہ تعالیٰ کے فضل کا طالب ہوگا تو اللہ تعالیٰ ضرور اپنا فضل فرمائیں گے چنانچہ جنت میں جو لوگ بھی جائیں گے وہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے جائیں گے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں

نہ جاویگا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں میں بھی۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانک لے۔ اس لئے دعا کو اور سوال کو جنت کے حصول کا سب سے آسان ذریعہ کہا گیا ہے ورنہ تو کتاب سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے لئے موجب بہت سی چیزیں ہیں مثلاً جنت کے اعمال میں سے ایک نماز ہی ہے اس کو مفتاح الجنۃ کہا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح جنت کی مفتاح نماز ہے اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ السُّؤَالُ یعنی جنت کی کنجی اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا بھی ہے اس لئے کہ جنت بھی انھیں کی ہے اور سوال بھی انھیں سے ہے اور مالک کو اپنے مملوک میں تصرف کا کامل اختیار ہوتا ہی ہے اللہ تعالیٰ جسے کچھ عطا فرمانا چاہیں تو کوئی منع کرنے والا نہیں اور جس سے کوئی چیز روک لیں اُسے کوئی دینے والا نہیں

پھر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا دلیل ہے احتیاج کی اور اسکی کہ جو چیز طلب کر رہا ہے اس کا یہ بندہ خواہشمند اور مشتاق ہے چنانچہ آخرت میں اسی سوال کرنے کی وجہ سے جنت بارگاہ خداوندی میں سفارش کرے گی کہ یا اللہ یہ میرا مشتاق اور طالب تھا لہذا آپ اس کو جنت میں داخل کر دیجئے نیز جنت بھی اپنے طالبین کی مشتاق ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت حضرت علی رضؓ اور حضرت عمار رضؓ وغیرہ کی مشتاق ہے اور رغبت ایک طرف سے نہیں ہوا کرتی بلکہ جانبین سے ہوا کرتی ہے چونکہ وہ لوگ جنت کے مشتاق تھے اس لئے جنت بھی ان کی مشتاق ہوئی معلوم نہیں ان حضرات نے کس طرح سے جنت کو یاد کیا تھا کہ جنت بھی انھیں یاد کرنے لگی۔

یہی حال دوزخ کا بھی ہے کہ آپ یہ دنیا میں اس سے جو پناہ مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں اس سے حفاظت کا جیسا کہ حدیث شریف میں دعا آئی ہے اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ تو اسکی وجہ سے دوزخ بھی سفارش کرے گی کہ یا اللہ یہ مجھ سے دنیا میں پناہ مانگتا تھا لہذا آپ اسے پناہ دیدیجئے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا اور مانگنا حصول مقصد کا ایک بڑا ذریعہ ہے لوگوں نے بڑی بڑی چیزوں کا سوال کیا ہے اور وہ انھیں ملی ہیں کسی نے ایک لاکھ روپیہ مانگا ہے تو وہ بھی ملا ہے۔ کریم کو سب سے زیادہ پسند جو چیز ہے وہ سوال ہی ہے دنیا میں دیکھ لیجئے کوئی شخص سخی ہوتا ہے اور لوگ اس سے سوال کرتے ہیں تو وہ ان کے مانگنے پر اپنا خزانہ خالی کر دیتا ہے اب دیکھ لو معاملہ کتنا آسان ہے جب بندہ کا مانگنا خدا کو پسند ہے تو کیوں نہ اس سے جنت ہی کا

سوال کیا جائے۔ عربی میں اگر آپ کو دعا یاد نہیں ہے تو اردو ہی میں مانگئے کہ یا اللہ جنت دیجئے جنت ہی میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے مگر یہ بات کبھی ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی کہ اللہ سے اُسے طلب کرنا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ سوال کرنے کو کچھ سمجھتے ہی نہ ہوں گے یا حقیر عمل سمجھتے ہوں گے یہی شیطان کی رہزنی ہے کہ جو عمل نہایت آسان اور سہل تھا جس میں وضو اور وقت کی بھی کوئی قید نہیں تھی اس نے اس کو بے وقعت کر دیا اور جو بڑے بڑے اعمال ہیں ان کے کرنے کی آپ کو ہمت نہیں پس اِدھر سے بھی گئے اور اُدھر سے بھی گئے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کو شعراء نے شعر سنایا ہے اس پر انھوں نے گھوڑا جوڑا اور نہ جانے کیا کیا دیا ہے جو شخص وسعت والا ہوتا ہے اور سخی ہوتا ہے اسے سوال پسند ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کوئی مجھ سے مانگے اور میں اسکو دوں۔

یہی حال اہل اللہ کا بھی ہوتا ہے کہ وہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے پاس جو دولت ہے اُسے عہ کوئی مانگے۔ چنانچہ ایک بزرگ اپنی آخر عمر میں افسوس کرتے تھے کہ کھانا پکا پکایا تیار ہے کوئی کھانے والا نہیں۔ اہل سخا کو کسی کو کچھ دینے میں اور کھلانے پلانے میں ایک حظ ملتا ہے۔ میں زمانہ طالب علمی میں مدرسہ میں دیکھتا تھا کہ آئے دن دعوت ہو رہی ہے۔ میں دعوتوں میں تو جاتا نہ تھا۔ ایک دفعہ اسٹیشن سے آرہا تھا راستہ میں ایک شخص نے پکڑ لیا اپنے گھر لے گیا اور وہیں باہر کرے میں بٹھا کر اور گھر کے اندر سے سالن کی ہانڈی، دیگچی، رکابی، روٹی کا ڈبہ سب لا کر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ لیجئے مولانا صاحب نوش فرمائیے دست خود دہان خود۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب اور تھے وہ بھی پرے خیال کے تھے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ سب دعوتوں کا انکار تھوڑے ہی کرتے ہیں ایسی دعوت کوئی کرے تو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس بیچارے نے بڑی عزت کیساتھ ہم لوگوں کو کھانا کھلایا۔

اسی طرح دہلی کے ایک صاحب سال میں ایک دفعہ طلبا کی دعوت کیا کرتے تھے اس طرح کہ دہلی سے سب چیزیں لاتے۔ عشاء کے بعد سے کھانا پکتا تھا اور صبح آٹھ بجے سے کھانا شروع کر دیتے بہت اہتمام کرتے تھے اور بہت احترام سے کھلاتے تھے۔ ہم لوگ کہتے تھے کہ ہاں یہ ہے دعوت کیونکہ طالب علموں کو حقیر نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا بہت ادب کرتے تھے اور نہایت محبت سے کھلاتے تھے۔ کھانا کھلاتے وقت برابر خود بھی ٹہلتے رہتے تھے۔ یہ اس پر سنا رہا ہوں کہ جو لوگ اس مزاج کے ہوتے ہیں انھیں کھلانے ہی میں لطف آتا ہے۔

(حاشیہ) عہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ مجھ سے بھی جب کوئی شخص دینداری کی دعا کراتا ہے تو مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کو بھی یہ پسند ہے کہ بندہ اُن کی جانب اپنی حاجت کو پیش کرے اور اُن سے سوال کرے۔ یہ سوال بڑی چیز ہے۔ اہل حوصلہ اسکی قدر کرتے ہیں۔ اور اگر کسی نے کسی سائل کے سوال کی ناقدری کی ہے تو اس کے وبال میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ایک شخص نے ایک دروازہ پر جاکر سوال کیا اندر سے ایک عورت اس سائل کو دینے کے لئے آئی اور روتی ہوئی گھر کے اندر واپس گئی اس کے شوہر نے پوچھا کیا بات ہے اُس نے کہا باہر جو فقیر آیا ہے وہ میرا پہلا شوہر ہے میرے حقوق (نان نفقہ) ادا کرنے کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے مجھے طلاق دیدی تھی جس کے بعد میں تمہارے نکاح میں آئی۔ اس نے کہا ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ کون شخص ہے دیکھ کر کہا کہ ارے مجھے یاد آیا میں فقیر تھا اور اس کے دروازہ پر بھیک مانگنے گیا تھا اور اس سے سوال کیا۔ اس پر اُس نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ بد اخلاقی ناگوار گذری چنانچہ اس کی بیوی اور اس کا مال تو مجھے عطا فرمادیا اور میرا فقر اُسے دیدیا

میں نے یہ واقعہ ایک دفعہ وعظ میں ایک جگہ بیان کیا تھا۔ ایک امیر شخص تھا اُس پر اثر ہو گیا تھا۔ وعظ تک تو پہلو بدلتا رہا بعد میں مجھ سے کہا کہ بات سمجھ میں آگئی چنانچہ پھر اسکی حالت بدل ہی گئی۔ میرے پاس آنے جانے لگا۔ میں نے کہا یہ دنیا کسی کی نہیں ہوتی آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے پاس ہے۔ رہنے والی چیز تو بس جنت ہے کہ جب کسی مؤمن کو مل جائے گی تو پھر چھینی نہیں جائے گی۔ اس واقعہ سے آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ سوال بڑی چیز ہے۔ آپ سے کہتا ہوں کہ کیا اس کا احترام نہ کیجئے گا۔ اگر اس کا احترام نہیں کرو گے تو کچھ اور نقشہ دیکھو گے۔ پس جب سوال ایسی بڑی چیز ہے تو پھر اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

خلاف طریقت بود کاولیاء　　　تمنا کنند از خدا جز خدا

یعنی طریقت کے خلاف یہ بات ہوگی کہ اللہ والے اللہ تعالیٰ سے اُن کی ذات کے سوا کسی اور چیز کا سوال کریں اس شعر کے خلاف ہے یہ تعلیم (حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کیا ہے)

اس کے متعلق کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال غیر خدا کا سوال ہی نہیں ہے کہ طریقت کے خلاف ہو اس لئے کہ جنت کا سوال انھیں کے حکم سے ہے اِس لئے کہ

Scanned with CamScanner

ارشاد فرماتے ہیں وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ یعنی سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی جانب۔ پس یہ حضرات جنت کا سوال از خود نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ خدا کا حکم ہے۔ نیز اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا محل ہے

ع عاشقاں جنت برائے دوست میدارند دوست

اب جبکہ اللہ تعالیٰ ہی جنت کی طرف دوڑا رہے ہیں تو پھر اس سے صبر کرنا اور زہد اختیار کرنا جائز نہیں ہے ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں

یعنی جب دین کے سلطان ہی ہم سے طمع کے خواہشمند ہوں تو اب اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ڈالنی چاہیے، جن لوگوں نے جنت سے زہد اختیار کیا ہے وہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے سنت کے خلاف ہے۔ انبیاء علیہم السلام باوجودیکہ مقام قرب میں ہوتے ہیں مگر انھوں نے اللہ تعالےٰ سے جنت کا سوال کیا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ حضرتؒ فرماتے تھے کہ لوگوں کو دس روپیہ سے تو صبر نہیں ہے اور چلے ہیں جنت سے صبر کرنے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف بہت سی باتوں میں لگے ہوئے ہیں اور یہاں جب وہ سوال چاہتے ہیں تو اسمیں سے لگے زہد اختیار کرنے جنت سے زہد اختیار کرنا عبدیت کے خلاف ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ عبد کامل ہوتے ہیں اس لئے جہاں ان حضرات نے حصول جنت کے لئے اور عبادت کی ہے وہیں سوال بھی ہے اور جس طرح جنت اس لئے مطلوب ہے کہ محل وصال محبوب ہے اسی طرح مؤمن کو نماز بھی اس لئے محبوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ یعنی اللہ تعالےٰ کی عبادت اس طرح سے کرو کہ گویا انھیں دیکھ رہے ہو جس عبادت کا اسمیں تذکرہ ہے اس کا فرد اعلیٰ نماز ہی ہے چنانچہ جنت میں مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی جو رویت ہوگی تو اس کی استعداد نماز ہی سے ہوتی ہے۔

آپ مشکل چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن آسان کو نہیں لیتے جس طرح سے کہ ایک طالب علم مجھ ہی سے کہتا تھا کہ مشکل مشکل باتیں تو میری سمجھ میں آجاتی ہیں لیکن آسان نہیں آتیں میں نے اسے ڈانٹ کر بھگایا اور کہا کہ جب آسان کو نہیں سمجھے تو مشکل کو کیا سمجھو گے نہ تم

Scanned with CamScanner

آسان ہی کو سمجھتے ہو نہ مشکل کو سمجھتے ہو۔ سب سے بڑا اور آسان ذریعہ سوال ہی ہے۔

حضرت مولاناؒ ایک امیر کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ اپنے لڑکے کے بارے میں کہتا تھا جو ذرا دیندار تھا اور دیر دیر تک دعا مانگتا تھا کہ اس سورے کو دیکھو ہاتھ پھیلا پھیلا کر کیا مانگے ہے اس کے پاس کمی کس چیز کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ روپیہ پیسہ موجود ہو مگر شاید وہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگتا ہو محض روپیہ اور دولت کا پاس ہونا جنت سے کیسے بے نیاز کر دے گا جنت کی استعداد نماز سے بھی ہوتی ہے اسی لئے نماز کو جنت کی کنجی کہا گیا ہے اسی طرح سے جنت کی کنجی سوال بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے اور سائلین کے توسط اور وسیلہ سے سوال کیا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْكَ فَاِنَّ لِلسَّائِلِ عَلَیْكَ حَقًّا اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان لوگوں کے وسیلہ سے جو تجھ سے سوال کرنے والے ہیں اس لئے کہ سائل کا آپ کے اوپر حق ہوتا ہے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سائلین کے وسیلہ سے سوال فرما رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ سائل کا آپ پر حق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سائل اور اس کے سوال کا حق ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی ابواب بر جو شمار فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سائلین کو مال دیا جائے قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۝ یہاں السائلین کے تحت صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ای الطالبین للطعام یعنی وہ لوگ جو کھانا طلب کرتے ہیں چاہے وہ اغنیاء ہی کیوں نہ ہوں اس لئے کہ جب انھوں نے سوال کر لیا تو اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ان کی ضروریات کو کافی نہیں اور اگر وہ سائل فقیر ہو پھر تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور ظاہر یہی ہے اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَاِنْ جَاءَ عَلٰی فَرَسٍ یعنی سائل کا ایک حق ہوتا ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو اس لئے گھوڑے پر آنے والا اکثر وبیشتر غنی ہی ہوتا ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ سائلین سے مراد یہاں وہ ساکین ہیں جو سوال کرتے ہیں پس ان کا حال ان کے سوال سے معلوم ہوتا ہے یعنی اگر وہ سوال نہ کریں تو کوئی ان کو حاجتمند نہ سمجھے اور پہلے جو مساکین آیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی زبان سے سوال نہیں کرتے بلکہ انکی حالت ہی ان کی حاجت کی ترجمان ہوتی ہے اگرچہ بظاہر وہ امیر معلوم ہوتے ہوں اس قول پر جب کہ سائل سے مراد مسکین کے ہوئے تو پھر حدیث میں جو قید لگائی ہے کہ اگرچہ وہ گھوڑے

پر سوار ہو کر آئے اس کا تو کچھ فائدہ ظاہر نہیں ہوا تو اس کے متعلق صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ حق سائل کی اعانت کی تاکید مقصود ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ سوال بھی سبب استحقاق ہوتا ہے اگرچہ کسی غنی ہی کی جانب سے کیوں نہ پایا جائے جس طرح سے کہ قرابت اور یتیم ہونا سبب استحقاق تھا مطلب یہ ہوا کہ ابن سائل سے مراد اگر وہ مسکین ہی لیا جاوے جس کا فقر اس کے سوال کرنے سے معلوم ہوا تو اس شخص کے اندر جہت استحقاق دو پائی گئی ہے۔ ایک غربت دوسرا سوال اور انمیں سے ایک بھی اسکو مال دیئے جانے کی متقاضی ہے چہ جائیکہ دونوں بلکہ سوال کے بارے میں یہ فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی غنی بھی کریگا تو مال پانے کا مستحق ہو جائے گا اس لئے کہ اس کا سوال کرنا بتلا رہا ہے کہ اسکے پاس جو مال ہے وہ اسکی ضروریات کو کافی نہیں

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح سے ایک شخص جنت کے لئے بہت عمل کر رہا ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال بھی کر رہا ہے تو اسمیں کیا حرج ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص آنے کو تو گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اور سوال کر رہا ہے یعنی جس طرح اس کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ غنی ہے اس کو مال دینا جائز نہیں لیکن سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین ہے قابل امداد ہے اسی طرح سے جو شخص عمل کر رہا ہے تو اس کے عمل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن جب ساتھ ہی ساتھ وہ سوال کر رہا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسکی نظر اپنے اعمال پر نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کر رہا ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا نہایت اچھا حال ہے اللہ تعالیٰ اسی توکل کی برکت سے اس کا کام بنا دیں گے (اسی مفہوم کو حضرت حافظ نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست
راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

یعنی اپنی دانش اور تقویٰ پہ بھروسہ کرنا یہ طریقت میں کفر ہے۔ راہ طریقت کے سالک کو اگرچہ وہ کتنے ہی ہنر رکھتا ہو توکل رکھنا چاہئے ——— اور یہ جو کہا گیا ہے کوئی شخص گھوڑے پر بھی سوار ہو کر آئے اور سوال کرے تو اسکو دیدینا چاہئے کیونکہ سوال دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا غناء بس ظاہری ہی ہے ضروریات کے پورا کرنے سے وہ قاصر ہے تو یہ بالکل صحیح ہے بہت سے واقعات بزرگوں کے اس پر شاہد ہیں۔ ایک بزرگ سے ایک شخص نے صدقہ کے کچھ روپئے دینے

Scanned with CamScanner

کے لئے مصرف پوچھا کہ کس کو دوں انھوں نے کہا کہ شہر پناہ کے باہر سب سے پہلے جو شخص ملے اُسے دیدو چنانچہ جو شخص سب سے پہلے ملا وہ ایک ہزار کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور ویرانہ کی طرف سے آرہا تھا اور کوئی چیز اپنے دامن کے نیچے چھپائے ہوئے تھا یہ صاحب پہلے تو رُکے کہ اتنے بڑے امیر کبیر کو صدقہ کیسے دوں لیکن پھر خیال کیا کہ عجب آدمی ہو جب شیخ نے صراحۃً کہدیا ہے کہ جو پہلا شخص ملے اس کو دیدینا تو پھر اب تمھیں اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ وہ رقم انھیں دیدی اور انھوں نے قبول بھی کرلی اسکے بعد دیکھا کہ پھر وہ اسی ویرانہ کی طرف چلے اور وہاں پہونچ کر دامن سے نکال کر کوئی چیز پھینکی اور واپس چلے آئے ۔ ان صاحب کو خیال ہوا کہ آخر یہ کیا قصہ ہے چنانچہ ہمت کرکے اُن سے پوچھا انھوں نے کہا کہ جب تم نے دریافت کیا تو سنو ! میں نے ویرانہ سے جو چیز اٹھائی تھی وہ مردار تھی اس لئے کہ میرا تین دن سے فاقہ ہے ایسی حالت میں مردار کھانا جائز ہوجاتا ہے اسی لئے آج میں نے ایک مری ہوئی چڑیا اٹھائی تھی کہ گھر جاکر کھاؤں گا لیکن جب ادھر سے لوٹا تو تم نے مجھے روپئے دیدیئے اب میرے لئے اس کا کھانا جائز نہ تھا اس لئے میں واپس جاکر پھر اُسے وہیں ڈال آیا ۔ اب انھیں پیسوں سے سامان خریدوں گا اور پکاکر کھاؤں گا باقی تم جو میرے بدن پر ایسا قیمتی کپڑا دیکھ رہے ہو تو محض آبرو بچانے کیلئے ہے تاکہ کوئی میرے ظاہر حال سے مجھے محتاج نہ جانے اور میرا حال لوگوں سے طالب مال نہ ہو ان صاحب نے جو روپیہ لیکر گئے تھے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک بزرگ کے امتحان میں پاس ہوگئے اور اپنے دل میں کہا کہ یہ بہت بڑا سبق ملا ۔ اب یہ حال ہے کہ لوگ پیر ہی کو آکر مشورہ دیتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں کہ یہ گدے پر کیوں بیٹھتے ہیں ۔ حضرت شیخ الہندؒ قالین پر بیٹھے ہوئے تھے ایک صاحب آئے اور حضرت کے قریب اسی قالین پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے آپ اس پر کیوں بیٹھتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ آپ اس پر کیوں بیٹھے ہیں انھوں نے کہا ہم تو ضرورۃً بیٹھے ہیں ۔ حضرت نے فرمایا کہ ہم بھی ضرورۃً ہی بیٹھے ہیں اس پر وہ بالکل چپ ہی تو ہوگئے اور اٹھ کر چلدیئے ۔ بزرگوں پر اس قسم کا اعتراض ہر زمانہ میں لوگوں نے کیا ہے لیکن جب حقیقت حال سے واقف ہوگئے ہیں تو اپنے اس خیال پر بہت نادم بھی ہوئے ہیں ۔ مولانا جامیؒ کا واقعہ میں نے بیان کیا تھا کہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر یہ کہہ کر ان کے یہاں سے لوٹ گئے تھے کہ

ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

(ترجمہ) یعنی وہ شخص مرد (اللہ والا) نہیں ہے جو دنیا کو دوست رکھتا ہو — لیکن جب خواجہ احرارؒ نے اس پر دوسرا مصرعہ لگا دیا کہ

ع اگر دارد برائے دوست دارد

(ترجمہ) یعنی اگر رکھتا ہے تو دوست کے لیے رکھتا ہے — تو پھر یہی مولانا جامیؒ ان سے بیعت بھی ہو گئے اور پھر حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے متعلق یہ فرمایا کہ ؎

چوں فقر اندر قبائے شاہی آمد بتدبیر عبید اللّٰہی آمد

(ترجمہ) جب فقیری و درویشی شاہی قبا میں آئی (تو یونہی نہیں بلکہ) حضرت عبید اللہ کی اصلاح و تربیت سے آئی — اللہ تعالیٰ اپنے تک سب کو پہونچاتے ہیں امیروں کو بھی پہونچاتے ہیں غریبوں کو بھی پہونچاتے ہیں یہ نہیں ہے کہ خدا تک پہونچنے کے لیے آدمی کا غریب ہونا شرط ہو لوگوں کو ان سب باتوں کا علم ہے نہیں بس جو جی میں آیا کہہ دیا جو بات اپنی عقل میں آئی دوسروں کو رائے دیدی اسی پر کبھی کبھی یہ پڑھا کرتا ہوں کہ ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

(ترجمہ) یعنی تونے تو کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو تو دیکھا نہیں بھلا تو پرندوں کی زبان کو کیا سمجھے گا

حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے یہاں ایک عورت نے اپنے لڑکے کو کر دیا ایک دن لڑکے کو دیکھنے آئی تو دیکھا کہ چنا کھا رہا ہے اور حضرت کو کہ وہ پلاؤ کھا رہے ہیں اس پر اس نے اعتراض کیا حضرتؒ نے یہ کیا کہ تمام ہڈیوں اور بوٹیوں کو جمع کر کے کہا قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ وہ مُرغ زندہ ہو کر شور کرتا ہوا بھاگا حضرتؒ نے اس بڑھیا سے فرمایا دیکھ جب تیرا بیٹا اس مرتبہ پر پہونچ جائے گا تب مرغ پلاؤ کھائے گا ابھی اسے چنا ہی کھانا پڑے گا۔ بھائی کاملین کا حکم اور ہے ناقصین کا حکم اور۔ اہل نفس کا اور حکم ہے اور جو نفس سے چھوٹ چکا ہو اس کا حکم اور لوگ دونوں میں فرق نہیں کرتے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال تو نہ کامل مخور میباش لال

یعنی اچھے کھانے کھانا اور تصوف کے نکات بیان کرنا کامل شخص کیلئے جائز ہے مگر چونکہ تم کامل نہیں ہو اسلئے تم مت کھاؤ اور اپنی زبان کو بند رکھو — اسی طرح سے ایک بزرگ دوسرے بزرگ کے مہمان ہوئے انھوں نے بیوی سے کہا کہ مرغی ذبح کرو بیوی کا کچھ منشا نہ رہا ہوگا بد دلی کے ساتھ

ذبح کیا ان بزرگ پر اسکی نیت منکشف ہوگئی۔ جب کھانا سامنے آیا تو انھوں نے بوٹیوں کی طرف منہ کرکے کہا ہُش ان کے یہ کہتے ہی سب بوٹیاں جمع ہوکر مرغی بن گئی اور وہ شور کرتی ہوئی گھر کے اندر بھاگ گئی صاحب خانہ سمجھ گئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گھر والوں کی نیت ٹھیک نہیں تھی اور وہ ان بزرگ پر منکشف ہوگئی بڑی ندامت ہوئی مہمان نے اُسے محسوس کیا اور کہا کچھ حرج نہیں ہے شوربہ اور مصالحہ تو ہے ہی اس سے بھی روٹی کھائی جاسکتی ہے بوٹی نہیں ہے نہ سہی۔ دیکھا آپ نے عورت اگر بداخلاق ہوتی ہے تو شوہر کی عزت ہی اتار لیتی ہے ایسے بزرگ شخص مہمان ہوئے جو اتنے بڑے صاحب کرامت تھے کہ ان پر سیکڑوں مرغیاں قربان مگر اسکی طبیعت اتنی چھوٹی تھی کہ ایک مرغی کے ذبح ہوجانے پر دل دل میں ان پر اعتراض کرنے لگی یہ بہت بُری چیز ہے بے ادب ہمیشہ محروم رہتا ہے جسے جو ملتا ہے ادب سے ملتا ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

یعنی خدا سے ہم ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں کیونکہ بے ادب حق تعالیٰ کے لطف وکرم سے محروم رہتا ہے اور بے ادب صرف اپنا ہی بُرا نہیں کرتا بلکہ اطراف عالم میں آگ لگادیتا ہے۔

دہلی میں ایک بزرگ تھے بادشاہ نے خفا ہوکر ان سے کہا کہ ہمارے یہاں سے چلے جاؤ۔ فوراً اٹھے اور چلے گئے جب انکی سرحد سے باہر ہوگئے تو جس چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اُسے اُلٹ کر فرمایا کہ یا اللہ اس کی حکومت کو اسی طرح اُلٹ دے۔ بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو لوگوں کو بھیجا کہ ان کو بُلا لاؤ مگر وہ جاچکے تھے۔ دیکھئے ایسے درجہ کے تو بزرگ تھے اور ان کے ساتھ یہ بے ادبی کی ایسا ہوتا ہے آدمی جب کسی کو پہچانتا نہیں تو بڑے بڑوں کے ساتھ بڑی بڑی بے ادبیاں کرجاتا ہے۔ ایک جانب تو اعتراض اور انکار کے یہ واقعات آپ نے سُنے۔ اب اس کا دوسرا رُخ اعتقاد، ایثار اور کسی کو ماننے کے واقعات سنئے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لے گئے اس وقت انصار حضرات مہاجرین کے ساتھ جس سلوک اور ایثار کے ساتھ پیش آئے اس کی کوئی مثال نہیں پیش کیجاسکتی جن لوگوں میں مواخات کرادیگئی تھی تو انصار نے اپنے اس مہاجر بھائی کو اپنے کل مال کا آدھا آدھا دیدیا حتیٰ کہ اگر کسی کے دو بیبیاں تھیں تو اس نے ایک کو طلاق دیکر اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ تم اس

سے نکاح کرلو۔ دیکھتے ہیں آپ اس خلوص اور ایثار کو جب تک اسمیں قدم نہ رکھئے گا سب بیکار ہے اب آپ لوگ کیا صرف ظاہر ہی سے کام کریں گے کیا اسمیں باطن پیدا کرنیکی ضرورت نہیں ہے اخلاص پر ایک اور واقعہ سنئے!

ایک بزرگ طلباء کو درس دیا کرتے تھے ایک مرتبہ فاقہ سے تھے جس کا اثر چہرہ پر بھی معلوم ہوتا تھا ایک ذہین فہیم طالب علم نے بھانپ لیا کہ حضرت کے چہرے پر نقاہت ہے معلوم ہوتا ہے کچھ کھایا نہیں ہے۔ یہ خیال کرکے اس نے کہا کہ حضرت آج سبق نہ پڑھیں گے اور گھر جاکر عمدہ عمدہ کھانے خوان میں رکھ کر خود اپنے سر پر لایا اور استاذ کے سامنے رکھ دیا انھوں نے فرمایا اسے لے جاؤ ہم نہیں کھائیں گے عرض کیا حضرت کیا بات ہے کھانا مشتبہ ہے یا میرے اخلاص میں کچھ کمی ہے۔ انھوں نے فرمایا یہ بات نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ مجھے اشراف (انتظار) ہوگیا تھا کیونکہ تم نے جب یہ کہا کہ آج سبق نہ پڑھیں گے اور فوراً واپس گئے تو میں نے بھی یہی سمجھا تھا کہ تم کھانا لینے کے لئے جارہے ہو بس مجھے انتظار ہوگیا اور حدیث شریف میں ہے کہ بغیر اشراف نفس کے ساتھ کوئی چیز آئے تو لو طالب علم نہایت ہی سمجھدار تھا فوراً اسکو اٹھالی اور کہا بہت اچھا جاتا ہوں یہ کہہ کر کچھ دور واپس گیا جب نظر سے غائب ہوگیا تو پھر واپس آیا اور کھانا پیش کرکے کہا کہ حضرت لے لیجئے اب تو اشراف نہ رہا ہوگا اب تو اشراف کے ساتھ نہیں آیا چنانچہ انھوں نے لے لیا اور کھاکر بہت خوش ہوئے اور اسکے فہم اور اخلاص پر بہت دعائیں دیں آدمی میں جب اخلاص ہوتا ہے تو اُسے کام کرنے کا ڈھنگ بھی آجاتا ہے اب اس زمانہ میں روپیہ بہت خرچ ہوتا ہے لیکن ڈھنگ اور سلیقہ نہیں آتا ہیں۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ انبیاء اور اولیاء اللہ تعالیٰ سے جنت کا جو سوال کرتے ہیں تو اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جانب اپنے بندوں کو متوجہ فرمادیا ہے چنانچہ فرمایا وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ آپ لوگ مولانا محمد علی مرحوم کو جانتے ہی ہیں اسی جگہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ حج سے واپس آئے تو انھوں نے یہاں ایک تقریر کی اور اسمیں یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کو صفا اور مروہ پر دوڑا کر تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے دوڑا دیا لوگوں نے اس مضمون کو بہت پسند کیا کہ صفا اور مروہ کی سعی کو کس لطیف عنوان سے بیان فرمایا اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جنت کا ذکر کرکے اپنے سب بندوں کو دوڑا دیا اور ان میں باہم مقابلہ کرادیا

مسارعت کے معنی عربی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے ہیں۔ ایسا مقابلہ دین میں جائز ہے آپ سے کہتا ہوں کہ جنت آپ کے نزدیک ایسی بے وقعت کیوں ہوگئی ہے اللہ تعالیٰ تو اس میں مقابلہ کرا رہے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت کے باوجود آپ اسے سیکھتے نہیں بلکہ آپ جب پریشان ہوتے ہیں تو پیر کے پاس دوڑ کے جاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ تم دعا کرو۔ خود اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتے پیر سے خوش ہیں اللہ تعالیٰ سے ناراض ہیں حالانکہ جن چیزوں میں آپ مبتلا ہیں مال کی پریشانی، حالات کی پریشانی رزق کی تنگی، عافیت کا نہ ہونا، دشمن کی ایذا رسانی، نفس اور شیطان کی عداوت وغیرہ وغیرہ ان تمام چیزوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یا استعاذہ موجود ہے اسی طرح سے جو امور کہ آخرت سے متعلق ہیں مثلاً جنت کا سوال دوزخ سے پناہ اسی طرح سے قبر کا عذاب، سوال منکر نکیر، میزان، پلصراط ان سب کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں موجود ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا سوال بھی آپ سے ثابت ہے اور ان تمام چیزوں سے متعلق آپ کی سیرت اور آپ کا اسوہ موجود ہے کاش اگر آج مسلمان ان نسخوں کو استعمال کریں تو دارین کی فلاح ان کو حاصل ہو جائے لیکن افسوس اس کا ہے کہ نہ عوام ان سب باتوں کو جانتے ہیں اور نہ خواص ہی انھیں بتاتے ہیں لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے نور طلب کرتے ہیں میں ان سے تو یہ کہتا ہوں کہ جلدی سے کیوں دیدیں اس لئے تاکہ تم لیکر چلے جاؤ اور پھر ملاقات کو کبھی نہ آؤ اور ہم تمہاری ملاقات کو ترسیں اور بیر ہو کر اسی طرح اکیلے بیٹھے رہیں جاؤ نہیں دیں گے بہت دنوں اسی طرح لٹکائے رہیں گے لیکن آپ سے کہتے ہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں طلب کرتے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے کس طرح نور طلب کیا ہے:-

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَّمِنْ خَلْفِیْ نُوْرًا وَّ مِنْ اَمَامِیْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّ فِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ دَمِیْ نُوْرًا

وَ فِیْ شَعْرِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ بَشَرِیْ نُوْرًا وَّ فِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّ اَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّ مِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

یعنی یا اللہ کر دے میرے دل میں نور، اور میری بینائی میں نور، اور میری شنوائی میں نور، اور میری داہنی طرف نور، اور میرے بائیں طرف نور، اور میرے پیچھے نور، اور میرے سامنے نور، اور کر دے میرے لئے ایک خاص نور، اور میرے پٹھوں میں نور، اور میرے گوشت میں نور، اور میرے خون میں نور، اور میرے بالوں میں نور، اور میرے پوست میں نور، اور میری زبان میں نور، اور کر دے میری جان میں نور، اور دے مجھے نور عظیم، اور کر دے مجھے سراپا نور، اور کر دے میرے اوپر نور، اور کر دے میرے نیچے نور یا اللہ دے مجھے نور

(ربط مضمون کے سلسلہ میں ایک گذارش)

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہیں عرض کیا گیا ہے کہ حضرت اقدس کو کتاب و سنت سے خاص شغف تھا چنانچہ تعلق بالقرآن پر ایک معتد بہ حد تک گفتگو فرمانے کے بعد یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ جی چاہتا ہے کہ اسی طرح سے سنت پر بھی کچھ کلام کر دوں ——— اور اس سلسلہ میں وصیۃ السنۃ۔ بشریت کی راہ سے ترقی۔ مفتاح الرحمۃ اور راہ صفا کے عنوان سے مختلف مجالس میں گفتگو فرمائی چنانچہ وصیۃ السنۃ کے نام سے جو مجالس فرمائیں وہ آپ کے ملاحظہ سے گذریں ——— اب "بشریت کی راہ سے ترقی" ملاحظہ ہو۔ یہ مضمون بھی دراصل "وصیۃ السنۃ" ہی کی ایک کڑی تھی جس کو حضرت اقدسؒ نے ایک انوکھا عنوان مرحمت فرما کر اسکی شان کو دوبالا فرما دیا ہے۔

اگر ناظرین کرام کو یہ انداز بیان پسند آجائے اور قلب میں اتباع سنت اور شریعت کا کوئی داعیہ موجزن ہونے لگے تو اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب "مفتاح الرحمۃ" جو کہ تالیفات مصلح الامۃؒ کی جلد دوم میں طبع ہو چکی ہے اسکو بھی ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ ایک خاص کیف و سرور قلب میں پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ حضرت والا کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کے قلوب میں ان مضامین کو راسخ فرما دے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ جامی

Scanned with CamScanner

(بسلسلۂ وصیۃ السنۃ)

(مجلس اول)

بشریت کی راہ سے ترقی

فرمایا کہ میں اسوقت ایک مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں مگر آپ لوگ اسکو سنیں تو ہوش اڑجائیں اور خصوصیت سے علماء کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔
وہ یہ کہ ہم بشر ہیں فرشتے نہیں۔ اور تمام انبیاء بھی بشر ہیں۔ لہذا ہماری جملہ ترقیات بشریت ہی کی راہ سے ہیں ملکیت سے نہیں۔ انسان کو ملکی قوت بھی دی گئی ہے اور بشری بھی۔ مگر ملکی قوت بشری قوت سے کم ہے۔

چنانچہ انسان کے اندر جو ملکیت ہے اس کے اوصاف میں سے خدا کا ذکر اور تسبیح و تقدیس وغیرہ ہے اسلئے کہ فرشتے ہر وقت اسی میں مشغول رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ہ یعنی رات و دن یہ فرشتے تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں ——— اسی طرح انسان ان چیزوں کو بھی کرتا ہے۔ یعنی ذکر اور تسبیح وتہلیل میں بھی مشغول رہتا ہے۔ یہ تو ملکیت کی شان ہوئی۔ چنانچہ صوفیاء کو جو احوال طاری ہوتے ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں اس لئے کہ یہ بھی ملائکہ کی صفت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کلام فرماتے ہیں تو ملائکہ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر ہوش میں آنے کے بعد ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟۔ یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو کیفیات و احوال میں ازخود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بھی بڑی چیز ہے کہ کوئی شخص بشر رہ کر ملکی اوصاف اختیار کرلے

مگر میں اس وقت ایک دوسری چیز کو بیان کر رہا ہوں۔ یعنی بشریت کو اور یہ کہہ رہا ہوں کہ بشر حالت بشریت میں اوصاف بشریہ کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔ بشریت کے لوازم میں سے کھانا، پینا، سونا

پیشاب پاخانہ اور دوسری چیزیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے انہی چیزوں کو اعلیٰ درجہ کے قرب کا ذریعہ بنایا جس کو ہم لوگوں نے اعلیٰ درجہ کی غفلت کا سبب بنا لیا ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہی اوصاف بشریہ کھانا، پینا، سونا وغیرہ جو خالص بشریت اور موجب غفلت ہیں اور جن کا قرب میں کوئی دخل نہیں سمجھتے ہو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ درجہ کا ذکر بنا دیا۔ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے عین غفلت کو ذکر بنا دیا۔ اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ سنئے!

سونا تو خیر غفلت ہے ہی۔ کھانا بھی غفلت کا سبب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جتنے غافلین ہیں ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا صدور اسی کھانے ہی کے سبب ہوتا ہے۔ اگر کھانے میں کمی کریں تو ان سے معاصی کم صادر ہوں۔ اور اگر ان اوصاف بشریہ کو سنت کے مطابق کرلیں تو اسی سے غفلت دور ہو جائے۔

لیکن میں جو کہہ رہا ہوں یہ بات باوجود آسان و سہل ہونے کے آپ لوگوں کے سمجھ میں جلدی نہیں آوے گی۔ اس لئے کہ سنت سے بہت دور ہو چکے ہو۔ ہاں اگر کوئی ایسی چیز بتلا دوں کہ اس سے دماغ پر اثر ہو جائے اور بعض لوگ اس میں پاگل تک ہو جائیں تو اسکو البتہ سمجھیں گے کہ ہاں یہ کوئی چیز ہے۔

بعضے اشغال وغیرہ ایسے ہیں کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا لوگ پاگل تک ہو جاتے ہیں مگر میں اس کو نہیں بتاتا ہوں بلکہ یہ بتا رہا ہوں کہ اوصاف بشریت سے متصف ہونے کیوقت ہی میں قرب اور فرشتوں سے زیادہ قرب حاصل کر سکتے ہو۔

ان اوصاف بشریہ میں سے ایک کھانا ہے اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو دے۔ یہ ایک سنت ہوئی اور پھر بسم اللہ پڑھے یہ دوسری سنت ہوئی اور جب کھانا کھا چکے تو یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھکو کھلایا اور پلایا اور مجھکو مسلمان بنایا۔ یہ تیسری سنت ہوئی۔

اور ابوداؤد شریف کی حدیث ہے کہ جب مومن کھانے کے بعد یہ دعا پڑھے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ ھٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ (یعنی تمام تعریف ہے

اس اللہ کے لئے جس نے یہ کھانا مجھکو کھلایا اور بغیر حول و قوت کے مجھکو عطا فرمایا) تو اس کے سال بھر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح جب کپڑا پہنے اور یہ دعا پڑھے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَلْبَسَنِیْ هٰذَا اللِّبَاسَ وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ یعنی تمام تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جس نے مجھکو یہ لباس پہنایا اور بغیر حول وقوت کے مجھکو عطا فرمایا) تو اس کے دو سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

موحد جب کھانے کے بعد یہ دعا پڑھتا ہے تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسا کچھ ہوتا ہے اسکو وہی جانتا ہے اس لئے کہ یہ کھانا نعمت ہے اور نعمت سے منعم کی معرفت ہوتی ہے اور یہ معرفت فعل قلب ہے۔ لسان کا فعل نہیں۔ چنانچہ بخاری میں ہے :-

اِنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ ۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۳)

پس مومن جب نعمت کو استعمال کرتا ہے تو اس نعمت کے منعم کی معرفت اسکو حاصل ہوتی ہے اور اسی معرفت میں وہ غرق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ صرف اسی قلبی معرفت پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ زبان سے بھی منعم کا شکر اس طرح ادا کرتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور یہ ذکر لسانی اسی معرفت قلبی کا اثر ہوتا ہے اور اتنے ہی سے مومن بہت دور تک پہونچ جاتا ہے۔ اور منعم کی معرفت جو قلب میں حاصل ہوتی ہے زبان سے الحمد للہ کہنے کی وجہ سے اس میں اور ترقی ہوتی ہے۔ اور شکر کے طور پر جتنے کلمات مومن کہتا ہے وہ سب اس کے ایمان کی ترقی کے باعث اور ازدیاد ایمان کے موجب ہوتے ہیں۔ قلب میں جو چیز ہے یعنی معرفت جب وہ زور کرتی ہے تو زبان پر آتی ہے۔ اور جب زبان سے کہتا ہے تو دل میں جاتی ہے۔ زبان تائید کرتی ہے قلب کی اور قلب تائید کرتا ہے زبان کی۔ دونوں ایک دوسرے سے ملکر ایمانی ترقیات کے باعث ہوتے ہیں اور اس طرح مومن کا ایمان برابر بڑھتا رہتا ہے۔

اس کے لئے میں نے ایک مثال پیش کی تھی کہ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ مجھکو جب کوئی شخص ہدیہ دیتا ہے تو قلب اللہ تعالیٰ سے نیا معاملہ کرتا ہے اور ایک نیا عہد باندھ لیتا ہے۔

میں نے کہا کہ بھائی جبھی تو ان کو ہدیہ زیادہ ملتا تھا اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ جب ان کے پاس بھیجوں گا تو یہ فوراً میری طرف رجوع ہو جائیں گے اور مجھ سے

نیا عہد باندھیں گے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے یہ بیچارے ہدیہ پیش کرنے والے کیا دیتے — موحد یہی سمجھتا ہے کہ جو چیز بھی پہونچتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پہونچتی ہے سبحان اللہ خوب عہد ہے اور کیسا معاملہ ہے۔ ہم لوگ ذکر کرتے ہیں تب بھی قلب کا عقد اللہ تعالیٰ سے نہیں بندھتا اور ان کو دیکھئے کہ ہدیہ پا رہے ہیں اور نیا عہد باندھ لیتے ہیں میں یہ کہتا ہوں کہ وہ بزرگ ہدیہ لینے کے وقت جو نیا معاملہ کرتے تھے تو اس لئے کہ روپیہ حاجات کے رفع کرنے کا ذریعہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیا تعلق پیدا کرتے تھے ہم لوگوں کو اگر ہدیہ نہیں ملتا ہے تو کھانا تو دونوں وقت ملتا ہے۔

اسی کو کہتا ہوں کہ روپیہ اتنی مفید چیز نہیں ہے جتنا کھانا اور پینا۔ روپیہ تو اگر بہت سا بھی پاس میں ہو تو زیادہ تر وہ دوسروں کے ہی کام آتا ہے — ملازم کی تنخواہ، مکان کا کرایہ اور دیگر امور میں صرف ہو جاتا ہے۔ البتہ جو کھانا ہم کھا لیتے ہیں اور پانی پی لیتے ہیں وہی ہمارے کام آتا ہے۔ اسی سے ہماری بشریت کا قیام ہے۔ اس لئے کہ ہم اس کے محتاج ہیں اور برابر اس کو کرتے رہتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے لئے روپئے پیسے سے زیادہ کارآمد کھانا اور پانی ہے اس لئے اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھیں اور اس کا شکر ادا کریں اور ہر کھانیکے وقت اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھیں تو اسی سے اللہ تعالیٰ کا کتنا قرب حاصل ہو جائے، مگر یہ آسان نہیں ہے۔ اس کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا تب کہیں جا کر یہ حاصل ہوگا۔

وہ بزرگ جو ہدیہ لینے کے وقت نیا عہد باندھتے تھے ان کو یہ بات بہت دنوں میں حاصل ہوئی ہوگی — اسی طرح آپ بھی کرتے رہئے اور دل سے اخلاص کے ساتھ اور ہر وقت کی سنت کو اس کے استحضار کے ساتھ کیجئے۔ کرتے کرتے بتدریج یہ چیز حاصل ہو جائیگی ابتدا میں مجاہدہ کرنا ہوگا ورنہ جب کھانے بیٹھئے گا تو بھول جائے گا۔

پہلے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نفس پر غصہ اور ترک سنت پر رنج وغم اختیار کیا جاتا ہے تب نفس سنت کی راہ پکڑتا ہے۔

میں نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک بزرگ تھے وہ کھانا کھاتے وقت ہاتھ دھونا کبھی نہیں بھولتے تھے اور بسم اللہ کہنا بھول جاتے تھے۔ اور کھانے کے بعد کی دعا پڑھتے تھے

اسی طرح جب پاخانے جاتے تھے تو پہلے بایاں پیر داخل کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے لیکن دعا پڑھنا بھول جاتے تھے۔ اور نکلنے کے بعد کی دعا وہاں بھی یاد رہتی تھی اس کو بھی ضرور پڑھتے۔ اس پر انھوں نے اپنے نفس سے سخت محاسبہ کیا کہ دو دو سنتوں میں سے ایک کو لیتا ہے اور دوسری کو کیوں ترک کر دیتا ہے۔ جس طرح کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا سنت ہے اسی طرح بسم اللہ پڑھنا بھی سنت ہے بلکہ ہاتھ دھونے سے بڑھکر ہے۔ اسی طرح وہ بزرگ اپنے نفس کو برابر ملامت کرتے تھے کہ تم سے بڑی بڑی سنتوں پر کیا عمل ہوگا جب یہ چھوٹی سنتیں تم سے نہیں ہوتیں ——— غرض رنج کرنا اور غم اٹھانا اس راستہ میں مجاہدہ ہے۔ اگر غم نہیں کروگے تو بدحالی ہمیشہ رہ جائیگی۔

اہل اللہ اپنی بدحالی سے بہت رنج و غم کرتے ہیں تب کہیں جاکر سنت اور فرض کو پکڑتے ہیں۔

اسی طرح میں نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ کچھ بزرگ لوگ کہیں کھانا کھا رہے تھے اتنے میں ایک شخص آیا اور ان کو سلام کیا ان لوگوں نے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ اسی طرح کھانے میں مشغول رہے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سوال کیا کہ میں نے آپ لوگوں کو سلام کیا آپ لوگوں نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم صوفی لوگ ہیں ہمارا ہر کام اللہ کے لئے ہوتا ہے اور ہمارا کھانا بھی عبادت ہے۔ اور عبادت میں مشغولی کے وقت نہ سلام کرنا چاہیئے اور نہ اس کا جواب دینا چاہیئے جس طرح جب کوئی آدمی نماز یا ذکر کر رہا ہو تو ایسی حالت میں سلام کرنا اور اس کا جواب دینا نہیں چاہیئے۔

دیکھئے ان لوگوں نے کیسی عمدہ بات کہی کہ ہم صوفی لوگ ہیں ہمارا طریقہ غفلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استعمال کرنے کا نہیں۔ اور جب ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں تو اسی وقت ذاکر ہوتے ہیں۔ اور اس طرح سبب غفلت کو ذکر بنا لیتے ہیں سبھی مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اب تو حال یہ ہے کہ نماز میں بھی ذکر نہیں ہوتا۔ اور ان حضرات کا ذکر کھانے میں بھی ہوتا ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ آپ میں اور انمیں کتنا فرق ہے۔

کھانے پینے کے بعد پاخانہ کی نوبت آتی ہے اور کھانے سے بڑھکر اجابت کا ہوجانا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس لئے کہ اگر کھانا ہضم نہ ہو یا قبض ہوجائے اور پاخانہ نہ ہو تو سخت

Scanned with CamScanner

مصیبت ہوجاتی ہے اور جتنی بیماریاں ہیں وہ سب معدہ ہی سے ہوتی ہیں۔

اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمائی کہ جانے سے پہلے یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَائِثِ یعنی یا اللہ آپ کی پناہ چاہتا ہوں خبث اور خبائث سے۔ اور پہلے بایاں پاؤں داخل کرے اور جب نکلے تو پہلے دایاں پیر نکالے اور یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَ اَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ یعنی تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے موذی چیز کو مجھ سے دور کردیا اور اس چیز کو مجھ پر باقی رکھا جو نفع دے۔ کھانے کے بعد جو دعا پڑھی جاتی ہے اس سے کہیں بڑھکر یہ دعا ہے۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر یہ دعا نہ فرماتے تو ہم لوگ کھانے کو تو نعمت سمجھتے مگر اجابت کے ہوجانے کو بھلا کون نعمت سمجھتا یہ ہے بشریت کی راہ سے ترقی اسلئے کہ فرشتے نہ کھانے کو جانتے ہیں نہ پاخانے کو۔ سو اگر ہماری تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتے تو وہ ان سب چیزوں کو کیا بتلاتے اس لئے کہ ان کو وہ جانتے ہی نہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام چونکہ بشر ہوتے ہیں ان کی ترقیات کھانے میں بھی ہوتی ہیں اور پیشاب، پاخانہ کے ہونے میں بھی ہوتی ہیں۔ اور وہ اسی سے اللہ تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔

پس ہمارے لئے بھی یہ چیزیں قرب کا ذریعہ بن سکتی ہیں اس طور پر کہ ہمارا کھانا پینا پیشاب، پاخانہ سب سنت کے طریقہ پر ہو اور سب میں اتباع سنت کی نیت کیجائے۔

ضروریات زندگی میں سے ایک سونا بھی ہے اور یہ بھی لوازم بشریت سے ہے۔ چنانچہ سونے کیوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تعلیم فرمائی:۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَ اَنْتَ تَوَفّٰھَا لَکَ مَمَاتُھَا وَ مَحْیَاھَا اِنْ اَحْیَیْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصَّالِحِیْنَ وَ اِنْ اَمَتَّھَا فَاغْفِرْ لَھَا وَارْحَمْھَا یعنی یا اللہ آپ ہی نے میرے نفس کو پیدا فرمایا ہے اور آپ ہی اس کو وفات دیں گے۔ اسکی حیات اور موت آپ ہی کے لئے ہے۔ اگر اس کو زندہ رکھئے تو اس کی حفاظت کیجئے اس طرح کہ حفاظت کرتے ہیں آپ اپنے نیک بندوں کی اور اگر اسکو موت دیجئے تو آپ اسکی مغفرت فرما دیجئے اور اس پر رحم فرمائیے اسی طرح یہ دعا ہے کہ اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَ اَحْیٰی اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَکَ یَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَکَ اے اللہ آپ ہی کے نام سے مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں۔ اے اللہ آپ بچا لیجئے اپنے عذاب سے جسدن اپنے بندوں کو اٹھاویں گے۔ انکے علاوہ اور بھی دعائیں منقول ہیں

اور جب سو کر اٹھے تو یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْرُ ۔ یعنی تمام تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے بعد موت دینے کے ہم کو زندہ کیا اور اسی کی طرف پھر لوٹ کر جانا ہے ۔

جب سونے کے وقت دعاؤں کو پڑھکر سوئے گا تو ذکر ہی پر نوم ہوئی اور جب اٹھتے ہی دعا پڑھے گا تو بیداری بھی ذکر کے ساتھ ہوئی ۔ پھر درمیانی وقت بھی ذکر ہی میں شمار ہوگا اور اس کا سونا بھی سنت کے ساتھ ہوا اس لئے کہ اس وقت کی سنت کا لحاظ کر کے اور دعا پڑھکر تب سویا اور اس کی بیداری بھی سنت ہی کے ساتھ ہوئی تو درمیان میں جو وقت گذرا یہ سب سنت میں گذرا ۔

حضرات صحابہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے اس چیز کو سمجھا اور سنن نبویہ کو اپنے عمل میں جاری کیا ۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا صحابہ اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ کوئی سنت بھی ان سے متروک نہ ہوتی تھی

ایک صحابی جن کا نام حضرت حذیفہ ہے وہ گورنر تھے ان کی عادت تھی کہ جب کھانا کھاتے وقت کوئی چیز گرجاتی تو اُسے اٹھا کر صاف کر کے کھا لیتے تھے اس لئے کہ یہ بھی سنت ہے، (حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ رزق کا احترام کرنا چاہیئے یہ جس گھر سے نکل جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا ۔ اسی لئے صحابہؓ رزق کا بہت احترام کرتے تھے) چنانچہ حضرت حذیفہ ایک دفعہ فارس کے کسی مقام پر بطور دورۂ حکام تشریف لے گئے ۔ بڑے بڑے رئیس کفار ملاقات کے لئے آئے آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے وہ کفار بھی پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا آپ نے اٹھا کر صاف کر کے اس کو کھا لیا ۔ ایک خادم نے چپکے سے عرض کیا کہ حضرت اس وقت یہاں پر بڑے بڑے دنیادار کفار کا مجمع ہے اور یہ عجمی لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور یہ ایسی بات کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے اپنی نظروں سے گرادیں گے ۔ انھوں نے تو پست آواز سے کہا تھا مگر حضرت حذیفہ نے بلند آواز سے فرمایا کہ کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے اپنے خلیل اور اپنے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو چھوڑ دوں گا

سبحان اللہ کیا شان تھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی اور کیا عمدہ جواب دیا کہ چاہے یہ لوگ اپنی نظروں سے گرادیں یا کچھ بھی ہو ہم انکی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہیں چھوڑیں گے یہ لوگ ہم سے راضی ہوں یا ناراض ہم اسلئے یہاں نہیں آئے ہیں کہ ان لوگوں میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو ترک کردیں ورنہ اسی طرح سب سنتیں ایک ایک کرکے ختم ہو جائیں گی۔ دیکھئے حضرات صحابہ نے اس قدر اہتمام فرمایا تب سنتیں محفوظ رہ سکیں ہیں لہٰذا اب بھی علماء امت کو خصوصاً اور تمام امت کو عموماً چاہیئے کہ ان سنن نبویہ کو اپنے عمل میں جاری کریں ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ سنن و حدیث صرف کتابوں میں لکھی رہ جائیں گی اور امت ان کے برکات سے محروم ہی رہ جائیگی اسی لئے اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور اسکو عمل میں جاری کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس میں پہلے محنت کرنی ہوگی سنتوں کو یاد کرنا ہوگا اور ان کے مواقع پر انکو یاد رکھنا ہوگا۔

اسی کو میں نے کہا تھا کہ سنت کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو یاد کرنا ہوگا اور یہ مجاہدہ کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور نفس کو مارنا بھی سنت ہے اسلئے طالبین اور سالکین کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی شرارتوں پر خود غصہ کریں اور ترک سنت پر رنج و غم کریں تب کامیابی ہوگی اور سنت کی برکت ملے گی۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ ریاضت میں اپنے نفس پر غصہ کرنا ضروری ہے اگر ایسا نہیں کیا جائیگا تو اصلاح نہیں ہوگی۔

اگر نفس نہ ہوتا تو آپکی طلب اور آپکا مجاہدہ کیسے ثابت ہوتا اللہ تعالیٰ نے تو مجاہدہ ہی کیلئے نفس کو پیدا فرمایا اور اس نفس کی معلوم نہیں کتنی خواہشات ہیں اور ہر ہر خواہش اللہ تعالیٰ سے روکنے والی ہے اسلئے جو شخص اپنی ہر خواہش کا پورا مقابلہ کریگا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا درجہ پا دیگا اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ تم ہمارے دوست ہو اسلئے کہ تم نے اپنے نفس کو جو تمھارا دوست تھا ہماری خاطر چھوڑ دیا تھا — یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کو جو دیا ہے تو سب سے بڑی بشریت یہی ہے مگر اللہ والوں نے اسکو مٹا کر ذلیل و خوار کرکے رام اور تابع کرکے چھوڑا اللہ کے بندوں نے یہی کیا اور اپنی پوری سعی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کیطرف رجوع ہوتے ہیں کہ یا اللہ یہ نفس بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسکی خواہشات بھی آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں اگر آپ ہی اسکے رُخ کو پھیر دیں تو یہ رام ہو سکتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکے لئے یہ دعا فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا یعنی اے اللہ میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما اور اسکو پاک فرما تو بہترین پاک کرنیوالا ہے اور تو ہی اسکا ولی اور مالک ہے۔ بس ہمکو بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیئے اور سنت کی راہ پکڑنا چاہیئے۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت مصلح الامۃؒ نے اصلاحِ نفس کے باب میں یہ گُر کی بات سمجھائی کہ اسکا ایک آسان علاج اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کیونکہ نفس کی مثال خونخوار کتّے کی سی ہے جو دوسروں کا دشمن اور صرف اپنے مالک کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا فرمائی اور ہمیں کرنی سکھائی ہے کہ " اے اللہ تو نفس کا خالق و مالک ہے تو ہی اسے فجور و تقویٰ الہام فرمایا کرتا ہے لہٰذا میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما اور اسکا تزکیہ فرما۔

ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ دل سے اس طرح سے دعا کرنے کی توفیق عطا فرمادیں اور یہ دعا قبول ہوجائے تو نفس کا روڑا صاف ہو کر انسان کی اصلاح ہی ہوجائے اور پھر سنت پر چلنا اسکے لئے آسان ہوجائے اور اتباع سنت حصول نسبۃ کا زینہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے یہ راستہ آسان فرمادیں۔ جامی)

(بسلسلۂ وصیۃ السنۃ) (مجلس دوم)

بشریت کی راہ سے ترقی

سنئے! اس زمانہ میں لوگ میرے بدن پر گرنا چاہتے ہیں، جیسے چراغ پر پروانے گرتے ہیں، — اس کہنے سے میرا مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسے لوگوں کے قربِ جسمانی کو کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کافی نہیں۔

آدمی اللہ تعالیٰ تک جو پہونچتا ہے تو عمل کرکے، اور عمل جانتے ہیں کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنت کی پیروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ کر کبھی کوئی شخص خدا تک نہ پہونچا ہے، اور نہ پہونچ سکتا ہے۔

اور میں نے یہ بھی کہا کہ سنت سے میری مراد موٹی موٹی سنتیں ہیں، جو کھانے، پینے پاخانہ وغیرہ سے متعلق ہیں:-

چنانچہ دیکھئے! سب سے بڑی نعمت جس پر حیات موقوف ہے، کھانا، پینا ہی ہے انسان کے لئے اس کا استعمال ناگزیر ہے، — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ یہ چیزیں

Scanned with CamScanner

انسان کے لئے ضروری بھی ہیں، اور بشری تقاضہ کے موافق بھی ہیں، اس لئے اس کے استعمال میں حظ بھی آئے گا، اور شاید اس کا استعمال اپنے عادت کے موافق ساری عمر کرتا رہے، اور ہوسکتا ہے کہ ایک انسان انھیں میں انہماک کر کے اپنے آپ کو غفلت میں ڈالدے اسلئے آپ نے بڑا ہی کرم امت پر یہ فرمایا کہ ان سب اسباب غفلت کے شروع، درمیان، اور آخر میں اپنی ایک ایک سنت شامل فرما کر ان اسباب غفلت کو بھی اسباب ذکر بنا دیا۔

چنانچہ کھانے ہی کو لے لیجئے کہ شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے، اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنے کو مسنون فرمایا۔ اور ختم طعام پر یہ دعا مسنون فرمائی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اسی طرح سے کھانا کھانے میں نیت تقویٰ علی الطاعات کی مشروع فرمائی، اس طور پر آپ نے ایک مومن کے کھانے کو اس کی نماز کے مشابہ کر دیا۔

دیکھئے نماز میں بھی عبادت کی نیت کیجاتی ہے۔ چنانچہ اسی نیت کی وجہ سے علماء فرماتے ہیں کہ وہ عادت سے ممتاز ہو کر عبادت ہو جاتی ہے، اسی طرح سے انسان کھانا بھی گو عادۃً اور بشری خواہش کی بناء پر کھاتا ہے، مگر جب اس سے تقرب علی الطاعۃ کی نیت کرلی گئی، تو وہ بھی عبادت ہو گئی، اسی طرح نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ بھی پڑھی جاتی ہے، اور الحمد للہ بھی پڑھی جاتی ہے، یہ دونوں چیزیں کھانے میں بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو ملانے کے بعد ایک مومن کا کھانا، پینا بھی طاعت ہی ہو جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز نفس کی خواہش کے بھی موافق ہے یعنی انھیں استعمال کر کے عام آدمی کا جی بھی خوش ہوتا ہے، تو پھر ایک موحد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کر کے کس دل سے الحمد للہ کہتا ہوگا۔۔۔ پس جہاں اُس نے صمیم قلب سے خدا کو یاد کیا، پھر اس کے خدا تک پہونچنے میں کیا کسر باقی رہیگی۔

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھے ہدیہ دیتا ہے تو قلب اسوقت اللہ تعالیٰ سے ایک نیا معاملہ کرلیتا ہے۔۔۔ سبحان اللہ کیا بات ہے، ہر ہدیہ کے ساتھ نیا معاملہ کرتے تھے،

میں کہتا ہوں کہ یہ اس لئے کہ مؤمن موحد معطی حقیقی اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے، پس جب ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ایسا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اُن کو بہت دیتے ہیں۔ روپیہ ہمارے پاس بھی آتا ہے، مگر اس کی وجہ سے ہماری غفلت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور ایک اُن کے پاس

آتا تھا، تو اللہ تعالیٰ سے ایک نیا تعلق قلب کا بڑھتا جاتا تھا۔

میں نے اس سے یہ سمجھا کہ جب یہ بزرگ روپیہ کے بارے میں ایسا فرما رہے ہیں، حالانکہ روپیہ کُل کا کُل آدمی کی ذات پر نہیں خرچ ہوتا، بلکہ اس کا زیادہ حصہ دوسروں پر خرچ ہوتا ہے، متعلقین کے کام آتا ہے، خدام وغیرہ کو دیا جاتا ہے، میراث میں تقسیم ہو جاتا ہے، لیکن اپنی ذات کے لئے جو کھانا آپ حضرات کھا لیتے ہیں، وہی کام آتا ہے کہ پیٹ میں چلا جاتا ہے، اور جزوِ بدن بنتا ہے ـــ چنانچہ یہ دال، روٹی اور ایک گلاس پانی جو ہمارے پیٹ میں جاتا ہے، یہ روپیہ کے ملنے سے زیادہ قلب کے سنے، تعلق کے لئے مفید ہے، ہر کھانے پینے میں نیا تعلق قلب کو اللہ تعالےٰ سے ہو سکتا ہے، لیکن آپ اس کو سمجھیں اور عمل کریں تب نہ، آپ یا تو ہزاروں ہزار وظیفہ پڑھینگے یہاں تک کہ دماغ بھی خراب کر لیں گے، نہیں تو کھانا کھا کر الحمد للہ بھی نہ کہیں گے۔

پس جس طرح ان بزرگ نے فرمایا تھا کہ ہدیہ سے ایک نیا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے، حالانکہ روپیہ پیسہ مقصود بالذات نہیں ہے، اور کھانا، پینا تو مقصود ہے، اور کام آنیوالی چیز ہے قوام زندگی ہے، تو آدمی اگر اُسے بسم اللہ پڑھ کر شروع کریگا، اور الحمد للہ کہہ کر ختم کریگا، تو اس سے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کتنا ہو جاتا ہو گا ـ اب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں میں اثر کس چیز سے پیدا کیا جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تو ان کے سامنے رہ نہیں گئی ہے اس لئے کہ خود مستقل ہو گئے ہیں، لہٰذا اسمیں بھی کچھ تاثیر ہے یا نہیں، یہ تو ان کے سمجھ میں آتا نہیں، اور خود جو ذکر و شغل اپنی طرف سے تجویز کرتے ہیں، اسمیں وہ اثر نہیں پاتے اس لئے ہم لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ مسلمانو کو کیسے متاثر کیا جائے، اور کس طرح ان میں دین پیدا کیا جائے، اس پر انھیں سمجھاتا ہوں کہ بھائی مشائخ مستقل نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں، آپ کی بعثت ہی اس لئے ہوئی ہے کہ عبد کو خالق سے ملائیں۔

چنانچہ آپ نے اس کے لئے نہایت ہی سہل طریقہ استعمال فرمایا، وہ یہ کہ جو چیزیں کہ ہمارے نزدیک سبب غفلت تھیں۔ یعنی یہی کھانا، پینا، پاخانہ، سونا وغیرہ، آپ نے ان سب کو ذکر بنا دیا چنانچہ اللہ والوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے تعلق، اور ان کے ساتھ قلب کے باندھنے کا یہی وقت ہوتا ہے، ان نعمتوں کو پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے کیسا کچھ عہد باندھتے ہوں گے

اس کو وہی جانتے ہوں گے،

میں اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں، شاید کسی کے سمجھ میں آجائے۔ چنانچہ اگر کسی کے سینہ میں دل، اور دل میں ایمان واحساس موجود ہے، تو اسکے سجھ میں یہ باتیں ضرور آجائینگی، بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ؎

یعلم اللہ تا بجاناں دو قدم رہ بیش نیست آں یکے بر نفس خود نہ واں دگر در کوئے دوست

یعنی خدا جانتا ہے کہ محبوب حقیقی تک پہونچنے کا راستہ دو قدم سے زیادہ کا نہیں ہے۔ ایک قدم اپنے نفس پر رکھو، اور دوسرا قدم کوئے دوست میں رکھ دو۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ دعائیں کھانے کی، اور سونے کی اور پاخانہ آنے جانے کی امت کو سکھلائی ہیں، یہی دو قدم ہیں، یعنی تم سے اگر اور کوئی وظیفہ نہیں نبھتا تو کھانے اور پاخانے کی ان دونوں ہی دعاؤں کی سنت پر دل سے عمل کر لو، تو اسی دو قدم سے راہ طے ہو جائے۔

اللہ والوں نے ان مواقع پر بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت مستحضر کی ہے، باقی کھانے کا نعمت ہونا تو ظاہر ہے، اور دوسری چیز یعنی پاخانہ تو وہ اس لئے قابل شکر ہے کہ اگر وہ خارج نہ ہو اور پیٹ ہی میں رہ جائے، تو انسان ہلاک ہو سکتا ہے، اور ذرا سا قبض وغیرہ ہو جانے کی وجہ سے جو تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے، وہ تو روزانہ کا مشاہدہ ہے، اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاخانہ جاتے وقت یہ دعا مسنون فرمائی کہ مسلمان یوں کہے:۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ، اور فارغ ہونے کے بعد یہ دعا مسنون فرمائی کہ یوں کہے:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیۡ یا یوں کہے:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ اَذْهَبَ عَنِّیۡ مَا یُؤْذِیۡنِیۡ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیۡ

اس طرح پر ایک خالص بشری ضرورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنا دیا۔

حضرت مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ پانی پت میں ایک بزرگ تھے، انھوں نے اپنے لوگوں سے پوچھا کہ جانتے ہو ایمان کی سلامتی اور خاتمہ بالخیر کسے کہتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ حضرت ہی بتائیں کسے کہتے ہیں، فرمایا کہ ایمان کی سلامتی تو یہ ہے کہ پیٹ بھر کھانا، اور خاتمہ بالخیر

ہے کھل کر پاخانہ ہونا۔

ان بزرگ نے ظرافت کے انداز میں حقیقت بیان فرمائی، یعنی جس طرح سے کہ ایمان ایک دولت ہے، اسی طرح یہ دونوں چیزیں بھی نعمت ہیں، اس لئے کہ صحت اسپر موقوف ہے ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنا بدون صحت کے ممکن نہیں،

ہمارے اطراف میں ایک پیر آتے تھے، وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم کھلا پلا کر خدا تک پہونچا دیتے ہیں، ــ میں نے جب یہ سُنا تو کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہوں، اور وہ اس قول میں صادق ہوں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو بالکل یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے امت کو کھلا پلا کر، یعنی کھانے، پینے کے ذریعہ سے، جس کو دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ بشریت کی راہ سے خدا تعالیٰ تک پہونچا دیا ہے۔

علماء نے بھی تو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ لوگ کھانا، پینا جو کہ اسباب غفلت میں سے ہے، اسمیں اپنے آپ کو غفلت سے بچائیں۔ لیکن غفلت سے بچنے کا کیا طریقہ ہو، اسکو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے بیان فرمایا ہے،

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور شعر ہے، فرماتے ہیں کہ:-

۵　ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں (اور تجھے نفع پہونچا رہے ہیں) تاکہ تجھے روٹی میسر آسکے، اور تو غفلت کے ساتھ اس کو نہ استعمال کرے یعنی تیرے پیش نظر یہ بات رہے کہ یہ سب کی سب چیزیں حیران و پریشان، اور تیری فرماں بردار ہیں، ایسی حالت میں تو خدا کا فرماں بردار نہ ہو، یہ انصاف سے بہت بعید بات ہے،

تو علماء نے یہ تو فرمایا کہ روٹی غفلت کے ساتھ نہ کھانا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ بسم اللہ کر کے کھانا، اور تقویٰ علی الطاعۃ کی نیت سے کھانا، اور کھا کر الحمد للہ کہنا، اس طرح پر آپ نے اس عمل غفلت کو عمل ذکر و معرفت بنا دیا۔

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سونے کو جو کہ سراسر غفلت کا وقت تھا، اپنی مسنون دعاؤں کے ذریعہ ذکر بنا دیا،

Scanned with CamScanner

چنانچہ سونے سے پہلے سلمان کو اس دعا کے پڑھنے کو فرمایا کہ وہ یوں کہے :-
بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لَهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ - اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ
یعنی آپ ہی کے نام کے ساتھ اے میرے رب رکھا میں نے اپنے پہلو کو، اور آپ ہی کے سہارے اٹھاؤں گا اس کو، اگر روک لیں آپ میری جان، تو بخش دینا اس کو، اور اگر پھر بھیجیں آپ اسے تو حفاظت کرنا اسکی جس طرح حفاظت کرتے ہیں آپ نیک بندوں کی۔ اے اللہ بچانا مجھے اپنے عذاب سے، جس دن کہ آپ اٹھائیں اپنے بندوں کو۔

اور جب سو کر اٹھے تو یہ دعا مسنون فرمائی :- اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ - یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں زندہ کیا بعد مار دینے کے۔ اور اسی کی طرف اٹھنا ہے۔

غرض اس طرح کھانا، پینا، سونا، اٹھنا ان سب صفات بشریہ کو آپ نے معرفت کا زینہ بنا دیا۔ اس لئے کہ ہم بشر ہیں، فرشتے نہیں ہیں، ہمارے رسول بشر ہیں، لہٰذا ہماری ساری ترقیات بشریت کے تحت ہونگی، یعنی بشر رہتے ہوئے سنت رسول کی اتباع کر کے ہم ترقی کر سکتے ہیں، اور فرشتوں سے بڑھ سکتے ہیں۔

لیکن میں جو یہ باتیں کر رہا ہوں، اسکو آپ سنیں گے نہیں، اور آسان ذریعہ کو چھوڑ کر مشکل کو اختیار کریں گے، اور یہ بالکل اسی طرح سے ہے، جس طرح سے کہ آج لوگ فرائض کا اہتمام نہیں کرتے، اور اس میں بزرگی نہیں سمجھتے۔ اور نوافل کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھر جب فرائض سے بدعقیدہ ہو اور اسکی عظمت قلب میں نہیں ہے تو اس کے ذریعہ کیا پاؤگے، اور جب نماز، روزہ جو کہ عبادات خالصہ ہیں ان کے متعلق تمہارا یہ خیال ہے کہ اپنی بدعقیدگی کی وجہ سے ان کے ذریعہ خدا تک نہیں پہونچ سکتے، تو پھر کھانا، پینا جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے بھی ایک دنیوی فعل اور بشری تقاضا ہے اس کو کیا سمجھوگے ——— حالانکہ میں نے بتایا کہ وصول الی اللہ کا بہت سہل طریقہ ہے، اور ہم خرما ہم ثواب کا مصداق ہے، اس کے ذریعہ سے اوّلاً تو نعمت کی معرفت ہوتی ہے، پھر اس کے ذریعہ منعم کی معرفت ہو جاتی ہے، اب اسکو لوگ سمجھیں تو بہت جلد کامیاب ہو جائیں۔ مگر یہ بات جلدی تمہارے سمجھ میں آئے گی نہیں، اس لئے کہ دین سے بہت دور

ہو گئے ہو۔ اسی لئے اس کو بار بار بیان کرتا ہوں کہ شاید کسی کی سمجھ میں آجائے ۔

بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہایت ہی سادہ اور آسان ہوتی ہے ۔ اور اس لئے ایسی ہوتی ہے تاکہ اس کو سب لوگ کرسکیں ، اور دین نہ ہونے کی وجہ سے لوگ تکلفات کے عادی ہو جاتے ہیں ، اس لئے سادہ چیزوں کی عظمت کم کر دیتے ہیں ،

بزرگانِ دین انھیں چیزوں کے ذریعہ جن کی آپ کے نزدیک کچھ زیادہ عظمت نہیں ہے ، اپنے ایمان مع اللہ اور تعلق باللہ کی تجدید کرتے ہیں ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو یہی گُر سکھا دیا ، جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً ان کے ایمان کا جلا ہوتا رہتا تھا ، اور وہ اللہ تعالیٰ کے تعلق میں بڑھتے جاتے تھے ۔

چنانچہ نماز ، روزہ کے علاوہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ نماز و روزہ کے علاوہ اپنے کھانے ، پینے اور سونے کے ذریعہ سلوک کے مراحل طے کرتے تھے ،

جیسا کہ میں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول آپ کو سنایا ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ : ۔

اِنِّیْ اَحْتَسِبُ نَوْمَتِیْ کَمَا اَحْتَسِبُ قَوْمَتِیْ یعنی میں اپنے سونے میں ایسے ہی ثواب کی امید رکھتا ہوں ، جیسا کہ اپنے تہجد پڑھنے میں ،

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا کی تفسیر میں ان کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ، وَهُوَ هٰذَا

اللہ تعالیٰ نے نہار (یعنی دن) کے ساتھ لیل کی جو قسم کھائی ، تو اس سے معلوم ہوا کہ اوقات غفلت و راحت بھی حرمت رکھتے ہیں ، کیونکہ قسم کسی محترم چیز ہی کی کھائی جاتی ہے ،

شاہ صاحب رح کے الفاظ یہ ہیں کہ : ۔

" ازیں جا معلوم شد کہ اوقات غفلت و راحت نیز حرمت دارند کہ مدد و معاون ریاضات آئندہ می شوند و ہم باعث حصول ثواب عباداتیکہ متعلق بحقوق خلق است ـــــ چنانچہ معاذ بن جبل رض فرمودہ است اِنِّیْ اَحْتَسِبُ نَوْمَتِیْ کَمَا اَحْتَسِبُ قَوْمَتِیْ یعنی من در خواب خود نیز متوقع اجر و ثواب می باشم ۔ چنانچہ در تہجد خود ، چہ اگر تہجد ادائے حق خالق جل و علیٰ است ، خواب نیز ادائے حق نفس است ، و ہر دو حق بایجاب خدا تعالیٰ واجب ،

آرے غفلت کہ ممد بر طاعت نہ باشد و بحکم شرع و نیت امتثال فرمان الٰہی نبود آں غفلت ہیچ حرمت ندارد بلکہ حرام مطلق است ۔ (تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۲۲۹)

(ترجمہ) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ جو اوقات غفلت و راحت کے ہیں ان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں کلال و ملال دور ہو کر یہ آئندہ کی ریاضات کے لئے ممد و معاون بنیں، یا حقوق العباد سے متعلق جو عبادات ہیں ان کے حصول ثواب کا ذریعہ بنیں تو اس اعتبار سے انکی بھی حرمت ہے، اسی اعتبار سے حضرت معاذ ابن جبل رضؓ نے فرمایا کہ اِنِّی اَحْتَسِبُ نَوْمَتِیْ کَمَا اَحْتَسِبُ قَوْمَتِیْ حضرت شاہ صاحبؒ نے اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ تہجد میں اگر حق تعالیٰ کی حق کی ادائگی ہے، تو سونے میں بھی حق نفس کی ادائیگی ہے۔ اور یہ دونوں ہی حقوق یعنی حق اللہ اور حق العبد اللہ تعالیٰ ہی کے واجب کرنے سے بندوں پر واجب ہوئے ہیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح نفس کے مارنے کا حکم فرمایا ہے (درانحالیکہ وہ شرع کا مطیع و فرماں بردار نہ ہو) اسی طرح آپ نے اس کے حق کو بھی ادا کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ حقوق العباد میں اپنے نفس کا بھی حق داخل ہے۔ پس جب یہ دونوں ہی حق واجب الاداء ہوئے تو آپ اسمیں تفریق کرنے والے کون ہیں، اسی کا نام گمراہی ہے کہ جس چیز کو نفس کے موافق پا پائے لیا اور جس چیز کو شاق سمجھا چھوڑ دیا۔ حالانکہ خدا کے حکم ہونے میں دونوں برابر ہیں، پھر اسمیں آپ کا انتخاب کیسا۔ نص کے آنے کے بعد کسی کی رائے کا اعتبار باقی نہیں رہ جاتا

البتہ یہ غفلت طاعت کے جب معین نہ بنے اور بحکم شرع بھی نہ ہو، نیز اس راحت میں امتثال فرمان الٰہی کی بھی نیت نہ کی جائے، تو پھر یہ غفلت کچھ بھی حرمت نہیں رکھتی، بلکہ حرام ہے۔

دیکھا آپ نے علماء کیسی کیسی باتیں بیان فرماتے ہیں راحت و غفلت کے اوقات ہی کو دیکھ لیجئے تو بظاہر یہ مذموم معلوم ہوتے تھے، اور اسمیں مدح و خیر کا کوئی پہلو بظاہر نظر نہ آتا تھا، لیکن شاہ صاحب کی توضیح کے بعد معلوم ہوا کہ یہ انسان کو آئندہ کی ریاضات و عبادات پر مستعد کر دیتا ہے، اسکے کلال و ملال کو زائل کر دیتا ہے اس لئے یہ دنیا نہیں یہ دین ہے۔ اور حرام نہیں واجب ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ اگر راحت نہیں اختیار کروگے تو حقوق خلق سے رہ جاؤگے!"

دیکھئے ان صحابی نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ اِنِّی اَحْتَسِبُ نَوْمَتِیْ کَمَا اَحْتَسِبُ قَوْمَتِیْ انھوں نے اپنے اس ایک جملہ سے چونکہ سونے کے متعلق فرمایا ہے، کہ میں اسمیں ثواب کی امید

رکھتا ہوں حالانکہ وہ سراسر غفلت ہے، تو جب ایسی غفلت کی چیز باعث ثواب بن سکتی ہے۔ تو پھر اور دوسری چیزوں میں مؤمن کیوں نہ اجر و ثواب حاصل کر سکے گا، جن میں کہ غفلت اس سے کم ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کھانے پینے کے متعلق بیان کیا کہ اس کو اگر تقویٰ علی الطاعت اور بہ نیت امتثال فرمان الٰہی کیا جائے گا تو یقیناً موجب اجر و ثواب ہوگا لیکن اس کے لئے نیت شرط ہے، بدون اس کے نہیں ہوگا۔ دوسرے ہی لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کر کے اور ہر موقع کی سنت کو مستحضر رکھکر اپنے سونے و کھانے کو عبادت بنا لیا تھا اور ایک ہم ہیں کہ ہماری عبادت بھی ٹھیک نہیں۔ یعنی انھوں نے اوقات و اسباب غفلت کو عبادت و ذکر بنا لیا تھا، اور ہم نے اپنی عبادت کو بھی غفلت بنا لیا۔

علماء اگر یہ تفسیر نہ فرماتے تو ہم عبادت صرف حقوق اللہ ہی کو سمجھتے اور حقوق العباد کو عبادت کا درجہ دیتے ہی نہیں۔

بہر حال شاہ صاحب نے اسکی جو شرح فرمائی وہ بہت خوب ہے، انھیں کی برکت سے ایک بات میں بھی کہتا ہوں۔ وہ یہ کہ:-

جب ان صحابی نے اپنا قومہ ٹھیک کر لیا یعنی اپنی نیت درست کر کے جب اپنے قیام کو اللہ تعالیٰ کے لئے کر لیا تو کیا اس نیت کا اثر ان کے نوم پر نہیں پڑیگا؟ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہو جائیگی، ضرور ہو جائے گی۔

میں کہتا ہوں اسی کا نام وصول ہے ـــ میں سمجھتا ہوں کہ صوفیاء یہیں سے وصول الی اللہ کے مرتبے کے قائل ہوئے ہیں کیونکہ وہی حضرات واصل الی اللہ اور اہل اللہ کہلاتے ہیں کہ جن کا سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ یعنی انکی نیت ایسی ٹھیک ہو جائے کہ جو امور اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے ادا ہی ہوں، ان کے علاوہ جو چیزیں عادت وطبیعت سے تعلق رکھتی ہوں وہ سب بھی خالصۃً للہ تعالیٰ ہو جائیں کیونکہ انسان کا یہی کمال ہے اس لئے کہ قومہ ملکیت ہے اور نومہ بشریت ہے۔ اب اگر کسی نے قیام کو ٹھیک کر لیا تو اس نے ملکیت حاصل کر لی تو گو وہ بھی فی الجملہ کمال ہے لیکن بشر کا اعلیٰ کمال یہ ہے کہ بشریت میں رہتے ہوئے ترقی کرے پس قومہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے کر لینا اتنا بڑا کمال نہیں ہے جتنا کہ نوم کو جو ایک بشری وصف اور اوقات غفلت و راحت سے ہے، نیت درست کر کے اللہ تعالیٰ کیلئے کر لینا کمال ہے

چنانچہ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ اسی کمال پر فائز تھے، اور اپنے اس ارشاد سے امت کو اسی چیز کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ کسی نے قیام ہی کے ذریعہ ثواب حاصل کیا تو کیا کیا بات تو جب ہے کہ آدمی اپنی نوم میں بھی وہی ثواب واجر حاصل کرے جو قومہ میں حاصل کیا جاتا ہے،

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہاں صیغۂ واحد استعمال کیا اس سے معلوم ہوا کہ یہ اپنا حال یا اپنے جیسے حال والوں کا حال بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون سب کیلئے عام نہیں ہے، یعنی ہر ایک کا سونا نماز کی طرح ثواب رکھتا ہو ایسا نہیں ہے بلکہ جو لوگ حظوظ نفس سے چھوٹ چکے ہیں اور نفس کو فنا کرکے واصل ہو چکے ہیں، انکا یہ حکم ہے۔ ورنہ جب حظ نفس باقی ہو تو اس وقت تو مجاہدہ واجب ہے۔ کیونکہ اسوقت کی غفلت کیلئے کچھ حرمت نہیں۔

پس یہ حکم واصلین کا ہے محجوبین کا نہیں۔ لہذا جو لوگ نفس سے ابھی چھوٹے نہیں ہیں، اور اس حدیث کو اپنی عملی راحت طلبی اور غفلت شعاری کا پردہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ خداع نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ مخدوع ہیں۔

ایسوں ہی کیلئے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

زسنت نہ بینی درایشاں اثر مگر خواب پیشیں و نان سحر

یعنی جو لوگ مخدوع و محجوب ہیں ان لوگوں میں سنت کا کوئی اثر نہ دیکھوگے۔ سوائے دوپہر کے قیلولہ کرنے اور رمضان شریف میں سحری کھانے کے۔ مطلب یہ کہ یوں تو انکو کتاب وسنت سے ذرا بھی مس نہیں ہے، مگر مفید مطلب باتیں خوب یاد کر لیتے ہیں اور مقصود ان کا اس سے اپنے حظ نفس کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اور اس کو منسوب کر دیتے ہیں کسی بزرگ کی جانب یا کتاب وسنت کی طرف۔

یہ میں آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپکی سنت کھانے پینے سونے اور پاخانہ وغیرہ سے متعلق بیان کر رہا ہوں کہ دیکھئے آپ نے کس طریقہ سے ان معمولی معمولی چیزوں کا رخ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی جانب پھیر دیا۔

اسی کو کہتا ہوں کہ بڑی بڑی ریاضت ومجاہدہ اگر تم سے نہیں ہوتا تو کھانا تو کھاتے ہو، سوتے بھی ہو اور قضاء حاجت کی بھی ضرورت پیش آتی ہے، ان سب امور میں سنت

کا طریقہ اختیار کرو تب بھی محروم نہیں رہو گے۔ مگر بات یہ ہے کہ غفلت جو مسلط ہے وہ چلنے نہیں دیتی۔

ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ میں کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ بھی دھوتا ہوں اور فراغت کے بعد الحمد للہ بھی پڑھتا ہوں، لیکن شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جاتا ہوں اسی طرح یہ کہتے تھے کہ جب پاخانہ سے نکلتا ہوں تو اس وقت کی مسنون دعا پڑھتا ہوں لیکن جاتے وقت کی جو دعا ہے، وہ اکثر بھول جاتا ہوں۔ اس پر انھوں نے اپنے نفس سے مواخذہ کیا، اور اپنی اس حالت پر بہت رنج کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں سنت پر عمل کرنا چاہتا ہوں مگر نفس میرا عمل نہیں کرنے دیتا آدھی سنت کر پاتا ہوں اور آدھی نہیں کر پاتا۔

اور کہتے تھے کہ اس کیلئے یہانتک میں نے مجاہدہ کیا کہ یاد ہو گئی

سنا آپ نے سنت کیلئے بھی مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح سے آپ نے سنا ہو گا کہ لوگ طریق میں مجاہدہ کرتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یاد کرنے کیلئے بھی مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

لوگوں نے لکھ کر دیا ہے کہ سمجھ میں آیا کہ انھیں دعاؤں کو یاد کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہوگی، اور آپ یاد آویں گے، اور آپ سے نسبت حاصل ہوگی، اور پھر وہی نسبت ذریعہ بنے گی اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل ہونے کا۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے "القول الجمیل" میں فرمایا ہے کہ:

جس طرح سے کہ اور وظائف ہیں اسی طرح سے مشائخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جو اذکار صحاح میں وارد ہیں ان کو بھی وہ اپنا معمول بنائیں۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کو اگر آپ ترک کر دیں، عالم ترک کر دے۔ عامی ترک کر دے، تو دین کا ایک بڑا باب ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اسکی وجہ سے اتنا بڑا خلا ہو جائے گا کہ پیر لوگ مستقل سمجھے جائیں گے، ہر شخص کے پاس اس کے باپ دادا ہی کا وظیفہ رہ جائیگا، اور انھیں لوگوں کے اخلاق رہ جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وظائف اور آپ کے اخلاق تو ختم ہی ہو جائیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا (یعنی) بیشک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتا ہو، اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہو۔

اس آیت میں وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا جو آیا ہے تو الذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا کی تعریف ہی علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو شخص صبح وشام کی نیز مختلف اوقات کیلئے جو اذکار مسنونہ وارد ہیں، ان کا اہتمام رکھتا ہے، تو وہ بھی ذَاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ میں شمار ہوگا۔

علامہ نوویؒ نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ :-

سئل الشیخ الامام ابوعمرو بن الصلاحؒ عن القدر الذی یصیر به من الذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ فقال اذا واظب على الاذكار المأثورة صباحا ومساءً فی الاوقات والاحوال المختلفة لیلًا ونهارًا وهی مبینة فی کتاب عمل الیوم واللیلة کان من الذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ

کیونکہ مؤمن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اور محبت کے لئے محبوب کی باتوں کی یاد ضروری ہے۔

ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ ہمارے شیخ کہتے تھے کہ مولوی لوگوں کو جو نفع نہیں ہوتا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ بزرگوں کے یہاں جو اشغال ہیں، اس کو یہ نہیں کرتے۔

میں نے جب سُنا تو کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ اس نے نہیں پہونچتے کہ یہ لوگ نفس کو نہیں مارتے حالانکہ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے لئے نفس کا مارنا ضروری ہے۔ لہٰذا خواہشات نفس کو فنا کرنے کے لئے اتباع سنت ضروری ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے خوب کیا کہ اپنے تک پہونچنے کا ذریعہ نفس کے فنا کو قرار دیا اور اس کے اندر خواہشات رکھدیں تاکہ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کی قدر ہو اس نفس کی وجہ سے قدم قدم پر رکاوٹ ہوتی ہے یہانتک کہ بعض وقت مایوسی تک ہونے لگتی لیکن اللہ تعالیٰ کے جو طالب ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طلب میں نفس کا پورا مقابلہ کرتے ہیں اور سر و دھڑ کی بازی لگادیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب ان کی طلب ا؛

کوشش کو دیکھتے ہیں تو راستہ آسان کر دیتے ہیں وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ یعنی اور وہی وہ ذات ہے جو ان کے ناامید ہونے کے بعد بارش نازل کرتی ہے، اور اپنی رحمت کو پھیلاتی ہے۔

اس وقت ان حضرات کو اپنی کامیابی پر جو خوشی ہوتی ہے، اور جیسی قدر ہوتی ہے یہی حضرات جانتے ہیں، اور زبان حال سے یہ کہتے ہیں ؎

للہ الحمد ہر آنچہ دیدیم و رسیدیم بدوست　　آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

باقی یہ نفس ہے سخت چیز۔ ایسی چیز ہے کہ اس سے قرآن چھوٹتا ہے، حدیث چھوٹتی ہے، بزرگوں کا قرب چھوٹتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کیسی بری چیز ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسی کو اپنے قرب کا ذریعہ بنایا۔ اس کے ساتھ مقابلہ کرنے میں، اور راہ سنت تک پہونچنے میں مشکل شروع ہی میں پڑتی ہے لیکن جب بندہ تل جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سہل بھی فرما دیتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ جو بات بعد میں معلوم ہوئی اگر پہلے سے معلوم ہوتی تو اتنا مجاہدہ نہ کرتے۔ اتباع سنت کی برکت سے حضرت پر طریق کھل گیا ہوگا۔ اور یہ سمجھ میں آگیا ہوگا کہ سب سے سہل اور آسان طریق اتباع سنت ہے۔

میں بھی آپ کے سامنے اس وقت اسی کو بیان کر رہا ہوں کہ سنت کا راستہ سب سے آسان راستہ ہے، اور جس طرح سے کہ آپ ذکر اللہ، اللہ اول زبان سے کرتے ہیں، اس کے بعد دل بھی شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح سے کھانے، پینے، پہننے، سونے کی دعائیں اوّلاً زبان ہی سے پڑھتے پڑھتے دل بھی شریک ہو جائے گا۔ اور پھر آپ اس کے بعد قلب میں ایک جدا تعلق محسوس کریں گے ——— بڑی سنتوں سے تعلق چھوٹی سنتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آدمی پہلے چھوٹی سنتوں ہی پر عمل کرتا ہے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے پھر بڑی سنتوں پر عمل ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح سے علماء و مشائخ کے ذمے ضروری ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو سنت کی ترغیب دیں یعنی خود اس کا اہتمام کریں اور ان سے عمل کرائیں کیونکہ اگر مشائخ نہ کریں گے تو مرید بھی نہ کریں گے۔ اسی طرح سے جب علماء نہ کریں گے تو عوام بھی نہ کریں گے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے سنت بالکل ختم ہو جائیگی۔

سنت جو اب تک موجود چلی آرہی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ علماء و مشائخ نے ہر زمانہ میں اس

کے ساتھ شغف رکھا۔

چنانچہ ایک بزرگ مسجد میں داخل ہوئے تو بایاں پیر اندر پہلے رکھ دیا۔ پھر جب تنبیہ ہوا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور یہ خیال ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ ہم سے کچھ ناراض ہیں اس لئے دربار کا ادب مجھ سے فوت ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر پوری طرح عمل کر لینا آسان نہیں ہے۔ بڑے زبردست عامل کا کام ہے لیکن آدمی میں جب دھن پیدا ہو جائے ایسی کہ وہ سنن رسول کا تذکرہ برابر کرتا رہے، تو پھر اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ سنت سے اس کو دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور دوسروں کو بھی سمجھا سکے گا۔ میں یہ پڑھتا تھا کہ ؎

آؤ بیٹھیں مرکز انوار کی باتیں کریں نور برسائیں رخ دلدار کی باتیں کریں

لیکن آپ کی باتوں کو سمجھنا اور اس سے اثر لینا، اور اس کے نور کی معرفت ہر ایک کیلئے آسان نہیں ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

خاک سمجھیں گے وہ ظاہر بین ہوز نست جو ہمیشہ شاہد بازار کی باتیں کریں

اللہ تعالیٰ نے ہماری تربیت کیلئے انبیاء بشر میں سے بھیجے، ورنہ اگر فرشتے ہماری تربیت کیلئے مقرر ہوتے، تو اس کو ہم برداشت نہ کر سکتے، ہمیشہ خشیت و خوف ہی میں مستغرق رہتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو جن سے ہماری تعلیم و تربیت متعلق تھی بشر ہی بنایا تاکہ وہ ہمارے بشری تقاضوں سے پوری طور پر واقف ہو سکیں، اور تربیت آسان ہو۔

("وصیۃ السنۃ" کے سلسلہ کا مضمون "بشریت کی راہ سے ترقی ختم ہوا)

الحمد للہ والمنۃ کہ اس جگہ کتاب "تالیفات مصلح الامۃ" کا حصہ چہارم ختم ہوا اللہ تعالیٰ جلد حصۂ پنجم کی بھی ترتیب و طباعت کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین۔

Scanned with CamScanner